رفعت ناہید سجاد

چراغ آخرِ شب

گرمی سے پگھلتی کولتار کی زخم زخم سڑک کے ساتھ جڑ کر کھڑا گھر' کسی بے سہارا چھوڑے گئے بوڑھے کی طرح۔ اداس اور تنہا آتے جاتوں کو امید بھری نظروں سے دیکھتا۔ اب آسودگی کا اپنا زمانہ گزار کر ماضی کو خواب کی طرح کھوجتا تھا۔ بے رحم زمانے کے تھپیڑوں میں تنہا کہ کبھی جب 35ء سے 40ء میں یہ گھر بنا تو اس کی اپنی ایک شان ہوگی۔ قد آور' خوب صورت' باوقار لیکن بالکل سادہ' عمارتیں بھی اپنے رہائشیوں کی طرح ایک مزاج رکھتی ہیں اور اپنے زمانے کا رکھ رکھاؤ نبھاتی ہیں۔ پتہ نہیں اس گھر میں کون کون اور کب کب نہیں رہا ہوگا۔ معلوم نہیں اس گھر میں کتنے قہقہے لگائے گئے ہوں گے۔ کتنا رونا رویا گیا ہوگا۔ کون پیدا ہوا اور کس کس کا جنازہ اس گھر سے باہر آیا۔ اس کا ریکارڈ محض گھر کے پاس ہی ہوگا۔ کیونکہ اس کی عمر یہاں مقیم سب لوگوں سے زیادہ ہے' وہ دیکھتا ہے اور خاموش ہے کہ وقت کہیں آگے نکل گیا اور وہ وہیں کھڑے کھڑے زوال کا شکار ہوتا ہے' وقت کو آخر گزر ہی جانا ہوتا ہے۔

عمارت کی باہری سفیدی' سینکڑوں برساتوں کے وار سہہ کر کائی زدہ ہو گئی تھی۔ پہلی نظر میں وہ کسی تجریدی آرٹ کا ہنر پارہ نظر آتا تھا۔ کہیں پھپھوندی کے داغ۔ کہیں میلا روغن۔ کہیں سے سیمنٹ جھڑ کر جھانکتی خستہ حال سرخ اینٹیں اور اینٹوں کے جوڑ میں سے نمو کے شوق سے بے تاب' مختصر سا بوٹا' اپنے اکلوتے کاسنی پھول کی آنکھ کھولے' در و دیوار کی ویرانی کو حیرت ناک دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ کبھی ہوا کے منہ زور تھپیڑوں سے خود کو بچانے

کے لیے۔ ایک قطار میں کھڑے بوسیدہ روشن دانوں میں سے ایک کو قریب ترین پاکر اس کا سہارا پکڑتا۔

شرارتی بچوں کی طرح اندر جھانک کر دیکھتا تو کیا دیکھتا ایک خاتون ٹھک ٹھک بیل بجاتی ادھر سے ادھر جاتی ہیں۔ دو خواتین رنگ برنگے ریشم کے لچھوں میں الجھی کشیدہ کاری فرماتی ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو دھیان گیان میں مشغول رہتے ہیں۔ ایک کاہل سا لڑکا ہے اور ہمہ وقت کھلکھلاتی ایک لڑکی اور بھی بہت ہیں۔ پر اپنی کم عمری کی وجہ سے سب کو نہیں جانتا۔ پھر ہوا کا دوسرا جھونکا اس کو روشن دان کے شیشوں سے دور لے جاتا۔

اب تو روشن دان کے رنگین شیشے بھی ماضی کا حصہ بن گئے تھے۔ قدیم زمانوں میں استعمال شدہ کاپیوں کے گتے کیل ٹھونک کر شیشوں کی جگہ گاڑ دیے گئے تھے کہ جنگلی کبوتروں کی بیٹ سے فرش کو بچایا جا سکے۔ چونکہ ہر چیز اپنے اصل سے ہٹ کر اپنا مقام کھو دیتی ہے۔ اس لیے عارضی بندوبست کا بھونڈا پن نمایاں نظر آتا تھا۔

کاپی کے گتے پر لکھا عثمان عباس، جماعت ہشتم بی' اب بھی دھندلا سا پڑھا جاتا تھا۔ یہ الگ بات کہ اپنے وقت میں خوب ہی خوش خطی سے لکھے عثمان عباس ہشتم بی سر کے بل لٹک رہے تھے۔ گویا یوگا کرتے ہوں۔ کبھی کبھی اس طرح بھی ہم اپنے وقت میں حنوط ہو جاتے ہیں۔

روشن دانوں کے عین نیچے استقامت سے کھڑی کھڑکیاں' لوہے کی زنگ آلود سلاخوں میں قید اور ان میں آزادی سے پھڑپھڑاتا بڑی تائی کا پرانا جالی کا دوپٹہ کہ مکھی مچھر سے بچاؤ کے لیے اس سے تیر بہدف نسخہ کوئی ایجاد نہیں ہوا تھا۔

جہاں قفس ہے وہیں کہیں آزادی بھی ہے۔ ہوا کے جھونکوں کی مدد سے سلاخوں سے چھوٹ کر آزاد ہونے کی جدوجہد میں جالی کا وہ نحیف پردہ مایوس نہیں ہوا تھا۔

باہر برآمدوں کا روغنی سرخ فرش ابھی جگمگاتا تھا جو اس بات کا بین ثبوت تھا کہ کریم بی کے بوڑھے کپکپاتے ہاتھ تادم مرگ اس فرش کی آب و تاب برقرار رکھنے کی جدوجہد کرتے رہیں گے لیکن پھر آخر ہر چیز کو فنا ہے۔ اب وہ کریم بی ہوں یا سرخ فرش۔

بیرونی برآمدہ جو ایک نیم دائرے کی شکل میں ایک اجاڑ اور طویل لان میں کھلتا تھا۔ لان شاید وہ کبھی تھا اب تو جھاڑ جھنکاڑ اور خودرو پودوں سے اٹا ایک قطعہ زمین تھا جس میں اس گھر کے بچوں کا بچپن آنکھ مچولی یا اونچ نیچ کھیلتے گزرا تھا۔ کچھ ایسا ہی ان بچوں نے کھیلا ہوگا۔ جوان بچوں کے باپ دادا تھے اور جب وہ خود بچے تھے۔

سردیوں کی یخ آلود کہرے سے بھری شامیں اس گراؤنڈ کو مزید اداس کر دیتی تھیں' کونے میں کھڑے بھاری تنے والے بیل کے درخت سے موٹے موٹے آنسوؤں کی طرح ٹپ ٹپ گرتے بیل فضا کو مزید سوگوار بنائے دیتے تھے۔ ساتھ ساتھ کھڑے کیت اور کمرخ کے درخت' ارنڈ کی گھنی جھاڑیاں نما درخت اور ان میں ٹیبل ٹینس کی سائز کے سبز ارنڈ۔ کوئی نہیں جانتا ان درختوں پر جو کچھ لدا ہے وہ کس کام آتا ہے اور کیوں اگایا گیا ہے۔

درختوں کی طرح گھر کے مختلف حصوں کے بھی کیا دلچسپ نام ہیں۔ آنگن، دالان، صحن۔ کوٹھی کمرہ غلام گردشیں یا پائیں باغ۔۔۔ سنو تو لگتا ہے کسی محل میں رہتے ہیں کوئی شہزادی سوئی پڑی ہے۔ وقت وہیں تھم گیا ہے۔ یا باہر کوئی سونے کی زنجیر لٹک رہی ہے' فریادی باریابی کا منتظر ہے۔ (ایک تو ہم شہزادوں کا انتظار کرنے سے باز نہیں آتے۔)

دو سیڑھیوں کے اوپر خم کھاتا برآمدہ جیسے کسی نے کمان تان رکھی ہو۔ سرکنڈوں اور بانس سے بنے موڑھے کلاس کے تمیزدار بچوں کی طرح دیوار سے ٹیک لگائے سیدھی قطار میں دھرے جیسے پہاڑے یاد کرتے ہوں۔ جن میں سے ادھڑے تنکے جھانکتے تھے۔ اور ان پر رکھے نرم آرام دہ کشن جن کے مرکز میں اماں اور بڑی تائی نے گرمیوں کی سنسان دوپہریں کڑھائی کرتے گزاری تھیں۔

پاس پڑی راکنگ چیئر پہ اونگھتے اور اونگھ میں جھولتے سر عباس رشید!

حکومت پاکستان نے ابھی تین سال پہلے ساٹھ سال کا ہونے کی وجہ سے ان کو پروفیسری سے برخواست کر دیا تھا۔ یہ ریٹائرمنٹ بھی خوب ہوتی ہے جب تک آپ سیکھ رہے ہوتے ہیں' طالب علموں کو سکھاتے رہتے ہیں جب آپ مکمل طور پر سیکھ چکتے ہیں تو آپ کو ناکارہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ سر عباس رشید کے دماغ میں ایک پوری لائبریری کے برابر کتابیں تھیں۔ پروفیسری ان سے چھٹ گئی تھی لیکن سر ان کے نام کا ایسا لازمی جزو بن گیا تھا' جیسے انگریزوں کے عہد میں بیشتر غداروں کے نام کے ساتھ بطور ٹائیٹل چسپاں ہو جاتا تھا۔

وہ تھوڑی سی نیند لے رہے تھے۔ ابھی چند ہی لمحوں میں راؤنڈ پر ان کے بقول ان کی زوجہ محترمہ آجائیں گی اور ان ہی کے بقول ٹرائیں گی کہ وہ آنکھ نہیں جھپک سکیں گے۔ جس کتاب کو پڑھتے پڑھتے انہیں نیند آگئی وہ اسی طرح ان کی گود میں اوندھی دھری تھی۔

اماں آجاتیں تو اسی جگہ اسی لفظ سے پھر شروع کر دیتے زوجہ محترمہ جہاں ہوتیں بے تاب ہوتیں کہ وہ کہیں اور کیوں نہیں ہیں اس لیے وہ سبک رفتاری سے بار بار مقام بدلتی رہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا وہ جہاں نہیں ہیں، وہ جگہ ان کے بغیر بہت اداس 'بہت بے قرار ہوگی۔ سر عباس کو وہ گولڈ فش یاد آجاتی جو پانی کے چھوٹے سے ٹینک میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک کئی میل کا سفر طے کر لیتی تھی۔

برآمدے کے عین درمیان کھلنے والی گیلری کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا تھا کریم بی نے ابھی تیزی ماری تھی تازہ ہوا کو اندر آنے کی دعوت دے کر وہ گیلا فرش خشک ہونے کے لیے چھوڑ گئی تھیں' اب وہ کارنس پر رکھے کالسی کے گل دان سے مٹی کی پرت ایسے اتار رہی تھیں' جیسے وہ نفاست سے آلو کے چھلکے اتارتی تھیں۔ وہ پھر پھر مار اسپرے کی بارش کریں گی۔ ان کا محبوب شغل۔

گیلری کے دونوں طرف کی دیواروں پر اس گھر کا ماضی اور اس ماضی کا ماضی پارینہ فریموں میں جکڑا محفوظ تھا۔ کالی سفید فوٹو گراف۔ جو گزرتے وقت کے ساتھ پیلی پیلی اور دھویں میں اٹی ہوئی لگتی تھیں۔ ایک گروپ فوٹو۔ کیمرے کا فوکس اتنا بڑا نہیں تھا جتنے لوگوں نے اس میں سمانے کی کوشش کی تھی۔ کھڑے لوگ' کرسیوں پر بیٹھے' فرش پر براجمان۔

جیسی اس وقت کی سب تصویریں ہوتی تھیں۔ تمام مرد حضرات گھٹنوں پر ہاتھ رکھے' اکڑی ہوئی کمر کے ساتھ تن کر بیٹھے کیمرے کی آنکھ میں دم بخود دیکھ رہے تھے۔ سب خواتین کیمرے سے یا کیمرہ مین سے بہت شرما رہی تھیں۔ سب کے سروں پر دوپٹہ تھا اور ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ کی مٹھی' تصویر میں موجود سب کے سب شدید تناؤ کے عالم میں تھے۔ کسی کے چہرے پہ بھولی بسری مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔ شاید اس زمانے میں ہنسنا کوئی پسندیدہ عمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حتی کہ دو سال کے سر عباس رشید بھی زاروقطار رو رہے تھے اور اپنے دادا کے گھٹنے سے اچھل کر وہ اس شیطانی چرخے کی ممکنہ تباہ کاریوں سے بچ نکلنا چاہتے تھے۔ مختلف قسم کے داداؤں۔ ماموں' چچاؤں اور سب کی اولاد کے گروپ فوٹو۔ ان کے چہروں کو بہت دیر تک غور سے دیکھنے کے بعد حمیرا نے کہا تھا۔

"دیکھو! ان تصویروں کی آنکھوں میں دیکھو۔ صاف لگتا ہے یہ مرے ہوئے لوگ ہیں۔"

اور عثمان۔۔۔ جس کو ہر رومینٹک قسم کی فلاسفی کا ناس مارنے میں کمال حاصل تھا۔

"واقعی!" وہ بھونچکا ہو کر ان دونوں کی ڈگری کا رول ہاتھ میں پکڑے۔ گریجویشن والی تصویر تک اپنی آنکھیں لایا۔

"ہاں' صاف لگتا ہے یہ دونوں مری ہوئی ہیں۔"

"ہی ہی ہی۔" عبیر نے کہا تھا "کوئی ہنسی نہیں آئی۔"

"آؤ ہم ان تصویروں کو ڈی کوڈ کریں۔" عثمان نے اچانک ایک نئی گیم کا آغاز کیا۔ "ان کا تاثر دیکھو اور بتاؤ ان کے دل میں اس وقت کیا ہے۔"

"دادی اماں کوئی ادھورا کام چھوڑ کر آئی ہیں۔ غالباً "کڑھی" چولھے پر چھوڑی ہے۔ لکڑیوں کی آگ کے شعلے بلند ہیں۔ ان کو ڈر ہے کڑھی ابل گئی تو چھن سے چولھا بجھ جائے گا۔"

"یہ آسمان پر دیکھ رہے ہیں۔ کیا تب بھی لڑکیاں چھت پر آتی تھیں؟" رضا نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ یہ شاید کنکوے اُڑاتے ہیں۔ یا کبوتروں کے شوقین ہیں۔ ان کی نظروں کا یہ اینگل فکس ہو گیا ہے۔"

"یہ ہیرو بھی ہو سکتے ہیں۔ خلاؤں میں تکتے شاعری کرتے ہوں گے۔"

"یہ ایک ہی پوز میں بیٹھے اکتا گئے ہیں۔ کیمرہ مین نے فوکس کرنے میں بہت وقت لیا ہے۔ یہ لو میں نے تو کیمرہ مین کو بھی ڈی کوڈ کر دیا۔" رضا نے کمال کر دیا۔

"ارے واہ۔۔۔ ان خاتون کے تو بال کٹے ہوئے ہیں۔ یہ ضرور اپنے زمانے کی جون آف آرک ہوں گی۔" عبیر اچھل پڑی۔

"یہ بھی ایک عجیب فلاسفی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں زمانہ صرف وہی ہے، جس میں ہم آج جیتے ہیں، باقی سب قصہ کہانی، ہنسی مذاق ہے۔ ہم سے پہلے لوگ شاید پتھر کے زمانے میں رہتے تھے۔ آخر اس فریم سے باہر بھی ان کی ایک زندگی ہو گی۔ اس زندگی کا ہم یقین نہیں کرتے کیونکہ وہ زندگی ہم نے نہیں گزاری۔ ہم نہیں جانتے وہ کس واقعے پر خوش ہوئے ہوں گے اور کون سا قصہ ان کو غمگین کرتا ہو گا۔ خوشی غمی اضافی اصطلاحیں ہیں، جو ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ سارے لوگ جو اپنی زندگیاں گزار کے جا چکے ہیں۔ کبھی زندہ تھے، وقت کو آخر گزر جانا ہوتا ہے ان پر سے گزر گیا۔ اب ہم پر گزر رہا ہے۔

ایک، کسی اور زمانے میں کسی اور زمانے کے لوگ ہماری تصویروں کے سامنے کھڑے ہو کر سوچیں گے۔ وہ لوگ جو مر جاتے ہیں ان کی تصویریں مردہ کیوں ہو جاتی ہیں۔"

عبیر کو قنوطیت نے آلیا۔ "ہم کتنے غیر اہم لوگ ہیں ہمارے جیسے اور بھی کتنے پیدا ہوئے اور مر گئے۔ حالانکہ ہم خود کو کتنا ضروری تصور کرتے ہیں۔ جیسے ہم ہیں اور رہیں گے۔

آخر ہماری پیدائش کا مقصد کیا ہے؟

ہم یہ لوگ تو شاید پیدا ہی مرے ہوئے تھے۔ موت صرف جسم ہی کو نہیں آتی، کبھی جذبوں کو آجاتی ہے۔ کبھی ہمارے ست پڑتے عمل کو آجاتی ہے، اس آخری اور فائنل موت سے پہلے بھی ہم کئی بار مرے ہوتے ہیں۔ حالانکہ ہم سب مرے ہوئے لوگوں نے جینے کی بڑی خواہش کی تھی۔

ہر زمانے میں ہر عہد کے لوگ شاید اسی طرح جدوجہد کرتے ہیں اور اسی طرح ناکام ہوتے ہیں۔ ہر صبح ایک نئی امید، نئی زندگی کا آغاز کر کے۔ ہر شام اس دن کی موت کے بعد پھر ایک نئی روح کے ساتھ۔ سفر جاری ہے۔ سفر جاری رہتا ہے۔

☼ ☼ ☼

اندرونی صحن میں مچھر دانی تانے، ایک اکلوتے پلنگ پر چچا عبدالعزیز دراز تھے۔ چونکہ وہ صحن میں سوتے تھے اس لیے اجالا ہونے کی سب سے پہلی خبر ان کو ہی ملتی تھی۔ اور ان سے پہلے لوکاٹ اور امرود کے درختوں پر مکین طوطے چڑیوں کو۔ نماز سے ذرا ہی پہلے وہ بے پناہ شور مچاتے اور اپنے درخت کے آس پاس اُڑتے۔

ابھی فضا میں نیم روشنی اور نیم اندھیرے کا دھندلکا سا ہوتا تھا۔ مچھر دانی کی جالیوں سے نچڑ کر بھگوتی اوس میں نم ہوتا اپنا بستر جھاڑ کر چچا عبدالعزیز صبح کا استقبال کرتے۔

سب سے پہلے وہ اپنا بستر لپیٹ کر اپنے کوارٹر میں رکھ کر آتے۔ بان کی چارپائی دیوار سے ایسے ٹکا کر کھڑا کرتے جیسے کھونٹی پر چھتری لٹکائی جاتی ہے۔ جب تک وہ فجر سے فارغ ہوتے پرندے بھی اپنی عبادتوں کے بعد اپنے خاندان کی سرپرستی میں دانا دنکا چگنے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ تب سرمئی آسمان پر مشرق کی طرف سے نارنجی روشنی کے آثار نمودار ہوتے، بلند آواز میں وہ کلمہ پڑھتے ایک ایک کے کمرے کے سامنے سے گزرتے۔ یہ یاد دہانی تھی کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور اے غافل لوگو! پہلے اللہ کو یاد کر لو پھر سو رہنا۔ پتہ نہیں انہیں کیوں شک رہتا تھا کہ انہوں نے یاد نہ کروایا تو لوگ بھول جائیں گے۔

پھر کریم بی کے دروازے کے باہر ٹھہر کر ذرا زور سے کھنکھارتے۔ پھر کھنکھار بلند ہوتی جاتی کبھی اس قدر بلند ہو جاتی کہ ان کے سال خوردہ اور بیڑی زدہ پھیپھڑے اس بوجھ کو سہارنے سے انکاری کھانسی کے حملے کی لپیٹ میں آجاتے۔

"سونے والے جاگ جائیں۔" یہ تنبیہہ صرف کریم بی کے لیے تھی۔ اس لیے کہ کریم بی اک بار جاگ جاتیں تو گھر بھر میں کسی کا سونا ممکن ہی نہیں تھا۔ کریم بی کے پلنگ چرچرانے کی آواز کے ساتھ ہی ان کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی۔ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ناشتے کے لیے وہ صحن پار اپنے کوارٹر میں واپس چلے جاتے۔

آج کی اس صبح میں چچا عبدالعزیز کا کردار ختم ہوتا اور کریم بی کا رول شروع ہو جاتا۔ پتہ نہیں شور مچانے کے تمام تر آلات ان کے پاس کہاں سے آجاتے تھے۔ تنویر کی دی ہوئی ایک پرانی ہیل ان کا محبوب جوتا تھی۔ ہیلز کی چونچ پر لگا چمڑے کا ٹکڑا جھڑ گیا تھا۔ اب لکڑی کی ہیل سے ٹاخ ٹاخ کرتی وہ گھر بھر میں پھرتیں۔

وہ جو دروازہ کھولتیں ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر دھاڑ سے بجتا۔ پھر دروازوں کے خلاف ان کی بڑبڑاہٹیں۔ دودھ ابالنے کو چولھے پر چڑھاتیں تو دیگچی کا ڈھکنا چھوٹ کر گرتا۔ ٹھن ٹھن بجتا دور تک لڑھکتا جاتا۔ جیسی بازیگروں والا میوزک۔ صحن کا نلکا کھولتیں تو کھلے فرش پر تڑتڑ گرتا پانی۔ جب تک تمام اصحاب کہف بیدار نہ ہو جاتے ان کے ہاتھوں سے چیزیں چھوٹ کے یونہی گرتی رہتیں۔

ہر روز کی طرح توے پر جلتے گھی کی خوشبو اور آملیٹ کی مہک سے اس کی آنکھ کھلتی ابھی رات شروع نہیں ہوئی تھی کہ ختم بھی ہو گئی۔ رات اس نے اسکرپٹ پر دیر تک جان ماری کی تھی۔ آج لمبی تان کر سونے کا ارادہ تھا۔ پر بی کریم کے ہوتے ہر ارادہ پورا نہیں ہو سکتا۔

پانی کے بے شمار چھپکوں سے اس نے آنکھوں میں بسی بچی کھچی نیند بھگائی، یونی ورسٹی جانا ہے کپڑے استری ہوئے پڑے ہیں۔ پندرہ منٹ کی پیدل واک کے بعد یونی ورسٹی بس کے پوائنٹ کا انتظار۔ ان سب کے لیے ضروری تھا کہ ایک چھلانگ کے ساتھ بستر سے اٹھ جایا جائے۔

"مارننگ کریم بی!" کوئی اور ہوتا تو اس گڈ مارننگ کا مزہ چکھتا۔ لیکن یہ عبیر تھی اور اس کو سات خون معاف تھے۔

"وعلیکم السلام۔ ذرا اپنے والد کے لیے چائے کی کشتی تو لے جاؤ۔"

کریم بی کو علم نہیں تھا اور پروا بھی نہیں تھی کہ ان کی ڈکشنری اب سرکولیشن میں نہیں رہی اور یہ کہ ان کے استعمال میں رہنے والے بہت سے لفظ اب متروک ہو چکے ہیں۔

"بچپن میں جب وہ اسے "کٹو" کی کہانی سناتی تھیں۔ کٹو بولی چیچ چیچ یہ کیا ہے چیچ چیچ اس پر میری ماں بھی نہ بیٹھی۔ چیچ چیچ اس پر میری دادی بھی نہ بیٹھی۔ چیچ چیچ میں کیوں بیٹھوں۔"

تو کتنے برس وہ سوچتی رہی کٹو کوئی آن بان والی نک چڑھی شہزادی ہوگی اپنے خاندانی نسب پر نازاں۔۔۔ یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا کہ "کٹو" دراصل گلہری کو کہتے ہیں۔ کریم بی کو قصہ گوئی میں عبور حاصل تھا۔ کوئی واقعہ سناتیں تو قصہ مجسم ہو کر سامنے آجاتا۔

"اے لو ابھی تو توس سینک کے رکھے تھے۔" وہ چاروں طرف گھوم کر اور ایک ایک ڈھکن اٹھا کر تاسف سے اعلان کرتیں "ماموں اللہ بخش لے گئے۔"

ہر وہ چیز جو نظر سے چوک جائے پھر خود بخود مل جائے اس کا الزام ماموں اللہ بخش پر جاتا تھا۔ یہ والے ماموں کئی نسلوں سے کئی زمانوں میں اور تقریباً ہر شہر میں پائے جاتے تھے۔

"یہ دراصل ایک بہت فرینڈلی جن تھے casper کی طرح۔" عنبر نے سوچا تھا۔

ابا جان صبح صبح اپنی لائبریری میں ملتے کیونکہ ان کی اکثر رات وہیں اپنی رائٹنگ ٹیبل پر یا صوفہ کم بیڈ پر بسر ہوتی تھی۔ ان کے گھٹنوں پر ایک گرم کپڑا ہوتا اور اس کپڑے کے اوپر کھلی کتاب اور کتاب سے زیادہ کھلی مسکراہٹ۔ اس الجھنوں کی ماری دنیا میں جہاں کسی کے چہرے پر اطمینان نہیں ملتا وہاں ان کا چہرہ کھلا رہتا تھا۔ وہ اپنی کسی کل سے مایوس نہیں تھے۔

شہنشاہوں جیسی آن بان والے لباس پر ان کی ہیرو Look شاید ساری بیٹیوں کو اپنے ابا ہیرو لگتے ہیں۔

"آیئے بی بی!" ناک کی پھننگ پہ رکھی عینک کے اوپر سے انہوں نے آنکھیں اٹھائیں۔ آنکھیں جن میں اب بھی عقاب کی سی کوند لپکتی تھی۔ وہی استادانہ شان اور رکھ رکھاؤ۔ چائے کی پیالی ان کے ہاتھ میں اور خشک ٹوسٹ نزدیکی تپائی پر رکھ کر وہ ان کے پاس بیٹھ رہی۔ وہ اپنی بیٹی کو دیکھ کر تھوڑا موڈ ب ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی اسٹائل، جس طرح وہ اپنی خواتین شاگرد کے سامنے ہوتے تھے (پائپ میز پر رکھ کر احتراماً "کھڑے ہو کر)

وہ اپنے وقت کا نمائندہ تھے۔ ہر شخص کسی عدد یا گروہ میں شامل ہوتا ہے۔ ان کا زمانہ "اے خاک نشینوں اٹھ بیٹھو" والا تھا۔ اس وقت سوئے ہوئے مظلم سہتے لوگوں کو جھنجوڑ کر جگایا جا رہا تھا۔ مثال کے لیے روس اور چین کو پیش کیا جاتا۔

"تمہارے پاس کھونے کو کچھ نہیں، سوائے زنجیروں کے۔"

وہ ان لوگوں میں سے تھے، جو بڑی ایمان داری کے ساتھ گروہ سے وفاداریاں نبھاتے ہیں۔ یہ جان کر بھی کہ گروہ تتر بتر ہو چکا ہے۔ گروہ کے نظریات ہوا ہوئے اور مصلحت کوش بڑی چابک دستی سے تائب ہو کر نئے نظریوں سے مفاد اٹھا رہے ہیں۔ لیکن ان جیسے کچھ لوگ آخری دم تک اپنے نظریات پر جمے رہتے ہیں۔ پھر ان لوگوں میں جا شامل ہوتے ہیں جو تنہائی کی مار سہتے ہیں۔

"یہ شخص۔۔۔ میرا باپ۔" اس نے دکھ سے سوچا۔ "تاریخ کی ایک پوری کتاب ہے۔ انہوں نے تاریخ پڑھی ہی نہیں، بنانے والوں میں شامل رہے ہیں۔ لیکن شاید ہمیں کسی تاریخ کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنے ماضی سے شرمندہ ہیں۔ حال سے ناخوش اور مستقبل سے مایوس۔"

ان دونوں کے درمیان گفتگو کے سلسلے نہ بھی ہوں تو اس نے اپنے وقت کا یہ حصہ اپنے ابا کے پاس خاموش بیٹھ کر ہی گزارنے کا تہیہ کیا تھا۔ اور سارے دن کا حاصل یہی منٹ تھے۔ ان دونوں کے مابین زیادہ تر خاموش قسم کی کمیونی کیشن چلتی تھی۔ دیکھتی رہتی کہ وہ اپنے گرم کپڑوں کی طرف سے لاپروا تو نہیں۔ ناشتے سے پہلے والی بلڈ پریشر کی گولی ایک عدد کم ہے یا بھول گئے۔ وہ ان دنوں کون سی کتاب پڑھ رہے ہیں۔

ابا چائے کا گھونٹ بھرتے اور بے آواز پیالی کو پرچ میں رکھتے جاتے۔

یہ بیٹیاں بھی عجیب چیز ہوتی ہیں۔ باپ بوڑھا ہو جائے تو اس کی ماں بن جاتی ہیں۔ مگر چپکے چپکے وہ اپنے باپ کو یہ

بھی نہیں بتانا چاہتیں کہ اب ان کا دور اور ضرورت نہیں رہی۔ اسی لیے ان کو ریٹائرڈ کر کے کونے میں ڈال دیا گیا ہے' وہ کوئی ایسا سوال نہیں کرتیں جس سے اپنا بڑھاپا یاد آجائے ہاں ایسے وہ بے شمار سوال کرتی ہیں' جس سے گمان ہو ان کا باپ علم و دانش کا ایک دریا ہے۔

اپنی سادہ اور ذہین آنکھیں کھول کر وہ ان کے جواب میں اس قدر کھو جاتی' جیسے افسوس کرتی ہو' وہ اپنے ابا کے عہد میں کیوں پیدا نہیں ہوئی۔

وہ مسکرا دیے۔ ایک طویل مگر شفیق مسکراہٹ۔

بس ان دونوں کے درمیان یہی ایک ان کہا سمجھوتا تھا۔ ایک معاہدہ (شریف آدمی والا)

معاشرے کے گھسے پٹے معیاروں سے ہٹ کر ان کے گھر میں بیٹیاں ویسے بھی لاڈلی ہوتی تھیں۔ بڑی والی کو اماں نے سر چڑھا رکھا تھا اور چھوٹی کو ابا نے سر پر بٹھایا ہوا تھا۔ ان کو کچھ بھی کہنے اور کرنے کی کھلی چھوٹ تھی۔

"ایک کتاب لکھ رہے تھے Mob movements پر۔ ان کو تاریخیں اور واقعات ازبر تھے۔ کبھی ان کا ذہن اس تیزی سے سوچتا جس تیزی سے وہ لکھ نہ پاتے۔ تب وہ آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لیتے وہ ڈکٹیشن دیتے جاتے اور عبیو لیپ ٹاپ پر برق رفتاری سے انگلیاں پھیرتی جاتی۔ کبھی اس کی ماہر ٹائپسٹ جیسی تیز رفتاری سے بوکھلا جاتے۔ ہر عہد میں پرانی نسل اپنے دانش اور تجربے کی مارنئی نسل کو دیتی آئی ہے۔ "ہم زیادہ جانتے ہیں۔"

لیکن اس عہد میں انہوں نے نئی نسل کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ دنیا ایک گاؤں بن گئی تھی۔ کمپیوٹر ٹیبل پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے یہ گاؤں خوب دیکھ بھال لیا تھا۔ البتہ نئی نسل اور پرانی نسل کا جو صدیوں کا تضاد چلا آ رہا تھا۔ وہ اسی طرح موجود تھا۔ مگر یہاں نہیں۔ کم از کم فلم کھلا نہیں۔

ابا کے بعد وہ تیار کشتی دادی اماں کے لیے لے کر جاتی۔ کوئی بھی وقت ہو وہ اپنے نماز کے تخت پر ملتی تھیں۔ اماں نے ان کے لیے جگہ جگہ تخت بچھا دیے تھے۔ سورج کے حساب سے وہ مختلف وقت میں مختلف تختوں پر ہوتیں فجر اور اشراق برآمدے کے اس رخ جہاں تازہ ہوا کے جھونکے رات کی رانی اور موتیا کی مہک ساتھ لاتے تھے۔ دادی اماں کی لغت میں پھول بس تین چار ہی ہوتے تھے۔ رات کی رانی۔ موتیا گلاب اور گل عباس۔

چاشت' ذرا آتی دھوپ سے بچ کر اندرونی برآمدے میں۔ ظہر عصر اپنے کمرے میں مغرب اور اوابین کھلے صحن میں۔ عشاء اماں کے کمرے میں (کیونکہ اس کے بعد پوسٹ نماز Talk گفتگو) بھی ہوتی تھی۔ جس میں سارا دن کی عبادت کے بعد خواتین مونگ پھلی ٹونگتے چغلی سے شغل کرتی تھیں) تہجد کسی بھی ایسی جگہ جہاں سونے والوں کی نیند خراب نہ ہو۔

وہ اسے ہاتھ سے ٹہرے رہنے کا اشارہ کرتیں۔ البتہ تسبیح زیادہ تیزی میں گھماتیں کہ ان کو معلوم تھا وہ ان کی ٹرے لیے کھڑی ہے لیکن جب تک ان کا وظیفہ ختم نہ ہو جاتا اس کو انتظار کرنا ہوتا تھا وہ جتنی دیر وظیفہ پر رہتیں عبیر ان کو شوق سے دیکھتی رہتی۔ سفید جھاگ ایسا ململ کا بڑا سا دوپٹہ۔ سفید براق بال۔ جھریوں سے بھرا چٹا دودھ رنگ۔ جیسے سفید روشنیوں کا جھرنا اوپر سے نیچے تک بہتا چلا آ رہا ہو پھر وہ اس پر پھونک کر اس کو ڈیوٹی سے فارغ کرتیں۔ اس ایک ہلکی سی پھونک کی بدولت وہ سارا دن زمانے کے تیز جھکڑوں کی زد سے بچی رہتی۔

اماں اور بڑی تائی باورچی خانے میں ہوتیں۔ بڑی تائی معلوم نہیں ابا کی بڑی تائی تھیں یا اماں کی یا جگت بڑی تائی۔ وہ نہ صرف پھوہ تھیں بلکہ بے اولاد بھی۔ انہوں نے خود کو کسی پر مسلط کرنے کے بجائے بانٹ لیا تھا۔ چھوٹی سی عین کی صندوقچی کے ساتھ وہ کسی دن خود بخود آجاتیں۔ چند دن گزارتیں پھر سب کے منع کرنے کے باوجود اگلے پڑاؤ پر نکل جاتیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر بھی خوب مزہ آتا۔ ان کے پاس قدیم زمانوں کی عجیب داستانیں

تھیں۔ جب گھروں میں لالٹین کی روشنی ہوتی تھی اور ڈولی پر سفر ہوا کرتا تھا۔ کسی نامحرم نے ان کو دیکھنا تو درکنار ان کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ ان کے ابا لیگ کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے اور ان چند خوش نصیبوں میں سے تھے جنہوں نے قائداعظم کو سچ مچ کا دیکھا تھا۔

"سن چالیس میں ابا سہارن پور سے لاہور گئے تھے۔ لاہور تو بابا اتنی دور تھا' جیسے ولایت اور جب تمہارے دادا جیل میں تھے۔"

پھر وہ راؤنڈ لیتی عثمان کے کمرے سے گزرتی۔

"اٹھے نواب صاحب چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔" کسی فلم کے اس مشہور مکالمے سے ان کے ہاں دیر تک سونے والوں کو جگایا جاتا تھا۔ پھر وہ کسی اور کام سے کسی اور طرف نکل جاتی' اس کا اصل کام تو کریم بی کے چھوکرے کا سا تھا۔ آبے لونڈے' جا بے لونڈے۔

عثمان نے مندی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

انفرا تفری اور انتشار سے بھری اس دنیا میں اس کے وجود میں کس قدر ٹھہراؤ تھا۔ اس کو دیکھ کر کسی اطمینان بھری پرسکون جھیل کا احساس ہوتا تھا۔ خاموش' شانت' لیکن اندر گہرائیوں میں اتھاہ پانی بھرے۔ آپ اوپر سے اس کا اندر نہیں جان سکتے۔ اوپر اوپر سب اچھا ہے۔ سرکاری ٹی وی کی طرح۔

یہ بہنیں بھی خدا کی نعمت ہوتی ہیں۔ آس پاس ہوں تو جیسے دھوپ اور بارش میں کوئی چھاتہ تان دیتا ہے۔ کوئی اس سے پوچھے خدا کی بندی! مجھے اپنی صبح جاگ کر کرنا بھی کیا ہے' وہ پیٹ کے بل لیٹ کر کھڑکی سے صبح کے پھیلے اجالے کو روشن اور چمکدار ہوتے دیکھتا رہا۔

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ پھر سے ایک ہو
آسمان حد نظر' رہ گزر' رہ گزر

کھڑکی میں سے دور تک نظر آتے آسمان پر اس کو فیض یاد آ گئے۔

وہ وقت کے مشکل ترین عہد میں جی رہا تھا۔ بے اطمینانی' بے سکونی' انتشار اور کہیں کوئی بہتری کے آثار نہیں۔ ایسے وقت میں جب کہیں کوئی روزگار نہیں تھا' وہ کم از کم اپنے پیروں پر تو کھڑا تھا۔ اس کے بیک گراؤنڈ میں تو ویسے بھی کچھ نہیں تھا۔ سوا ایک دانش ور باپ اور خوب پڑھی لکھی ماں کے۔ باقی سب بلیک اینڈ وائٹ' لوگ کیا سوچتے ہیں ان کے پیمانوں میں کیا تولا جاتا ہے۔ اس کو کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

گھر کی سب سے بڑی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ سے ذمے دار تھا۔ چودہ سال کی عمر میں اس نے بے حد سنجیدگی سے اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کی ذمے داری کا بوجھ بانٹ لیا تھا۔ ابا کے بجائے وہ خود دونوں کو اسکول چھوڑنے جاتا۔ ہر قسم کی ذمے داری ماؤں پر ڈال دینے کا رواج ابھی عام نہیں ہوا تھا۔ ان دونوں کو پہنچا کر ہی وہ اپنے اسکول جاتا۔ خواہ اس کوشش میں وہ لیٹ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

اس کو یہ بھی یاد پڑتا تھا کہ پیدل چلتے وقت بہنوں کو سڑک کی طرف نہیں فٹ پاتھ کی طرف ہونا چاہیے۔ بڑی والی تو سمجھ دار بھی تھی وہ متانت سے گردن اٹھائے سیدھا راستہ طے کرتی لیکن چھوٹی والی سے کچھ بھی سیدھا نہیں ہوتا تھا۔ ہاتھ چھڑا کر وہ کسی مرگھلے کتے کے بچے کے پیچھے بھاگ پڑتی۔ اس کو گھسیٹ کر واپس فٹ پاتھ پر لانا پڑتا۔ فٹ پاتھ پر بھی وہ اچھلتی چلتی۔

"یہ آخر ٹھیک ٹھیک کیوں نہیں چلتی؟" بڑی والی تنگ آ کر بھائی سے سوال کرتی۔

بھائی نے اپنے بیگ کے ساتھ اس کا بیگ بھی کندھوں پر لادا ہوتا تھا۔ اپنے ناتواں کندھوں پر اس دہرے بوجھ کے ساتھ اس کے پیچھے بھی بھاگتا۔ اس دوران بڑی والی فٹ پاتھ پر اکیلی رہ جاتی' وہ اس کو فٹ پاتھ سے

چھلانگ مار کر نیچے اترتے۔ گھاس پر دوڑتے۔ رک کر نہایت دلچسپی سے درختوں پر بیٹھے کوؤں کو دیکھتے۔
خود سے الجھتی اور ناپختہ ذہن سے سوچتی رہ جاتی۔ "کیا سیدھے راستے اس کے لیے نہیں بنے؟"
اور جو جواب وہ بڑی والی کو تب نہیں دے سکا تھا۔ آج بتیس سال کی عمر میں سوچتا۔
"کیا سیدھے سیدھے چلنا شرط ہے؟ بل کھاتا خم دار راستہ بھی تو سیدھا راستہ ہو سکتا ہے" وہ خود بتیس سالوں سے بل کھا رہا تھا۔
وہ جب یونی ورسٹی گیا تو کس قدر خوش گمان تھا کہ یہاں سے نکلا نہیں کہ اس کے سامنے ملازمتوں کا جال بچھ جائے گا۔ وہ اپنی مرضی اور اپنی خواہش سے جو محکمہ چاہے گا چن لے گا۔ لیکن اونٹ کو پہاڑ کے نیچے سے گزرنے کے لیے کوئی لمبا چوڑا وقت درکار نہیں ہوتا۔ اچھے گریڈ اور قابلیت کے باوجود ملازمتیں پیدا ہی کسی کے بیٹے کسی کے بھائی کو دینے کے لیے کی جاتی ہیں' وہ منوہر جانگلی کی طرح اوت کا اوت ہی رہ گیا۔ کوئی ممبر' قومی اسمبلی' صوبائی اسمبلی کوئی وزیر یا تدبیر' کوئی کندھوں پر چاند ستاروں والا۔
وہ کسی کو نہیں جانتا' نہ کسی کو مانتا تھا۔
کبھی ابا نے سمجھایا تھا بیٹا سفارش اچھی چیز نہیں ہوتی۔ قابلیت خود اپنی سفارش ہے۔"
اسے معلوم تھا یہ سب تدریسی باتیں ہیں اور ان لوگوں نے باہمی مشاورت کے بعد نصاب میں شامل کی ہیں' جنہوں نے خود کبھی اس پر عمل نہیں کیا تھا۔ بس ہم کتابوں میں لکھ دیتے ہیں اور کتابوں سے پڑھ لیتے ہیں۔ ابا کو بھی زمانے نے دھوکا دیا ہوگا۔ وہ کون سا خلفائے راشدین کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔
ان کے وقت میں بھی پیٹ روٹی مانگتا تھا۔ روٹی کے لیے روزی چاہیے اور روزی کے لیے کوئی نگری سفارش۔
ایک دائرہ ہے جس میں آپ گھوم رہے ہیں۔
ہر اسمندر گوپی چندر' بول میری مچھلی کتنا پانی۔
واقعات تو وہی رہتے ہیں۔ صرف ان میں سے گزرنے والے بدل جاتے ہیں۔
جب وہ HEC کے اسکالر شپ پر مزید ایک عدد ڈگری لینے روانہ ہوا تو احباب نے اس کو سمجھایا تھا۔ "پلٹ کر مت آنا۔ یہاں پلٹ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔"
اس کے باوجود وہ پتھر کا ہونے پلٹ آیا تھا۔
بس اب اس نے سرکاری ملازمت کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اور اکثر بے روزگار رہنے پر اس کی منطق آس پاس کے افراد کی سمجھ سے بالاتر تھی۔
"ہمارے ہاں کمپیوٹر ایکسپرٹ کی ضرورت بطور ٹائپسٹ ہوتی ہے ——— ہیومن ری سورسز والوں کو سلیکٹ کرنے کے لیے ایک اور ہیومن ری سورسز چاہیے۔"
"لوگوں کو ہارڈ کاپی پر زیادہ اعتبار ہے۔"
"بڑے سے بڑے اداروں کے نیٹ ورک بیشتر وقت ڈاؤن رہتے ہیں۔"
اس کے باوجود اس میں تختی نہیں آئی تھی۔ اس نے ہمت بھی نہیں ہاری تھی۔ چھوٹے بڑے سب کام ملا کر ایک اچھے روزگار جیسا رزق تو بن ہی جاتا تھا۔ جس میں کینٹ سے گارڈن ٹاؤن تک آئی ٹی کی مختلف یونی ورسٹیوں میں کلاسز۔ سمیسٹ کرلایا ہوا کام۔ جس کو وہ اپنے آفس میں بیٹھ کر نمٹاتا۔
اس کا آفس ——— واضح ہو کہ اس کے اپنے کمرے کے ایک کونے میں رکھا کمپیوٹر تھا۔ وافر کمانے اور وافر لٹانے کے باوجود اس کو بے روزگاروں کے کھاتے ہی میں ڈالا جاتا تھا۔ کمانے کے یہ ڈھنگ سابقہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اس نے اپنے ساتھ کے لوگوں کی طرح خود کو یہ آپشن بھی نہیں دیا تھا کہ کامیابی صرف سفید فام

ملکوں میں اپنی براؤن شناخت کو ضم کر دینے کا نام ہے۔ اس نے اپنے سامنے بہت سے آپشن رکھے تھے لیکن یہ والدین۔
"جا رہی ہوں۔" عنبر نے اس کے کمرے کے ادھ کھلے پٹ سے سر اندر ڈال کر اعلان کیا۔
"ابھی سے؟ ابھی تو منے کھیلنے کے دن تھے۔"
وہ بے دلی سے چپل گھسیٹتا غسل خانے کی طرف چلا۔
سو ایک اور دن کا آغاز ہوا۔ "ہیلو۔" وہ موبائل کان سے لگائے دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم سر! عنبر ہے؟"
سر نے واکنگ اسٹک کی مٹھ پر ہاتھوں کا سہارا دیے نیم وا آنکھیں اٹھائیں۔
چہرے سے پہلے ان کی نظر پیروں پر پڑی۔ اس کے اٹھتے قدموں کے ساتھ کیچڑ سے بنے تازہ قدموں کے نشانوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کریم بی نے فرش دھونے کے لیے پلاسٹک ٹیوب سے خوب ہی پانی بہایا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔
پتہ نہیں سر حاضر ہیں یا غائب۔
اور بہت ہی کم لوگ جانتے تھے وہ یوں ٹرین میں سفر کرنے والی عورتوں کی طرح بیٹھے بیٹھے سوتے نہیں تھے۔
"وعلیکم السلام۔" وہ بمشکل ہمسٹری کے اوراق سے باہر آئے۔
"جیتی رہو۔" انہوں نے کچھ توقف سے صاد کیا "اندر ہے چلی جاؤ۔"
حالانکہ وہ خوب جانتے تھے وہ عنبر کے لیے نہیں آئی جس سے ملنے آئی تھی' وہ گھر پہ نہیں تھا اور چونکہ اس نے اس کا نام نہیں لیا تھا اس لیے اس کو بلاوجہ کی خفت سے کیوں دوچار کرتے۔
وہ وہیں کھڑی رہی۔ نہ اندر گئی نہ واپس پلٹی۔ پتہ نہیں کیا چاہتی تھی۔
"کالج نہیں تھا آج؟" انہوں نے ابتدا کر کے خود ہی آسانی پیدا کی۔
"تھا۔" وہ وہیں برآمدے کے پائیدان پر پاؤں رکھے مسکرا دی۔
"لیکن کوئی اسٹرائیک تھی ہم نہیں گئے۔ بلکہ ایک پروٹیسٹ تھا۔"
"خوب کیا ——" انہوں نے اضطراری کیفیت میں ٹانگ پر رکھی ٹانگ کا رخ بدلا۔
"مگر یہ تو ظاہر ہوا' آپ اور ان کے مسائل علیحدہ ہیں۔ آپ لوگ مل کر چلنا کب سیکھو گے۔"
"چلو۔" ثریا اندر ہی اندر چیں بہ جبیں ہونے لگی۔ "سر نے کلاس شروع کر دی۔ یہ سچ ہے کہ استاد کبھی ریٹائر نہیں ہوتا۔ اب آ ہی گئی ہوں تو آنے کا کوئی جواز پیدا کیا جائے۔" وہ دو قدم بڑھا کر ان کی نزدیکی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"مل کر سوچنا بھی ٹھیک ہے سر! لیکن اب چھوٹی چھوٹی باتوں سے پڑھائی خراب ہوتی ہے' افریقہ کے کسی حصے میں ان کے لوگوں سے ووٹ کا حق لے لیا گیا ہے' یہ اصل میں اس کے لیے پروٹیسٹ تھا۔"
وہ یہ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس نے کہا استاد عموماً" ایسے فقروں سے زیر ہو جاتے ہیں۔ ان کے چہرے سے لگا وہ قائل نہیں ہوئے۔ اس کی دلیل کا انہوں نے اعتبار بھی نہیں کیا۔ وہ پریشان کن حد تک ناقابل فہم آدمی تھے۔ حالانکہ اس عمر کے لوگ اس قسم کے فقروں سے کھل اٹھتے ہیں۔
پھر اس نے پینترا بدلا۔
"اور مل کر سوچنا؟ سب لوگ مل کر کیسے سوچ سکتے ہیں۔ ہم الگ الگ راستوں کے مسافر جب راستے ہی ایک

نہ ہوں تو سوچ کیسے ایک ہو سکتی ہے۔"

اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر تھیٹریکل انداز میں کہا۔ وہ ایک معروف ادارے سے پرفارمنگ آرٹس پڑھ رہی تھی اور اپنی تعلیم کا استعمال خوب جانتی تھی۔ شیکسپیئرین تھیٹر اس کا فیورٹ مضمون تھا۔

"آپ کا زمانہ اور تھا ہمارا زمانہ اور ہے۔"

وہی دلائل ختم ہو جانے پر زمانوں کی تبدیلی کا گھسا پٹا حربہ 'ہم سب اپنی اپنی جگہ سمجھتے ہیں' ہم مشکل ترین وقت سے گزر رہے ہیں' اچھا زمانہ تو پچھلی نسل گزار آئی۔ ورثے میں مشکلات چھوڑ کر۔ آسان راہوں سے گزرتی۔

دراصل آپ نے پچھلی نسل کی زندگی نہیں گزاری۔ ماضی کا ایک بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ اس میں اندیشے نہیں ہوتے۔ اب کیا ہوگا۔ نہیں ہوتا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب مزید کچھ نہیں ہوگا۔ وہ وہاں اسی طرح محفوظ ہو گیا ہے' اب جو خدشہ ہوگا وہ کل کے لیے ہوگا۔

ابا امن پسند اور صلح جو آدمی تھے۔ اختلاف رائے کو نہ صرف خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے' بلکہ اس کو ہوا بھی دیتے تھے۔ انہوں نے بحث کو نوجوان نسل کی زبان درازی کا بہانہ بنا کر کبھی نہیں سمیٹا تھا۔ شاید اسی لیے ان کے ساتھ بک بک کرنا آسان تھا۔ وہ جس تہذیب کی نمائندہ تھی' اس کے بارے میں جاننے کے تو وہ بے حد خواہش مند تھے۔ گرین کارڈ ہولڈر۔ امریکہ کی دور دراز کی کسی ریاست کے اندرونی مسائل میں پوری طرح شامل اور آپ کی نزدیک ترین ریاست کے مسائل پر ناک چڑھا کر غیر ملکی زبان اور لہجہ میں۔

"سیاست بور کرتی ہے۔"

"زندگی میں ایک ہی حسرت ہے۔ پرفارمنگ آرٹس کی ڈگری لے کر مہیش بھٹ کی کسی فلم میں رول کرنے کی" اور یہ کہ "آرٹ کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔"

وہ اور اس کی سوچ والے دوسرے ساتھی۔ ایسی اور اس سے ملتی جلتی گفتگو کے شوقین' جوان خون ابال کھاتا ہے۔ کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہے۔ پر کرنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔ نہ منزل نہ راستہ محض چھوٹی چھوٹی خواہشیں اور لفظوں کے گورکھ دھندے۔

قسمت سے ان کھلے دروازوں سے اندر آنے والے سب ہی لفظوں کے جادوگر تھے۔

علی ماس' ون ٹو تھری پاس۔

جیسے جادوگر خالی ہیٹ سے کبوتر اڑا دیتا ہے' ان کے ہاتھ کھوکھلے' بے معنی لفظوں کا کبوتر آ گیا ہے۔

جس وقت وہ اپنے غلط جگہ پیدا ہو جانے پر اپنا دفاع کر رہی تھی۔ کندھے اچکا کر ہاتھوں کو حیرت سے پھیلا کر اس وقت گیلری میں کھلنے والی کھڑکی کی سلاخوں سے جالی کا دوپٹہ لہرایا اور اماں کا سراپا نمودار ہوا۔

"اچھا تو بی ثریا آئی ہیں۔ میں سوچ رہی تھی' یہ کون Debate (تقریر) کی پریکٹس کرنے ہمارے گھر چلا آیا ہے۔"

انہیں نہیں معلوم موضوع بحث کیا تھا۔ کس کے دلائل وزنی تھے۔ کس کے بودے۔ لیکن شوہر کی دل شکنی کا اختیار وہ اپنے سوا کسی کو دینے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

"آ گئی تمہاری پلاٹون۔" انہوں نے دلی زبان میں پلٹ کر عبیر سے کہا۔ جانے اس کے گروپ سے ان کی بنتی کیوں نہیں تھی۔ تنویر کی دوستوں سے تو ان کا اچھا خاصا بہناپا تھا۔ لیکن مجبوری یہ تھی ابا نے اس گھر کو ہائیڈ پارک بنا رکھا تھا۔ جس کے جو جی میں آئے بولے۔ کھلی آزادی۔ چونکہ اس آزادی کا سب سے زیادہ فائدہ ان ہی کو تھا اس لیے وہ اس قانون کو معطل نہیں کر سکیں۔

وہ یہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ ثریا اس گھر میں کس مقام کی متلاشی ہے۔

یا شاید۔۔۔ جانتی تھیں

تب ہی!

اسے۔ ہر کیف ثریا کو عزیز رکھنا تھا وہ اس کے محبوب ترین شخص کی محبوب تھی۔ وہ پلاسٹک کی کرسی گھسیٹتی جیسے آن ڈیوٹی اس کے برابر آ بیٹھی۔

دونوں ہاتھ گود میں دھرے اطمینان اور اعتماد سے بات کرتی عبیر کو ثریا نے ایک نظر دیکھا۔

"یہ عجیب لوگ ہیں۔ باپ تنکوں کے ایک موڑھے پر بیٹھا ہے۔ جس کا پھوکس جگہ جگہ سے کترا گیا ہے' بیٹی پلاسٹک کی ایک بے رنگ' بدوضع کرسی پر اس طمانیت سے بیٹھی ہے۔ گویا دونوں تخت طاؤس پر متمکن ہوں اور انہیں اس بات کی پروا بھی نہیں کہ صرف ایک شال جو اس کے کندھوں سے لٹک رہی ہے۔ اس کی قیمت ان کے کمرے کے ایک مکمل سامان سے زائد ہے' ان کو اپنی تعلیم پر خوش گمانی ہے اور نہیں جانتے کہ انہوں نے عمر بھر میں تعلیم پر جو خرچ کیا وہ اس کی ایک ماہ کی فیس ہے۔

یہ سچ ہے کہ اس گھر اور دل کے دروازے ہمیشہ چوپٹ کھلے ملتے ہیں۔ جس کا جی چاہے دندناتا اندر آئے اور جو ہاتھ لگے اس پر بیٹھ جائے۔ وہ اسٹول ہو' ٹوٹے ہتھے والی کرسی ہو یا دھلا منجھا صاف ستھرا فرش۔ یہ لوگ جانے کتنے برس سے اس غار میں سو رہے ہیں۔ باہر سکہ بدل گیا ہے۔ ان کو خبر نہیں۔ انہوں نے تو بس آرکیالوجی کی طرح اپنے گھر کے کھنڈرات کو اسی حالت میں محفوظ کر لیا ہے۔ لیکن اس تلخی کا کیا کیا جائے جو اندر ہی اندر دھوئیں کی طرح بل کھاتی ہے کہ کہیں کوئی روزن ہو۔

"کینو لو گی؟" آدھ چھلا کینو اماں نے اس کی طرف بڑھایا۔

ثریا کو لگا' عبیر شرمندہ ہو گی۔ ٹرالی' سرونگ' ڈش نیپکن کے لوازمات کے بغیر کسی کی خاطر کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔

لیکن اس کے چہرے پر وہی اطمینان بھری الوہی مسکراہٹ تھی۔

لاعلمی بھی کیا نعمت ہے۔

وہ ان کے ہاتھ سے کینو لے کر چھیلنے لگی۔ پہلے کچھ دیر اس نے نفاست سے پھانکوں کے اوپر کی رگیں اپنی ہتھیلی پر جمع کیں۔ پھر روم میں رومن کی طرح رہتے وہ بقیہ پھانکیں اسی طرح نگل گئی۔

ابا نے دیکھا وہ بے چین سی بیٹھی تھی۔ کئی دفعہ اس نے کرسی پر پہلو بدلا۔ کچھ پوچھنا چاہتی تھی' کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن ابتدائی مختصر سی بحث کے بعد جیسے اس کا دل اس بحث سے بھی اچاٹ ہو گیا تھا۔ اماں اس کی طرف مطلق متوجہ نہیں تھیں اور اماں کو کون اس طرف متوجہ کر سکتا تھا۔ سڑک پار والے گھر سے کشور کمار کی آواز ہوا پر سوار در آئی۔

"کچھ تو لوگ کہیں گے۔" اماں جھومیں۔ "آہاہ۔"

ثریا کی حیرت میں ایک اور اضافہ ہوا۔ وہ چار پانچ سال سے اس گھر میں آتی جاتی تھی لیکن جب پردہ اٹھتا تھا ایک نیا منظر اس کو حیران کرنے کو سامنے ہوتا۔ اس کے طبقے میں خوشی اور غمی کے اس بے ساختہ اظہار کو مڈل کلاس attitude (رویہ) سمجھا جاتا تھا۔

اماں کو کشور کمار 70 کی دہائی میں لے گیا۔ ابا کی تاریخ ثریا کا کلاس ڈیفرنس اور عبیر کا اچھے کمپیئر والا غیر جانب دارانہ رویہ وہیں رک گیا۔ اماں ماضی میں پہنچ کر پھر سے گزرے وقت میں سے تاریخ وار چہل قدمی کرنے لگیں۔

"جب زندگی زیادہ خوشگوار تھی۔" (کس کی زندگی) ثریا نے اکتا کر سوچا "جب زیادہ سادہ تھی" (یا بے رنگ تھی۔ اس

نے پھر جڑ کر سوچا)
پتہ نہیں لوگ 70 کی دہائیوں کا ذکر اس طرح کیوں کرتے ہیں جیسے سارے زمانے کا Intellects تب ہی تو آ گیا تھا۔
گھناؤنی سازشوں سے بھری تاریخ کی ایک ناکام ترین نسل۔
ایسی خشک اور بے رنگ زندگی کہ ابھی ٹی وی میں بھی رنگ نہیں آئے تھے۔
مارشل لا، مشرقی پاکستان کی علیحدگی ایک مقبول لیڈر کی پھانسی ایک اور مارشل لا کوڑے قید منافقتیں۔
سازشیں، سازشیں اور بنا کسی احتجاج کے اپنی ساری ناکامیوں کو اپنی دانشوری کے کھڑاک میں چھپا کر کیسی ڈینگ مارتے ہیں۔ اماں کیا کہہ رہی تھیں وہ بھی متوجہ نہیں تھی۔ پتہ نہیں عثمان کہاں ہے۔ گزشتہ رات اس نے کہا تھا ...بس گیارہ سے پہلے نہیں جائے گا، صبح اس نے کنفرم ہی نہیں کیا اور اب وہ کیوں نہیں تھا نہ اس نے پوچھا نہ کسی نے بتایا۔
"میں اب چلتی ہوں۔" وہ ایسے یک لخت کھڑی ہوئی جیسے بیٹھی رہی تو اس منظر کا ایک حصہ بن جائے گی۔ وہ اس منظر میں شامل تو ہونا چاہتی تھی لیکن اس کا حصہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ جب سوچ الگ الگ ہو تو راستے کیسے۔
اس نے اپنی ہی کہی ہوئی بات دہرا کر اپنا اطمینان چاہا۔ وہ چلی گئی لیکن اس کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر اس کا وجود باقی رہا۔
"عجیب کنفیوز confused لڑکی ہے۔" اماں نے حسب عادت ایک آزاد فقرہ اچھالا۔
"ہاں۔" ابا نے اماں کی تائید کی جو کہ کم ہی ہوتا تھا۔
"جس معاشرے میں دہرے معیار ہوں، وہاں ایسی نسلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے والدین کا طبقہ کچھ اور ہے۔ دوست اس نے کسی اور طرح کے چنے ہیں۔ مطالعہ دانشوری کی حد تک زیادہ ہے۔ لیکن دانش کے باوجود اپنا راستہ خود منتخب کرنے کا اختیار نہیں۔ ایسے بچوں کو ان کے ماں باپ ایک حد تک آزادی دیتے ہیں۔ پھر اس کو حکم دیا جائے گا کہ بس۔ اپنی ابتدا کی طرف پلٹ آؤ۔"
"اور وہ پلٹ جائے گی؟" عبیر نے ابا کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ فٹ پاتھ پر بیٹھے فال نکالنے والے ہوں۔
"اس کو پلٹ جانا چاہیے۔" ابا سیاسی قسم کے نجومی تھے۔
کریم بی خاموشی سے اٹھیں۔ نچوڑی ہوئی ٹاکی سے اس کے قدموں کے آنے اور جانے کے نشانات مٹا کر پھر سے بھنڈی کاٹنے بیٹھ گئیں۔ حالانکہ یہ دھول اسی گھر کے صحن سے اس کے پیروں میں لپٹ کر چلی آئی تھی۔ وہ کہاں کی پیدل چلنے والی تھی کہ اس کے پاؤں خاک آشنا ہوتے۔
داغ صاف ہو گئے تھے۔
اس گھر میں بیرونی اثرات بس اتنی ہی دیر کو رہتے تھے۔

☼ ☼ ☼

تنویر گھر میں ہمیشہ افراتفری کے عالم میں آتی تھی۔ اس کے پاس وقت کم تھا اور لفظ زیادہ۔ اس کم وقت میں اسے سارے کے سارے لفظ استعمال کر کے جانا ہوتا تھا۔ اس کی آمد سے جیسے ہلچل سی مچ جاتی۔
اکلوتی بیاہی بیٹی کے شوہر کو مسکراتا دیکھنے کی حسرت میں چچا عبدالعزیز سے اماں تک ایک ایک فرد بچھا جاتا۔ لیکن وہ بے تاثر سا چہرہ لیے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے رہتے۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ پہلی دفعہ اس گھر میں اس نیت سے آئے تھے کہ لو مجھے دیکھ لو۔ وہ آج تک مانوس نہیں ہو پائے تھے اور یہ بھی نہیں کہ وہ مسکراتے نہیں تھے۔ مسکراتے تو وہ تھے لیکن عموماً" اس وقت جب ان کے زہر میں بجھے کسی جملے نے سب کے ہونٹوں سے ہنسی چھین لی ہو۔ تنویر ان کی ایک ایک مسکراہٹ پہ فدا ہوتی دوڑتی پھرتی۔
کالج میں اس کا دوسرا پیریڈ ہوتا تھا۔ نو بج کر بیس منٹ پر وہ نوکری پر جاتے گڑیا کو گھر چھوڑ کر جایا کرتی تھی۔ وہاں اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ ناشتہ کر کے آتی۔ حالانکہ اسے بھی اتنی ہی بھوک لگتی تھی۔ بقول کریم بی "ہپکائیوں کی طرح بیٹھ بیٹھ لگتی۔"
اس کا ناشتا میز پر لگا ہوتا تھا۔ میز پر اس لیے کہ شاید کسی دن اس کا شوہر بھی کھانے بیٹھ جائے۔ لیکن وہ کچھ کھانے کے بجائے کلائی غیر معمولی طور پر بلند کر کے وقت دیکھتے رہتے۔ یوں تو دیواروں پر کلاک لگے تھے لیکن کلاک میں وقت دیکھنے سے آس پاس کے لوگوں کو کسی کے مصروف ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ جب ان کی کلائی بے صبری سے اور بار بار چہرے تک آنے لگتی تو تنویر کے پاؤں بے ربط ہونے لگتے۔
اس نے اپنے چوبیس گھنٹوں کو بے شمار خانوں میں بانٹ رکھا تھا۔ ہر خانے کا کام مقررہ گھنٹوں میں نمٹانے کے لیے اس کو اپنی رفتار اور جذبات کو کچھ اور جنوں خیز کرنا پڑتا تھا۔ زنجیریں تھیں کہ ٹوٹتی نظر نہیں آتی تھیں۔ سلائس پر سرخ ملیدہ تھپا ہوا ہے اور کریم کی بادل سی مہین تہہ۔ صبح سے کریم بی ان دو سلائس کی رکھوالی پر بیٹھی ہیں۔ ایک لمحہ بھی چوک گیا تو وہ یہاں سے بھی خالی پیٹ چل دے گی۔ ایک بڑا بوک مارنے سے سلائس پر ہلال احمر کا سا مونو گرام بن گیا۔ الٹے ہاتھ میں چائے کا مگ۔ جس کے بڑے بڑے گھونٹ زبان ہی نہیں دل بھی جلاتے تھے۔ جب مگ رکھا اور پرس اٹھایا تو اگلے گھونٹ کے لیے مگ ماموں اللہ بخش لے جاتے۔ وہ تیزی میں کئی قدم آگے آچکی ہوتی تھی۔ واپس پلٹ کر مگ ڈھونڈا تو پرس غائب۔
انہیں گڑیا کو چھوڑ کر الٹے قدموں جانا ہوتا تھا۔ حاضری رجسٹر پرنسپل آفس میں ان کی ٹیبل پر ان کی نظروں کی عین سیدھ ہی رکھا ہوتا۔ لیٹ دستخط کرنے کا مطلب آدھے دن کی چھٹی۔
اور آٹو کا بھی کوئی بھروسہ نہیں اگر وہاں اسٹارٹ ہو گئی تھی تو یہاں بھی حسب منشا اسٹارٹ ہو جائے گی کوئی ضمانت نہیں۔
"دودھ کی بوتل، دودھ کا ڈبہ، نیپیز، فراک۔"
ایک ایک چیز کریم بی کے حوالے کرتی وہ حاضری لگواتی جاتی۔
"بوتل دوبارہ دھو لیجیے گا۔ اس دن بھی آپ نے بغیر دھوئے دودھ بنایا تھا۔ رات تک اس کا پیٹ خراب رہا۔"
اس کی تیوری پہ شکن آگئی۔ کریم بی کو ناکردہ خطا پر بھی شرمسار ہونے میں کمال حاصل تھا۔ گڑیا کو سینے سے چمٹا کر انہوں نے گنہ گار آواز سے کہا "اللہ کرم کرے۔ آج احتیاط سے دھولوں گی۔"
"دیکھیے۔ اس کی کمر کھل رہی ہے۔ ٹھیک سے ڈھکیے ہوا لگ جائے گی۔"
لفظ تھے کہ ریل کے ڈبے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔
ناشتہ ختم ہوا۔ گڑیا کریم بی کی تحویل میں چلی گئی تو وہ عبیر کی طرف پلٹی۔
پتہ نہیں کیوں۔ اس کو اپنی اس بہن سے بچپن سے خوف آتا تھا۔ وہ اس کی طرف رشک سے بھی دیکھتی۔ وہ اس سے کہیں زیادہ ذہین shiny اور لاڈلی ہونے کے باوجود زندگی کو اپنے اختیار میں نہیں رکھ سکی۔ ایک وہ تھی جو جی میں آتا کرتی اور اپنے آپ میں مطمئن رہتی۔ تنویر نے جو کچھ اپنی مرضی سے کیا اس پر پچھتاووں کے ڈھیر لگ گئے۔ کسی کے سامنے اپنی شکست ماننا بھی آسان نہیں۔ انا کے اس طرح پرخچے اڑتے ہیں۔
کوئی بہت پرانی بات بھی نہیں تھی۔ وہ دونوں ایک ہی اسکول ایک ہی کالج میں جاتی تھیں۔ اس فرق کے ساتھ

کہ عبیر کالج آئی تو وہ کالج کے فائنل میں تھی۔ اس کو اپنی بڑی بہن اپنا آئیڈیل لگتی تھی۔ کالج میں اس کو سب جانتے تھے۔ میگزین کی ایڈیٹر اسپورٹس کمیٹی کی اہم ممبر کالج کے ہر فنکشن میں آگے آگے۔ ہر طرف تنویر تنویر لوگ اس سے پوچھتے تم تنویر کی بہن ہو۔ اس سے اس کی عزت دوچند ہو جاتی۔ عبیر بہت آرگنائز نہیں تھی اور کوئی اتنی اہم بھی نہیں تھی کہ اس پر فخر کیا جاتا۔ لیکن تنویر ہر جگہ اس کو ساتھ رکھتی۔ اس کی آواز میں مان ہوتا۔

"یہ میری چھوٹی بہن ہے۔"

دونوں کی دوستوں کا اپنا اپنا ایک علیحدہ گروپ تھا۔ تنویر کا وسیع گروپ لیکن عبیر بہت سوشل نہیں تھی۔ گنے چنے دوست، ایک حمیرا ہی تھی جو بچپن سے ساتھ چلی آرہی تھی۔ حمیرا کو بھی خود بخود تنویر کی محبت حاصل رہی۔

پھر تنویر کی شادی ہوئی۔ جو اب تک ہونے والے سب واقعات میں سے حمیرا اور عبیر کے لیے بے حد بھڑ لنگ رہا گو اس کی شادی کوئی بہت دلچسپ قصہ نہیں تھی۔ لیکن گھر والوں کی سمجھ داری نے اس واقعے کو کسی فساد کی نذر نہیں ہونے دیا۔ ان دنوں اس کا ایک کمزور روپ سامنے آیا۔ انسان بڑے بڑے رنگ بدلتا ہے۔ ان دنوں وہ جس رنگ میں ڈھلی تھی وہ بھی مانوس نہیں تھا۔

"آج کل تم کیا کر رہی ہو عبیر؟" اس نے اپنی آواز میں ضرورت سے زیادہ رسان پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

"میں ماسٹرز کر رہی ہوں۔" اس کا مطلب سمجھ جانے کے باوجود اس نے اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔

تنویر جھنجلا گئی۔ بے کار ہی تھا اس سے کچھ کہنا۔۔۔ وہ پھر بھی اس سے مخاطب رہی۔ حالانکہ اب وہ امی کو سنا رہی تھی۔

"پتہ نہیں تم کن activities (سرگرمیوں) میں ہو۔ نعیم تمہاری شکایت کر رہے تھے، کہہ رہے تھے جن لوگوں میں تمہارا اٹھنا بیٹھنا ہے، کچھ اچھے لوگ نہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ تو جیل بھی ہو آئے ہیں۔ کام کرنا اچھی بات ہے لیکن احتیاط بہت ضروری ہے۔ آخر ہمارا ایک خاندان ہے۔ پھر میری سسرال ہے۔"

"اپنی سسرال کو تو آپ سمجھا دیں کہ وہ صرف آپ کی سسرال ہے۔ خاندان کو میں سمجھا دوں گی۔" وہ اب بھی ویسی ہی شانت تھی۔ حمیرا نے اس کو ٹہوکا دیا۔ وہ بدتمیزی کر رہی تھی۔

"چلو نا عبیر! لیٹ ہو رہے ہیں۔" ہاں شاید بدتمیزی تو کی اس نے۔

اماں کھانے کی میز پر بیٹھی ذرا سا پہلو بدل کر عبیر کی طرف شکایت بھری نظروں سے دیکھنے لگیں، تنویر کے کہے ایک ایک لفظ پر امی کو ایمان کی طرح اعتبار تھا۔ آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ دل کو یقین ہونا چاہیے۔ اور ان کو اس کے ایک ایک لفظ کا یقین تھا۔ اس پر اعتبار کی خوشی وہ بڑی خوشی تھی، جو اماں اس کو دے سکتی تھیں۔ اس کے الزامات دل سے تسلیم کر کے۔

تنویر کے الزامات بھی Pass the parcel کی طرح چلتے تھے۔ نعیم بھائی کے کسی واقف نے ان سے کہا تھا۔ جسے نعیم بھائی نے تنویر تک پہنچایا تھا۔ اب تنویر اس کو اماں تک پہنچا رہی تھی میوزک اماں پر آکر بند ہوا تھا۔ لیکن سزا عبیر کے لیے تجویز کیے جانے کے منتظر تھے۔

"یہ تو صریح بے ایمانی ہوئی۔ کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں۔"

"یہ تو باپ کی لاڈلی ہیں بھائی۔ ہر بات میں ان کی پشت پناہی حاصل ہے ان کو۔"

اماں کو ابا سے آج کے نہیں برسوں کے گلے تھے اور ایک یہی شکوہ نہیں اور بھی بہتیرے تھے۔ پتہ نہیں اتنی بیزاری کے باوجود ہم ایک دوسرے کے ساتھ عمر کا اتنا طویل عرصہ کیسے گزار لیتے ہیں۔

عبیر اس ساری محنت پر پانی پھیرتی مسکرا دی۔ صرف حمیرا مضطرب تھی۔ "چلو بھی نا۔" وہ کسی کی طرف بطور خاص متوجہ کبھی بھی نہیں۔

وہ اس کو نروس حالت میں ضرورت سے زیادہ ذمے داریاں اٹھائے اور ان کو نمٹانے میں ہراساں دیکھ رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں گدھے بھی بنائے ہیں گھوڑے بھی، ایسے بھی لوگ ہیں۔ جن پر جتنا بھی بوجھ لاد دو وہ اٹھائے پھرتے ہیں۔ وہ بھی ہیں، جو اڑی کر جاتے ہیں اپنی غلطی نبھانے کے لیے غلطی پر غلطی کرتے جانا۔ یا سادگی سے کہہ دینا۔ بے شک مجھ سے حماقت ہوئی۔ پتہ نہیں اس میں زیادہ مشکل کیا ہے۔

اس کی ساس علیل تھیں مرض بھی چھلاوا تھا۔ کیونکہ کسی ٹیسٹ اور الٹرا ساؤنڈ کی پکڑ میں ہی نہیں آتا تھا۔ عجیب اڑیل گھوڑا سا مرض تھا۔ ان کو اپنے مرض پر فخر بھی ایسا تھا جیسے عموماً بگڑے بدتمیز بچوں پر ان کی ماؤں کو ہوتا ہے۔

"یہی تو میرا مرض ہے۔" وہ اپنی آواز میں غرور سمو کر کہتیں۔ "سب ٹیسٹ کلیئر، ایکسرے صاف، ڈاکٹر اپنی جگہ پریشان۔ اب تو ہر ڈاکٹر نے جواب دے دیا، وہ کہہ رہے ہیں ہمارے بس کا روگ نہیں۔ ہمارا تو سب پڑھا لکھا فیل ہو گیا۔"

پھر میڈیکل سائنس کو عاجز اور بے بس کر دینے پر ایک اور فاتحانہ قہقہہ۔

وہ دوا بھی اپنے ہاتھ سے نہیں کھاتی تھیں اور بہو کے ہاتھ سے تو ہرگز نہیں۔ عموماً دوائی کی یہ خوراک نعیم بھائی کے ہاتھ سے شفا پاتی تھی۔ ایک گولی نگلنے سے پہلے وہ کافی دیر ٹھنکتیں۔ احتجاجاً کڑوے کڑوے منہ بناتیں۔ بڑی خوشامدوں کے بعد دوا کی گولی ہاتھ میں پکڑنے کے بجائے منہ کھول دیتیں۔ اور دیر تک جھرجھریاں لیتیں۔ پھر وہ مجمع چھٹ جاتا جو ان کے گرد، دوا کی گولی، پانی کا گلاس، اور شکر کی پھکی لے کر آکھڑا ہوتا۔

علاج معالجے کے طویل تجربے نے انہیں میڈیکل ایکسپرٹ بھی بنا دیا تھا۔ چھوٹے موٹے مرضوں کی تشخیص اور دوائیں تجویز کرنا تو ان کے لیے بالکل آسان تھا، وہ تو ڈاکٹر کے لکھے نسخے پر ماہرانہ اعتراض بھی کر سکتی تھیں۔

"ہاہ۔۔۔ اس بے وقوف نے کیا کیا۔ گلے۔۔ کے لیے یہ اینٹی بایوٹک دی۔ ارے یہ تو پیٹ کے مرض کے لیے ہے پتہ نہیں کیسا جاہل ڈاکٹر ہے۔"

سب کی سب Anti biotic اور Pain killers کے نام ان کو ازبر تھے۔

"نہیں، اچھی ہے، بس اس کے سائیڈ ایفیکٹس بہت ہیں۔"

"ہاں، کھالو بس 10mg کی نہ لینا 5mg والی لے لو۔"

"بڑا بے وقوف ہے۔ Hourly 8 دے رہا ہے یہ تو Hourly 6 ہوتی ہے۔"

انہوں نے ایف ایس سی تو کی تھی پری میڈیکل۔ اس سے آگے چونکہ میڈیکل میں داخلہ نہیں ملا تو بیماریوں پر بڑے ذوق شوق سے گفتگو شروع کر دی۔ یہی ان کا محبوب موضوع تھا۔

تنویر کو دوپہر کا کھانا صبح صبح پکا کر نکلنا ہوتا۔

اس کو کھانوں کے آرڈرز بھی اس طرح دیے جاتے، جیسے وہ ہاتھ میں مینو کارڈ لیے کھڑی ہو۔ ایک عدد پرہیزی کھانا تو لازم تھا ہی۔ "نمک کم ہو اور Olive oil میں پکا ہو۔ صرف وائٹ میٹ۔"

پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہی کہتیں۔ "نمک تو بالکل ہی نہیں ڈالا کم کہا ہے ڈاکٹر نے یہ تو نہیں کہا کہ بالکل بند کر دو۔"

وہ نمک دانی اپنی پلیٹ کے عین اوپر چھنکاتی جاتیں اور کہتی جاتیں۔ نعیم بھائی کا پیٹ نکل آیا تھا۔ سو وہ صرف سبزی کھاتے تھے یا کم از کم سبزی سے ابتدا کرتے تھے۔

بہنوں کو بھانت بھانت کے کھانوں کا شوق تھا۔ ان کا دعوا تو پکانے کا بھی تھا لیکن ہنوز ایسا کوئی تجربہ ہوا نہیں

تھا۔ فرمائشیں کر کے پکوانا یا ہوم ڈلیوری کو فون کھڑکا دینا۔

اس گھر میں اگر کوئی سب سے بے بس، معصوم، مظلوم اور کسی قسم کے احتجاج کے بغیر جینے والا تھا تو اس گھر کا سربراہ تھا۔ جو ملا جیسا ملا کھا لیا۔ جہاں جگہ ملی سو گئے۔

اسی لیے تنویر کی ساس کہتیں۔ میرے مہر میں تو شوہر کی طرف سے دو چیزیں ملیں۔ خراٹے اور ڈکاریں۔

لیکن جب وہ تنویر کو ایک طویل اور صبر آزما برداشت کے ساتھ خاموشی سے کام کرتے دیکھتے۔ تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتے۔ ہاتھ میں گرمی تو اس کے باپ کی سی تھی۔ لیکن وہ اعتماد اور اپنے پن کا یقین اس ہاتھ کے دباؤ میں ناپید تھا۔ تھوڑی دیر کو جیسے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگتے۔

تنویر میں بہشتی بی بیوں والی ساری ہی صفات جمع تھیں۔ جب تک شوہر نہ کھالے لقمہ منہ میں نہ ڈالنا۔ پنکھا جھلنے کا تو اب رواج نہیں رہا تھا۔ چھت سے لٹکا پنکھا بھر بھر ہوا دیتا تھا۔ ہاں جب تک وہ کھاتا رہتا وہ واری صدقے ہوتی اس کا منہ دیکھتی رہتی۔

"ذرا نمک دینا۔" وہ بالشت بھر کے فاصلے پر رکھی نمک دانی کی طرف اشارہ کرتا۔ ابھی اس نے روٹی پلیٹ میں ڈالی تھی اور سالن نکالنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی۔

"تھوڑا سا سالن ڈال دینا۔" ڈائننگ سے باہر دوسرے کسی ڈونگے کی طرف اشارہ۔

"آدھی روٹی دینا۔ بس بس آدھی۔ پوری نہیں چاہیے۔"

"وہ باقی کی آدھی روٹی دینا۔"

"گلاس میں پانی ڈال دینا۔"

"بہت ٹھنڈا ہے۔ تھوڑا سا فریش واٹر ملا لاؤ۔"

"ذرا لیموں کاٹ دو۔"

اس کی روٹی پلیٹ میں سوکھتی جاتی اور کھانا ختم ہو جاتا۔ لوگ جب کرسیاں گھسیٹ رہے ہوتے تو ابھی اس کے ہاتھ میں نوالہ ہوتا۔ کوئی نہ کوئی حیرت سے ضرور پوچھتا۔

"ابھی تک کھا رہی ہو۔"

فرسٹ ہینڈ علم کا وہاں کوئی خاص رواج نہیں تھا، زیادہ تر علمیت سینہ گزٹ سے چلی آتی تھی۔ کسی سنی سنائی بے بنیاد بات، جس کو تحقیق نے رد کر دیا ہو، وہاں رد نہیں کی جا سکتی تھی۔ ساس جی علم کا خزانہ تھیں۔ جس پر کوئی سانپ بھی نہیں بیٹھا تھا۔ کسی بھی تحقیقی علمی بحث میں ثبوت کے لیے ان کو پیش کیا جاتا تھا ان کا فیصلہ حتمی اور آخری ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ ایک فارسی مصرعے میں "پلنگ" کا ترجمہ انہوں نے چارپائی کیا۔

"اگر تجھ میں ہمت ہے تو چارپائی جتنی چھلانگ لگا۔" وہ ترجمہ وہیں مستند ہو گیا۔

تڑتڑ بحث کرتی، فلسفہ بگھارتی، علم و فضل کے دریا بہاتی تنویر بیگم اس گھر میں سب لفظ گنوا کر آئی تھیں۔

وہ عموماً ان علمی مباحث کے دوران، دونوں ہاتھ گود میں رکھے سر جھکائے ہاتھ کی بڑی چھوٹی لکیروں پر غور کرتی رہتی۔ اس کے ماضی والے گھر میں کوئی کتاب آتی تو باری باری سب پڑھتے تھے حتیٰ کہ پڑوس سے حمیرا رضا کو بھی بلا لیا جاتا پھر ابا کی لائبریری میں بیٹھ کر اپنا اپنا تجزیہ پیش کیا جاتا جو عموماً اتنا طویل ہوتا کہ ریویو پر ہی ایک ضخیم کتاب بن سکتی تھی۔ لیکن یہاں اس کے سب لفظ گونگے ہو گئے تھے۔ شروع میں اس نے کچھ کوشش کی لیکن اپنا تمسخر بنوا کر چپ کی راہ لی۔

میڈیکل کے بعد اس کی ساس کا دوسرا شوق درس دینے کا تھا۔ پتہ نہیں انہوں نے کس کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھی تھیں اور کب پڑھی تھیں اور اس میں معلومات کہاں سے اخذ کی گئی تھیں۔ لیکن وہ خود کو فقہ اور شریعت پر کمانڈ سمجھتی تھیں۔ حالات اور ضرورت کے مطابق ان کے پاس بہت سے احکامات تھے۔

مثلاً "۔۔۔ تنویر اور نعیم بیٹھے ہوں تو۔ "مرد کا حق ہے کہ عورت اس کو خوش رکھے۔ عورت مرد کے لیے بنائی گئی ہے مرد عورت کے لیے نہیں پیدا ہوا۔ ایسی عورت جس سے اس کا مرد خوش نہ ہو جہنم میں جائے گی۔"

"یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر عورت نے روزہ رکھا ہوا ہو تو روزے کے باوجود ہانڈی میں نمک چکھے تاکہ اس کا شوہر خوش ہو کر کھا سکے۔"

اوپر نیچے تک اس کے پورے وجود میں سردی کی لہر کرتی گزر گئی۔۔۔ یہ کس مذہب کی بات کر رہی ہیں۔ کس نے ان کو اختیار دیا ہے وہ اپنی سرداری کی خاطر مذہب سے کھیلیں۔

"اور عورت کو بھی جواباً" کوئی حق دیا گیا ہے؟"

"مرد کے بخشے نہ جانے پر بھی ہے۔ کچھ ان کی پٹاری میں؟"

یہ سب انہوں نے بحق اپنی ذات ضبط کر رکھا تھا۔ ہاں البتہ کبھی ان کا سامنا اپنے شوہر سے ہوتا تو درس ماں کی عظمت اور پاؤں تلے جنت پر نکل جاتا۔

ایک مرتبہ پتہ نہیں کیسے اس کے منہ سے پھسل گیا۔ "پاؤں تلے جنت کا مطلب ہے اگر ماں کی خدمت کی تو اولاد جنت میں جائے گی۔ اس میں ماں کے جنت میں جانے کی بشارت نہیں ہے۔ ماں اپنے اعمال سے جائے گی یا نہیں جائے گی۔"

کتنی طویل خاموشی کے بعد انہوں نے کلمے پڑھے۔ توبہ استغفار کی۔ کانوں کی لو کو چھوا اور اپنی بخشش کی دعا مانگی اور اس گناہ کی توبہ طلب کی جس کی وجہ سے ان کے کان خطاکار ہوئے۔

پھر انہوں نے بڑبڑا کر لیکن سنانے والی آواز میں کہا۔

"بے دین گھروں کی بے دین اولادیں۔"

کس میں جرأت تھی جو مذہب پر ان کی اجارہ داری کو چیلنج کرتا۔

نعیم جرنلسٹ تھا۔ ایسے ایک پرنٹڈ میڈیا میں جس کی سرکولیشن کوئی غیر معمولی زیادہ بھی نہیں تھی۔ کیونکہ اردو اخباروں کی ایک کھیپ تیار تھی پھر مقابلہ نیوز چینل سے بھی تھا۔ دن رات میں ڈیوٹی کا کوئی حساب نہیں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح سگریٹ کے دھوئیں اور چائے کی بے شمار پیالیوں کی طرح ان کے مابین صرف سیاست پر بات ہوتی تھی۔ ملکی حالات بین الاقوامی امور امریکہ اسرائیل انڈیا۔

جب پہلی دفعہ تنویر نے اسے دیکھا تو وہ مڈل ایسٹ کرائسس پر بڑی معلوماتی تقریر کر رہا تھا۔ اس کو سن، تاریخ واقعات کی ترتیب سب ازبر تھی۔ وہ اپنی دوستوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس نے دبی زبان میں ملیحہ سے کہا۔

"میرا خیال ہے اس آدمی کی نالج بہت زیادہ ہے۔"

محبوب، جب شوہر بنتا ہے تو کیا تب بھی محبوب رہ سکتا ہے۔ اس کا اصلی روپ کون سا ہے شوہر والا یا محبوب والا؟

یہ ابھی تک تنویر کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

یا شاید آ گیا تھا۔

ہم بھی عجیب مخلوق ہیں۔ ایک عارضی خوشی کا تجربہ کرنے کے لیے خود کو گنی پگ بنا کر لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں کہ لو بھائی، تم ہم پر تجربے کرو۔

اپنی ساری کی ساری تنخواہ گھر کی چھوٹی بڑی ضرورتوں پر بیس سے پہلے پہلے ختم کرتے۔ اسے کبھی یاد نہیں آئیں وہ ڈگریاں جو اس نے کبھی لی تھیں۔

وہ تربیت جو اسے دی گئی تھی۔ جانے کہاں رہ گئی۔

رہ گئی تو بس ایک عورت رہ گئی۔

ہائے عورت!

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

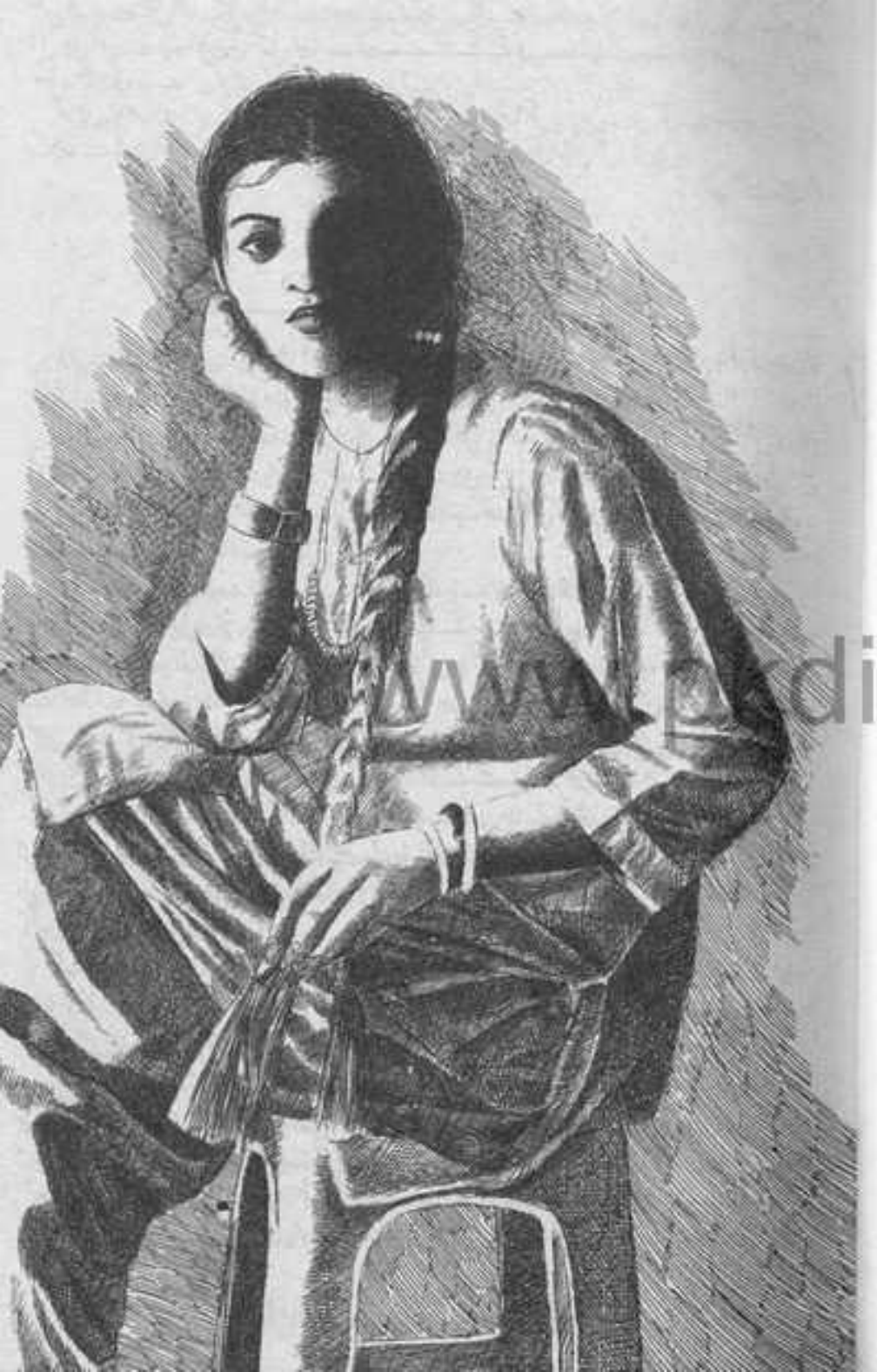

رفعت ناہید سجاد

چراغِ آخرِ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی تجربے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ۔ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ نوریہ، عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی نوریہ ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گھنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں۔ اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ نوریہ کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر سکتے تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونیورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

www.pkdigest.com

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے' وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیر اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے' لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے امراء کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی آپی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آئی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

۲

دوسری قسط

دیر سے نکلے۔ بس مس ہوئی۔ رکشا خراب ہوا۔ Presentation تاخیر سے شروع ہونے پر ڈاکٹر صاحب کا موڈ خراب ہوا۔ حمیرا سے جھاڑ کھائی سو الگ۔ "کیا ضرورت تھی تمہیں تنویر سے بحث کرنے کی؟"

اور اب وہ کیمپس کی سب سے بلند عمارت کی ریلنگ سے لگی اپنا خراب مزاج درست کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تیز ہواؤں کی زد میں اڑتے بالوں کو سنبھالتے اس نے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ سارا شہر اس کے قدموں میں ڈھیر تھا۔ گرد' دھواں اور آلودہ فضا سے بہت دور کا منظر دھندلا جاتا تھا۔ لیکن کناروں تک لبریز نہر درختوں کی قطار ساتھ لیے چپ چاپ بہتی صاف دکھائی دیتی تھی۔

شہر کے عین درمیان نہر کے کنارے کنارے یہ درس گاہ جانے کب سے قائم تھی۔

انگریزوں نے یہ یونیورسٹی مال روڈ پر بھنگیوں والی توپ کے سامنے انارکلی بازار سے متصل تعمیر کی تھی۔ مین گیٹ کے باہر فٹ پاتھ پر اس کے یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر کا قد آدم بت ایستادہ تھا۔ جو بعد ازاں وہاں سے اکھاڑ کر غائب کر دیا گیا۔ سڑک کے پار سبز لکڑی کے کھمبوں پہ کھڑی نولکشن مارکیٹ تھی۔ جو چیز پاکستان بھر میں کہیں سے نہ ملتی ہو پنجاب اسٹور سے مل جاتی تھی۔ بائیں طرف ذرا فاصلے پر پاک ٹی ہاؤس تھا۔ جن بڑے بڑے ناموں کی آج کتابیں پڑھی جاتی ہیں' وہ وہاں مجسم موجود ہوتے تھے۔ ایک مختصر سا کمرہ' کمرے کے اوپر ایک اور کمرہ' ادب پر گرم جوش مباحثہ کرتے ادیب اور سیاسی حالات پر خون جلاتے دانشور۔ یونیورسٹی کے دائیں ہاتھ دفتر لاٹ صاحب تھا۔ جہاں تقدیروں کے ایسے فیصلے کیے جاتے' جو دانشوروں کا خون جلانے کا سبب تھے۔ یہ خواص کی دنیا تھی۔ عوام ان دنوں کوئی چیز نہیں تھے۔ ان کا کام دن رات کھٹ کر گھر والوں کو روٹی فراہم کرنا تھا۔ ان دنوں تانگوں کو بھی مال سے بچ کر نکلنا ہوتا تھا۔

ایک طرف گورنمنٹ کالج تھا۔ جس کا ابھی اتنا مضحکہ خیز نام نہیں رکھا گیا تھا۔ میوزیم کنگ ایڈورڈ۔ ایک چھوٹا سا خفیہ دروازہ جو آپ کو میو اسپتال تک لے جاتا تھا۔ ٹریفک لائٹ پورے لاہور میں صرف مال روڈ پر نصب تھیں۔ یہیں ڈبل ڈیکر بھی چلتی تھی۔

پنجاب یونیورسٹی اور اس کا پڑوس ایک قدیم کلچر تھا۔ یہاں داخل ہو کر جیسے آپ تاریخ کے صفحوں میں داخل ہو جاتے تھے۔ پھر آس پاس بڑھنے لگا۔ لاتعداد کالج' کمرشل ایریا' جیولرز' انارکلی بازار بھی پھیل کر باہر آ گیا۔ شہر کے عین وسط میں' جیسے وہ لاہور شہر کا چوک بن گئی۔ ہر راستہ وہاں سے گزر کر جاتا تھا۔ لہٰذا آنندی (غلام عباس کا مشہور افسانہ) کی طرح طے پایا کہ یونیورسٹی کو شہر کے مہذب لوگوں سے دور لے جا کر بسایا جائے۔

چاروں طرف بڑھتی ہوئی نئی بستیوں اور ٹریفک کے اژدحام میں پھنسی نیو کیمپس بھی اب ضعیف ہو چکی ہے۔

یونیورسٹی میں داخل ہونے والوں کو ہر روز بھاگتی دوڑتی ٹریفک کے بیچ سے راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی طالب علم کسی ٹائر کے نیچے روندا جاتا۔ اندھا دھند بھاگتی اور کچلتی ٹریفک کو بھی کہیں پہنچنے کی اتنی ہی جلدی ہوتی' جتنی کسی طالب علم کو اپنے ڈپارٹمنٹ پہنچنے کی۔

اگلی بات کہ شہادت طلبہ کا مقدر بن رہی تھی۔ کچھ دیر کو ٹریفک بلاک کی جاتی۔ جن گاڑیوں کا قطعی کوئی قصور نہیں تھا' ان کو پکڑ کر آگ لگا دی جاتی۔ پھر کچھ دیر کے لیے یہ مسئلہ جھاڑ دے کر قالین کے نیچے کر دیا جاتا۔

کچھ دن بعد پھر علم کے حصول میں سرگرداں ایک طالب علم... چند اور گاڑیاں۔

ابھی جیسے کل کی بات ہے۔ تب اماں 'اماں' نہیں بنی تھیں' وہ مسز نائلہ عباس بھی نہیں بنی تھیں۔ یہ 1972ء تھا جب نائلہ مہدی ایک تنگ مکان سے نکل کر' جس کی گلی میں کھلی نالیاں بہتی تھیں۔ اس عظیم الشان درس گاہ میں داخل ہوئی تھی' کھو جانے اور بھٹک جانے کے تصور سے ہراساں وہ ایک ایک قدم ناپ تول کر رکھتی تھی۔ کیفے ٹیریا جاتی تو ڈپارٹمنٹ گم ہو جاتا۔ ابھی بینک میں چالان جمع کرا کے نکلتی تو ڈپارٹمنٹ نظروں سے کہیں کھسک جاتا۔ بیشتر لوگ عمر میں پہلی دفعہ کو ایجوکیشن میں آئے تھے۔ دور دراز سے آئے لڑکے جن کے علاقے میں لڑکیاں ووٹ ڈالنے کو بھی دستیاب نہیں تھیں۔ یہاں اس قدر وافر اور کھلے عام پھرتے دیکھ کر بوکھلا جاتے' لڑکیاں بھی کترائی کترائی پھرتیں۔ پھر آہستہ آہستہ ہر چیز کی عادت پڑ جاتی۔ لڑکے 'لڑکے' لگنا بند ہو جاتے اور لڑکیوں میں بھی کچھ ایسا نظر نہ آتا کہ چلتے چلتے ٹھوکر لگ جائے۔

نائلہ مہدی کو بھی راستوں کی پہچان مسئلہ نہ رہی۔ بلکہ کیمپس پرایا لگنا بھی بند ہو گیا۔ کیمپس کے چاروں طرف ہو کا عالم بھی مانوس ہو گیا۔ فاصلے البتہ نہیں سمٹے کہ کیمپس کے پاس آخری آبادی فیروزپور روڈ تھی۔ روڈ سے جب نہر کے لیے ٹرن لیتے تو جیسے بے آباد خاموش سناٹا آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ چپ چاپ بہتی نہر' دونوں طرف قد آور گھنے درختوں کے سائے میں پانی کا رنگ تاریک لگتا۔ سیدھی اور اداس سی کولتار کی سڑک کیمپس تک اسی سناٹے میں جاتی تھی۔ آس پاس نہ کوئی آبادی' نہ آبادی کے آثار۔ کہیں کسی منچلے' اکا دکا گھر خاموش نظروں سے اس اداس سی نہر کو دیکھا کرتا۔

اس طویل سڑک پر مسلسل تنہائی کے خوف کے سوا کچھ ساتھ نہیں ہوتا۔ اپنے بڑے بھائی کے اسکوٹر کی پچھلی گدی پر نائلہ مہدی کے پاؤں لٹکے لٹکے جب سو جاتے تو کہیں جا کر کیمپس کے نیلے رنگوں والا آڈیٹوریم نظر آتا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں گنی چنی گاڑیاں۔ لیکن بے شمار سائیکل اور موٹر سائیکل کھڑے ہوتے۔ ڈپارٹمنٹ کے سامنے اس کو اتار کر ابھی بھائی جان کو واپس فیروزپور روڈ تک جانا ہوتا۔ کیفے ٹیریا کا سامنے والا قطعہ زمین ایک گھنے جنگل کی صورت تاحد نظر پھیلا ہوتا۔ اونچے درختوں کے سائے میں کرسیوں پر براجمان طالب علم لیڈر جوشیلی تقریریں کر رہے ہوتے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب "جھوٹے روپ کے درشن" (راجہ انور کے خطوط پر مشتمل کتاب' جو جامعہ پنجاب کے ہوسٹل سے لکھے گئے) کا المیہ باب رقم ہو رہا تھا۔ صبح صبح ہی کیفے ٹیریا آباد ہونا شروع ہو جاتا۔ آئی ای آر کی پشت پر نہر کنارے ایک چھوٹی سی پھوس کی ہٹ تھی۔ جہاں نہر میں رسی سے بندھی کشتیاں پانی میں ہوا کے ہچکولوں سے دھیرے دھیرے ڈولتی رہتیں۔ ہٹ (Hut) پر چائے ملتی تھی اور بیکری کے خستہ بسکٹ۔

رمضان میں جب کیفے ٹیریا بند ہو جاتا' یہ ہٹ تب بھی کھلی رہتی تھی۔ اس ہٹ کے نیچے گیان دھیان میں گم مٹی اور گھاس کے فرش پر آلتی پالتی مارے ڈاکٹر نذیر نظر آتے۔ اپنے وقت کے عظیم الشان پروفیسر اور دانش ور۔ گورنمنٹ کالج کے سابقہ پرنسپل۔ ان کی مٹھی میں سگریٹ ہوتا اور فرش پر چائے کی پیالی دھری ہوتی۔ ان کے عہدے اور نشست میں کچھ مشترک بھی تھا یا نہیں' ہم اس سے بے خبر تھے۔

ہاسٹل سے آنے والے طلبہ وطالبات کے گروپ وقفوں وقفوں سے نہر کنارے سڑک سے گزرتے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے پل پار کرکے کیمپس کی حدود میں داخل ہو جاتے۔ پل کے نیچے بندھی ہوئی کشتیوں میں بیٹھ کر بلند آواز ملاحوں کے گیت گاتے۔ او میرے ماجھی اب کی بار لے چل پار۔

نہر اور کیمپس کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ کیمپس سے لگ کر چلتی نہر ایس بی سی تک جاتی' پھر ہوسٹل آتے اور نہر چلتی جاتی۔ اس کے بعد کیا تھا وہاں نہ کوئی گیا نہ کوئی خبر لایا کیونکہ وہ دن دہاڑے بھی وہاں گرلز ہوسٹل کے پیچھے گیدڑ آجاتے تھے چھٹی کے بعد کیمپس ویران ہو جاتا لیکن سنہرا لاحصہ پھر بھی توانا اور شاش لگتا۔ ہاں ذرا دور چلو تو خوف آتا تھا ہم کس ویرانے میں آنکلے ہیں۔ کیمپس اس کے بعد علاقہ غیر تو نہیں شروع ہوتا۔

سناٹے میں گرتے سفیدے کے پتے اور ان کی مینتھول کی تازہ مہک سے فضا آباد رہتی۔ درختوں کی سرسراہٹ اور خشک پتوں کے جوتوں تلے آکر چرمرانے کی آواز کے سوا میلوں خاموشی تھی۔ کبھی کوئی اکا دکا گاڑی آتی تو اس کی گھن گرج دور سے سنائی دیتی۔ وہ گاڑی بھی ہوسٹل تک آکر رک جاتی۔ یہ کوئی گزرگاہ نہیں تھی۔

یہاں سے راستے کہیں کو نہیں جاتے تھے۔

نہر کے اس طرف کھیت ہی کھیت تھے کھیتوں سے گزرتے تو ایک مختصر قدیم مندر کے شکستہ آثار میں ایک منحنی سی پگڈنڈی پر چلتے ماڈل ٹاؤن کا کے بلاک شروع ہوتا' پہلا گھر ڈاکٹر اسرار کا تھا جہاں وہ درس دیا کرتے تھے۔

آئی ای آر کی تیسری منزل سے دیکھو' جہاں ان دنوں شعبہ صحافت تھا تو دور کہیں ایک نئی بستی کے آباد ہونے کے اثرات نظر آتے تھے۔ اس کا نام سولہ سو ایکڑ اسکیم تھا۔ جو بعد میں علامہ اقبال ٹاؤن کہلایا۔ سردست وہاں میلوں تک پھیلا ایک لق ودق میدان تھا۔ جہاں دھول اڑتی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا' جب لوگ ایک طویل آمریت کے بعد مشرقی پاکستان کو گنوا کر آئے تھے۔ مسلسل جدوجہد کے بعد ایوب خان اور یحییٰ خان سے نجات حاصل کرکے۔ وہ جتنی سازش کی تمہید کرکے یقین سے جیتے تھے کہ اب ملک میں کبھی مارشل لا نہیں لگے گا۔

لوگوں کے دلوں میں بڑے بڑے عزم' جرأت اور حوصلے تھے۔ شدید صدمے سے نڈھال ہو کر نیا پاکستان بنانے کا عزم۔ دشمنوں سے ٹکرانے کی جرأت اور ناکام معیشت کو سنبھالنے کا حوصلہ' وہ لوگ۔ جو اس ادارے میں عظیم ارادوں اور منصوبوں سے داخل ہوتے تھے۔

"کیا ان کو حسب یقین مل گیا۔۔۔؟"

"کیا وہ لوگ آج اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟"

اب کیمپس چاروں طرف سے سڑکوں اور آبادیوں میں گھرا دھویں اور ٹریفک کے شور میں اٹا ٹپ رہا تھا۔ لوگ دور دور سے ڈگری کی کشش میں یہاں کھنچے آتے ہیں۔ یوں تو یونی ورسٹیوں کی کوئی کمی نہیں رہی کہ کنال در کنال کے گھر بھی یونی ورسٹی بن گئے تھے۔ جن سے پرائیویٹ ادارے دھڑا دھڑ affiliation لے رہے تھے۔ ان ghost یونی ورسٹیوں کے سوا کراچی یونی ورسٹی بھی تھیں۔ جن میں سے کچھ بین الاقوامی معیار کی بھی ہیں۔

کتنا اچھا لگتا ہے یہ تصور کہ آپ کے وطن میں کچھ بین الاقوامی معیار کا بھی ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں ہم نے بین الاقوامی معیار کی فلم بنائی ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا ڈیم۔

دنیا کا سب سے بڑا اسٹیڈیم۔

اور جب اقوام اپنے معیار بناتی ہیں تو اس غریب سے جان لڑاتے وطن کو کسی گنتی شمار میں نہیں ڈالتیں کہ دنیا کی بہترین 100 یونیورسٹیوں میں پاکستان کی کسی یونی ورسٹی کا نام نہیں۔

کیمپس بھی ایسا ہی ایک ادارہ ہے۔ ایک خاص معاشی طبقے کے لوگ یہاں داخلہ لیتے ہیں۔ بہت خواہش مند تھے۔ کسی زمانے میں اس یونی ورسٹی کے طلبہ حکومتیں بدل دیا کرتے تھے۔ صحیح یا غلط یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے لیکن ان میں کچھ کر گزرنے کا عزم تھا۔ طاقت تھی' جیلوں میں زندگی گزارنے کا حوصلہ تھا' وہ کچھ نہ کچھ کر گزرتے تھے۔ اکھاڑ پچھاڑ کی۔

اب سب کچھ بدل گیا ہے۔ ترجیحات بھی نظریات بھی۔

اب نظریات اتنے اہم نہیں رہے۔ ترجیحات سامنے آگئی ہیں۔ سب سے بڑی ترجیح پیسہ ہے۔

عبیرہ نے اوپر بالکونی سے جھانکا۔ لوگ باگ گروپ کی شکل میں ٹولیاں بنائے گھومتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ کہیں کوئی تنہائی کا مارا کسی درخت کے نیچے یا کسی تنہا بنچ پر اپنے آپ میں گم نظر آتا تھا۔ ایسے لوگ اپنی بنائی جنت میں رہ رہے تھے۔ دنیا گھومتی کہیں سے کہیں جا پہنچی ان کو پروا نہیں تھی۔ جیسے مخروطی گول گھومتی گیند پر ایک ہی جگہ کھڑا ہوتا ہے۔ حالانکہ کرہ خوب گھوم رہا ہوتا ہے۔ وہ اسی بل کھاتی گھومتی دنیا میں دشت کے ایک گوشے میں آرام فرما رہے تھے۔

ہاں ان جوڑوں میں اب بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی' جو اپنی طرف سے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر محبتوں کے جہان آباد کیے بیٹھے تھے اور سمجھتے تھے سلیمانی ٹوپی پہن کر بیٹھے ہیں کوئی ان کو دیکھ نہیں رہا۔ حالانکہ وہی سب سے نمایاں نظر آرہے ہیں۔ پبلک میں پھرتے couples کو تو کوئی پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا۔ پھر بھی درختوں کے پیچھے چھپ کر ملاقات کرنا ان کو زیادہ دلچسپ زیادہ Thrilling لگتا ہے۔ کوئی دیکھ لیتا تو خبر عام ہو جاتی اسکینڈل بنتا۔ آپ توسب کا مرکز بن جاتے۔

محبت کی کہانی کبھی اولڈ فیشن نہیں ہوتی۔ گو کیمپس کی محبتیں کم ہی پائیدار ثابت ہوئیں۔ جیسے ہمیں ایک دم غصہ آجاتا ہے ایک دم محبت بھی ہو جاتی ہے۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد جیسے غصہ اتر جاتا ہے محبت کا بھوت بھی اتر جاتا ہے۔

www.pkdigest.com

"ارے یہ عبیرہ تو یہاں کھڑی ہے"

"عبیرہ۔" نیچے سے کسی نے اس کو دونوں ہاتھوں کا مائیک بنا کر آواز دی۔ اس نے بلندی سے جھک کر دیکھا' اس کا گروپ تھا۔

"ہم لوگ آفس جا رہے ہیں۔ حمیرا کو لے کر پہنچ جانا۔" وہ چونکہ اوپر تھی اس لیے ان کو آواز بلند کرنی پڑی۔

"پہنچ جاؤں گی۔" اس نے ریلنگ سے کہنیاں نکالے تابعداری سے کہا۔ اعجاز نے گروپ سے ذرا پیچھے رہ کر اس کو تشویش سے دیکھا۔

"یہ تم جولیٹ کی طرح بالکونی میں کیوں کھڑی ہو؟"

"میں کیمپس کی ہسٹری لکھ رہی تھی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا لکھ چکو تو آجانا انتظار ہو رہا ہے۔" اس نے جوابا" وہی سنجیدگی اختیار کی۔

"اچھا۔ نہ سہی بین الاقوامی معیار کی۔" اس نے خود سے بحث سمیٹتے سوچا۔ "پاکستان کی بہترین یونیورسٹی میں سے تو ایک ہے نا۔"

ساری کائنات سمٹ کر اک نقطے پر مرکوز ہو گئی۔ اہم نقطہ۔

پاکستان!

☼ ☼ ☼

کام کیا تھا ہر شخص خود کو خود ہی ڈیوٹی تفویض کرتا اور کام میں جت جاتا۔
اور آفس بھی کیا تھا۔
صوفی چیمبرز کے ایک غلیظ سے فلیٹ کا ایک مختصر سا کمرہ۔ جو کبھی اعجاز کے ایک دوست کی ملکیت تھا۔ وہ جب آسٹریا settle ہوا تو قبضہ گروپ سے بچنے کے لیے فلیٹ کی چابی اعجاز کو دے گیا تھا۔
جس نے دو کرسیاں ایک میز (جس کی ایک ٹانگ کے نیچے دو اینٹیں بھی رکھی تھیں) اور ایک بدرنگ پھٹی دری بچھا کر آفس کا آغاز کر دیا تھا۔ ایک چھوٹے سے گروپ کو لے کر جس کے بانی اراکین کی تعداد دس سے زیادہ نہیں تھی۔ بڑے بڑے عزائم' بڑی بڑی منصوبہ بندیوں کے ساتھ۔
حمیرا حوصلہ بڑھانے (یا کبھی گھٹانے) کو سعدی شیرازی کی حکایات ساتھ ساتھ سناتی جاتی تھی۔
"ہم لوگ تعداد میں کم ہیں۔ تھوڑے ہیں۔ لیکن چیونٹی بھی ہاتھی کی سونڈ میں گھس جائے تو۔"
"فنڈ ریزنگ ضروری ہے۔" قیصر کہتا۔ "ہم تہی دست غریب طالب علم۔"
"ہم اسپیج کریں گے۔ شوز کریں گے۔"
"شغل چلی۔" حمیرا مایوسی سے کہتی اور عزم سے ڈٹ جاتی "ضرور کریں گے۔"
"جب ایک جیسے سوچنے والے اکٹھے ہونے لگیں تو آہستہ آہستہ گروپ پریشر گروپ بن جاتا ہے۔"
"اور ہمارا موٹو کیا ہے Love Pakistan۔" پاکستان سے محبت کرنے والوں کی تعداد کم تو نہیں بس ان کو یاد نہیں رہا۔"
بڑی بڑی این جی اوز کے بھاری بھرکم بجٹ' چھ لنگر میں تنخواہیں لینے والوں میں اسی گروپ کی حیثیت' سانپوں کے بچوں کے درمیان کھیلنے والے بچے کی سی تھی' رنگ' ڈھنگ' چال' ڈھال وہی۔ لیکن صرف ایک نمک کی چٹکی کی مار۔
"Poor cousing of NGO Self Help"۔
وہ خود کو غیر ملکی مفادات سے محفوظ رکھنے کے لیے کسی قسم کی امداد لینے پر تیار نہیں تھے' آپ سفید فام قوم سے پیسہ مانگ کر اپنا مفاد سامنے رکھ ہی نہیں سکتے۔
این جی او والے کہتے ہیں "ہاں ہیں کچھ ایسی کالی بھیڑیں۔ لیکن ہماری آرگنائزیشن تو۔۔۔"
اس تو کے بعد تو بہت سے کلیشے ہوتے ہیں۔ نعرے ہوتے ہیں۔ نصابی فقرے ہوتے ہیں۔ پر سب کے سب جھوٹ ہوتے ہیں۔
اس چھت کے نیچے موجود لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو کسی صلے کی توقع نہیں' ان مٹھی بھر لوگوں کو کسی کی لاش سے گزر کر کامیابی حاصل نہیں کرنی۔ ان کا مقصد صرف یہ یاد دلانا ہے کہ یہ ملک آپ کا ہے' اس سے محبت کریں یہ آزاد ملک ہے۔ ازراہ کرم اس کو آزاد ہی رہنے دیں۔ اس موٹو سے کسی سفید فام ملک' کسی تیل پیدا کرنے والے مسلمان ملک کو کوئی خاص رغبت نہیں وہ اور بہت سی چیزوں میں آپ کو الجھانا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس لچھے دار پروگرام ہیں۔
ماحولیاتی آلودگی' ہیومن رائٹس' انسداد بے رحمی حیوانات۔
اس پر سینکڑوں انجمنیں کام کر رہی ہیں۔
آپ کے پاس کھانے کو روٹی ہے کہ نہیں۔ پینے کے لیے گندہ پانی سہی۔ پر کتنی دور ہے۔ آپ جس جگہ رہتے ہیں کیا اس کو گھر کہا جا سکتا ہے۔ آپ کا بچہ بھیک مانگتا ہے کہ اسکول جاتا ہے۔
ان کی حالت بہتر بنانے کے لیے ہمارے پاس کوئی منصوبہ نہیں۔ این جی او کا بجٹ منظور کروانے کے لیے ہم

www.pkdigest.com

دنیا کی ظالم ترین قوم بننے پر تیار ہیں۔
ہم پاکستانی ہو کر پاکستان کے خلاف بک بک کرنے پر خوشی سے آمادہ ہوتے ہیں کیونکہ اس سے پیسہ ملتا ہے۔
پاکستان کی پائیداری کسی کو قبول نہیں۔
کبھی کبھی جب اس کا کام میں جی نہ لگتا اور اس قسم کی باتیں اسے سوچ سوچ کر دکھ دینے لگتیں تو وہ سر اٹھا کر سست روی سے بلتے پنکھے کے پر گننے لگتی۔
کچھ ہو گا بھی یا نہیں ہو گا۔ محض مرض تجویز کر دینے سے شفا نہیں ہو جاتی۔ یہ گنتی کے لوگ احمق تھے یا احمقوں کی جنت میں رہتے تھے۔ جن کو گمان تھا ان کے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے محبوب راستے سے گھر میں داخل ہوئی۔ برآمدہ برآمدے سے گزر کر ڈرائنگ روم جہاں ہمیشہ ایئر فریشنر کے بجائے پھولوں کے اسپرے سے فضا آباد ملتی۔ پھر گیلری' اور دونوں دیواروں پر آویزاں قدیم تصویریں۔ گیلری کے دونوں طرف کھلنے والے سب کمرے گرمی اور حبس سے بھلستے ویران پڑے تھے۔ اماں کا سوشل سرکل ہر وقت فعال رہتا تھا۔ بڑی تائی سو رہی تھیں یا نہا رہی تھیں۔ کوئی بھی' کچھ بھی' کہیں بھی تبدیل نہیں ہوتا۔ گرمیوں کی دوپہروں کے مخصوص ویران سناٹے میں اس نے بے آواز دروازہ کھولا۔ ایک محبوب دروازہ' اس محبوب راستے کے درمیان پڑتا تھا۔ ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے اس نے سر اندر کیا۔
ابا اپنی مخصوص کرسی پر جو در اصل ان کے ابا کی کرسی تھی۔ کتاب ہاتھ میں لیے گم تھے۔
"آؤ عبیر بیٹا۔" ان کی مسکراہٹ اتنی موہوم ہوتی کہ بس مسکرانے کا شائبہ ہی گزرتا۔
وہ جوابا" مسکرا دی۔ کھلی ہوئی اور کھلی کھلی مسکراہٹ۔ نسلوں کے مزاج کا فرق تھا۔
وہ چوکڑی مار کے ان کے قدموں میں بیٹھ رہی۔
"کھانا کیوں نہیں کھایا؟" ان کو بند دروازوں کے پیچھے بھی اس کے اندر کی خبر رہتی تھی۔
"سموسے کھا لیے تھے۔" مختصر جواب۔
"پنکھا تیز کر لو۔"
"نہیں ابا! بہت مناسب ہے۔" تیز ہوا ان کے گھٹنوں کو پریشان کرتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی۔
"بہت دن سے آپ نے اپنی کتاب کا اگلا چیپٹر نہیں لکھوایا ابا!"
انہوں نے ایک نظر اپنی عزیز بیٹی کی طرف دیکھا۔ ابھی جب یہ بے آواز دروازہ کمرے کے اندر کھلا' وہ اس سے چند ہی منٹ پہلے سوچ رہے تھے۔ عبیر گھر ہوتی تو وہ ڈکٹیشن دے دیتے۔ روح کا روح سے بڑا عجیب سمجھوتا ہوتا ہے۔
عبیر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ وہ کبھی کبھی خود کو کچھ ایسے غیر ضروری کاموں میں ہی الجھا لیتی ہے کہ ابا پس پشت رہ جاتے ہیں۔ اس نے دوسری کرسی گھسیٹ کر Laptop گود میں رکھا۔
(کیا دنیا میں میرے لیے اس سے زیادہ پیارا آدمی بھی کوئی اتارا گیا ہے؟)
کچھ دیر کے لیے جیسے واقعات ایک قطار میں ان کے ذہن سے گزرتے رہے۔
"دکھ اس بات کا ہے۔" ابا نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔ عبیر نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ (پاکستان کی تاریخ لکھتے وقت کیا کوئی ایسا واقعہ ہے جو دکھ سے شروع نہ ہوتا ہو؟)
"دکھ اس بات کا ہے کہ ہم نے 1947ء میں جو آزادی حاصل کی تھی وہ 1958ء میں ختم ہو گئی۔ پھر یوں

والوں اور ہندوؤں والوں کو نئے ایک راستہ ان لیا۔ ہر پانچ سال بعد وہ ملک پر شاہی کر دیے ... کرنے کا عزم کرتے رہے۔ شہ بار بار پاکستان فتح کرتے رہے۔
ہمارے لوگ 5 جولائی 1977ء سے ایک سوئی ہوئی قوم بن چکے ہیں۔ وہ اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ امید کی کسی کرن کے بھی منتظر نہیں رہے۔ تیس سال سے ان پر مردنی طاری ہے۔ حکمران طبقہ ملک کو اس طرح لوٹ کر کھاتا رہا جیسے پاکستان اس کی جیتی ہوئی جاگیر تھا۔ حکمران فاتح ہیں اور ہم مفتوح غلام رعایا۔ ہم نے مارشل لا کا ایک طویل عرصہ خوشی سے گزارا ہے حالانکہ ہم نے ڈائر کا مارشل لا برداشت نہیں کیا تھا۔"
ابا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔ شاید لفظ ختم ہو گئے تھے۔ واقعات کے ختم ہونے میں تو ابھی کوئی کمی نہیں آئی تھی۔
"ہماری ایک نسل پرولتاریہ کو اس کا حق دلانے کے لیے اٹھی تھی۔" وہ پھر سے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں شروع ہوئے۔ "انقلاب کے لیے زندگیاں تج کے رومانس جھیلتے رہے۔ حتیٰ کہ سوشلزم کا وہاں ہی وجود نہ رہا جہاں سے وہ شروع ہوا۔ بالکل اسی طرح جیسے سو سال پہلے ہم نے تحریک خلافت کے لیے جانیں دی تھیں اور جن کے لیے دیں انہوں نے خود ہی خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ ہم کیا چاہتے ہیں؟ کون سا نظام؟ ہم ابھی تک یہ فیصلہ بھی نہیں کر پائے۔ ہم راہرو کے پیچھے دو قدم دوڑ کر ٹھہر جاتے ہیں۔ پھر ایک نیا شخص وردی میں آ جاتا ہے' وہ کہتا ہے سیدھے ہو جاؤ۔ ہم تمہیں سیدھا کرنے آئے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے اگر آپ اسلام پر یقین کرتے ہیں تو مجھے پانچ سال کے لیے منتخب کر لیں۔ اب جابر حکمران بھی اسلام کا ایک رکن بن گئے۔
ان لوگوں کو اپنی سازشوں پر عمل کروانے میں کبھی دقت پیش نہیں آئی۔ ہم ہی بڑھ بڑھ کر ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ واحد بد نصیب سرزمین ہے۔ جس کا سربراہ عوام کے نہیں امریکہ کے ووٹ سے منتخب ہوتا ہے۔"
ابا سانحوں سانحوں کو لمحہ لمحہ خود پر جھیلتے رہے۔ اسی روانی سے اس کا ہاتھ کی بورڈ پر دوڑتا رہا۔ پتہ نہیں کتنا وقت گزرا اور پہلے کون تھکا۔
صحن میں شام اتر رہی تھی۔ اس نے کمپیوٹر بند کیا۔ اور ابا کے کمرے کی کھڑکی سے لگ کر چپ چاپ چچا عبدالعزیز کو لان میں جمع خشک پتوں کے ڈھیر کو آگ لگاتا دیکھتی رہی۔
خشک پتوں کے سلگنے کی دھواں دیتی خوشبو۔ اس کی محبوب خوشبو تھی۔ بہت دن سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ جھلستی گرمی نے سرسبز درختوں کو مرجھا دیا تھا۔ لوکاٹ اور جامن کے خشک ہوتے پتوں کا ڈھیر دیوار سے ٹیک لگائے ہولے ہولے جل رہا تھا۔ ایک ماچس کی تیلی کا ننھا سا شعلہ اور چڑچڑ کی آواز دیتی آگ کی لپٹیں اپنے ڈھیر کو بھسم کیے دے رہی تھیں۔ اندر ہی اندر سلگ کر۔
"ہمارے اندر ایسی کوئی آگ نہیں کیا؟" اس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر دونوں بازوؤں کی قینچی سی بنا کر آگ اور دھوئیں کی نفسیات پر خوب غور و خوض کیا۔
کریم بی کھانسی سے بے حال باہر نکلیں۔ چچا عبدالعزیز کو برا بھلا کہہ کر واپس ہو لیں۔ وہ صرف یہی جتانے آئی تھیں کہ کوڑے کی اس آگ نے ان کو کھانسی لگا دی ہے۔ چچا عبدالعزیز کو پتوں سے کھانسی نہیں آتی تھی۔ ان کے پھیپھڑے پتوں کی ہنڈیا کی شکل میں جانے کتنے مثل دھواں اندر اتار لے گئے تھے۔ شعلے بیٹھ گئے لیکن دبے ہوئے ڈھیر میں سے جگہ بنا کر گاڑھا گاڑھا سرمئی دھواں ہوا کے رخ پر بل کھاتا ابھی تک آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا۔
"چچا Polution (آلودگی)۔" عثمان نے ڈرائیو اپنی گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
"آپ کو محکمہ ماحولیات والے پکڑ کر لے جائیں گے۔"

چچا خوش دلی سے ہنس دیے۔
"آئے تھے ابھی اندر سے۔ آپ کا کیا نا' وہی مچھے والے کھانے کھاتے۔"

کبھی کبھی انسان خوامخواہ بھی ہونے لگتا ہے۔ عثمان کے ساتھ اس کے کلائنٹس تھے' وہ ان کے ساتھ اپنے آفس کی طرف چلا گیا۔ آگ ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ تھوڑی دیر کو آگ نے درجۂ حرارت میں واقعی اضافہ کر دیا تھا۔ وہ یونہی کمروں برآمدوں میں ٹہلتی پھرتی رہی۔ اماں اپنی کسی سہیلی کی بہو کی کسی تقریب میں مدعو تھیں۔ دادی اماں تخت پر' بڑی تائی طویل طویل غسل فرما رہی تھیں گویا اس کے لیے تنہا افسردہ بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

یونہی اس نے کسی کو بطور خاص آواز دیے بغیر اطلاع دی۔ وہ جا رہی ہے اور چلی گئی ایسے ہی بے سبب اداس لمحوں میں اس کو E بلاک کی یاد ستاتی تھی۔ اس کا موڈ چونکہ اچھا نہیں تھا اس لیے وہ رکشا گھر کے اندر تک لے گئی۔ پہلی نظر اس کی رضا پر پڑی۔ آنے کی طرح بجھتی شام میں وہ ہمیشہ کی طرح اپنی گاڑی کے ناز اٹھا رہا تھا۔ پلاسٹک کی ٹیوب سے دھل دھل بہتا پانی' پتہ نہیں گاڑی کا پسینہ ٹھنڈا کر رہا تھا یا صفائی۔

"ایں تم اس وقت گھر پہ؟" وہ رکشا سے چھلانگ مار کر باہر آئی۔
"اور تم اس وقت ہیلی کوپٹر میں بیٹھ کر کہاں سے آ رہی ہو۔"
"چلو پہلے رکشا کا کرایہ دو۔" اس نے رعب سے کہا۔
"کاش میں اس وقت گھر پہ نہ ہوتا۔" اس نے جیب تھپتھپائی۔
"بہت کنجوس ہوتے جا رہے ہو۔" وہ غرائی "کیا پکا ہے؟"
"کھانا۔۔۔ اس سے آگے کچھ نہیں پتا۔۔۔ پتا کرو اور مجھے بھی بتاؤ۔"
وہ اس کے ساتھ ساتھ اندر آیا۔
"چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"
"سوا بارہ۔" اس نے تصحیح کی۔ "بارہ تو اسی وقت بج گئے تھے جب اچانک میرا دل اس دنیا سے اچاٹ ہو گیا تھا اور میں نے فیصلہ کیا تھا جسے فوری طور پر E بلاک ہونا چاہیے۔"
حمیرا کھلا چمچ ہاتھ میں لیے ننگے پاؤں بھاگتی باہر آئی۔
"اچھا ہوا تم آ گئیں۔ مجھے تمہیں ایک مزے کی بات بتانی تھی۔" وہ ایسے کھلی جیسے اس کا برسوں بعد آنا ہوا ہو۔
"ضرور۔۔۔ کوئی اسکینڈل۔" رضا نے گھرکا۔
"نو جی اسکینڈل تھوڑا' بالکل سچا واقعہ ہے۔۔۔ وہ جو تھی نا مطلب ہے کہ۔"
عبیر کے دل میں ٹھنڈک اتر گئی۔ "کیسی نعمت ہوتے ہیں ایسے دوست۔۔۔ وہ جانتے ہیں کہ اس موڈی سی لڑکی کو اس وقت خوشی کی ضرورت ہے اور وہ اس کو خوش کر رہے تھے۔"
تائی نے باہر نکل کر دیکھا۔ ان کے سب بچے بشاش تھے وہ بھی خوش ہو گئیں۔
ان کی اولاد بھی ان کو تائی کہتی تھی۔
کہتے تو شاید تائی جی تھے۔ لیکن ہم سب اتنی جلدی میں رہتے ہیں کہ لفظوں کو بھی الگ الگ ادا کرنے میں
"سوری میم نہیں۔"
وہ دوپٹے کے پلو سے اپنے بھیگے ہاتھ پونچھتی باہر آئیں۔ ان کی پوروں پر ابھی تک گندھا آٹا چپکا ہوا تھا۔ وہ گھریلو اماں تھیں۔ خالص اور کھری کہانیوں کے کردار جیسی طویل بیوی کی وجہ سے ان میں ہالکوپی والا طنطنہ بھی نہیں تھا۔ اسفنج کی بھیگی چپل' چلنے میں زمین سے رگڑ کھاتی' آٹے میں سنے ہاتھ لیے جیسے اس وقت شفق شام میں گھر میں

www.pkdigest.com

بہار آ گئی۔
"تائی! میں نے دوپہر کا کھانا ابھی نہیں کھایا۔" مظلوم سا بن کر تائی سے اسپیشل توجہ ملتی تھی۔
"اور وہ جو سموسے کھائے تھے۔"
"ارے کیوں گنتی ہے لڑکی؟" تائی گھبرائیں۔ "باورچی خانے میں آ جاؤ۔ ابھی روٹیاں ڈالنے لگی ہوں۔ ساتھ ساتھ کھاتے جانا۔"
اس سے قبل کہ وہ یقین کرتیں کہ ان کے حسب حکم کوئی ان کے تعاقب میں چلا بھی ہے کہ نہیں پیر پٹختی وہ اندر جا چکی تھیں۔
ابلے چاول' ثابت مسور' لیموں میں ڈوبے پیاز' چٹنی میں رنگا سبز دھنیا۔۔۔ اور توے سے اترتی گرم روٹیاں اس کے دل کو قرار آ گیا۔ "واہ!"
رضا اندر آیا تو وہ دونوں ٹھاٹھ سے اسٹول پر چڑھی' پہلی روٹی اترنے کی منتظر تھیں۔
"ایں!" وہ چونکا۔ "یہ کون سا وقت ہے کھانے کا' سنا ہے ٹی وی کی ایجاد سے پہلے لوگ مغرب کی نماز کے ساتھ کھانا کھا لیا کرتے تھے اور یہ بھی سنا ہے وہ جو تم تھیٹر کے لیے اسکرپٹ لکھ رہی تھیں وہ ریجیکٹ ہو گیا۔"
"ہیں۔" حمیرا اچھل پڑی۔ "یہ کب کی بات ہے۔ کس نے کیا؟"
"میں نے کیا۔ ابھی ابھی۔"
"ہی ہی ہی۔ کتنے مزاحیہ ہیں اللہ آپ!" اس نے بلیک اینڈ وائٹ فلموں والا لہجہ اختیار کیا۔ اچانک اداسی کی ایک لہر ان کے درمیان گزری۔
"تھیٹر کا کچھ نہیں بنا؟" ایک نے ٹھنڈی آہ بھری۔
"نہیں نا۔" مایوسی کی ایک اور لہر تھوڑی دیر کا سکوت!
"کتنی محنت کی۔ جان توڑ مشقت سے لکھا عبیر کا اسکرپٹ۔ پاگلوں کی طرح کی ہوئی ہماری ریہرسلز۔" حمیرا نے دل گرفتگی سے کہا۔ "اور اس میں قابل اعتراض بات ہی کیا ہے طلبہ برادری قوم کے رہنماؤں کو اس تھیٹر کے ذریعے ایک پیغام ہی تو دے رہی ہے۔ پاکستان سے محبت کا پیغام۔ ان کو یہ پیغام وصول کرنا بھی گوارا نہیں؟"
"ہم کتنے مضبوط ارادوں سے نکلتے ہیں۔ کتنی خواہشیں لے کر۔" حمیرا کا چھوڑا جملہ عبیر نے آگے بڑھایا۔ "ہم اپنے ملک کے لیے یہ کریں گے۔ وہ کریں گے۔ جیسے ہم سب کچھ کر گزریں گے۔ پھر ہمارے راستے میں ایسی رکاوٹیں آ جاتی ہیں جو ہم نے کبھی سوچی بھی نہیں تھیں۔ کیوں ہم یہ تھیٹر کیوں نہیں کر سکتے؟"
"یہ زندگی ہے۔" رضا نے سہولت سے کہنا شروع کیا۔ "کوئی آپ کا کوٹ نہیں کہ درزی آپ کو ناپ کے عین مطابق سی کر دے۔ پھر ایک Trial ہو۔ فٹ نہ بیٹھے تو پھر سے کتر بیونت کر دے۔ جو ہے اور جیسا ہے۔ آپ کو اسی میں سمانا ہے۔"
"کیا یہ مسئلہ جبر و قدر ہے؟" عبیر کو ہمیشہ سے سوال کرنے کی عادت تھی۔
"پتہ نہیں۔" رضا نے رکا رکا سا سانس لیا۔
"میرا تصوف پر مطالعہ ابھی خام ہے۔ جس دن اس قابل ہو گیا اس سوال کا جواب ضرور دوں گا۔ فی الحال میں زندگی سے تعلقات اچھے رکھنے کا درس دے رہا ہوں۔"
تائی نے ایک نظر دیکھا۔ ان تینوں کے چہروں کی تابناکی ماند پڑ گئی تھی۔ پتہ نہیں وہ زندگی سے کیا مانگ رہے

تھے ایسی کیا چیز ہے جوان کو ملی نہیں؟

"یاد ہے جب ہم لوگ چھوٹے چھوٹے تھے۔ F.80 کے برآمدے میں ہم ورائٹی شو کیا کرتے تھے۔ برآمدہ ہمارا اسٹیج۔ تین سیڑھی نیچے جو Drive تھی وہ ہمارا پنڈال تھا۔ پورا D.P.S شو دیکھنے آتا تھا۔ پانچ روپیہ adult کا ٹکٹ اور بچوں کا ہاف۔ ہم چونکہ پانچویں میں پڑھتے تھے اسی لیے ہم adult تھے۔ بچوں سے ہماری مراد تھی کلاس تھری یا فور کے بچے۔

ایک ستون سے دوسرے ستون تک پلاسٹک کی رسی باندھ کر گھر کی چادریں لٹکا دیتے تھے۔ تنویر کو میک اپ کے سامان کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن شو والے دن کیونکہ اس کا ڈرامے میں نہایت اہم رول ہوتا تھا اسے سب معاف تھا۔ اس دن وہ مندریا کی طرح گھاگھرا پہن کر اور جو نام جھام ہاتھ لگتا کانوں گلے میں لٹکا کر ریڈ لپ اسٹک کے ساتھ جس کا ایک coat گالوں پر بھی پھیرا جاتا تھا' خود کو مدھوبالا سمجھتے اسٹیج پر آتی۔ عیبو بلوروی آنکھوں سے عین نیچے پہلی قطار میں بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی بہن کو جو اس حلیے میں دیکھا۔ ایک بھیانک چیخ ماری اور اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ ڈرامہ میں اتنی دیر کے لیے وقفہ اشتہارات آگیا۔"

"آپ لوگ تو جو کرتے تھے' سو کرتے تھے۔ میں سوچتی ہوں۔ بچے لوگ آخر پیسے خرچ کرکے کیا دیکھنے آتے تھے۔"

"ارے بھئی اس قدر آمدنی ہوتی تھی ہماری۔ اور عثمان صاحب ایسی Cash Book maintain کرتے تھے کہ بے شک Audit کروالو۔

پھر اس آمدنی سے ہم Emd Blytow اور Dhal کی کتابیں خرید کر اسی ایف کی لائبریری میں گراں قدر اضافہ کرتے۔ آج جو تم لوگ اتنی فضل فاضل ہو' اس کی وجہ ہماری فنڈ Raising ہی تھی۔"

"بھائی بس طے پایا کہ تم بوڑھے ہو چکے ہو۔ بزرگ فرما گئے ہیں جب انسان بیٹھے بیٹھے ماضی میں کھو جائے تو سمجھ لو وہ اپنا بہترین وقت گزار چکا ہے۔"

"اور یہ بھی طے پایا۔" عیبو نے گرہ لگائی "اگر ہمارے پاس پلاسٹک کی ڈوری اور گھر کی چادریں نہیں ہیں تو ہم اسٹیج پہ کچھ نہیں کر سکتے۔"

تایا نے کوہان نما توے سے گیند ایسی گول گپا روٹی عیبو کی پلیٹ میں ڈالتے ایک ایک کا منہ دیکھا۔ پھر اور ہوا۔ اب سب ہنس رہے تھے۔

بات ساری کی ساری تو انہیں کبھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان کے پلے کمپیوٹر کا ایک لفظ نہیں پڑتا تھا اور کہا جاتا تھا آج کل کی نسل کمپیوٹر کی نسل ہے' لہٰذا انہوں نے اپنے بچوں کو سمجھنے کا ارادہ چھوڑ کر صرف محبت کرنا شروع کر دی تھی۔

"ہے نا میرے پاس پلاسٹک کی تھیلی۔ پندرہ بیس گز کی ہوگی۔ کام چل جائے گا؟"

"چادریں جتنی کہو اتنی دے دوں۔۔۔ اور دال کیوں نہیں ڈالتیں۔ سوکھی پلیٹ پہ روٹی کیوں رگڑے جا رہی ہو؟"

سو عیبو نے نرے میں نمک رکھتے فیصلہ کیا۔ "سوچنا سمجھنا ہی آخر کیوں ضروری ہے۔ بس کر گزرنا چاہیے۔"

چائے دانی میں ابلتا پانی ڈال کر اس نے پلٹ کر ایک نظر حمیرا کی طرف دیکھا۔

"آج ابا اپنی کتاب کا جواب لکھوا رہے تھے' اس میں کچھ باتیں بڑی ہولناک تھیں۔ ہم پتا نہیں کب سے ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں ہمیں کوئی حق حاصل نہیں۔ ہم کٹھ پتلیوں کی طرح بس الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں ہلا رہے ہیں۔ ہماری جگہ بولتا بھی کوئی اور ہے' ہمیں ہلاتا بھی کوئی اور ہے تو اچانک میرے اندر انتشار بڑھ گیا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" حمیرا نے کیبنٹ میں مختلف ڈبوں میں محویت سے جھانکتے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن کیا تمہیں نہیں پتا تھا کہ ہمیں ہلاتا کوئی اور ہے۔"

"کیا کبھی ایسا ہوگا کہ وہ نہ ہو جو اب تک ہوتا آیا ہے۔" عیبو اپنے آپ میں گم تھی۔

"کیا معلوم ہو ہی جائے۔" اس نے ایک پلیٹ میں بسکٹ ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا۔ "ایسی کون سی مایوسی کی بات ہے اور کون جانے کبھی نہ ہو۔" حمیرا کے پاس ہر طرح کی گنجائش ہوتی تھی۔

"اس کا مطلب وہ لوگ جو ہمارے سسٹم کے خلاف بک بک کرتے رہتے ہیں وہ غلط نہیں؟"

عیبو اور عیبو کے سوالات!

"یہ تو فیصلہ وقت ہی کرے گا۔ ہم کسی کو غلط درست کہنے والے کون۔" وہ ٹرے اٹھا کر تیزی میں اندر کی طرف چلی۔

"سنو حمیرا!" عیبو نے اسے لپک کر آواز دی۔ "کیا تم اندر سے بھی اس قدر مطمئن ہو؟"

حمیرا نے لمحہ بھر رک کر اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔"

تایا کی لمبی اور پتلی سی چوٹی جو کمر تک پہنچتے پہنچتے اور باریک ہوتے ایک بال کی شکل کی رہ جاتی تھی' جوڑا بنانے کے لیے ان کے ہاتھ چابک دستی سے بالوں کے چھلوں میں الجھتے نکلتے' آزاد ہوتے تو ان کی گدی کے عین اوپر ایک ننھا سا بل کھاتا جوڑا وجود میں آتا۔ یہ جوڑا اصل میں ان کے تکیے کا کام دیتا تھا۔ بالوں کی اینڈوی پر وہ بھری دوپہروں میں فرش پر لیٹ کر نیند لیتیں۔ ان کا تعلق طبقہ امراء سے ہوتا تو قیلولہ فرماتیں۔

رضا اللہ ہاتھ میں لیے گلاس میں دانے چھنکاتا اندر آیا۔ اس قدر غیر دلچسپ اور بور کھیل پر وہ جھپٹ کر رہیں۔ تایا بھی کھیلی گوٹیوں کے کنارے آبیٹھیں۔ کھیلا رنگ ان کا کالی رنگ تھا مگر لگ کیا کرتی' جب کھیل ہی ضیا بے ایمان کے ساتھ ہو جس کے چھ آئے بغیر گوٹ باہر آجاتی۔ دشمن کی پکی پکائی گوٹ ایک انگلی کی حرکت سے ابتداء میں آکھڑی ہوتی۔ اپنی گوٹ ہمیشہ اسٹار پر بیٹھی ہوتی۔ کھیل میں بے ایمانی کا اپنا نشہ ہوتا ہے۔

٭ ٭ ٭

وہ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے تیز ہوا سے کوڑا بکھر جاتا ہے۔ آرگنائزیشن سے جو خبر آئی تھی اس نے ان سب کو مزید دکھی کر دیا تھا۔ جب ہم ایک عزم لے کر نکلتے ہیں تو کامیابی کی بابت زیادہ سوچتے ہیں۔ ناکامیوں کو سوچیں تو شاید ہمارے کام رک جائیں۔ لیکن جب ناکامی' ناگہانی کی طرح اچانک آکر راستہ روک لیتی ہے تو آپ اور آپ کے ہوائی قلعے اڑادھم نیچے آگرتے ہیں۔

مایوسی نے اس بری طرح لپیٹ لیا تھا کہ سابقہ دو ڈھائی ماہ کی محنت بھی ضائع ہوتی دکھتی تھی۔ عیبو کا خوب صورت اسکرپٹ۔ اداکاروں کے روپ میں کیمپس اور آرگنائزیشن کے پرجوش ورکر۔ ساری اسٹیج ریہرسلز کے بعد نکا سا جواب مل گیا تھا۔ کوئی ٹوٹا پھوٹا اسپانسر بھی ان کا پروگرام اٹھانے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ دن رات کی بھاگ دوڑ اور ہر طرف سے مایوسی کے بعد وہ تھک کر چور ہو چکے تھے۔ جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ آنے جانے والوں کو ان کے اس طرح بکھر کر بیٹھنے سے وقت ہو رہی تھی۔ وہ خود کو اور ان کو بچاتے سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں اتر رہے تھے۔

وہ ۔۔۔

سیڈ آئل بنانے والی فرم کے اپنے تحفظات تھے' انہوں نے اسپانسر کرنے سے معذرت کی تھی۔ موبائل سروس والوں نے روکھا سا جواب دیا تھا' اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ہم اسپانسر نہیں کرتے۔ ہاں اگر کسی میوزک گروپ کو بلاؤ۔ فلاں پاپ سنگر۔ تو وہ راضی تھے لیکن اس نئے زمانے میں آغا حشر کون دیکھتا ہے۔

دودھ کی ملٹی نیشنل کمپنی نے کہا تھا انہیں منظور ہے۔ لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔ پروگرام دبئی میں ہو اور انڈیا سے کسی ایکٹر کو بطور مہمان خصوصی بلاؤ۔

تاریخی علامتی تھیٹر!

جیسے کوئی پھن پھیلایا ناگ تھا۔

کمیٹی سمجھا سمجھا کر تھک گئی کہ تھیٹر کا مطلب آغا حشر نہیں ہوتا۔ تھیٹر کا مطلب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جانا بھی نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ سانولی سترا انڈین ایکٹرز اسٹیج پر دھما چوکڑی مچا رہیں۔

وہ پہلو بچاتے پھرے۔

یہ نوجوان نسل ہے۔ منہ پھٹ' بے راہ رو گستاخ۔

آخر ہم دنیا بھر کی ایڈ پر چلتے ہیں۔ ہماری ایک معاشی پالیسی ہے۔ کیا جانے علامت کی شکل میں ہمارے خلاف کیا پیغام آئے۔ انہوں نے ایک نظر اسکرپٹ دیکھا تھا۔ ان کو ذرا تند و تیز لگا۔ اسکرپٹ رائٹر اپنے سب ساتھیوں سمیت اس کو گلیمر کا رنگ دینے پر تیار نہیں تھے۔

مصلحتیں' مصلحتیں۔

ہم اپنے وطن میں بھی سسرال کی طرح رہتے ہیں۔ کوئی کچھ کہہ نہ دے۔ کوئی خفا نہ ہو جائے' کسی کو برا نہ لگ جائے۔ غیر ملکی مفادات ان کی اولین ترجیح تھی۔ ملک کا مفاد کس چیز میں ہے۔ ان کو اس بات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ کمپنی کے P.R.O نے بڑے تحمل سے سمجھایا تھا۔ سفید فام ملکوں سے اس ادارے کو امداد ملتی ہے۔ اور ادارہ اپنا مانگا ہوا پیسہ اس Stage Show پر لگائے جو در اصل اس سفید فام ملک کے خلاف ایک پیغام ہے۔ یہ ہو سکتا ہے؟ ناممکن۔۔۔!

سو دن مایوسی کا تھا اور ان کے ہاتھ بندھے تھے۔

سر فیصل اپنا لیپ ٹاپ اور اپنا پاپ اٹھائے آفس سے نکل کر لیکچر روم کی طرف چلے' آفس سے نکلتے ہی انہوں نے دیکھ لیا تھا ان کے شاگردانِ رشید لیکچر روم میں ان کا انتظار کرنے کے بجائے ٹوٹے خشک پتوں کی طرح بکھرے' بے جان پڑے تھے۔

انہوں نے لمحہ بھر کے لیے درگزر کرنا چاہا۔ جب طالب علم کلاس بنک کرنے کے موڈ میں ہوں تو ان کو موقع دینا چاہیے۔ شرارت پر ان کا حق ہے آخر۔۔۔ اور ان کو پڑھانے کے لیے چلے جانا چاہیے' جو اچھے بچوں کی طرح کلاس روم میں حاضری لگواتے اور نہایت تابعداری سے لیکچر سننے کے موڈ میں ہوتے ہیں۔

ایک اچٹتی سی نگاہ سے انہوں نے دیکھا۔ بنک کرنے والے کسی شرارتی موڈ میں نہیں تھے۔ وہ سب کے سب چوٹ کھائے لگتے تھے۔

ان لوگوں کے بغیر کلاس لینا بھی محض خانہ پری تھا۔ جاوید کی نوک جھونک' قیصر کی کج بحثی۔ حمیرا کی میں نہ مانوں۔ منہ پھٹ زاہد کے منہ سے نکلا کوئی تیر۔ جو اس کے روکتے روکتے بھی پھسل جاتا۔ ایک موہوم سی مسکراہٹ لیے بڑی متانت سے جملے کاٹتی عبیرہ۔

کلیسا مجھے کھینچے ہے کعبہ مجھے روکے ہے۔

www.pkdigest.com

سرفیصل کو آتا دیکھ کر انہوں نے کھسک کر اپنے درمیان ان کے لیے جگہ بنائی۔ وہ چونکہ استاد تھے اسی لیے اولین سیڑھی بطور احترام ان کو پیش کی گئی۔ ایک خوشگوار مسکراہٹ سے ان کا خیر مقدم کیا گیا اور جواباً ایک ایسی ہی مسکراہٹ وصول کی گئی۔

"سوری سر جی!" اعجاز نے معذرت کا آغاز کیا۔ "کلاس میں ہم جانا تو چاہتے تھے۔ لیکن ہمارے درمیان بحث چھڑ گئی۔"

"سر جی!" اس نے دکھ بھری سنجیدگی سے کہا۔

"کیا آپ کے ساتھ ایسا ہوا ہے کہ حالات نے آپ کو مایوس کر دیا ہو؟"

"جی۔!"

"ہمم۔" سر نے "ہم" کو دیر تک اپنے ہونٹوں میں بھینچے رکھا۔

"سو آپ یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے حالات ٹھیک کر رہے تھے؟"

"ہم کوشش کر رہے تھے۔" جاوید نے فقرے کو درست انداز میں سامنے رکھا "مگر ہاتھ بندھے ہیں۔"

سرفیصل نے پائپ نکالا۔ ڈبی کھول کر تمباکو بھرا۔ companion سے پریس کر کے ماچس کی تیلی دکھاتے، دو تین زور زور سے پھونکیں ماریں۔ ایک ڈرامائی سے وقفے کے بعد انہوں نے ایک نظر سلیک پر ڈالی۔

"ہمارا مسئلہ پتا ہے کیا ہے؟ ہم سوچتے کچھ ہیں۔ کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ اور ہیں۔ لوگوں سے کسی اور چیز کی توقع کرتے ہیں۔ ہم ٹھیک سے یہ بھی نہیں جانتے کہ دراصل ہمارا مسئلہ ہے کیا۔ صرف غلطی کی نشان دہی کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اس غلطی کی ذمے داری سے مبرا ہو گئے ہیں۔ ہم حالات بدلنے کے لیے بھی ان کی طرف دیکھتے ہیں جنہوں نے آپ سے زیادہ محنت کر کے حالات کو یہاں تک پہنچایا۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہے۔

"اگر آپ نو دس لوگ ۔۔۔ یا آپ جیسے چلو نو سو لوگ یہ سوچ کر نکلتے ہیں کہ یہ نظام غلط ہے۔ اس کو بدلنا چاہیے۔ پہلے آپ کو وہ سوچ بدلنی پڑے گی جو سب غلط ہوتا دیکھتی ہے اور برداشت کرتی ہے۔ جن سیڑھیوں پر آپ بیٹھے ہیں دنیا میں اس کا کیا حصہ ہے۔ ذرا google Earth پر دیکھیے۔ یہ سیڑھیاں ایک نقطے سے بھی حقیر ہیں۔ آپ نظام بدلنا چاہتے ہیں وہ بھی کس خواہش پر کہ جس نظام کو آپ اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ سو ہی آپ کی مدد کو آئے کہ آؤ بھائیو مجھے مل کر اکھاڑ پھینکو۔"

کچھ دیر کو جیسے انہوں نے ماضی میں جھانکا۔

"میں سمجھتا ہوں اتنا بھی بہت ہے کہ آپ سوچتے ہیں اور اس نسل کے جذباتی نمائندے ہیں، جہاں جذباتی ہونا گالی ہے۔ مجھے جذباتی لوگ اچھے لگتے ہیں شاید اس لیے کہ ہماری ساری نسل جذباتی تھی۔ آپ اپنے حصے کی اینٹ لگائیے۔ اگلی نسل اگلی اینٹ لگائے گی۔ جب یہ عمارت مکمل ہو گی تو ہم آپ نہیں ہوں گے، لیکن عمارت ضرور ہو گی۔ صرف یہ یاد رکھیے یہ مایوسی آپ کو اپنے حصے کی اینٹ لگانے سے روک نہ دے۔"

"ڈر لگتا ہے سر! لوگ ہمیں روک دیں گے۔" قیصر نے بے بسی سے کہا۔

"خوف زدہ آدمی دو میں سے ایک کام کر سکتا ہے یا خوف سے مر جاتا ہے یا اپنے خوف کو مار ڈالتا ہے آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

وہ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ کے سہارے سے اٹھتے بولے "کلاس میں آئیے۔"

☼ ☼ ☼

اسٹیج پر لٹکے گاڑھے عنابی پردوں کے پیچھے سے روشنیاں چھن چھن کر پردے کو چمک دار بنا رہی تھیں۔ کسی بھی لمحے یہ پردہ دائیں بائیں طرف سرک کر کونے میں سمٹ جائے گا۔ سارا کھیل بس پردہ اٹھنے سے پہلے تک کا ہی ہوتا ہے۔

مہینوں سے اس ڈرامے کی تیاری ہو رہی تھی۔ ہال میں، کھلے آسمان تلے۔ گھاس پر اس کی ریہرسلز کہاں کہاں نہیں کی گئی تھیں۔

میوزک گروپ۔ کاسٹیوم، ڈیکور، کس کس مسئلے پہ کیسی کیسی دھواں دھار بحث نہیں ہوئی تھی۔ اور اب بس پردے کا سرکنا باقی تھا۔ آرکسٹرا پردہ نمبر 2 کے پیچھے چھپا بیٹھا تھا، کبھی کبھی کسی تار کو ٹیون کرنے کی ایک جھنجھناتی سی آواز باہر آتی پھر ادھر خاموش ہو جاتی۔

لوگ ٹولیوں کی شکل میں مجمع میں رل مل کے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ ان کو اپنی نشست سنبھالنے کی کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ تھیٹر شروع ہو گا تو بیٹھ جائیں گے کیونکہ وافر نشستیں ابھی خالی تھیں۔

ابھی چند دن پہلے تو وہ جیسے ناامیدی اور مایوسی کے نرغے میں آ گئے تھے۔ کچھ لوگ پتوار چھوڑ کر لہروں کے ساتھ بہنے پر آمادہ تھے، کچھ ابھی ہاتھ پاؤں مارتے تھے کہ آسانی سے ڈوبنا منظور نہیں تھا۔ پھر ان کو اچانک 3 عدد اسپانسرز مل گئے۔ ڈریس ڈیزائن کرنے کے لیے ایم ایم عالم روڈ والی بوتیک شاپ علیحدہ اسپانسر کر رہی تھی۔

عبیر کا لکھا ہوا اسکرپٹ شاہ حسین کے ہاتھ میں تھا وہ Prompter تھی لہٰذا تخت شاہی کے پیچھے آلتی پالتی مارے ٹھاٹھ سے براجمان تھی کوئی اپنی لائن بھولنے لگا تو اس کو بیچ میں لقمہ دینا تھا Prompter کا اصل کام سلیمانی ٹوپی پہن کر اسٹیج پر آنا ہے کہ موجود ہو پر نظر نہ آئے۔

عبیر اپنے گروپ کے ساتھ مطمئن تھی۔ اس نے کبھی خود کو اتنا خود مختار محسوس نہیں کیا تھا کہ پیچھے [illegible] آزاد ہو گئے۔

www.pkdigest.com

ثریا اسٹیج پر چڑھی فنکاروں کو مختلف اینگل بتا رہی تھی۔ جس رخ وہ ناظرین سے بھی منہ نہ موڑ لیں اور یہ بھی نہ ہو کہ بالکل ہی آڈینس سے سلام علیک شروع ہو جائے۔

"چہرے کا رخ 45 ڈگری، لائٹ کا شیڈ، بازو کا جھکاؤ۔ کوئی بات نہیں بابا۔ لوگ جانتے ہیں تم پروفیشنل نہیں، طالب علم ہو۔ چیزیں پرفیکٹ نہیں ہو سکتیں۔ پرفیکشن کے قریب ہوتی ہیں۔"

رضا اور عثمان ہجوم میں شامل کسی بحث کا حصہ تھے۔ آج کل لوگ معاملات پر اپنی رائے ضرور دیتے ہیں۔ مختلف گروپ، مختلف مباحث اور لفظوں کی کوئی کمی نہیں۔

عمیرا چونکہ کاسٹیوم میں تھی۔ اس لیے وہ عبیر کی طرح ادھر سے ادھر دندناتی نہیں پھر سکتی تھی۔ اس نے سائیڈ سے جھانکا۔ رضا اور عثمان، عبیر کے ساتھ دائرے کی شکل میں بہت سے لوگوں میں گھرے کسی موضوع پر بہت سنجیدہ بات کر رہے تھے۔ اس کی تسلی ہو گئی وہ کہیں گئے نہیں یہیں تھے اس چھت کے نیچے۔ وہ اسکرپٹ پر سر جھکا کر پانی کی طرح ازبر اسکرپٹ پھر سے یاد کرنے لگی۔

اپنی اپنی نشستیں سنبھال لینے کی آواز مائیک پر گونجی اور ہال میں ہلچل۔ عبیر میکانکی انداز میں پلٹ کر اسٹیج کی طرف آ گئی۔ سائیڈ روم میں ایک اونچے اسٹول پر پاؤں لٹکائے وہ اپنی کاسٹ کو عوام کے روبرو ہوتے دیکھنے کی منتظر رہی۔ اناؤنسمنٹ ہو جانے اور پردہ اٹھنے کے دوران کا طویل وقفہ اس کو ہول کھلاتا رہا۔

اس نے پاؤڈر روم سے جھانکا۔ ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ وہ تمام لوگ بھی جو برآمدوں اور سبزہ زاروں پر ٹہل رہے تھے اعلان سن کر اندر آ گئے۔

ایک طویل ناامیدی کے دورے سے گزر کر یہ ہو بھی سکے گا یا نہیں۔

پھر یہ کہ اچھا! اگر ہو گیا۔ پھر؟
پھر کوئی دیکھنے بھی آئے گا یا نہیں؟
کسی سنجیدہ سوچ، کسی اور یجنل تخیل کی قوم عادی نہیں تھی۔ ہلا گلا ہو۔ شور شرابہ۔ دھوم دھڑکا۔ یہاں ایسا نہیں تھا تو کیا ہو گا اگر کوئی دیکھنے ہی نہ آیا۔

اور اب جب ایک ہجوم اسے دیکھنے آگیا تھا تو کیا اس قابل بھی ہو گا کہ دیکھا جائے۔

انڈوں، ٹماٹروں کے بارے میں اس نے مزاحیہ کتابوں اور مسخرے شوز میں سنا تھا۔ کوئی ذاتی تجربہ نہیں تھا۔ پتہ نہیں وہ کس پر پھینکے جاتے ہیں؟ اس کی آرگنائزیشن نے غالباً "اس پر غلط طور پر اعتماد کر کے اتنا بڑا ڈرامہ لکھنے کو دے دیا تھا۔ وہ کون سی نامور قلم کار تھی۔ یونہی چھوٹے موٹے ٹی وی اسکرپٹس یا آن لائن ادبی ویب Sites پر لکھنے کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں تھا کہ اس کو اتنا بڑا اسکرپٹ تھما دیا جائے (وہ انڈے ٹماٹروں سے مار کھانے سے گھبرا رہی تھی۔) یہ بھی نہیں پتا ڈرامہ لکھنے کی ڈیوٹی کس نے لگائی تھی۔ وہ بہت سوں کو تو پہچانتی بھی نہیں تھی۔ اس کو ہمیشہ کیمرے کے پیچھے رہ کر کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ تیز روشنیاں اس کا احاطہ کریں تو وہ چندھیا جاتی تھی۔

یہ تیسری دفعہ تھی کہ اس نے سائیڈ روم سے تھیٹر کی طرف نظر کی۔ ڈرامہ مشکل تھا مگر مبہم نہیں۔ معنی خیز فقرہ سازی میں اس کے استاد شعیب ہاشمی اور انور مقصود تھے۔ وہ ان کے فقروں کی ساخت اور اس کی تہہ میں چھپے معنی در معنی پر وہ دم بخود ہو جاتی۔

کہانی ایک قدیم داستان پر مشتمل تھی۔ جو بھی کل صبح شہر میں سب سے پہلے داخل ہو گا اس کو حکمران بنا دیا جائے گا۔

قیصر ایک سیدھا راستہ بھٹک کر ادھر آنکلا تھا۔ بغیر ویزہ اندر داخل ہونے پر اس کو گرفتار کرنے کے بجائے امور سلطنت تھما دیے گئے۔ بادشاہ وقت نے اس کو وزیر اعظم بنا دیا تھا۔

اس کے بعد سازشوں، منافقوں، دشمنوں کے ساتھ سازباز اور جھوٹ کا ایک طویل عہد تھا۔ اس نے ایک نظر ہجوم کی طرف دیکھا کیا اس کا پیغام Decode ہو رہا تھا۔

"پتہ نہیں۔ تمیرا کے بقول۔

یا شاید ہو رہا تھا۔ لوگ سنجیدہ تھے یا زیر لب مسکراتے تھے لیکن بور نہیں ہو رہے تھے۔ اس نے پہلی قطار میں بیٹھے وائس چانسلر، ٹیچرز، نامور اور مقبول دانش وروں کے عقب میں دوسری تیسری قطار میں نظر کی تو یکدم چونک گئی۔ شہریار کا مسکراتا چہرہ یہاں سے بھی روشن دکھائی دیتا تھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ پورے انہماک سے ایک ایک لائن سن رہا تھا۔ اس کی خاطر اتنی دور دراز سے سفر کر کے یہاں تک آنا۔ اس کو سرشار کر گیا۔ اچانک اس نے سنا اپنے عقب میں کھسر پھسر محسوس کی، رحیم کل کسی کو کہہ رہا تھا۔

"وہ تیسری لائن میں۔ لیفٹ کی طرف چوتھا، محتاط رہنا۔" اس کی آواز میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔ شہریار اپنی چھوٹی حجامت میں سب سے الگ نظر آ رہا تھا لمحہ بھر کو اس کو خوف محسوس ہوا کہیں اس کو غلط نہ سمجھ لیا جائے چھوٹی حجامت والوں اور لمبے بالوں میں بہت فاصلے آ گئے تھے۔

آخری منظر بتدریج بجھتی اور کم ہوتی روشنیوں میں سیاح اپنے ٹانڈے بھانڈے سمیت کر چپت ہوا۔ اہل شہر منتظر تھے اب جو کل صبح سب سے پہلے

پردہ عوام اور فنکاروں کے درمیان ہموار ہوا۔

ناظرین کی طرف سے گونجتی تالیوں کی آواز پر اس نے کئی مرتبہ سوچا واقعی اچھا تھا یا لوگ بامروت ہیں۔

عبیو اور آرٹسٹ دوستوں کو ان کے واقفین نے گھیر لیا تھا۔ پوری ٹیم تھینک یو تھینک یو کی گردان کرتے

چمک رہی تھی انہوں نے نظروں میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ الحمد اللہ سب بخیر ہوا۔

تب لوگوں نے دیکھا۔ وہ تیسری لائن میں، جس چوتھے شخص سے محتاط رہنے کو کہا گیا تھا، وہ قدم بڑھاتا ان ہی کی طرف آ رہا تھا۔

اسٹیج کی سائیڈ پر اترتی سیڑھیوں پہ کھڑے اعجاز نے پلٹ کر دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں بات کروں گا اور کوئی نہیں بولے گا۔ یاد رکھنا، یہ اسکرپٹ میں نے لکھا ہے۔"

عبیو نے بڑی حیرت سے اعجاز کی طرف دیکھا "ہیں؟"

وہ اس طرح کریڈٹ لینے کا شوقین تو نہیں تھا۔ پھر کیوں۔

"مبارک ہو۔ یہ ساری تالیاں تمہارے لیے تھیں۔" وہ عبیو کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"نہیں سب کے لیے۔" وہ خوشی سے تمتمائی۔

پھر وہ اپنی ٹیم کی طرف پلٹی۔ "میرا کزن شہریار۔"

کزن تو بس خالہ زاد، پھوپی زاد ہوتے ہیں۔ تعارف میں کسی عہدے کی پخ لگانا اس کو کچھ مناسب نہیں لگا۔

کتنی دیر پہلے کا سونگھا سانپ جیسے بل میں پلٹ گیا۔ ایک قہقہہ جس کا فوری مطلب کم از کم شہریار کے پلے نہیں پڑا۔

"حد ہو گئی لاحول ولا۔ ہم سمجھے سی آئی ڈی نے حملہ کر دیا۔"

"ہم لوگ کچھ زیادہ ہی وہمی ہوتے جا رہے ہیں۔" شہریار اخلاقیات نبھا رہا تھا۔

"یہ تو آپ سے سب ہی کہیں گے کہ بہت اچھا تھا۔ لیکن اس طرح حق ادا نہیں ہو گا۔ عموماً "لوگ تعریف کرتے گفتگو میں ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ میرا مسئلہ اور ہے میرے پاس لفظ کم پڑ گئے ہیں میں سیدھا سادا آدمی آپ کی طرح [illegible] قلم کار تو نہیں بس اتفاق [illegible] قابل یقین۔"

پھر پلٹ کر عثمان اور رضا کی طرف چلا گیا۔ وہ بشاشت سے اس کی طرف لپکے۔

"ہاؤ ڈی ڈوک۔ ابھی میں رضا سے کہہ رہا تھا، پتہ نہیں شہریار پہنچتا ہے یا نہیں۔"

پھر ڈوک نے کچھ دیر تمیرا کے کاسٹیوم اور اس کی ڈائیلاگ ڈیلیوری کو سراہا۔ کچھ دیر خالی ہوتی کرسیوں پر بیٹھ کر انہوں نے ضروری و غیر ضروری سوالات اور جوابات کا تبادلہ کیا۔ ادھر ادھر کے بزرگوں کی صحت کی بابت دریافت کر کے وہ ہاتھ جھاڑ تا کھڑا ہو گیا۔

"اب چل دوں۔" اس نے جیسے خود سے فیصلہ کیا۔

"ٹھہرو گے نہیں آج رات۔"

"مشکل ہے۔ اب چلا تو کہیں صبح تک پہنچوں گا۔ عبیو کہاں ہے۔ اس کو خدا حافظ کہہ لوں۔"

"تم نے دیکھا ڈوک۔ کس قدر کمال نکلیں یہ لڑکیاں۔" رضا نے ہنستے ہوئے کہا "اور اب ذرا عبیو کی شکل غور سے دیکھنا۔ بچوں کی طرح منہ پر ہاتھ رکھ کر اور آنکھیں میچ کر ہنستے ہنستے پاگل ہوتی یہ لڑکی کہیں سے ڈرامہ نگار لگتی ہے اور وہ جو آج کی اسٹار ہیں تمیرا بی بی۔ شہزادی کے کاسٹیوم میں فرش پر چوکڑی مارے اپنی تھیٹر کمپنی کے ساتھ گپ لگا رہی تھیں۔"

اس کے لہجے میں بڑے بھائیوں والا غرور تھا۔

شہریار نے دور اسٹیج پر کسی کام میں مگن عبیو کی طرف دیکھا۔ کامیابی یا غیر متوقع کامیابی سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"او کے عبیو!" اپنے گروپ کے ساتھ جلدی جلدی سامان سمیٹتی عبیو نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا "میں

www.pkdigest.com

چلوں۔"

"مجھے تو امید بھی نہیں تھی تم آجاؤ گے۔ ابھی جب پرسوں تم سے بات ہوئی۔"

چھوٹے سے بیگ میں وہ گاؤن کی تہہ جما کر ٹھونستے ہوئے معصومیت سے بولی۔

اچانک وہ کام روک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ صرف اس کی خاطر میلوں کا سفر کر کے پہنچا تھا۔

"چلو ڈوک۔ تمہاری جیپ تک تو چھوڑ آؤں۔ تم نے کھانا وانا بھی کھایا؟"

وہ ہمیشہ کی طرح دھیان کرتی فکر مند ہوتی کتنا سکون دیتی تھی۔

باہر رات بھیگ رہی تھی۔ فضا میں اوس کی نمی نے جیسے ماحول کو نم آلود کر رکھا تھا۔ وہ جیپ کے رخ جانے کے بجائے 'کوریڈور سے سبزہ زاروں میں اترنے والی سیڑھی پر بیٹھ گیا' وہ بھی چپ چاپ اس کے ساتھ بیٹھ رہی۔ اندر کی مصنوعی ٹھنڈ سے ایک دم باہر آکر فضا میں زیادہ گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

"میں سن رہا تھا لوگ تم سے کہہ رہے تھے کہ یقین نہیں آتا یہ تم نے لکھا ہے۔ لیکن میں اس کا ایک ایک جملہ سن رہا تھا۔ مجھے تو ہر فقرے میں تم بولتی نظر آرہی تھیں' میں ان دو چار جملوں کو بھی اس سے علیحدہ کر سکتا ہوں جو تم نے نہیں لکھے۔"

اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ واقعی دو چار جملے اس کے نہیں بھی تھے۔

وہ کتنی دیر سر نیچے کیے جیسے اپنے آپ میں گم رہا۔ پھر جیسے اچانک کسی حتمی نتیجے پر پہنچ گیا۔

"میں تمہاری جدوجہد دیکھ کر سوچ رہا تھا' یہاں کوئی انقلاب آبھی سکتا ہے یا نہیں۔ لوگ برسوں سے اسی طرح جی رہے ہیں' بڑی قربانیاں دے کر ایک گول حاصل کرتے ہیں۔ پھر ایک لیڈر آتا ہے اپنی قیمت لگاتا ہے۔ بڑی ڈھٹائی سے قوم کی قبر پہ قوالی کرتا ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں اور جانتے ہیں جو حکمران ہیں ان کی اور عوام کی ہمیشہ ہر موضوع پر دو الگ الگ رائے ہوتی ہے۔ پھر ایک طویل خاموشی ایک اور لیڈر ایک اور حکمران struggle دراصل ہم لوگ معاشی طور پر محروم ہیں۔ اسی لیے ناانصافی پر صبر کرتے ہیں۔"

عبیر نے اس کی طرف دیکھا۔ معلوم نہیں وہ اتنا سنجیدہ کیوں تھا۔ عام حالت میں وہ بڑا خوش مزاج اور قصہ گو مشہور تھا۔

"جانتی ہو جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اور جیسا کہ میرے تمہارے بزرگوں کو علم ہے کہ میں بہت لائق شاگرد نہیں تھا۔ ہاں دوڑ میں مجھ سے کوئی نہیں جیت سکتا تھا۔ ہمارے اسکول میں ہمارے ہیڈ ماسٹر کا بیٹا بھی پڑھتا تھا۔ اب یہ میری بدنصیبی کہ وہ ہمیشہ نمبر 2 آتا۔ ایک مرتبہ انٹر سکولز ایتھلیٹکس ہو رہے تھے۔ انسپکٹر آف اسکولز بھی آئے ہوئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر نے پی ٹی ماسٹر کے کان میں کچھ کہا۔ اس وقت ہمیں سیدھی قطاروں میں کھڑا کیا جا رہا تھا۔ مجھے قطار میں Extreme رائٹ کھڑا کیا گیا۔ پی ٹی سر ہونٹوں میں ریلوے گارڈ والی سیٹی دبائے قطار کی طرف آئے۔ انہیں چونکہ یہ دیکھنا تھا کہ سب کا پاؤں لائن پر ہے یا کوئی فاؤل کھیل رہا ہے۔

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا۔ سیٹی بجائی اور بچوں کے بھاگ جانے کے چند سیکنڈ بعد میرا ہاتھ چھوڑا۔ میں جان توڑ بھاگا۔ لیکن فرسٹ ماسٹر صاحب کا بچہ ہی آیا وہ کڑی اسٹینڈ پر فاتح کے روپ میں کھڑا تھا۔ تالیاں پٹ رہی تھیں۔ واہ واہ ہو رہی تھی۔ اس کو کندھوں پر اٹھایا گیا۔ اچانک پی ٹی سر اس کا ہاتھ پکڑ کر پنڈال میں شامیانے کے نیچے لال قالینوں اور لال کرسیوں پر بیٹھے انسپکٹر اور ہیڈ ماسٹر کی طرف گئے۔

"آپ کے علم میں ہے سر! یہ جو فرسٹ آیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کا بچہ ہے۔"

پچھلی نشست سے جلدی سے ایک اور ٹیچر نے اچک کر اپنا سر ان دونوں سروں کے درمیان گھسیڑا۔

"جناب صرف کھیل کی بات نہیں۔ بچہ ہر سال کلاس میں اول آتا ہے۔"

ہیڈ ماسٹر عاجزی اور انکساری سے گردن جھکائے کہ "بس جی بندہ کس قابل ہے۔" سازشی ٹولہ فتح کا جشن منا رہا تھا۔

شامیانے کے بانس سے لگ کر روتے ہوئے دل گرفتہ بچے پر کسی کی نظر نہیں گئی۔

پھر جب برف زاروں میں مائنس 40 درجہ حرارت میں میری پوسٹنگ ہوئی تو مجھ سے پہلے وہاں کسی اور کی پوسٹنگ آئی تھی لیکن ہمیں بتایا گیا کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس کی پوسٹنگ کینسل ہو گئی۔ چند ہی دنوں میں اس کو ٹریننگ پر امریکہ بھیج دیا گیا۔ اس کا باپ G-8 کے کسی ملک میں ایمبیسڈر تھا۔ پھر کسی اور کا نام سنا اور ایسی ہی کسی وجہ سے اس کا جانا بھی منسوخ ہوا۔ پھر میری باری آئی عمر بھر کی ٹریننگ کے باوجود "یس سر" کہتے میری زبان غوطہ کھا جاتی تھی۔ مگر میں نے قطعی Resist کرنے کا نہیں سوچا ایک تو اس لیے بھی کہ میرے پاس وہ ناگزیر وجوہات نہیں تھیں جو سابقہ لوگوں کے پاس تھیں۔

میں شامیانہ کا ڈنڈا پکڑ کر رویا تو نہیں لیکن کئی دفعہ سوچا

Why me

ہم جب گلیشیئرز اور سفید سرمئی سی برف کی ایک طویل دنیا میں داخل ہوئے تو چلتے چلتے گھنٹوں تک برف میں غرق ہوتے تھے۔ ایک دوسرے سے کم بات کرتے تھے کہ بلندی کی وجہ سے سانس پھولتا تھا۔ پھر ایک خوب صورت سے اگلو میں' میں نے بیٹھے سوچا میں خوش نصیب ہوں جو ایک ایسی جگہ دیکھ رہا ہوں۔ جو آج تک ویسی ہی ہے' جیسی اللہ تعالیٰ نے روز اول بنائی ہو گی اور یہ کہ بے شک یہاں گھاس کی ایک پتی نہ اگتی ہو لیکن ہم دشمن کو اس کے برف کے ایک گالے پر بھی قابض نہیں ہونے دیں گے۔ ہم لڑیں گے اور شہید ہوں گے۔"

وہ ایک گہرا سانس لے کر کچھ دیر چپ رہا۔

"پھر اس دن مجھے پتہ چلا۔ ان نوے ہزار لوگوں پر کیا گزری ہو گی جب ان سے ہتھیار ڈلوائے ہوں گے۔ وہ تو جان دینے ہی گئے تھے نا اور ان کو یس سر کہنے کی ٹریننگ بھی نہیں تھی۔"

وہ رنجیدہ سا ہو گیا۔

"میں تم لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ تم ویسے ہی ہو' پرجوش' پرامید چمکتے چہرے مسرت سے تمتماتے۔ تم دنیا بدلنے کے خواہش مند ہو۔ کسی کو جرأت مت دینا۔ وہ تم سے تمہارے ہتھیار چھنوا سکے۔"

وہ اٹھ کر چل دیا۔ اس کو ایک طویل سفر پہ جانا تھا۔ ملتان' بہاول پور' احمد پور۔

وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھی اس کو جاتا دیکھتی رہی۔ کھمبوں کے پاس سے گزرتے کبھی اس کا سایہ طویل ہو جاتا کبھی سمٹ کر پیروں میں آجاتا۔ پھر وہ اندھیرے میں کہیں تحلیل ہو گیا۔

اندھیرے میں تحلیل ہونے سے پہلے اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ بچوں ایسی معصومیت سے کھلی پڑ رہی تھی۔ اتنی دور کا سفر کر کے یہاں پہنچنے اور راتوں رات الٹے قدموں لوٹنے اس کی قیمت وصول ہو گئی۔ اس کا دمکتا چہرہ اور کامیابی کی سیڑھی پر ایک قدم۔

اب وہ یہ دمکتا چہرہ آنکھوں میں بسا کر صحرا کی ریت ہنسی خوشی پھانک سکتا تھا۔ آڈیٹوریم کے شیشوں سے چھن چھن کر آتی روشنی میں وہ کتنی دیر سر جھکائے بیٹھی رہی۔

اتنی بڑی کامیابی کے باوجود اس پر قنوطیت طاری ہو گئی۔

وہ پلٹ کر ہال میں آئی تو تیز روشنیوں کے غبار میں زندگی اسی طرح تازہ دم اور جھلملاتی تھی۔

عثمان اور ثریا لپک کر اس کی طرف آئے "لوگ تمہیں پوچھ رہے تھے کہاں چلی گئی تھیں۔" شکریے کے ڈھیر وصولتے وہ پھر لوگوں کے بیچ تھی۔

www.pkdigest.com

"ڈاکٹر کو رخصت کرنے۔"

"چلا گیا...؟"

"چلا گیا... !جی تھینک یو۔ جی میں نے لکھا تھا بس سب ہی نے مدد کی تھی۔ بڑی نوازش آپ کی جی تھینک یو۔"

عثمان نے دیکھا اس کی آنکھیں مسکرانے میں چہرے کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

پچھلے کئی دنوں کے مسلسل کام اور جگار نے ان سب کو ہلکان کر دیا تھا۔ البتہ جب کامیابی مل جائے تو تھکان ایک نامحسوس سی Excitement میں بدل جاتی ہے۔ اپنا کمرہ عرف جھجو کا چوبارہ پُرسکون ٹھنڈے مانوس ماحول میں جیسے کئی دن بعد ہی پیار کر لیتا۔ اپنا کمرہ ویسے ہی فکروں کی گرد جھاڑ دیتا ہے۔

اس مختصر سے کمرے میں اس کا مختصر تر سامان تھا۔ ایک بیڈ' بیڈ کے ساتھ دیوار سے لگی کتابوں سے بھری شیلف۔ جن میں سے بیشتر اماں کی جوانی کی کتابیں تھیں۔ جب وہ پڑھا کرتی تھیں اور ان کے زمانے میں جو ادیب لکھا کرتے تھے۔ اماں ادب میں وزن کی قائل نہیں تھیں۔ ہلکا پھلکا ہو آسانی سے سمجھ میں آ جائے پریشان نہ کرے۔

دوسرے کونے میں اس کا کمپیوٹر دیوار میں نصب اس کی وارڈروب جس کی سائیڈ پر ڈریسنگ کیبنٹ اس کی ذاتی دلچسپی کی ساری چیزیں اس کے آس پاس ہی ہوتی تھیں۔

گرمیوں کی ایک طویل حبس بھری دوپہر کچھ پڑھ کر گزاری جائے۔ وہ شیلف سے ایک کتاب گھسیٹ کر کھولتی اور بن پڑھے واپس رکھ کر کوئی دوسری گھسیٹ لیتی۔ ابھی قرعہ فال "نسخہ ہائے وفا" کے نام نکلا ہی تھا کہ بند دروازے سے بی کریم کا سر اندر آیا۔ "کوئی صاحب تشریف لائے ہیں۔" اس اطلاع کے ساتھ [illegible] تھیں۔

"مجھے بلا رہے ہیں؟"

"بڑے صاحب کو پوچھتے ہیں۔"

"تو کریم بی ان کو بتا دیجیے۔ ابا جان دو تین دن کے لیے اوکاڑہ گئے ہیں۔" وہ واپس پلٹی ہی تھیں کہ ٹھٹک کر رک گئیں۔

"عثمان میاں بھی تشریف نہیں رکھتے۔ اماں قیلولہ کر رہی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں کریم بی۔ پھر آ جائے گا۔ کوئی ان کا student ہی ہو گا۔"

"یہی تو بات ہے۔ وہ کہا کرتے ہیں وہ تمہارے ابا کو بچپن سے جانتے ہیں اور جب تک ابا واپس نہیں آتے وہ یہیں بیٹھ کر ان کا انتظار کرتے رہیں گے۔ اب بڑے میاں بیٹھک کے صوفے پر دھونی دیے بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تین دن اسی طرح گزار دیں گے۔"

اس نے گھبرا کر پاؤں میں چپل ڈالے۔

ابا جان لیے دیے رہنے والے آدمی تھے۔ اب جو کوئی ایسا بے تکلف یارانہ جتا رہا ہے تو اس کا حق ہی بنتا ہو گا۔ وہ بیٹھک میں داخل ہونے کے لیے گیلری تک آئی تو ٹھٹک گئی۔ ابا جان کے مہمان صوفے پر دھونی دینے کے بجائے گیلری میں اس کی طرف پشت کیے بڑے اہتمام سے وہ تصویر دیکھ رہے تھے۔ جس میں ابا جان کیمرے کی دہشت سے چلا کر رو رہے تھے۔ اس کے سلام کا جواب بھی انہوں نے بغیر چونکے اور بغیر پلٹے ہی دیا۔

"کم از کم پچاس سال پرانی تصویر ہے۔"

"کچھ زیادہ۔" جھجو نے رسان سے کہا۔

وہ اس کی طرف پلٹے تو نامانوس چہرہ داڑھی عینک' ہیٹ۔

ایک نظر میں وہ ابا جان کے دوست سے زیادہ جیمز بونڈ زیرو زیرو سیون لگے۔

"معاف کیجیے میں یہاں چلا آیا۔ اس طرف کچھ اسپرے کیا ہوا تھا۔ آپ سر عباس کی بیٹی ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے اخلاق نبھایا۔ "ابا جان اصل میں اوکاڑہ گئے ہیں۔"

"ہمم۔" انہوں نے ایک بے معنی سا لفظ ادا کیا۔

"پچاس سال سے پرانی تصویر۔ کچھ عجیب بات نہیں' سال صدیاں کیسے چٹکی بجاتے گزر جاتے ہیں نا؟"

"معلوم نہیں۔ پچاس سال گزار کر میں یہ تجربہ آپ سے ضرور Share کروں گی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"ضرور۔" انہوں نے اسی سنجیدگی سے کہا "بھولیے گا نہیں۔"

انہوں نے خود ہی ایک کرسی پر بیٹھ کر اطمینان سے پوچھا۔

"تو خاطر مدارات نہیں کی جاتی آپ کے ہاں۔"

"معاف کیجیے۔ میں بھول گئی۔ میں نے اصل میں آپ کو پہلے کبھی دیکھا نہیں۔"

"تو گویا خاطر صرف ان کی کی جاتی ہے جن کو آپ نے پہلے دیکھا ہو۔"

ابا کے دوست کی یہ کج بحثی کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ بعض لوگ عمر کے ایک خاص حصے میں چیخ چڑے ہو جاتے ہیں۔ بظاہر وہ ایسے بھی نہیں لگتے تھے۔

"میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔"

انہوں نے اچانک بایاں ہاتھ کھولا اور دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے جیسے گنتی شروع کر دی۔

"بات [illegible] طبیعت میں سادگی ہے۔ اچھی بات ہے۔ لوگوں کو محض ان کی face value پر لیتی ہیں اچھی بات نہیں۔"

وہ ٹھٹک گئی۔

"اپنی غلطی آسانی سے مان لیتی ہیں' طبیعت میں شک کا مادہ ہے۔ ذرا سی جلد باز ہیں' انجام سے بے پروا۔"

انگلیاں ختم ہو گئیں۔ الزام ختم نہیں ہوئے۔

"اور ٹھہر جائیے خاتون! میں چائے نہیں پیتا۔ اب چلتا ہوں پھر واپس آؤں گا۔ نصف صدی بعد آپ کو یاد دلانے۔"

وہ دم بخود حیرت سے آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتی رہی۔ وہ دروازہ کھول کر اطمینان سے باہر نکلے۔ برتنوں کی چھن چھناک کے ساتھ کریم بی شربت کے دو سرخ گلاس اور جگ لیے اندر داخل ہوئیں۔ اس نے ایک نظر کریم بی کی طرف ڈال کر پلٹی تو وہ جا چکے تھے۔ کھلے دروازے سے باہر برآمدے میں یا گیٹ پر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

لمحہ بھر کے لیے سردی کی یخ کرتی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو برف کر گئی۔

باقی آئندہ شمارے میں

www.pkdigest.com

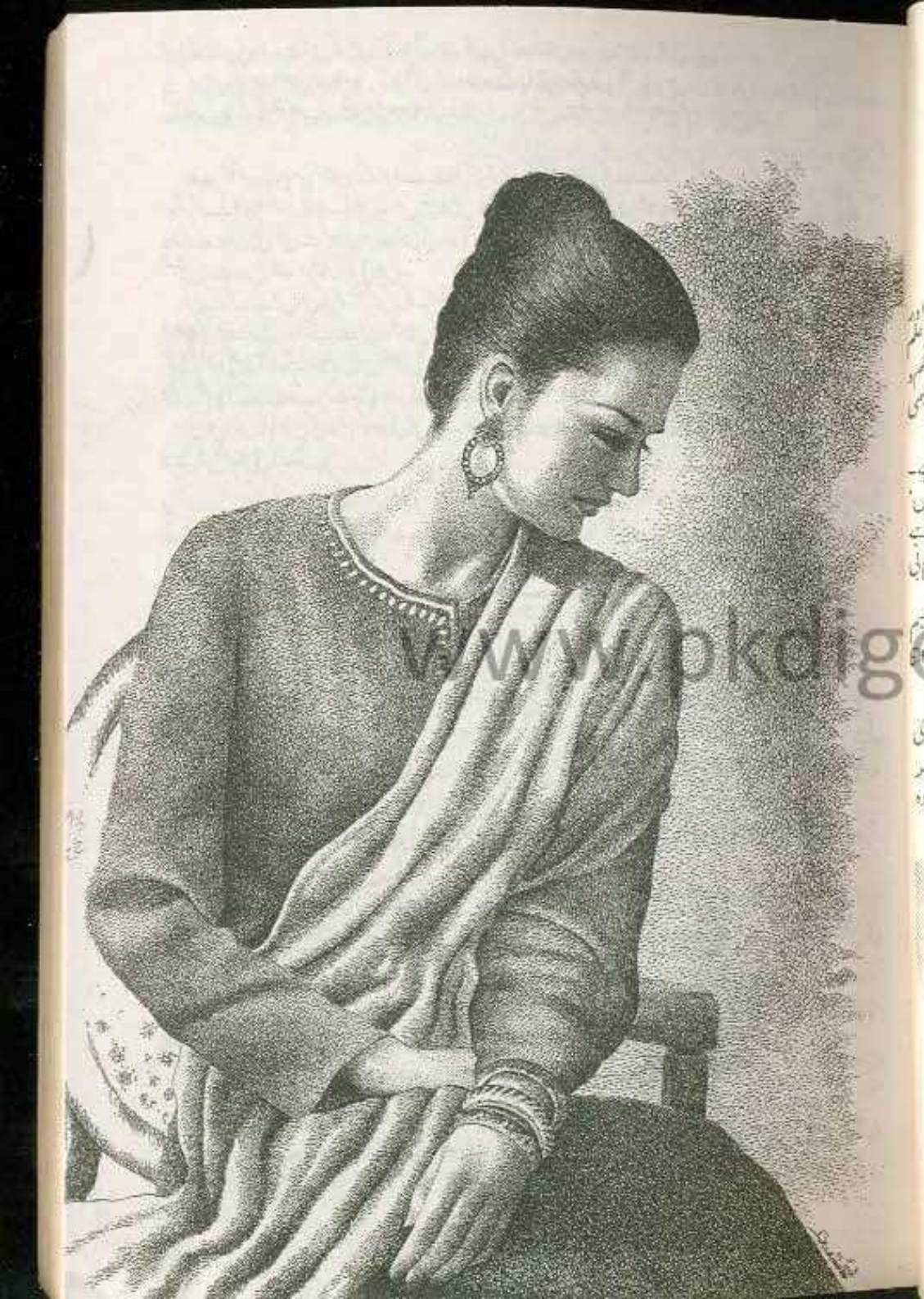

رفعت ناہید سجاد

چراغ آخر شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی تجربے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر، عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گنا دی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں۔ اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی ثریا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی [illegible] کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

www.pkdigest.com

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے۔ وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیر اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ

صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔
گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے امرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ تایائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔
ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کو نا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کرکے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔
ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۳
تیسری قسط

"گئے؟" کریم بی ہاتھ میں ٹرے پکڑے ششدر سی کھڑی تھیں۔ "یا تو گھر بسا کر بیٹھے رہتے تھے یا جاتے گھوڑے پر سوار۔"
عبیر اپنے آپ میں گم کھلے دروازوں، خالی راستوں کو حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ کچھ کہیں نہ کہیں غلط تھا کیا تھا مگر یہ تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔
"کون تھا کریم بی؟" اس نے کریم بی سے زیادہ خود سے پوچھا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے اس کی ذات کی غلطیاں انگلیوں کی پوروں پر ترتیب دی جارہی تھیں۔ لمحوں میں ہی جیسے یہاں کبھی کوئی تھا ہی نہیں۔
"کیا معلوم کون تھا، میں تو ابھی وہاں بٹھا کر تم کو بلانے گئی بی بی! مجھے تو پہلے ہی مشکوک لگ رہا تھا۔ ایک دفعہ تو سوچا بھی دروازے سے چلتا کردوں۔ آج کل ایسے اٹھائی گیرے بہت پھرتے ہیں۔"
"کون ہو سکتا ہے؟" کریم بی کے تجزیوں سے بے خبر وہ ابھی تک اس الجھن سے نکلی نہیں تھی۔
ان کا ضبط جواب دے گیا۔ مجرم اب تک کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہوگا۔ نہ کسی نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی نہ شور ہنگامہ برپا کیا۔
"میں کہتی ہوں آس پاس نظر دوڑاؤ۔ چیزیں دیکھو کیا لے گیا آخر؟" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے میز پر پٹخی۔
"آپ بھی کمال کرتی ہیں کریم بی! کیا چیز لے جائے گا کوئی یہاں سے۔" وہ جھنجلا گئی۔
"اے لو! اچکوں کے ہاتھ جو لگے وہ لے جاتے ہیں، کوئی چھان پھٹک تھوڑا کرتے ہیں۔ یہ اٹھاؤ دور رکھو۔"
انہوں نے ٹرے واپس اٹھاتے عبیر کو گھورا۔ ان کی بڑبڑاہٹ گیلری کے آخر کسی کھلے دروازے میں غائب ہونے تک جاری تھی۔

ذرا ہی دیر میں وہ خواتین کے نرغے میں گھری حاتم طائی کی طرح سوالنامہ حل کررہی تھی۔ اس پر اندیشوں، خدشوں، بدگمانیوں کی بوچھاڑ کردی گئی تھی۔ گویا وہی تو ابا کے دوست کو بلا کر لائی تھی پھر ان کو بھی بنا کر دیوار سے چپکا دیا تھا۔ یہ بھی اس کی کوئی سازش تھی۔ یا تو سب کے سب آرام فرما رہے تھے، موجود ہی نہیں تھے۔ برا بھلا کہنے کا موقع ملا تو اپنے تیر کمال سنبھال سب مورچوں میں آ ڈٹے۔
"کہاں سے آئے تھے؟"
"نام تو کچھ بتایا ہوگا آخر؟"
"کوئی میسیج بھی نہیں دیا؟"
"پھر کب آنے کا کہا؟"
کتنا مزہ آتا ہے جب کسی کی حماقت آپ کے ہاتھ لگ جائے کیسے آپ اس کو ریشہ ریشہ ادھیڑ ڈالتے ہیں۔ وہ ہونق سی بنی ایک ایک کا منہ تک رہی تھی۔ کوئی سوال اسے کرنے کا موقع ملا ہوتا تو ان کو جواب بھی دیتی۔ کریم بی ہر دو منٹ کے وقفے کے بعد سارا واقعہ جزئیات سمیت پھر سے سنانے لگتی۔ سوالات کرنے والا بورڈ بھی از سر نو اس دلچسپی سے واقعہ سننے لگتا جیسے اس سے پہلے انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔
پہلے مہمان نے اس پر جی بھر کر نکتہ چینی کی تھی۔ اب گھر والے محاذ بنائے کھڑے تھے۔ اگر کریم بی نے موقع کا گواہ ہونے کا فائدہ نہ اٹھایا ہوتا تو وہ صاف بچ نکلتی لیکن ان کے پاس چشم دید شہادت تھی۔ وہ مہمان یا چور جو بھی تھا، انہوں نے اس کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور گیلری میں کھڑا ملا اور جب وہ شربت لے کر اندر داخل ہوئیں تو انہوں نے اپنی گنہگار آنکھوں سے بھاگتے دیکھا۔
"کون ہوگا آخر؟" کریم بی اس الجھن سے نکلنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔
"ماموں [illegible] بخش تھے۔" عبیر نے چڑ کر کہا۔ "اور کریم بی بات کو نمک مرچ نہ لگایا کریں۔ بھاگا کہاں تھا وہ آرام آرام سے گیا تھا۔ بھاگنے کی اس کی عمر بھی نہیں تھی۔"
"اور ڈرائنگ روم میں مچھروں کا تیز بو والا اسپرے کیا تھا آپ نے۔ وہاں تو کسی بھی شریف آدمی کا کھڑا ہونا مشکل تھا۔"
"اے لو ان کی بات سنو۔ گھر والے خطا کار ہوگئے، چور شریف آدمی نکلا۔"
"تو خطا کار تو تم ہی ہوئیں کریم بی! تم نے بھیجا بھی تو کس کو۔" اماں اپنی اولاد کے عقل کے سلسلے میں کچھ خاص خوش گمان نہیں تھیں۔
بڑی تائی ان کی فوری مدد کو آئیں۔ کندھے پر تولیہ ڈالے، پانی نچڑتے بھیگے بالوں کے ساتھ۔
بڑی تائی اور امی نزاکت علی، سلامت علی کہلاتی تھیں۔ جہاں سے ایک نے راگ چھوڑا دوسرے نے وہیں سے اٹھا لیا۔
"مجھے کہا ہوتا میں تو جاگ ہی رہی تھی۔ ذرا گرمی لگی تھی، سوچا دو لوٹے پانی ڈال آؤں۔"
"یہ اچھا ہوا۔" عبیر نے سوچا۔ کچھ دن سے گھر میں کہا سنی کم تھی اب ایک موضوع ہاتھ آیا ہے تو چند روز تو خواتین کے اچھے کٹ جائیں گے۔ ریپیٹ ٹیلی کاسٹ کا اس گھر میں خاصا رواج تھا، جب تک مسئلہ دھواں دھواں ہو کر تحلیل نہ ہو جاتا، ہر روز حقے کی طرح تازہ کیا جاتا۔
قیاس آرائیاں، گمان، خدشے، خوش فہمیاں۔
نادیدہ مہمان کو کس کس زاویے سے پرکھا نہیں گیا۔ اس کو کٹہرے میں لاکر الزامات کی بھار دی جاتی رہی۔ اس

دن بھی جب حمیرا اس کی فوری رہائی کے لیے طلب کی گئی تو گھر میں قدم رکھتے ہی وہ بھونچکا رہ گئی۔
یہ کیا ہو رہا ہے؟
اینٹوں والے صحن کے آخری حصے میں چچا عبدالعزیز کے کوارٹر کے پاس 'خواتین کی محفل جمع تھی۔ واشنگ مشین کا اسپانسر شور مچا رہا تھا۔ کریمی سر تا پاؤں پانی میں شرابور اور بڑی تائی چلا چلا کر بول رہی تھیں۔ ای لانڈری کے ڈھیر پہ کمر کو ہاتھ کا سہارا دیے محض ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔
"عثمان نے بتایا تھا گھر میں کوئی چور آ گیا تھا اور بی بی عبیر نے اپنی سادہ لوحی میں اس کو پکڑنے کے بجائے اس کی خوب خاطر مدارات کی۔ چائے پلوانے پر بھی اصرار کیا۔ چور مشکل سے اپنی جان چھڑا کر بھاگا۔"
اور چوری کیا ہوا مسروقہ مال برآمد کیا گیا یا چور لے بھاگا۔ یہ ایف آئی آر میں درج نہیں تھا۔ جب سے عبیر کی انسان شناسی کر کری ہو گئی تھی۔
وہ چچا عبدالعزیز کی بان کی جھلنگا سی چارپائی میں غرق بیٹھی تھی 'گردن جھکائے' دونوں ہاتھ گود میں رکھے۔ وہ جیسے اپنے ہاتھ کی لکیروں پہ غور کر رہی تھی 'جرگے کے عین درمیان۔
گویا سلسلہ درد کی زنجیر کا ابھی ٹوٹا نہیں۔ اسے اپنی بے چاری دوست پر بہت ترس آیا۔ وہ اتنی بے خبر تھی کہ اس کے آنے کی اس کو اطلاع بھی نہیں ہوئی 'کیا بھی کیا۔
حمیرا طول ہو کر اس کی چارپائی پر اس کے برابر آ بیٹھی۔ اس کو بجلی کے کرنٹ جیسا جھٹکا لگا۔ وہ گود میں سیل فون رکھے Build City کھیل رہی تھی۔ اس کے بیٹھنے سے چارپائی کے بانوں میں جھول پیدا ہوا 'عبیر کا ہاتھ غلط پڑا اور پوری بلڈنگ اڑا دھم نیچے آن گری۔
"شاباش!" حمیرا نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھی تم رو رہی ہو۔"
"کس بات پر؟" اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "160 پلاٹ کھڑے کر دیے تھے تم نے گرا دیے۔ اس بات پر رو رہی ہوں؟"
"وہ رضا اور عثمان......" وہ ہچکچائی۔ "دراصل میں انہوں نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ کیا یہ تم سے ابھی تک ناراض ہیں۔ وہ چور والی بات۔"
"مجھ سے نہیں 'یہ سب باجماعت اس ڈیلر سے ناراض ہو رہے ہیں جس نے ان کو یہ مشین بیچی ہے۔"
کپڑوں کی ایک کھیپ تیار ہو گئی تھی۔ پلاسٹک کی ٹوکری میں نچڑے ہوئے کپڑے 'جھٹک جھٹک کر اور کلپ لگا کر صحن میں پھیلے تار پر لٹکانے کی ڈیوٹی اس کی تھی۔ گویا کپڑے نہیں دھل رہے ہیں 'باقاعدہ دھوبی گھاٹ کھلا ہوا تھا۔ سفید کپڑے رنگین کپڑوں سے چن چن کر بڑی تائی الگ کر رہی تھیں۔ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کے نوٹ اور سکے اماں الگ کرتی تھیں۔ الٹے اتارے ہوئے کپڑوں کو سیدھا کرنا بھی ان کی ذمہ داری تھی۔
ادھڑی ہوئی سلائی کی مرمت دادی اماں کے ہاتھ تھی۔ "ذرا دھاگہ ڈالنا۔" وہ ہر دو منٹ بعد سوئی کے ناکے سے جنگ ہار کر سوئی پروئی ہوئی نکی عبیر کے حوالے کر دیتیں۔ چونکہ وہ گھر کا چھوکرا تھی 'اس لیے تار بھر کر واپس آتی۔ سہولت سے دھاگہ ناکے سے گزارتی جیسے ریل روانی سے سرنگ میں داخل ہو کر باہر نکل آتی ہے۔ یہاں سب کام مل جل کر ہی ہوتا تھا۔
کام ہو رہا تھا یا قوالی 'کچھ سازندے تھے 'کچھ قوال اور کچھ محض تالیاں بجانے والے۔
"کیا حال ہے تیری ماں کا؟" دادی اماں نے پیر کے انگوٹھے میں کپڑا کس کر تر پائی کرتے کہا۔
"اچھی ہیں۔" حمیرا ٹوکری میں سے اپنے پسندیدہ رنگ کے کلپ چن کر عبیر کو تھماتے ہوئے بولیں۔
"اور اس اسپانسر سے وجہ ناراضی کیا تھی؟" اس نے عبیر سے پوچھا۔ "اس نے تو کسی چور کو چائے کی پیش

کش نہیں کی ہو گی۔"
"شکر کرو 'ان لوگوں کے حافظے اچھے نہیں 'جوں ہی کوئی نیا موضوع ہاتھ آتا ہے 'پچھلا اٹھا کر طاق پر رکھ دیتے ہیں 'ورنہ سوچو اچھے حافظے کتنی اذیت دیتے ہیں۔ ویسے سو دن تک اس ڈیلر کی طرح میرے بھی خوب کان کھینچے تھے۔"
حمیرا ہنس دی۔ "ہر زمانے میں بڑے ادیب کے ساتھ یہی سلوک ہوتا آیا ہے۔ ان کو تمہارے Build city کی طرح عمارت نصیب ہونہ ہو 'کتبہ ضرور نصیب ہوتا ہے۔ اسی سے ثابت ہوا تم بڑی ادیب ہو۔"
واشنگ مشین کچھ دیر کو بند ہوئی تو فضا میں اتنی دیر کو ایسا سکون ہوا 'جیسے ٹرین کے نکل جانے کے بعد پلیٹ فارم۔
"کتبہ۔ کس کا کتبہ۔"
بڑی تائی کے کان میں کچھ نامناسب سے الفاظ پڑے تھے۔ حمیرا گڑبڑا گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے تو اسے کچھ نہیں سوجھا۔
"وہ اصل میں ہم منو کے کتبے کی بات کر رہے تھے۔"
"توبہ توبہ۔" انہوں نے منو کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ان کی جوانی میں منٹو جیسا بھولا 'بے ضرر آدمی بھی توبہ توبہ تھا۔
"ہم دھوبی گھاٹ پر موجود خواتین کے لیے ٹی پارٹی کا اہتمام کرتے ہیں۔" حمیرا نے بھاگ جانے میں عافیت جانی۔
"تو چائے جو چور نے پینے سے انکار کر دیا تھا 'آپ کے لیے بنا کر لاتے ہیں۔" وہ ذرا دیر کو کریمی کے پاس رکی۔
"شاباش کریم! باپ کے زمانے میں دھوبی کپڑے پٹختے ہوئے گانا بھی گاتے تھے۔ دیکھو موہے لاگا سولھواں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ ستاروں کا آنگن،	نسیم سحر قریشی	قیمت: 400 روپے
☆ ایمان امید اور محبت،	عمیرہ احمد	قیمت: 200 روپے
☆ اے وقت گواہی دے،	راحت جبیں	قیمت: 350 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت،	شازیہ چودھری	قیمت: 180 روپے
☆ امر بیل،	عمیرہ احمد	قیمت: 450 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر
شائع ہو گئے ہیں

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 2216361

www.pkdigest.com

سال۔ آپ ابھی انٹرو تک نہیں پہنچیں گی کہ چائے کی کشتی تیار ہوگی۔" وہ بڑی مہارت سے کریم بی کا بھی استعمال کرتی۔

بہت سلیقے سے آئل میں پیڑوالے سموسے فرائی کرتے اس نے بچوں ایسے فخر سے کہا۔ "تمہارے ڈراسے بڑی شہرت ہوئی تم نے ریویو دیکھے؟ بہت دن تک بس کیمپس میں یہی ایک گرم ٹاپک رہا۔ سر فیصل کہہ رہے تھے کہ لوگوں نے میرے آنسو پونچھ دیے۔ اندیشہ تھا وی سی صاحب ضرور کوئی اختلافی بیان دیں گے لیکن اس دن بہت دیر تک وہ یہی ایک بات کہتے رہے 'ہمیں ایسے ٹیلنٹڈ طالب علموں کی سخت ضرورت ہے' اور تو اور سارہ حق بھی آفس آئیں۔ صرف اسکرپٹ رائٹر کی ایک شکل دیکھنے۔"

عبیر نے ایک نظر اس کے چابک دستی سے کام کرتے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر بے دھیانی سے پوچھا۔

"کون 'سارہ حق۔"

ٹرے تیار تھی، چائے سے لبریز مگ، پلیٹ بھر کر سموسے اور کیچپ کی سرخ بوتل۔ وہ کچن کے دروازے سے باہر نکلتے ٹھٹک گئی۔

"تم سارہ حق کو نہیں جانتیں؟"

"نہیں تو۔"

"کمال کرتی ہو عبیر؟" اس کو اس کی جہالت کا سخت صدمہ ہوا۔

"اتنی مشہور و معروف ہستی۔ ان کو کون نہیں جانتا اور تم کہتی ہو کون سارہ حق؟"

وہ خجل ہوگئی۔ واقعی وہ "Who iswho" سے قطعی لاعلم رہی تھی۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اپنے گنے چنے لوگوں کی انگلی پکڑے باہر نکلتی۔ منزل سے باہر اس کو کچھ سجھائی بھی نہیں دیتا تھا۔ پرندوں کی طرح وہ اپنے غول سے بچھڑ کر راستہ بھٹک جاتی تھی۔

امی نے چٹ پٹی چیزوں پر ایک نظر ڈالی۔ "یوں کہو ہمارا تو بہانہ تھا، اپنی دعوت اڑائی جا رہی ہے۔"

"نہ نہ۔" حمیرا نے رسان سے کہا۔ "ہم مل بانٹ کر کھانے کے عادی ہیں۔"

"لیڈر ہی ہوئے پھر تو۔" امی نے الٹی آستین کے بل کھولتے کہا۔

"عثمان کو بھی چائے دے آؤں۔" ایک پلیٹ میں اس کا مگ رکھ کر اطراف میں تین ورقی سموسے جماتے اس نے اعلان کیا۔ "میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے کمرے سے آواز لگائی تھی۔ چائے میں بھی پیوں گا۔"

عثمان نے اپنے کمرے کی سلاخوں والی کھڑکی سے باہر جھانکا۔

دور صحن میں کپڑے دھل رہے تھے یا مینا بازار لگا تھا، ایک جشن کا سماں تھا۔ گھر میں موجود سب کی سب خواتین شیڈ کے نیچے دھوپ بارش سے بچی مشین کے گرد ایسے جمع تھیں جیسے ایک مدت سے یہ دلچسپ کام اس گھر میں نہ ہوا ہو۔ شور مچاتی ہنستی، چائے اڑاتی۔

یکجا اور خوش باش۔

دیوار کے ساتھ کھلی نالی میں سرف کے جھاگ کا ڈھیر بھاگتا پھر رہا تھا۔ تازہ گری برف کی طرح پھولا پھولا سورج کی شعاعوں سے منعکس ہوتے اور جھلملاتے قوس قزح کے سے ترمرے رنگ ڈھیر پر چھپکے مارتے تھے۔

یہ تین نسلوں کی عورتیں ہیں۔ تاریخ کے تین مختلف دور جیسے بال آئے آئینہ میں ایک ہی چہرے کے کئی روپ نظر آتے ہیں۔ ٹکڑیوں میں تقسیم شکستہ چہرے۔

ایک عورت اس نسل کی نمائندہ ہے، جہاں وہ اونچی دیواروں اور بند دروازوں میں قید تھی، جس کی حیثیت ایک مادر زاد لونڈی سے زیادہ نہیں تھی جس کی ماں بھی غلام تھی، ان کی ضروریات جنگل میں پھرتے کسی جانور سے زیادہ

نہیں تھیں، البتہ ان کے عہد میں ریل گاڑی ایجاد ہو گئی تھی۔

شکستہ آئینہ کے ایک ٹکڑے میں جو دوسرا چہرہ نظر آتا ہے، وہ اس نسل کا ہے، جس نے دیواریں تو نہیں توڑیں لیکن دروازے کھول دیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دماغوں کے بند کواڑ بھی کھل گئے۔ یہ کسی ذہنی انقلاب سے ذرا پہلے کا دور تھا جس میں لوگ سوچتے تھے اور کڑھتے تھے۔ وہ اندر سے نکل آئے تھے اور باہر ان کو قبول نہیں تھا۔ جلد سناٹا کسی آنے والے ہنگامے کی پیشن گوئی کرتا تھا۔ بڑی بڑی چیزوں کی ایجادات سے پہلے چھوٹی چھوٹی چیزیں دریافت ہو رہی تھیں۔

انسان چاند پر پہنچ گیا۔ پہلا دل ٹرانسپلانٹ ہوا۔ زچگی اور تپ دق سے مرنے والی جوان اموات میں کمی آگئی تھی۔

تیسری نسل سائنس کے اس ترقی یافتہ عہد میں پیدا ہوئی، جہاں ہر روز ایک نئی ایجاد پچھلی ایجاد کو مات دے ڈالتی ہے۔ بظاہر اس نسل نے سابقہ نسل کی عورت کی کشمکش سے خود کو آزاد کرا لیا۔ اس لحاظ سے وہ خوش نصیب عہد کی عورت ہے۔

ہر پرانی نسل کے خاتمے پر ایک نئی نسل آجاتی ہے، خلا کہیں نہیں۔

سوچنے کا حق بھی کسی کو دیتے ہیں تو ہم دیتے ہیں، وہ حق چھین بھی لیتے ہیں تو ہم ہی چھینتے ہیں۔ آزادی ہم دیتے ہیں، آزادی کا اصل میں مطلب کیا ہے، کون فیصلہ کرے گا۔ عورت خود کیا چاہتی ہے؟

مذہب کیا سکھاتا ہے، معاشرے کی کیا بندشیں ہیں۔ ہیومن رائٹس والے کیا کہتے ہیں۔ اگر کوئی خوشی کا پیمانہ دریافت کرتا، ترازو آپ کے پاس ہو تو آپ ماپ سکتے ہیں، کس عہد کی عورت زیادہ بہتر تھی۔ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کس عہد کی عورت ہمارے لیے بہتر تھی۔

اس عمر کے شیلف میں ایک قطار سے کھڑی موٹی موٹی جلد والی ادق کتابیں، فلسفے کی گتھیاں، شاعری کے پلندے، کچھ بھی تو عورت سے خالی نہیں۔

عورت پاکیزہ ہے، گلدان میں کھلا ایک پھول ہے۔

عورت ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے۔

عورت حاسد ہے، عورت بد نیت ہے، عورت لالچی ہے، چیری جوتی ہے، دیومالائی داستانوں میں ساری دیویاں عورتیں ہیں، بدی کا تمثیل بھی اور نیکی کا بھی۔ ان کی شرم و حیا کی قسمیں کھائی جاتی ہیں لیکن جسم بیچنے والی بھی ایک عورت ہے، جو جذبہ قتل بنی وہ عورت تھی۔ مر کر قربانی دینے والی بھی عورت۔

عورت کے بارے میں آج تک جو کچھ مستند کتابوں میں تحریر ہوا، وہ مرد نے ہی لکھا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ مرد اپنی تمام تر میل شاونزم کے باوجود عورت کے وجود سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی بلند و بانگ لیاقت کے باوجود بھی عورت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور اس کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ وہ مرد کو سمجھ سکے۔

اتنی بے شمار قسموں میں ثریا کو کس کھاتے میں ڈالا جائے۔ وہ اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود ثریا کو سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔

ثریا اس وقت اس کی طرف بڑھی، جب وہ کسی بھی کیٹگری میں اس کو بریکٹ نہیں کرتا تھا۔ وہ انسانوں کو کسی فارمولا میں فٹ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ حتی کہ وہ اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ "فوراً" ہی ثریا نے جانا وہ دو مختلف بیک گراؤنڈ سے آئے تھے، تاہم ان کی سوچ میں یکسانیت تھی پھر اس نے فیصلہ کیا۔ وہ الگ الگ راستوں کے مسافر، جب راستے ہی ایک نہ ہوں تو سوچ کیسے۔"

www.pkdigest.com

وہ صبح سے ان کمزور لمحوں کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔
کبھی کبھی ہم پر بہادری کا ناروا بوجھ ڈال دیا جاتا ہے۔ کیونکہ آپ اس گھر کے سب سے بڑے بیٹے ہیں' لہٰذا آپ کو مضبوط ہونا چاہیے۔ آپ سے کسی کمزوری کی توقع نہیں کی جاتی۔ سو وہ پاؤں زمین پر سختی سے گاڑے' چٹان کی طرح جما کھڑا تھا۔
"نواب صاحب! چائے تیار ہے۔" حمیرا نے پیالی اس کی طرف بڑھائی' لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور ہٹالی۔
"تو صاحب بہادر کو قوم کا غم کھائے جا رہا ہے؟"
وہ مسکرا دیا۔ کبھی جو اس کو کوئی ڈھنگ کا خطاب نصیب ہوا ہو۔
اندر کا الاؤ جیسے سرد ہو گیا' اس نے جشن منانے والوں کی طرف ایک اچٹتی نظر ڈالی۔
دیوار کے ساتھ لگی کھلی نالی میں سرف کے جھاگ کا بھاگتا ڈھیر بجھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہماری چھوٹی سی آرگنائزیشن لیکن جب انہوں نے ہمارا آفس دیکھا اور ہمارے کام کرنے کا طریقہ تو وہ بہت متاثر ہوئیں۔"
سوکھے ہوئے کپڑوں کے ڈھیر سے حمیرا نے شکنوں بھرا کرتا گھسیٹ کر نکالا۔
"کہنے لگیں' اتنے تھوڑے لوگ ہیں لیکن کتنے منظم اور محنتی۔"
آستین کی تہہ کرتے کے نصف حصے پر سلیقے سے جمائی وہ رکی۔ "تم سے تو خاص طور پر ملنے آئی تھیں۔ ان ہی کی کوششوں سے ہمارے پلے کو میڈیا میں اتنی کوریج ملی' ورنہ تو ہمارا کوئی پروگرام اٹھانے کو بھی تیار نہیں تھا۔"
کرتا ایک طرف رکھ دیا گیا۔ ڈھیر سے اٹھائی پتلون اب اس کے ہاتھ میں تھی۔
"ان کی بیک پر اتنا سوشل ورک ہے۔ عورتوں کی تعلیم' ان کے حقوق' پتہ نہیں کتنے گھرانوں کو ان کے ہاں سے روٹی ملتی ہے۔ ہماری خوش قسمتی کہ انہوں نے ہمیں اتنی اہمیت دی۔ وہ ہمارے گروپ کی سرپرستی کے لیے بھی تیار ہیں۔"
اب اس کے ہاتھ میں ایک اور کپڑا تھا اور وہ متاثر ہونے والی اسٹیج سے نہیں نکلی تھی۔
"چھوڑو پرے' تم رک جاؤ' میں کیا کروں گی ان سے مل کر۔"
"تم میں یہ بڑا نقص ہے۔" وہ جھنجلا گئی۔ "بھاگتی کیوں ہو لوگوں سے۔"
"واقعی۔" اس نے افسوس سے سوچا۔ "سب ٹھیک کہتے ہیں' اس میں اتنے نقص ہیں کہ انگلیوں پر نہیں گنے جا سکتے' اس کے لیے ایک کیلکولیٹر کی ضرورت ہے۔"
"سارہ حق ہم جیسے لوگوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ تم ان کی باتیں سنو گی تو تمہارے دین دنیا بدل جائیں گے۔"
اس نے ایک آہ بھری۔ "دین بدلنے کی تو میں قائل نہیں۔"
"بے وقوف! میں نے محاورہ بولا ہے۔ بدلتی تو دنیا بھی نہیں' بس خیالات بدل جاتے ہیں اور ہم تو رہتے ہی خیالوں کی دنیا میں ہیں۔"
تہہ جمائے کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے دوسری طرف نکل گئی۔
رات گئے جب وہ شہریار سے Net پر گپ ہانک رہی تھی تو سارہ حق سے ممکنہ ملاقات کا تذکرہ بھی نکلا وہ فکر مند سا ہو گیا۔

"بڑی مشہور خاتون ہیں۔ معاشرے کی پسی ہوئی عورتوں کے لیے انہوں نے بہت شہرت پائی۔ ان کی لسٹ میں بڑے بڑے کام بھی ہیں لیکن تم سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟"
اگلے دن کیمپس کی سیڑھیاں تیز تیز الانگتے اسے قیصر نے پیغام دیا۔
"ملاقات کا دن اور وقت طے ہو گیا۔ انہوں نے عنبر کو خود سے ملنے کی اجازت دے دی۔"
"ایں۔۔۔ اجازت یا دعوت۔۔۔؟ کیا وہ کسی دربار میں رہتی ہیں؟ بہت خاص ہیں۔"
"نہایت خاص۔ کیا تم ان سے ملی ہو؟"
"کبھی نہیں۔"
"پھر تم سے ملنے پر اتنا اصرار کیوں۔" وہ حیرت بھری تشویش سے اسے دیکھنے لگا۔
"تم لوگوں نے ہی تو کہا تھا' اسکرپٹ۔"
"مجھے تو کوئی اور وجہ لگتی ہے۔"
"ڈراؤ نہیں' ورنہ میں بالکل نہیں جاؤں گی۔" اس نے بغیر ڈرے دھمکی دی۔
"تم گیارہ بجے پہنچ جانا' تمہارا لنچ بھی ہے ان کے ساتھ۔ وہ بہت پنکچوئل ہیں اور مصروف بھی۔" ایک ہی منٹ میں وہ اشتہاری موٹر سائیکل کی طرح ہوا ہو گیا۔
"واہ جی واہ۔ کیا ادا ہے۔ آپ خود کو تو وی آئی پی سمجھتے ہی ہیں' ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو آپ کو ایسا سمجھنے میں آپ کی دل و جان سے مدد کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔"
طلبہ برادری کا گروہ در گروہ کلاس روم میں داخل ہو رہا تھا۔ یونیورسٹی' رنگا رنگ علم کا مرکز' تعلیم حاصل کرنے والوں کا گروہ اور وقت گزارنے والوں کا گروہ۔۔۔ جو محض وقت گزارنے آتے تھے' وہ بھی کچھ سیکھ کر ہی جاتے' یہ جگہ ہی ایسی ہے۔ نفرت' بغض اور عناد کی بھی کمی نہیں تھی۔ پتہ نہیں تعلیم میں نفرت کہاں سے سیکھی جاتی ہے۔
وہ کلاس روم کی گیٹ کے ذرا پرے سبزہ زار کی طرف رخ کیے حمیرا کو فون کر رہی تھی۔
"کل گیارہ بجے انہوں نے بلایا ہے اور لنچ بھی ہے۔ شاید چینیوں کی طرح وہ ساڑھے گیارہ بجے دوپہر کا خاصا تناول فرماتی ہیں۔ ہمارے وقت کے مطابق ڈیڑھ دو بجے کھانا ہوا تو وہ میری اور میں ان کی شکل کب تک دیکھیں گے۔ تم چل رہی ہو نا؟"
"ہیں۔۔۔" اس کی حیرت بھری آواز آئی۔ "اول تو میری اس اسائنمنٹ کا خاتمہ ممکن نہیں۔ صبح سے لائبریری میں بیٹھی ہوں' انٹرنیٹ dead ہے۔ دوئم یہ کہ مجھے انہوں نے نہیں بلایا' وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ لیڈر جس کو بلاتا ہے وہی جاتا ہے۔ یہ خالہ غفوراں کے بیٹے کا ولیمہ نہیں کہ مع اہل و عیال چل پڑو۔"
"چلنا نہیں؟" عائلہ نے کلاس میں داخل ہونے سے پہلے اسے ٹوکا۔
"پتہ نہیں۔" اس نے بیزاری سے جواب دیا۔ اس کے اندر اچانک سناٹے ابھر آئے تھے اور آس پاس کا شور ان سناٹوں میں مخل ہوتا تھا۔ معلوم نہیں عائلہ کہاں جانے کا سوال پوچھتی تھی۔ کلاس میں یا دربار میں۔
تو گروپ نے ان کو لیڈر مان لیا جو نیت امام کی سو میری۔ نئے لوگ زندگی میں داخل ہوں تو ایک کھٹکا سا لگا رہتا ہے۔ پتہ نہیں وہ آپ کی زندگی کا حصہ بن سکیں گے یا آپ کی زندگی کو توڑ پھوڑ کر الگ ہو جائیں گے۔
آخری قطار میں بچھی کرسیوں پر وہ غائب دماغی سے بیٹھی تھی کہ حمیرا کا میسج آیا۔
"ایسی بھی کیا بات ہے' پریشان مت ہو۔"
برسوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے رہتے ان کا تار برقی والا رابطہ بحال رہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

www.pkdigest.com

مراتب علی روڈ کی پوش بستی میں جہازی سائز کے گھر کے عظیم الجثہ گیٹ کے سامنے کھڑے رکشہ سے سلنڈر کی پھٹ پھٹ جیسی آواز ماحول کے سکون کو تہس نہس کر رہی تھی۔ رکشہ کتنی ہی دیر گیٹ کے سامنے کھڑا رہا۔ شاید سواری آنے پائیوں کا حساب برابر کر رہی تھی۔ یا اترنے اور نہ اترنے کے سلسلے میں گومگو میں مبتلا تھی۔

واچ مین بے چین ہو رہا تھا۔

دیر بعد سواری نے ایک ٹانگ اتاری' پھر دوسری۔ اب وہ مجسم سامنے تھی۔ ایک قدیم مسجد جیسی عظیم الشان عمارت کے سامنے کھڑے ہو کر اس کو اپنی کم مائیگی کا احساس تو نہیں ہوا' البتہ اپنے اور اس محل وقوع کے بے جوڑ ہونے کا خیال ضرور آیا۔ دیو ہیکل تناور درختوں کی پناہ میں گھری خوف زدہ عمارت۔

غریب عورتوں کو ان کا حق دلوانے کی جنگ کرنے والی خود غربت سے کوسوں دور تھی۔ غریبوں کے لیڈر ہمیشہ امیر کیوں ہوتے ہیں۔ (اور امیر نہ ہوں تو لیڈر بننے کے بعد ضرور ہو جاتے ہیں۔) کوئی مفلس قلاش اپنے طبقے کا لیڈر کیوں نہیں ہوتا۔ کسی کیفیت سے گزرے بغیر آپ اسے کیسے محسوس کر سکتے ہیں۔ درد کیا ہوتا ہے' آپ کیسے بیان کریں گے جب کبھی درد ہوا ہی نہ ہو۔

وہ یہاں کیوں بلوائی گئی تھی۔ اندیشوں نے پھر سر اٹھایا۔

لکڑی اور شیشے کے کیبن میں کسی ڈمی کی طرح شوکیس میں سجا واچ مین باہر آگیا۔ اس کے کندھے پر بڑی سی بندوق جھول رہی تھی۔ جیسے اس نے اپنا سارا بچپن باپ کے کندھوں پر جھولتے گزارا تھا۔

گن مین شاید خود بھی اس کے بے جوڑ ہونے سے آگاہ تھا اور ہر غریب آدمی کی طرح اس کے دل میں دوسرے غریب آدمی کے لیے کوئی احترام تھا نہ ہمدردی۔

رکشہ میں بیٹھ کر اس گیٹ کے سامنے اترنے والی عورتوں سے وہ خوب واقف تھا۔ گھر سے بھاگ کر پناہ کی تلاش میں آئی لڑکیاں۔ معاشرے کے جبر کا شکار لڑکیاں۔ مگر عموماً" ان کا حلیہ جدا ہوتا۔ ان کے بال خشک روکھے اور تباہ حال ہوتے تھے۔ کپڑے خستہ اور ملگجے' چہرہ مسلسل روتے رہنے کی وجہ سے ستا ہوا اور سوجا سوجا۔ پہچان لیے جانے کے خوف سے چادر میں چہرہ۔

وہ منتظر رہا۔ وہ کچھ کہتی ہے' کوئی داد فریاد' کوئی دہائی۔

وہ تو ایسے آئی تھی اور دلچسپی سے در و دیوار کو دیکھتی تھی جیسے دیہات سے آئے لوگ چڑیا گھر کو۔ وہ دیکھ رہی تھی کوکی کیک کے رنگ کا گھر باہر والے گیٹ سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اب اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔

"کس سے ملنا ہے؟"

گن مین نے بیزاری سے اور اندر کتوں نے غصے سے بھونک کر پوچھا تھا۔

"سارہ حق کا گھر یہی ہے۔"

سوال ہی احمقانہ تھا۔ گھر کے نام کی تختی گولڈ پلیٹڈ — میں سامنے ہی جگمگا رہی تھی اور وہ یہ بھی دیکھ سکتی تھی کہ اس نام کی خطاطی اپنے وقت کے مشہور اور انتہائی مہنگے خطاط کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

"کیا نام ہے آپ کا۔" گن مین کا خشک اور مشینی لہجہ۔

"عبیر... عبیر عباس!"

اس نے واکی ٹاکی پر اندر کسی سے دیر تک بات کی۔ ڈبل لیف کے دروازے کا تنگ والا حصہ اندر کے ایک کلک سے خود بخود unlock ہوا۔ بڑا والا بھی ہو جاتا' اگر وہ کار میں بیٹھ کر آئی ہوتی۔

"کتے بندھے ہوئے تو ہیں نا؟" اس نے دایاں قدم اندر رکھتے ہی ہچکچا کر پوچھا۔ اسے خود بھی اپنی اس بزدلی کا دکھ ہوتا تھا۔ اور اس سے زیادہ دکھ کہ اس قدر ڈرپوک ہو کر بھی وہ کیسے کیسے مشکل کاموں میں ہاتھ ڈالتی تھی۔

گن مین منہ پھیر کر ڈیوٹی پر واپس آگیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس نے کتوں کے سلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کے چہرے پر ایک تضحیک ضرور تھی۔

اس گھر میں آنے والوں کی قسمیں ہیں' اور وہ ہر قسم سے آگاہ تھا۔ ان سے بھی جو "ہاؤ سویٹ" کہہ کر کتوں سے چمٹ جاتی ہیں۔ یا "نائس ڈوگ" کہہ کر دور سے راہ و رسم بڑھاتی ہیں۔ اور اس نسل سے بھی جو چیخ مار کر کسی قریب کھڑے آدمی سے چمٹ جاتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں بشت بشت کرتے کوئی کوئی سا ہاتھ لگ جائے تو اس کتے کو دے ماریں۔ گھر والے جہاں انسانی حقوق کے علمبردار ہیں' وہاں انسداد بے رحمی حیوانات کے بھی قائل ہیں۔ لہٰذا آپ کتے کو ڈنڈا نہیں مار سکتے۔ وہ آپ کو کاٹتا ہے تو چپ چاپ کٹوا لیں۔

وہ اس کو اور جانوروں کو "آپس میں خود نمٹ لو" جیسے ارادے سے اپنے کیبن میں پھر اٹینشن اور ساکت کھڑا ہو گیا۔ فیصلہ کی کسی گھڑی میں اس نے اپنا دوسرا قدم بھی اندر رکھ دیا۔ باہر کی دنیا باہر رہ گئی' ایک نئے جہان میں اس کا قدم تھا۔

اس کے دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ ایک وسیع ڈرائیو تھی اور بائیں ہاتھ لش گرین آسٹریلین گھاس۔ جو اس جھلسائی گرمی میں بھی پگھلے زمرد کی طرح یہاں سے وہاں تک بہہ رہی تھی۔

پتھر سے بنے بڑے بڑے foot steps گھاس کو تکلیف نہ دے کر لان میں چہل قدمی کرتے جھولے تک جانے کے لیے ہے۔ جس کے کونے میں ایک کینوپی تھی اور نیچے بچھی براؤن دھاریوں والی کینوس کی سفید کرسیاں' کیا آرام دہ ماحول تھا۔

وہ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھاتی رک گئی۔ اندر کی عمارت میں داخل ہونے والا دیو ہیکل دروازہ بند تھا۔ دروازے کے ساتھ لگے سرسبز شاداب گملوں کے پاس اس نے رک کر سوچا۔ اب بھی وقت ہے پلٹ جاؤں۔

اور یہ پہلی دفعہ نہیں تھی کہ وہ جب بھی کچھ کر گزر رہی ہوتی تو اسے شدت سے احساس ہوتا' اس نے کیا حماقت کی۔ پلٹنے کا وقت بھی گزر گیا۔ کسی خاتون نے دروازہ کھول دیا تھا۔ از سر نو شناخت کے مراحل سے گزر کر مکمل تحقیقات کے باوجود اسے سر سے پاؤں تک دیکھا گیا۔ (یہ تو انگلش چینل سے کراس کرنے سے بھی مشکل نکلا۔)

"آپ بیٹھیے۔" اس کو بٹھا کر وہ ایک اور دروازے میں غائب ہو گئی۔ وہ چپ چاپ منتظر بیٹھی کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔ کونسول پر سجے پیور سلک کے اصل سے قریب تر پھول۔ کبھی گمان ہوتا اس میں سے تازہ پھولوں کی مہک بھی آ رہی ہے۔ سائیڈ بورڈ پر چاندی کے چمچماتے برتن۔ دیواروں پر لگی abstract پینٹنگ۔ کبھی گھر کے مکینوں کے مزاج کا پتا دیتے تھے' اب تو یہ ڈیکوریٹر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

"آتی ہوں گی ابھی۔" اس نے اطمینان سے بیٹھتے سوچا' اس سے قبل کہ اس کا اطمینان بے صبری کی حد میں داخل ہوتا دروازہ کھول کر ایک اور خاتون داخل ہوئیں۔

"آئیے۔"

"چلو۔ یہ کیا عورتوں کو آزاد کرائیں گی۔ جو خود ایک کنیز کی طرح دیوار در دیوار پتھروں میں چُنی ہوئی ہیں۔" وہ اٹھ کر خاتون کے پیچھے ہولی۔

"بے چاری ہماری Elite کلاس۔ انہوں نے اپنے لیے سکون سے جینا بھی حرام کر لیا ہے۔" وہ اس خاتون کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تو لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک گئی۔ "ایک غیر معمولی لمبے چوڑے کمرے میں جس کے فرش اور دیوار کا ایک ایک انچ آرائش سے ڈھکا پڑا تھا۔ دور ایک کونے میں ان کا مختصر سا وجود اپنے سے دگنے صوفے والی کرسی میں سمایا ہوا تھا۔ سفید کپڑوں پر سرخ لپ اسٹک کی تازہ تہہ کے ساتھ وہ جس کرسی پر بیٹھی تھی

www.pkdigest.com

اس کے بازو gold plated تھے۔

"بیٹھو۔" وہ اس تپاک سے ملیں تو اسے اندازہ ہوا' صرف وہی ان کو بغور نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کا اپنا جائزہ بھی اسی شدت سے لیا جارہا تھا۔ لیکن چونکہ قیصر کے بقول وہ چوٹی کے لیڈروں میں سے تھیں' اس لیے ان کو اپنے چہرے کے تاثرات کو بے تاثر رکھنے میں کمال حاصل تھا۔

"اس دن میں نے تمہیں دیکھا تو تھا' مگر مجھے علم نہیں تھا وہ پلے تمہارا لکھا ہوا ہے بعد میں پتا کیا تو سوچا تم سے ملنا چاہیے۔"

عنبر اس دن سے مسلسل اس الجھن میں مبتلا تھی۔ جب اس کی تعریف ہوتی تو وہ پروفیشنل کی طرح محض مسکرا کر تھینک یو میں قبول نہیں کرسکتی تھی۔ بہت انکساری کا مظاہرہ کرتی تو لوگ منافق کہہ دیتے اور سنجیدہ رہ جاتی تو لوگ کہتے ایک پلے لکھ کر سر پر چڑھ گئی ہے۔ اسی الجھن میں اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"پچیس' چھبیس سال کی عمر میں اتنی پختہ تحریر کوئی آسان کام نہیں۔" اس کی عمر میں تین' چار سال کا اضافہ انہوں نے از خود کردیا۔

"تمہیں دیکھ کر آج میں خود کو بہت یاد آئی۔ ابھی دو' چار سال پہلے جب میں تمہاری عمر کی تھی۔" اسی تمکنت سے اس کے سامنے والی کرسی پر بے نیازی سے استادہ رہی۔ اپنے حصے کے دو سال کسی دوسرے کے پلڑے میں ڈال کر اس بندر بانٹ کی کیا ضرورت تھی بھلا۔

"مگر اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔" اس نے انار کے رس کا ایک گھونٹ بھر کے سوچا' کچھ لمحوں کے لیے جیسے ایک اجنبی سی خاموشی ان کے درمیان منڈلائی۔

"امتحان تو اب شروع ہونے والے ہیں نا۔ کیا سوچا ہے زندگی میں کیا کرنا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ بڑی خوف ناک بیروزگاری ہے۔ کرنا تو جاب ہی چاہتی ہوں۔"

"ہمیں جوائن کروگی؟" گویا انٹرویو شروع ہوگیا تھا۔

"آپ کو؟ یعنی "عورت فرنٹ" کو۔ پتا نہیں۔" اس نے کسی منافقت کے بغیر کہا۔ اس کی صاف گوئی ان کو کچھ پسند نہیں آئی' غالباً" ان کے چہرے کا رنگ بدلا۔ پھر واپس نارمل ہوگیا۔ وہی سیاسی بے رنگی۔

"آج ہماری عورت معاشرے کے جبر میں پس رہی ہے۔ مرد بھی اس کا شکار ہے' لیکن مرد صرف معاشرے کی مار سہہ رہا ہے' عورت' مرد کے استحصال کا بھی شکار ہے اور معاشرے کے جبر کا بھی۔ اس پر دوہرا ظلم ہوتا ہے۔ کبھی گاؤں جاؤ' وہاں کی عورت کی حالت دیکھو۔ یا شہر کی کسی غریب عورت کو ظلم سہتے دیکھو۔ آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں۔ عورت کا گھرانہ صاحب جائیداد ہے تو بھی اس کی قرآن سے شادی کردی جاتی ہے۔ باپ' بھائی' شوہر' وہ سب سے بچنے کے لیے پیدا ہوتی ہے' حتیٰ کہ مسجد کا مولوی بھی اسے جہنم کے سوا کہیں بھیجنے کے لیے تیار نہیں۔"

ایک اور خاموش وقفہ آگیا۔

"میرا مطلب ہے۔" اس نے اپنی اصلاح کی۔ "عورت کے لیے تو انسان یوں بھی کام کرسکتا ہے' بغیر جوائن کیے۔"

"جاب کرکے تمہیں ہوسکتا ہے اپنا گروپ چھوڑنا پڑے۔ اپنی آرگنائزیشن' کیا تم اپنی جماعت کے ساتھ مخلص ہو؟"

"ہوں تو' میرا نہیں خیال میری آرگنائزیشن یہ شرط لگائے گی کہ میں نوکری نہ کروں۔"

"اس میں بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ یہ کوئی جمہوری ملک تو ہے نہیں۔ ہوسکتا ہے تمہیں جیل جانا پڑے۔"

جیل کا آئیڈیا اسے پسند نہیں آیا۔ جیل اندر سے تو کیا اس نے کبھی باہر سے بھی نہیں دیکھی تھی۔ سنا ہے دادا نے انگریزوں کی جیل کاٹی تھی' جب انگریز بہادر نے ان کو بے بات تھپڑ مارا تو انہوں نے بے سوچے سمجھے جواباً" اس کو تھپڑ جڑ دیا۔ اور کہا ہمارے وطن میں ہم پر غراتے ہو۔ انگریز ان کے لفظ تو شاید پورے نہیں سمجھا' لیکن تیور سمجھ گیا۔

نتیجے میں جیل ہوگئی۔ اسی دوران ملک آزاد ہوگیا۔ ابا جان اور ان کے بھائی لٹے پٹے پاکستان آگئے' کسی کو خیال نہیں آیا ملک آزاد ہونے پر اس چھوٹے موٹے مجاہد کو بھی آزاد کرالیا جائے۔ وہ وہیں گزر گزرا گئے۔ ویزے' پاسپورٹ کی سہولتوں کے بعد جب بڑے تایا ان کو ڈھونڈتے پھرے تو پتا چلا کئی سال ہوئے ان کو ختم ہوئے۔ محکمہ جیل کے پاس یہ ریکارڈ موجود نہیں تھا' ان کی قبر کہاں ہے' اور یہ بھی نہیں کہ وہ کس جرم میں قید تھے۔ بس جیل سے اس کا اتنا ہی تعارف تھا۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ تھپڑ مار کر ہی جیل جایا جائے۔ آج کے عہد میں ہم تھپڑ بھی کھاتے ہیں اور جیل بھی جاتے ہیں... سارہ حق آرگنائزیشن کے ضوابط' قائدے' قانون' سیاست کی باریکیوں پر اس سے بحث کررہی تھیں۔ وہ براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھتے جانے کون کون سے زمانوں کی کررہی تھی۔

سارہ حق کا خیال تھا وہ دم بخود بیٹھی ہے۔ شاید مرعوب ہوگئی ہے۔ ان سے مرعوب ہونا کوئی نئی بات نہیں' وہ عادی ہیں۔ لیکن مڈل کلاس لوگ جو ڈگریوں کے حصول میں اپنی جان مارتے ہیں' بعض اوقات متاثر ہونے والی چیزوں سے سرسری گزر جاتے ہیں۔

یہ دنیا بھی بھانت بھانت کے لوگوں سے بھری پڑی ہے' ہم جہاں رہتے ہیں ایک عجائب خانہ ہے ہر شیلف پر ایک نئی چیز رکھی ہے۔ حالانکہ ہم سمجھتے ہیں دنیا بس اتنی ہی ہے جتنے حصے میں ہم رہتے ہیں۔ اور لوگ بھی بس ایسے ہی ہیں یا اس سے کچھ ملتے جلتے' عنبر نے سوچا۔ انسان کا مطالعہ کس قدر دلچسپ چیز ہے۔ جاسوسی ناول کی طرح' اگلے صفحے پر کیا ہوگا' نہیں پتا۔

ان دونوں نے اپنے اپنے حساب سے ایک دوسرے کو پڑھنے کی کوشش ترک نہیں کی۔

"ہماری عورتوں میں بہت inhibitation ہے۔ خاص طور پر ہمارے شہر کی لڑکیوں میں۔"

ہاتھ پھیلا کر اور انگلی میں رنگ برنگی شعاعیں دیتے نگینے کے ساتھ ان کی تقریر جاری تھی۔

"ہمارے گھر کے مرد... باپ' بھائی' شوہر ہمیں خود مختار دیکھ کر جل جاتے ہیں۔ وہ ہمیں عمر بھر سے ڈکٹیشن دینے کے عادی ہیں۔ یہ مت پہنو' یہ مت کھاؤ' ایسے مت ہنسو' اس کے ساتھ مت گھومو۔"

انہوں نے تھم کر اس کے چہرے کا تاثر دیکھا۔

"ہم خود بھی یہ سچ سننے کے لیے تیار نہیں۔ مگر یہ حق ہے کہ ہمارے راستے کی رکاوٹیں ہماری اپنی ہیں۔ اگر تمہارے گھر کی رکاوٹیں تمہارے گھر کے مرد ہیں تو بھی بتادو۔"

"جہاں تک میں جانتی ہوں۔" اس نے ٹھہراؤ سے کہا۔ "میں خود مختار ہوگئی تو میرا بھائی نفلیں پڑھے گا۔ اس کی آدھی زندگی میرے کام کرتے بسر ہوئی ہے۔"

"ہم۔" وہ سوچ میں غرق ہوگئیں۔ "اس کا مطلب ابھی نیچ ایج سے نہیں نکلیں۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس کی رکاوٹیں ہٹانا چاہتی ہیں یا ڈالنا چاہتی ہیں۔

عنبر نے انکار نہیں کیا' سوا اپنی زندگی میں انقلاب لانے کا درس دینے کے لیے ان کی تقریر لنچ تک اور لنچ کے دوران جاری رہی۔ مبہم سے الفاظ' اور ان میں شامل نصیحتیں' ہدایات کا موضوع وہ خود تھیں اور اپنا آئیڈیل بھی وہ آپ۔

www.pdfdigest.com

سماجی شعور' طبقاتی جدوجہد' مرد کا معاشرہ' مظلوم عورت اور انقلاب انقلاب' جدوجہد' جدوجہد بھاری بھرکم الفاظ کے بوجھ تلے پستی عبیرہ کچلی جارہی تھی اور آنکھیں چھپک چھپک کرتکتے رہنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

کھانا سست روی سے کھایا گیا۔ دو افراد کو کھانا کھلانے والوں کی تعداد پانچ تھی۔ بٹھایا کہیں گیا تھا' کھانا کہیں اور بیٹھ کر کھایا۔ پوسٹ لنچ ٹاک کے لیے کوئی تیسری جگہ چنی گئی اور شام کی چائے کھلے آسمان کے نیچے ٹیرس پر۔ اسی دوران لاتعداد فون کالز ریسیو کیں۔ آفس میں کام کی ہدایات جاری کیں اور کسی پرائیویٹ چینل پر ایک اہم مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کیا' اہم خاتون' اہم تر کام۔

ایک تھکا دینے والا دن آخر اپنے انجام کو پہنچا۔ درختوں کی چوٹیاں جاتی دھوپ سے سنہری ہوکر جھلملا رہی تھیں۔ وہ اسے رخصت کرنے دروازے تک آئیں۔ چاروں طرف نظر گھما کر جب انہیں ڈرائیوے پر کوئی اجنبی گاڑی نظر نہ آئی تو انہوں نے احتیاطاً" پوچھ لیا۔

"تمہارے پاس کوئی سواری ہے؟"

"باہر سے رکشہ مل جائے گا۔"

"یہاں کہاں رکشہ۔ اتفاق ہی ہے کہ کوئی سواری اتنا اندر آئی ہو۔ ٹھہرو میرا ڈرائیور تمہیں چھوڑ دے گا۔"

وہ خود بھی اس بات سے نابلد تھی کہ شہر لاہور میں کوئی ایسی جگہ بھی ہوسکتی ہے' جہاں رکشہ والے ایک قطار میں کھڑے ڈیزل نہ پھونک رہے ہوں۔ وہ تو خود بھی ابھی رکشہ سے اتری تھی۔ لیکن شاید پسند نہیں کرتی تھیں' ان کے لوگ اس کو رکشہ سے جاتا دیکھیں۔

کار کا دروازہ بند کرتے انہوں نے کھلے شیشے سے جھانک کر اسے دیکھا۔

"تم لالا کو کیسے جانتی ہو۔"

"کون لالا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

ان کے چہرے پر ناگواری سی آگئی۔

"کم آن۔ لالا نے کہا ہے تو میں تم سے ملی ہوں۔"

"کون لالا؟" اس نے اب خود سے پوچھا تھا۔ جب ہم ہر وقت جھوٹے اور منافقوں کے درمیان رہتے ہیں تو کوئی پورا پورا سچ بولتا آدمی بھی آپ کو سچا نہیں لگتا۔

وہ بے اعتباری سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ "خدا حافظ۔"

پہلے ہی پتا تھا' اس نے سیٹ سے ٹیک لگاتے ایک اطمینان کا سانس لیا۔

کسی اور کے دھوکے میں اس قدر خاطر مدارات ہوگئی' لیکن اتنا تو ہوا اچھے لوگ۔۔۔!

☼ ☼ ☼

چچی صحن کے کونے میں نل کے کنارے سیمنٹ کی ایک اینٹ کی بنی منڈیر پر بیٹھی دیگچیوں کے تلے کی کالونس لوہے کی سپی سے رگڑ رگڑ کر اتار رہی تھیں۔ نلکے پر کپڑے کی دھجی چھینٹوں سے خود کو بچانے کے لیے پانی کو ڈسپلن کرنے کے لیے بندھی تھی۔ پھر بھی چچی کے کپڑے جھاڑ جھنکار ہوگئے تھے۔

برتنوں کا ایک ڈھیر کمرے میں پڑا تھا۔ تانبے کے بے قلعی گلاس' پلاسٹک کی پلیٹیں' کمرے کے کچے فرش پر اوندھے پڑے تھے۔ چچی کی پیشانی پر تین موٹے موٹے عمودی بل تھے۔ ان کا ٹریڈ مارک' ان دونوں کو آتا دیکھ کر بھی ان کے چہرے پر کوئی خاص بشاشت نہیں آئی۔

"کم بخت کام والیاں۔" انہوں نے بیزاری سے کہا۔ "روٹیاں لگ گئیں ان کو۔ کام کاج کرتے جان جاتی

ہے مانگنے کو منہ ہر وقت کھلا۔ یہ دے دو' وہ دے دو۔" "وعلیکم السلام۔" ان کی آواز پیسے والوں کی سی مخصوص رعونت تھی۔ عبیرہ ان کے پاس ہی مونجھ کی پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

"چچا کہاں ہیں؟" عثمان کی فوری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بھی عبیرہ کی طرح ایک چوکی پر بیٹھ کر آسانی وقل سے برتنوں کی رگڑائی شروع کردے یا کوئی دوسرا دروازہ دیکھے۔

"ارے بچے! ہوتے کہاں۔ آرام فرمارہے ہوں گے۔" انہوں نے اسی بیزاری سے کہا۔ "کام ہی کیا ہے دن بھر میں۔ اخبار پڑھ لیا' خبرنامہ دیکھ لیا' کھالیا سو گئے۔"

باورچی خانے کی کھڑکی کا پٹ کھول کر فوزیہ نے سر باہر نکالا۔

"آہ عبیرہ باجی۔" عبیرہ باجی اس لیے کہ وہ خود پچھلے کئی سالوں سے ایف اے کا امتحان دے رہی تھی۔ وہ کسی سے ملتی تو یہ ضرور کہتی۔ "میں نے ایف اے کا امتحان دیا ہے' اسی سال۔"

ان کے ہاں پڑھائی کو بہت سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا۔ جس کا جی چاہا پڑھ لیا۔ نہیں تو کوئی ضروری نہیں گھر بیٹھو عیش کرو' چچی کے بقول "روٹیاں توڑو۔"

روٹی ان کے گھر عالبا" وافر پکتی تھی اور وافر بچتی تھی کہ اکثر صحن میں دھوپ میں پڑی چارپائی پر سوکھتی رہتی تھیں' روٹی سکھانے کا کلچر کہاں تھا؟ یہ اسے بعد میں ہی پتا چلا کہ سوکھی روٹیاں ہاون دستے سے کوٹ کر مرغیوں کا دانہ تیار کیا جاتا ہے۔

"واؤ۔" عبیرہ نے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ "بڑی خوب صورت امبرائیڈری ہے شرٹ پر۔ خود کی ہے؟"

اس نے ناک چڑھائی۔

"مجھے تو گنواروں کی طرح ایسے کام کرنے بہت برے لگتے ہیں۔"

عبیرہ نے چپ چاپ ایک نظر صحن پر ڈالی۔ رات جن چارپائیوں پر سویا گیا تھا' وہ اسی طرح صحن میں آڑی ترچھی ... بستروں اور تکیوں کے ساتھ اپنی اپنی جگہ دھوپ میں تپ رہی تھیں۔ ... پھیلانے والے ... ایسے لگ رہے تھے جیسے گرم حمام کی دکان کے باہر لٹکے ہوتے ہیں۔ شور مچاتی بھاگتی اور بھاگنے میں بیٹ کرتی مرغیاں بستروں پر چڑھی تھیں' اور روہ بجا رہی تھی۔

"یہ تو جب بھائی جان پچھلی دفعہ چھٹی پر آئے تو احمد پور سے لے کر آئے تھے۔ آپ یہ تو بتائیں آج ہمارے گھر کیسے بھول پڑیں۔" فوزیہ نے طنز کرنا نیا نیا سیکھا تھا۔ ناپختہ مہارت کا بھونڈا پن اس کے وار کرنے میں نمایاں تھا۔

"دادی اماں نے کہا تھا۔ ان کی خیریت پوچھ کر آؤ۔ شہریار نے بھی کہا تھا میرے گھر ہو کر آنا۔"

عثمان نے اندر جاتے جاتے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی بہن ایسی ہی بے وقوف تھی۔ لوگ کیا پوچھ رہے ہوتے ہیں' ان کے لفظ کیا کہتے ہیں اور ان کو کیا جواب دینا چاہیے۔ یہ اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا تھا۔

فوزیہ کی نظر پلٹ کر دیکھتے عثمان پر پڑی۔ وہ آسمانوں میں اڑنے لگی۔ ہیرو جیسی شکل والا عثمان عباس یوں ہی لوگوں کی انگلیاں زخمی کررہا تھا اور پھر بھی بے پروا رہتا تھا۔

برتن عبیرہ نے سنبھال لیے تھے' اس لیے چچی کے ہاتھوں میں سستی اور زبان میں تیزی آگئی تھی۔ بڑی والی پر سسرال میں ڈھائے جانے والے ظلم' بے چارے بیٹے کو امریکہ لے کر بھاگ جانے والی بہو' برے وقت میں کام نہ آنے والی سسرال' خالہ ماموں کے دیے کپڑے پہننے والی ان کی بے بیاہی بیٹی' جگہ جگہ پھرتا ان کا بیٹا' ان لوگوں سے میل بڑھاتا جو ان کو پسند نہیں' اور جو ان کے کہنے میں بالکل نہیں تھا۔

ایک ہاتھ سے مکھی اڑاتی' لہجے میں ملامت اور شکوہ ملا جلا' ان سے بات کرو تو لگتا تھا مدت سے کوئی سامع ان کو نصیب نہیں ہوا' اور درمیان درمیان میں لقمے دیتی فوزیہ۔

www.pkdigest.com

"اور کیا۔۔۔ شہریار بھائی سے تو اتنا بھی نہ ہوا۔"
"ان سے حالانکہ کہا بھی تھا کہ۔۔۔"
ہم سب اس قدر دکھی اور تلخ کیوں ہیں ہم نجات کیوں نہیں پا لیتے یا اس کے عادی کیوں نہیں ہو جاتے۔
اندر کہیں کمرے میں کسی فلمی گانے کا میوزک بجا۔ فوزیہ اچھل کر کھڑی ہوئی۔ "میرا فون۔"
"مجھے ماموں نے لے کر دیا ہے۔" وہ سیل اٹھائے باہر آئی۔ "بائیس ہزار کا ہے' کیمرہ بھی ہے۔"
اس کے علاوہ موبائل میں کیا کیا ہونا چاہیے' اس کی اس کو پروا نہیں تھی۔ برتن دھو کر تولیے سے ہاتھ پونچھتی عبیر کی تصویر اس نے کھینچ کر دکھائی۔ کچھ چیزیں (اسٹیٹس سمبل) ہوتی ہیں' موبائل فون بھی ان میں سے ایک تھا۔ لیکن تھا۔ اب لوگ سائیکل سواروں اور ریڑھی والوں کے ہاتھ میں فون دیکھ کر بدمزہ ہوتے ہیں' اب معیار بدل گئے ہیں۔ لوئر کلاس کو مڈل کلاس میں آتے دیکھنا لوگوں کو پسند نہیں۔
عبیر نے اس کو کمرہ کا رعب جماتے اور چہرے پر موبائل کا غرور طاری کرتے دیکھا تو اس کا دل شاد باد ہو گیا۔ پتا نہیں کون کون سی حسرتیں ہم دل میں لیے گزر جاتے ہیں۔ دنیا سے اتنے شکووں کے باوجود اس کی ایک خواہش تو پوری ہوئی۔
چچی برتنوں والا ٹوکرا سیٹ کرا کے انہیں تو مہمانوں کی خاطر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ٹرے میں چائے کے تین مگ اور سیبوں کی ٹوکری لیے وہ کمرے میں آئیں تو ان کی قمیص بھیگ کر پیٹ سے چپکی ہوئی تھی۔
"اے سی کیوں نہیں لگایا۔" انہوں نے بیٹی کو ٹوکا۔
"میں کمرے میں کب تھی' میں تو چائے بنا رہی تھی۔" اس نے ناگواری سے کہا۔ "میں ہوتی تو فوراً" چلا لیتی۔ مجھ سے تو اے سی کے بغیر ایک منٹ نہیں بیٹھا جاتا۔"
چچا اپنے مؤدب بھتیجے سے اپنے پسندیدہ موضوعات پر بحث کر رہے تھے۔
نائن الیون' وانا' وزیرستان' شہریار۔
چچی اپنے آپ میں مسکرائیں۔ "فوج میں چلے جاتے تو عثمان میاں تم بھی ٹھاٹھ سے افسری کرتے۔"
ان کو اس کا مستقبل تاریک رہ جانے کا بڑا قلق ہوا۔ عثمان مسکرایا۔ وہ ایسے دلچسپ کرداروں کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتا تھا۔ جیسے چچی اس کے سرہانے رکھی کتابوں کے انبار میں سے ایک ہوں' چچا خاموش ہو گئے۔ ان کی پائنتی کی طرف بیٹھا بھتیجا زیر لب مسکرا رہا تھا۔ یہ ان کے گھر میں تہذیب کا ایک حصہ تھا جو آباؤ اجداد سے چلا آتا تھا کہ جب آپ کسی ایسی چارپائی پر بیٹھیں جس پر کوئی بزرگ تشریف فرما ہوں تو آپ چارپائی کے سرہانے والی طرف نہیں بیٹھتے۔
چچی نے گفتگو جاری رکھی۔ "نوکری لگی کہیں؟"
"جی نہیں۔"
"اے لو اتنا پڑھنے کا فائدہ۔"
"جی! قطعی کوئی فائدہ نہیں' بے کار ہے۔"
ان کی خواہش تھی اس کے ذریعہ آمدن پر سیر حاصل تبصرہ کرتیں' لیکن جو بات عثمان کو نہ کرنی ہو اس سے کوئی اگلوا نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر انہوں نے پھر کسی موضوع کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں ماریں۔
انفارمیشن کے اس عہد میں جب زمانہ پوری دنیا سے خوب باخبر تھا' وہ بے خبر رہنا نہیں چاہتی تھیں۔ کسی کے گھر میں کیا ہو رہا ہے' کی اطلاع لینے کے لیے انہیں سوالات کا ڈھیر لگانا پڑتا تھا۔
"سنا ہے تنویر کا شوہر اخبار و خبار میں کام نہیں کرتا۔ امریکہ کے کسی جاسوسی ادارے کے لیے کام کرتا ہے؟"

"ہمارے سسر بھی خوب تھے' سب کو پڑھا دیا' بس چھوٹے والے کو جاہل رکھا۔ ہمارے نصیب۔ سنا ہے مزاج کے بہت تیز تھے۔ غصے میں کسی کا سر پھاڑ دیا' عمر قید ہو گئی' مزاج تو ان کا بھی ہو بہو باپ پر پڑا ہے۔ ارے ہم سے پوچھو تم پر تو بہت مہربان ہیں' چچا جو ہوئے۔"
چھک چھک چلتا انجن پٹری بدل دادی اماں پر آگیا۔
"ہمارے گھر تو رہتی نہیں' بابا جہاں رہتی ہیں' وہاں آسائش زیادہ ہے۔ پھر اولاد سے تو محبت نہ ہوئی آسائش سے ہوئی۔"
"بڑی تائی کہاں ہیں آج کل؟ سنا ہے کریم بی کے کمرے میں بھی اے سی' لیکن ان کے کمرے میں صرف پنکھا۔ ملی تھیں شکایت کر رہی تھیں۔"
"اچھا شکایت کر رہی تھیں۔" عبیر نے رسان سے کہا۔ "میں پوچھ لوں گی کہ چچی نے کہا ہے۔" چچی کا رنگ فق ہو گیا۔ بھائی عباس کی اولاد سے کچھ بعید بھی نہیں۔
"اے لو۔ وہ کیا مانیں گی' ایسے ہی میری چولی پھڑواتی ہو۔"
وہ گڑبڑا کر اپنی دودھ پتی کا مگ (جسے انہوں نے مسلسل کپ کہا تھا۔) تھام ہاتھ میں لیے باہر نکل گئیں۔
عثمان نے ایک اطمینان بھری مسکراہٹ سے عبیر کی طرف دیکھا۔ ہتھیار پھینک دیے گئے تھے' سفید جھنڈا لہرا رہا تھا۔
اب امن تھا' عارضی امن' ہر دو جنگوں کے درمیان کا وقفہ۔
وہ جب طویل سیدھی سڑک پر مارچ کرتے رکشہ کی تلاش میں فٹ پاتھ پر مرے مرے قدموں سے چل رہے تھے تو عبیر نے خود کو بہت بوجھل محسوس کیا۔ ابا کے عزیز بھائی کی دیکھ بھال کی ذمے داری بھی عثمان پر عائد تھی۔ شہریار کی وہ دور دراز کی پوسٹنگ کی وجہ سے یہ بھی اس کے ذمے تھا۔ اور وہ ایسا ویسا' چچا کے گھر تنہا جاتے خوف کھاتا تھا۔
"بھائی!" عبیر نے جیسے کنویں کی تہہ سے پوچھا۔ "دنیا میں اتنے دکھ کیوں ہیں۔ لوگ ان دکھوں کے عادی کیوں نہیں ہوتے۔ ان میں اتنا غصہ کیوں ہے؟"
"اب ہر کوئی برگد کے نیچے تو بیٹھنے سے رہا۔" عثمان نے فلسفی نظر آنے کی کوشش کی۔ "بات یہ ہے۔ ہم اپنی ناکامیوں کی ذمے داریاں کسی اور پر ڈال کر ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں کہ ہم نے کوشش کی مگر فلاں فلاں شخص ہماری راہ کا روڑا بن گیا۔ اس طرح ہم بری الذمہ۔ پھر بیٹھے اس فلاں شخص کو کوستے رہتے ہیں۔ ابتدا" تو اس کا یقین لوگوں کو دلاتے ہیں۔ پھر ہمیں خود بھی ایک دن یقین ہو جاتا ہے کہ سچائی دراصل یہی ہے۔ اگر خود کو نااہل قرار دے دیا جائے تو امید ختم ہو جاتی ہے۔ وہ مایوسی بڑھ جاتی ہے۔"
"تمہیں نہیں لگتا۔ ڈوک اس ماحول میں Misfit ہے۔"
گھر گھر کرتے رکشہ کے ایک دروازے سے اس نے داخل ہوتے پوچھا۔
"وہ بے چارہ فیلڈ ایمبولینس کے ایک خاکی شامیانے میں بیٹھا صحرا کی خاک پھانک رہا ہے۔۔۔ اور بہت۔۔۔"
رکشہ والے نے رکشہ کی زمین سے starter اٹھایا۔ اندر شور میں اضافہ ہو گیا تھا' اس کو جملہ مکمل سنائی بھی نہیں دیا۔
"بھائی!" دو منٹ کی خاموشی کے وقفے سے اس نے اڑتے بالوں اور پھڑپھڑاتے کپڑوں کو سنبھالتے خوف سے لرزیدہ کچھ سہمی آواز نکالی۔
"سوچو۔ اگر تمہاری شادی فوزیہ سے ہو تو تم کیسی زندگی گزارو گے۔"

www.pkdigest.com

عثمان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کس قسم کے وہم اس کو ستاتے رہتے ہیں۔

"تمہیں پتا ہے۔ ہمارے ہاں شادی ہو نہیں جاتی کی جاتی ہے' سو ہم لوگ جس سے شادی کرنا چاہیں گے وہی ہوگی۔ یہ فلمی شادی ہمارے گھر میں نہیں ہوئی کہ ماں نے مرتے مرتے وصیت کی تھی۔ لاحول ولا۔"

اماں نے ساری کتھا سن کر انتہائی سکون سے کہا۔ "جہالت..... نسل بانسل کی جہالت....."

"اس کا مطلب ایم اے' پی ایچ ڈی' دنیا سے او ہیں نہیں؟"

بی کریم کے والے سے کنکر چنتے ہاتھ تھن ہی میں ساکت ہو گئے۔

"ارے بی بی اگر تمہارے ہفتے بھر کے سوالوں کی گنتی کی جائے تو لاکھ سوا لاکھ تو ہوتے ہوں گے۔ سوا لاکھ کا کلمہ نکال لیتیں تو اجر بھی ملتا۔"

وہ چپ ہو گئی۔ کریم بی کے اس جملے میں بریکٹ میں لکھا تھا۔ "بک بک بند کرو۔"

☼ ☼ ☼

کانفرنس ہال کے سبز زمردیں شیشوں کی کھڑکی سے اس نے باہر جھانکا۔ باہر ٹریفک کا اژدحام تھا۔ شیشوں سے منعکس سبز دھوپ کے قتلے' ہر کھڑکی کے ساتھ ساتھ اندر ہال کے فرش پر بچھے ہوئے تھے۔ ایک ہلکی سی درز سے آتی روشنی کی لکیر میں ناچتے رنگ برنگے ذرات اپنا تماشا دکھا رہے تھے۔

اس نے کھڑکی سے ٹیک لگائے ایک نظر باہر کی طرف ڈالی۔

گول چکر کے گرد سارے رکشہ' کاریں ایک دائرے میں گھوم رہے تھے۔ جیسے ہم بچپن میں بازو پھیلا کر اور آنکھیں بند کر کے گول گول چکر کھاتے تھے اور اس وقت تک گھومتے رہتے جب تک دھڑام سے گر نہ پڑیں۔ پھر فرش پر لاش کی طرح ساکت پڑے کتنی دیر اس کیفیت سے گزرتے رہتے۔

ٹریفک اندھا دھند گھوم رہا تھا۔ آنکھیں بند کر کے بچوں کی سی تیزی سے۔ اس کا جی چاہا' دوڑتی ٹریفک کو روک کر پوچھے۔ کدھر کو جاتے ہو۔ کہاں ہے تمہارا کونڈا۔

لیکن شاید وہ نہ رکتے۔ نہ جواب دیتے۔ کہ لوگ ہمیشہ جلدی میں ہوتے ہیں۔ کبھی زمانہ آہستہ چلتا تھا۔ لوگ دھیمے لہجے میں بولتے تھے۔ فضاؤں میں مشینوں کا شور نہیں تھا۔ سست رفتار سواریاں چرخ چوں چلتی تھیں۔ لوگوں میں میلوں پیدل چلنے کا تصور تھا۔ رفتہ رفتہ دنیا نے رفتار پکڑلی۔ شاید خاتمہ قریب آگیا ہے۔ اور دنیا کے کام ابھی ادھورے پڑے ہیں۔ سو ان کو جلدی میں نمٹانا ہے۔

کسی کی نئی کتاب لانچ کی جا رہی تھی۔ وہ کوئی نامی گرامی ادیب تو نہیں تھی کہ ایسی کسی محفل میں اس کا ہونا لازم ہوتا' اس کو تو حمیرا یہاں گھسیٹ لائی تھی۔ وہ اس کی مردم بیزاری سے بہت گھبراتی تھی۔

"چلو نا' اتنا مزہ آتا ہے لوگوں کا تماشہ دیکھیں گے۔"

وہ کھڑکی سے لگی ایک نظر باہر سڑک پر دیکھتی' ایک نظر ہال میں ڈالتی تھی۔ وہ دو مختلف چینل ایک ساتھ دیکھ رہی تھی۔ لوگ گروپ کی شکل میں آ رہے تھے۔ عموماً "کسی کتاب پر اتنے لوگ اکٹھے نہیں ہوتے جتنے آج یہاں جمع تھے اور ابھی تو آ رہے تھے۔ ورنہ تقریب رونمائی میں تو لوگوں کو کھینچ گھسیٹ کر منت سماجت کر کے لانا پڑتا تھا۔ (جیسے وہ لائی گئی تھی۔) اس کتاب کا مصنف ایک بیوروکریٹ نہ ہوتا تو اس کتاب کو اتنی پبلک بھی نہ ملتی۔ وہ مسلسل ہجوم میں تھا۔ اتنے کتاب نواز لوگ یہاں بستے ہیں' اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ ان کے چہروں پر زبردستی کی مسکراہٹ طاری تھی۔

یہ ویسے بھی کوئی خالص ادبی قسم کی نشست نہیں تھی۔ اس میں آدھے شوبز کے لوگ' کچھ سیاست دان' زیادہ بیوروکریٹس اور کچھ گنتی کے ادیب شاعر' دانشور بھی تھے۔

گلاس میں برف کی ٹکریوں کے ساتھ گھلتے سوفٹ ڈرنکس ہاتھوں میں تھامے' وہ سب سیاست پر دھواں دھار بحث کر رہے تھے۔ سیاست پر بات کرنا کبھی بند نہیں ہوئی' اس لیے کہ لوگ مطمئن نہیں ہوتے اور لوگ کیسے مطمئن ہوں۔ اپنے طور پر لمبی چوڑی بحثوں میں الجھ کے بڑے زیرک قسم کے تجزیے کر کے بھی ان کا حکومتی امور میں کوئی حصہ نہیں۔ حکمرانوں کے فیصلے من و عن قبول کرنے پڑتے ہیں۔ عوام سے کوئی پوچھنے نہیں آتا ہم کس کھیت کی مولی ہو۔

کچھ سال قبل ادیب بھی اشتراکی اور غیر اشتراکی ہوتے تھے۔ اب وہ تقسیم ختم ہوئی' مگر اس کی باقیات موجود ہیں۔ اب بھی دو طرح کے لکھنے والے اور سوچنے والے لوگ ہیں' اس نے کھڑکی سے ٹیک لگائے دیکھا۔

وہ جو ایک طرف گروپ کھڑا ہے' "آزاد خیال ہے۔ اس کا اپنا خیال ہے کہ وہ آزاد خیال ہے۔ آزاد خیال تو بڑی اچھی چیز ہے' لیکن اس کا خیال اور ذہن کسی اور چیز کا پابند ہو گیا ہے۔ سو اس کی آزاد خیالی بھی ایک ڈبے میں بند ہے۔

دوسرا گروپ وہ ہے' جو ان میں گھلنا ملنا چاہتا ہے' لیکن پرانا گروپ ان کو قبول نہیں کرتا۔ ان میں زیادہ تر شاعر ہیں' بے معنی لفظوں کی تراکیب' بے وزن بے ہنگم شاعری' مگر نوجوانوں خصوصاً" لڑکیوں میں بہت مقبول ہیں۔ اس کم عمری میں بھی تقریباً" ہر ایک پندرہ' بیس شاعری کی کتابیں لکھ بیٹھا ہے۔ ان کا گیٹ اپ بھی ہیرو والا ہے۔ ماتھے پر بالوں کی جھولتی لٹ' گردن میں سونے کی زنجیر' ہاتھ میں کڑا' کان میں بالی' کھلا گریبان' سب نہیں تو ان میں سے ایک چیز ان کے وجود پر ضرور ہوتی ہے جو ان کے گروپ کی پہچان بنتی ہے۔

پرائیویٹ چینل کا مائیک لیے کوئی محنت کش صحافی لوگوں کا انٹرویو کرتا پھر رہا ہے۔

"آپ بہت مقبول سنگر ہیں۔ آپ کو یہ عزت ملی کہ آپ نے انڈیا میں بھی گایا۔ کیا آپ کو پاکستان اور بھارت میں گانے کوئی فرق محسوس ہوتا ہے؟"

جس سے پوچھا گیا تھا اس نے خود کو لیجنڈ سمجھتے ہیروؤں کی طرح کندھے اچکائے' دور خلاؤں میں دیکھا۔

"میں تو ملکی سیماؤں کا قائل ہی نہیں۔"

انڈین فلم انڈسٹری کے دو تین چکروں نے اس کی ڈکشنری تبدیل کر دی ہے۔

"انڈیا میں گاتا ہوں تو وہ فلمی گانا گواتے ہیں' پاکستان میں گاتا ہوں تو یہاں کے لوگ پاپ پسند کرتے ہیں۔ مجھے بھی ذاتی طور پر پاپ پسند ہے۔ اس لیے پاکستان میں بہتر محسوس کرتا ہوں۔" گویا صرف اس لیے۔

انٹرویو کرنے والے کو بھی اس کے بیان میں کوئی قابل گرفت بات نظر نہیں آئی۔

"انڈیا میں ہم سے بہت محبت کی جاتی ہے۔" ایک اور گلوکار۔

"یہ تصور غلط ہے کہ وہ ہمارے دشمن ہیں۔ ہم نے تو جا کر دیکھا ہے' آرٹسٹ کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔"

"وہ پاکستانیوں سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن ان کی ہر چوتھی فلم پاکستان کے خلاف بنتی ہے۔" کسی نے کیوٹے کر کہا۔ "ان کی فلم میں ہر غنڈہ' کرایہ کا قاتل' یا ہیروئن کے بھائی کا نام عبدل یا اسلم ہوتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فلم میں جو پاکستانی غنڈہ دکھایا جاتا ہے' اس کے لیے وہ کسی پاکستانی کو بلاتے ہیں اور وہ بڑے فخر سے یہ رول کر کے سینہ پھلاتا واپس آتا ہے۔"

وہ آپ کے سولہ کروڑ مسلمانوں کا تو بڑا ہی خواہ ہے۔ اپنے ملک میں مسلمان اسے نظر نہیں آتے۔ جن پر سرکاری نوکریاں بند ہیں۔ حساس اداروں کے پاس سے نہیں گزر سکتے' ان کو آگ لگا کر مار دیا جائے تو کوئی پرسان حال نہیں۔

www.pkdigest.com

وہ سب کے سب شاہ رخ اور عامر خان نہیں۔ شبانہ اعظمی کو بھی چلا چلا کر ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہندوستان کی وفادار ہے۔ اور اس کی وفاداری اتنی بااعتبار بھی نہیں کہ وہ ایک مکان لے سکے۔ آپ ان کا صدر دیکھتے ہیں ان کے Talk shows دیکھیں۔ اسمبلی کے سیشن دیکھیں۔ راہ چلتے لوگوں سے پاکستانی کے بارے میں رائے معلوم کر کے دیکھیں۔ آپ بھولے بھالے لوگ ہیں' آپ ان کی نیت نہیں جان سکتے' کیونکہ آپ لوگ ہیں قوم نہیں۔

چینل کا اینکر پرسن وہاں سے مائیک لے کر چلا گیا۔ وہ اس تقریر کرنے والے سے متفق نہیں۔ ذاتی طور پر متفق بھی ہو تو اس کو معلوم ہے پاکستان کا ایک آزاد چینل' حکومت پاکستان کے خلاف رائے دینے میں جس قدر بھی روشن خیال ہو انڈیا کے خلاف ایک لفظ On Air نہیں جانے دے گا۔

عبیر کی نظریں' اس نمائندے کے تعاقب میں اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ وہ کیمرو کی ٹیم کے ساتھ دانشوروں کے گروپ کی طرف چلا۔

بیوروکریٹ کی طرح تھوڑا بہت کلف ہمارے دانشور کی گردن میں بھی لگا ہوتا ہے' سب دانشور ایک دوسرے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔

قوم تو ایک طرف' وہ ایک طبقہ بھی نہیں۔

ہر دانشور کے گمان میں دوسرا جعلی ہے' دیکھنے میں وہ بھی ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ گردنیں اکڑائے' ٹائیاں باندھے' ٹانگ پر ٹانگ رکھے' سگریٹ کے دھوئیں میں فلسفہ اڑاتے۔ گو اب ان کی تعداد میں کمی آتی جا رہی ہے۔ ان کی جگہ سیاسی تجزیہ نگاروں نے لے لی ہے۔

وہ سب کے سب مشہور و معروف لوگ ہیں۔ ہر روز ٹی وی پر دیکھ دیکھ کر عبیر ان کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔ ان میں سے ایک صاحب ہر روز کسی نہ کسی چینل پہ دکھائی دیتے ہیں اور یہ ثابت کر کے دم لیتے ہیں کہ پاکستان غلط بنا ہے۔ اس کو بننا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اس پر ان کو یہ رونا بھی ہے کہ اس ملک میں کچھ کہنے کی آزادی نہیں۔ اپنے پاکستانی مائیک سے بھی انہوں نے کبھی انڈیا کے غلط ہونے کا اظہار نہیں کیا۔ اور ان کے ہوش مند کانوں نے کسی انڈین آزاد چینل سے' اپنے وجود کا انکار کرنے کی "روشن خیالی" کا اعلان نہیں سنا۔ لیکن ان کی دانشوری مصر ہی پاکستان میں کیڑے نکالنے پر ہے۔

جب آپ پاکستان کو برا بھلا کہتے ہیں تو عظیم دانشور' روشن خیال آزاد منش۔

لیکن جب اپنے ملک کے دفاع میں بولتے ہیں تو ناپختہ ذہن۔ "ایک تو ہماری قوم جذباتی بڑی ہے۔"

ایک اور افلاطون صاحب کو کیمرو کی روشنیاں spot کر رہی ہیں۔ بالی والے شاعر کی طرح انہوں نے بھی بے شمار کتابیں لکھی ہیں' ان کا موضوع "تاریخ" ہے۔

تاریخ جیسی نازک چیز پر ان کا کرخت وار ہوتا ہے۔

"ہندوستان میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ یہ غلط ہے کہ اسلام صوفیاء نے پھیلایا۔ خود خواجہ نظام الدین اولیاء کے ہاتھ پر صرف ایک شخص مسلمان ہوا تھا۔"

ایسا کہتے اس کے چہرے پر قابلیت کا ایک غرور لہرایا۔ اس نے ایک نئی تاریخ رقم کروالی ہے۔ عجیب ہوا' بڑی دیر سے اکتا کر بیٹھے اعجاز نے سر اٹھایا۔

"اور وہ ایک یقیناً" تمہارا باپ نہیں تھا۔ ورنہ تم اتنے حرام زادے نہ ہوتے۔" لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔

کتنی دیر انہیں لگا وہ ابھی باہم دست و گریباں ہوتے ہیں۔ لیکن تاریخ دان اٹھا۔

"کس قسم کے جاہل لوگ ان محفلوں میں بلائے جاتے ہیں۔" وہ باہر نکل گیا۔ کسی نے اسے روکا بھی نہیں۔

"جذباتی نسل۔" دانشور پائپ منہ میں دبا کر اس کو دھوتے ہوئے بڑبڑایا۔

"پتا نہیں۔ ہم کسی کو بولنے کا حق کیوں نہیں دیتے۔" عبیر نے کھڑکی سے لگے لگے اپنا سڑک والا channel ٹیون کر لیا۔

تاریخ دان لفٹ سے اترا۔ پارکنگ لاٹ سے اپنی چمکتی عظیم الشان گاڑی سڑک پر لایا۔ کار کا دروازہ بند کرنے والا لڑکا اپنے پانچ روپوں کا منتظر ہی کھڑا رہا۔ وہ اعجاز کا بدلہ ٹائروں سے لیتا' پیں کر کے نکل گیا۔

یہ بھی عجیب حسن اتفاق ہے' پاکستان کے وجود کے خلاف علی الاعلان بولنے والے لوگ پاکستان میں ٹاٹھ سے رہتے ہیں۔ بڑی بڑی گاڑیوں میں فراٹے سے گھومتے ہیں۔

"تم مجھے ٹھیک جگہ لائیں۔" اس نے حمیرا کو اطلاع دی۔ "خوب ہی تماشا دیکھا۔"

سارہ حق' تاخیر سے آئیں۔

تاریخ دان واک آؤٹ کر چکا تھا۔ دانشور خفا تھے۔ شاعر اداس' اور گلوکار باری کے منتظر' مصنف نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ معلوم نہیں بحیثیت صاحب کتاب کیا کیا یا بطور اعلا سرکاری افسر کیا۔ ہر دو حالتوں میں وہ ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی عادی لگتی تھیں۔ مائیک پر موجود شخص نے ان کے لیے استقبالیہ کلمات ادا کیے۔ جس میں چار چاند لگ جانے اور محفل کی رونق دوچند کرنے جیسے کلمات بھی شامل تھے۔ وہ مسکراتی' اپنی پذیرائی کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتیں مرکزی میز پر بٹھا دی گئیں۔ چاند چاہے چار لگے یا دو!

لوگ ان کی طرف لپک کر گئے۔ جن میں نعیم بھائی بھی تھے۔

عبیر کو اس محفل میں دیکھ کر ان کے ماتھے پر ناگواری کی ایک شکن آئی تھی۔ حمیرا نے بے دھیانی میں سلام کر ڈالا۔ وہ گھر کی عورتوں کو محفل میں پہچاننے کے قائل نہیں تھے۔ لہٰذا ان سنی کر گئے۔

"عورت کا مقام گھر ہے۔" ہجوم میں بہت پچھلی کرسیوں پر بیٹھے حمیرا نے عبیر کے کان میں سرگوشی کی۔

"اس کی حیثیت گلدان میں سجے پھولوں جیسی ہے۔ اس کا کام شمع محفل بننا نہیں' چراغ خانہ بننا ہے۔" نعیم بھائی کی تیوری بھی کہہ رہی ہے۔

"لیکن اپنی عورت کو تو انہوں نے چراغ خانہ نہیں بنایا۔ صبح صبح اٹھ کر تو وہ بھی مزدوری پہ نکل جاتی ہے۔"

"مگر سمجھو کہ اب آئی تیوری کی کم بختی! یہ تمہاری بہنیں کیا اور لور پھرتی ہیں۔"

ان کی زندگی ایسے ہی کلیشے سے عبارت تھی۔

ان دونوں کی نظریں نعیم بھائی پہ گڑی تھیں۔ اپنی طرف سے وہ ان سے آنکھیں چرانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا سارہ حق نے ان کا سلام سرکی جنبش محض سے قبول کیا تھا۔ اس کے باوجود نعیم بھائی نے پلٹ کر محفل کی طرف فخر سے دیکھا۔ مشہور لوگوں سے واقفیت نکالنا اور اس پر اترانا بھی ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔

فنکشن کا باقاعدہ طور پر آغاز ہوا۔ گویا صرف سارہ حق کا ہی انتظار تھا۔

کتاب کی شان میں نامور لوگ قصیدہ خوانی کر رہے تھے۔ وہ لمبی لمبی تقریریں لکھ کر لائے تھے اور بڑی فرصت سے پڑھ رہے تھے۔ گویا جلدی میں صرف وہی رہتی تھی۔

اس نے یونہی صفحے پلٹ کر ایک سرسری نظر شاعری کی اس نئی کتاب پر ڈالی۔

مونگا ٹائٹل' رقص کرنے والے فرش کی طرح چکنے پھسلواں صفحے' الفظوں کی چمک دار سیاہی۔ 238 صفحوں کی اس کتاب میں' ہر صفحے پر شاعری کے نام پر' تین چار لائن درج تھیں۔

مائیک پر موجود شخص' کتاب میں درج علامتی ترکیبوں پر باریک بینی سے مدح سرا تھا۔

جامنی سڑک۔ ارغوانی برسات' سبز رات' بھیگی نیند۔

www.pkdigest.com

نظموں کے نام تھے؟ یا قوس قزح کی بے ترتیب پریشان خیالی' اس کے کچھ پلے نہیں پڑا۔ نقاد کتاب میں کیے گئے تجربوں پر رطب اللسان تھا۔ عبیر کو اپنی اہلیت پر کچھ زیادہ گمان بھی نہیں تھا۔ اس نے کتاب بند کر دی۔

جب مائیکروفون سنبھالے شخص کہتا ہے یہ کتاب ایک استعارہ ہے تو ضرور ہوگی۔

نعیم بھائی بھی مائیک پر بلائے گئے' چند مقرروں کی طرح انہوں نے شاعری کے بارے میں تو ایک لفظ نہیں کہا' البتہ اپنے اور شاعر کے پرانے مراسم کے حوالے دے کر لوگوں کو ہنسا کر چلے گئے۔

شاعر گریڈ 20 کا افسر نہ ہوتا تو شاید وہ ان کو ان مراسم کی یاد دہانی بھی نہ کرواتے۔

سارہ حق بھی آئیں۔ انہیں بیوروکریٹ سے اپنے پرانے تعلقات کا حوالہ دینے کی فکر نہیں تھی۔ کیونکہ ان کے شناختی کارڈ میں والد کے خانے میں ایک نامور ریٹائرڈ جنرل کا نام رقم ہے' اور جنرل' ریٹائرڈ ہو کر بھی نہ ریٹائر ہوتا ہے نہ تائب!

مایا کو مایا ملے کر کے لمبے ہاتھ۔

انہوں نے شاعری کو تو دو جملوں میں نمٹا دیا۔ کتاب کے اس پلیٹ فارم سے بھی وہ اپنی این جی او اور اس کے سوشل پروگرام کی تفصیل سے آگاہ کر رہی تھیں۔ ان کے گرد ہمیشہ معتقد مرعوب لوگوں کا حلقہ رہتا تھا اور وہ ان کی اپنے کام سے dedication سے بھی آگاہ تھے۔ لہٰذا واہ واہ سمیٹ رہی تھیں۔

تقریریں جاری رہیں۔ کسی نہ کسی کی خوشامد چلتی رہی۔

پتا نہیں کتنے طویل گھنٹوں پر مشتمل پروگرام تھا کہ تو پہ ہی ختم ہوا۔ لوگ چائے کی طرف چلے۔ جب میزوں پر ہلا بولا جاتا ہے تو اس کو سخت اذیت ہوتی تھی۔ وہ اپنے گروپ میں شامل ہو کر میزوں کے خالی ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

"تم لوگ سارہ حق سے تو نہیں ملیں نا؟"

اعجاز کو شک گزرا۔ اور ٹھیک گزرا۔

"ابھی ابھی تو وہ آئی تھیں۔ اور ان کے گرد اس قدر بھیڑ تھی۔"

اس نے بچوں کی طرح سہم کر بہانہ گھڑا تھا۔ ان سے ملنا کیوں ضروری ہے۔ وہ اعجاز سے پوچھتی بھی تو لازم نہیں تھا کہ جواب مل ہی جاتا۔

"میں بھی اسی لیے نہیں ملا۔" اس نے رسان سے کہا۔ "آؤ مل آتے ہیں۔"

وہ اعجاز کے قدموں کے پیچھے قدم رکھتی ان کی طرف چلی۔

سارہ حق کی نظریں بار بار بھٹک کر دور کھڑے اسی گروپ کی طرف آتی تھیں۔ وہ تنہا نہیں تھیں' وہ کبھی بھی تنہا نہیں ہوتی تھیں۔ ان کے کان' ان کے ساتھ دائرے میں کھڑے لوگوں میں سے کسی کی بات پر متوجہ تھے۔ لیکن آنکھیں ان لوگوں کے اپنی طرف اٹھتے اور بڑھتے قدم گن رہی تھیں۔

ان کی جمی اور ٹھہری ہوئی نظر سنجیدگی ان کے ارادوں کو جانچ رہی تھی۔ رخ روشن کے آگے گویا بھاپ اٹھتی کافی کی پیالی نہیں' شمع رکھی تھی۔

پروانہ ادھر آتا ہے؟ یا اس کی ہے جرأت کہ ادھر نہ آئے؟؟

وہ قریب پہنچے تو انہوں نے نظریں بھی ادھر کر لیں جدھر کان تھے۔ پیڈسٹل پہ کھڑے ہو کر کسی کا انتظار' شخصیت کے ساتھ لگا نہیں کھاتا۔

"اچھا تم لوگ بھی آئے ہو۔" سلام پر وہ ایک دم چونکیں۔

لمحہ بھر کے لیے عبیر کی طرف دیکھا۔

وہی روکھی نظر' وہی خشک لہجہ۔

پتا نہیں وہ اس سے کیوں ناخوش تھیں اور منتظر بھی تھیں کہ وہ آئے اور ملے' جس آدمی کے گرد اتنے لوگ ہوں۔ ان میں ایک نہ بھی ہو تو کوئی حرج تو نہیں۔ مگر کیوں نہیں؟

ایک بھی کیوں نہیں!

تمجمع سے ذرا ہٹ کے وہ اعجاز سے مخاطب تھیں۔ کوئی ہدایت' کسی event کا ذکر جس میں قریبی لوگوں کو ساتھ لے کر آنے کی نصیحت تھی۔ آئندہ کا لائحہ عمل طے کر لیں گے۔

وہ از خود لیڈر بن چکی تھیں۔ جیسے بعض لوگ پیدائشی ورکر ہوتے ہیں۔ وہ پیدائشی لیڈر تھیں۔ پھر وہ پلٹ کر کسی اہم آدمی سے اہم باتیں کرنے لگیں۔

"عبیر بی بی' عمیر الٰہی۔" کوئی Batch لگائے آن ڈیوٹی ورکر ان کو ڈھونڈتا ان تک پہنچا۔

"نیچے آپ کے بھائی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

سارہ نے حیرت سے پلٹ کر اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ جلوس نکالتی' نعرے لگاتی' تھیٹر میں رول کرتی' کو ایجوکیشن میں پڑھتی۔ سارے جہان میں دندناتی گو رات ہو گئی تو بھائی لینے آیا ہے۔

یہ کیا دورنگی ہے۔

آخر کب ہماری لڑکیاں مردوں کے سہارے سے خود کو آزاد کروا پائیں گی۔

وہ بالکل ہی مایوس ہو گئیں۔

عبیر نے کھلے آسمان تلے آ کر ایک طویل گہرا سانس کھینچا۔ جیسے اسے برسوں کے بعد رہائی نصیب ہوئی تھی۔

کھیل ختم ہے۔ ہنھم
کھیل ختم شد۔
تماشا تمام شد!

باقی آئندہ شمارے میں

www.pkdigest.com

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی قیمت: 400 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل قیمت: 180 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبیں قیمت: 350 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 2216361

رفعت ناہید سجاد

چراغِ آخرِ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت او نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے۔ جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیِ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی وینڈز وغیرہ کے لیے پروگرام لکھ کر کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کے علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے۔ وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیر اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے۔ لیکن

www.pkdigest.com

صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔
گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اہل و عیال کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔
عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کر دیتی ہیں۔
ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کو نا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔
ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۴
چوتھی قسط

لاہور کی برسات بھی عجیب ہوتی ہے۔
تپتی جھلستی دھوپ میں، تندور میں سکتی روٹیوں کی طرح جھلسانے بدن اچانک ہوا کے خوشگوار جھونکوں کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ چاروں طرف سے امنڈ امنڈ کر اور ہاتھیوں کی طرح جھوم جھوم کر آتی سیاہ گھٹائیں اور دیکھتے دیکھتے جل تھل۔
وہ گھر سے نکلیں تو آسمان پر آگ اگلتا سورج دھوپ کی حدت سے زمین کو گرما رہا تھا۔ سواری کی تلاش میں ماری ماری چوک تک پہنچیں تو پچھلی کے خشک پنجر ایسے بادل ٹکڑیوں کی شکل میں آسمان پر بکھرے تھے۔ سڑک پر آئیں تو موٹے موٹے قطرے موسلا دھار بارش میں تبدیل ہو گئے۔ پانی کی تیز بوچھاڑ سے خود کو بچاتے ہوئے انہوں نے نیلے پلاسٹک کے شیڈ میں سمانے کی کوشش کی۔ جس کی کرسیاں لوگوں نے شوقیہ ہی توڑ کر وہیں اوندھی گرادی تھیں۔ شیڈ کو علاقے کی جمعدارنیاں city dump کے طور پر استعمال کرتی تھیں، لمحے بھر کی غلاظت کا انبار الٹ، ہاتھ جھاڑ کر فارغ۔
بارش کے تیز پانی میں پلاسٹک بیگ، دودھ اور جوس کے نچڑے ہوئے خالی ڈبے، غلیظ پانی میں بچوں کی کاغذ کی کشتیوں کی طرح تیرتے، آپس میں الجھتے ان کے پیروں سے ٹکراتے تھے۔
وہ لوگ پونے چار بجے نکلے تھے۔ ٹھیک چار بجے دھواں دھار پانی برسا اور پچھلے آدھ گھنٹے سے جم کر برس رہا تھا۔ اگر بارش اسی رفتار سے ہوتی رہی تو سارے شہر کے کوڑے کے ڈھیر بارش کے پانی میں شامل ہو کر سڑکوں پر تیرتے پھریں گے۔
بینش نے پریشانی سے اپنی ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اس حالت میں آگے جانا تو ممکن تھا ہی نہیں، واپسی بھی تقریباً ناممکن تھی۔ فنکشن پانچ بجے شروع ہونا تھا اور ٹیچرز کی ہدایت کے مطابق ان کو فورم میں ہر حال میں

شرکت کرنی تھی۔ اس اجلاس میں شرکت کے لیے لوگ دور دراز سے آرہے تھے۔ ان کو انٹری پاس بھی مشکل سے حاصل کر کے دیا گیا تھا۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے قابل استاد، انٹرنیشنل ریلیشنز کے ماہر، بڑے بڑے تجزیہ نگار۔ ان کا موضوع بحث مڈل ایسٹ تھا۔ یوں تو مسئلے پاکستان میں بھی کچھ کم نہیں تھے۔ لیکن ان مسئلوں کے حل سے ماہرین کو کوئی دلچسپی نہیں۔ عرب اسرائیل مسئلے پر دنیا کے سارے بوجھ بجھکڑ اکٹھے ہو کر پاکستان کو عقل سکھانے آئے تھے۔
(کیونکہ پاکستان کو عقل سکھانا بہت آسان ہے۔)
اسلامی نظام، معتدل اسلام، روشن خیال اسلام
آپ کے حکمران آپ کی کم عقلی پر ماتم کرتے ایسے اجتماعات عام منعقد کیا کرتے تھے۔
ان کا خیال تھا اب تک ہم نے جو پڑھا غلط تھا۔ جو پڑھایا وہ جھوٹ تھا۔ ساری تاریخ کو رد سے مٹا کر از سر نو لکھنے کی ضرورت تھی۔ قدماء کہتے ہیں جو اپنی تاریخ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں ان کا جغرافیہ خود بخود بدل جاتا ہے۔
بطور جدید عہد کے طالب علم، ایسے اجتماعات میں وہ عموماً شرکت کرتے اور دھواں دھار بحثیں کر کے لوٹتے تھے جس پر دیر تک تالیاں بجتی تھیں۔
خواتین کے بس اسٹینڈ کے پاس تلنگوں کا گروہ اکٹھا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کسی کو بے بس دیکھ کر خوشی منانا ہماری تفریح ہے۔ بارش میں ایک دوسرے کو پکڑنے کے لیے بھاگتے، چیخیں مارتے، ساون انجوائے کرتے بھی ان کی ساری توجہ بارش سے بچنے کے لیے شیڈ میں کھڑی لڑکیوں کی طرف تھی۔ ان کا خیال ہے سڑک پر کھڑی ہر لڑکی پبلک پراپرٹی ہوتی ہے اور پبلک پراپرٹی کا ہم اسی طرح ہی استعمال کرتے ہیں جیسے بس شیڈ کا کیا تھا۔
ایسے وقت میں وہ لوگ بھی جو اس ڈرامے کا حصہ نہیں بننا چاہتے تھے اس تماشے کو محض بیزاری سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ کر دکھانے کا ان کا بھی ارادہ نہیں تھا۔
"ٹھہرو! میں ان کو بتاتی ہوں۔" ملیحہ رستے تڑاتی جوش میں ان کی طرف لپکی تھی کہ تنویر نے اس کو سختی سے پکڑ لیا۔
"کیا کرتی ہو؟ تم ایک نیا show شروع کروا دو گی۔ لوگ یہی دیکھنے اکٹھے ہو جائیں گے۔"
"ایک تو تم بزدل بہت ہو۔" وہ ان سارے ڈرپوکوں سے عاجز آکر پیچھے ہٹ گئی۔
غلیظ پانی میں شڑاپ شڑاپ پاؤں ڈبوتے اور نکالتے بینش کو اپنے معاشی حالات کا یک لخت بہت صدمہ ہوا۔ ایک قریب سے گزرنے والی گاڑی کے ٹائروں نے احتیاط کے باوجود ان کو بھگو دیا تھا۔
"تف ہے اس زندگی پر۔" بینش نے ملال سے کہا۔ "آج کوئی چھوٹی موٹی گاڑی ہمارے پاس ہوتی تو لوگوں پر چھینٹیں اڑاتے چھپ چھپ کرتے ہم بھی زن سے گزر جاتے۔"
"اگر بالفرض آپ کے پاس گاڑی ہوتی بھی۔" تنویر نے مفروضے پر کام کیا۔ "تو ہمیں کہیں پانی کے اس سیلاب میں بند کھڑی ہوتی۔ اس وقت ہم زیادہ بے چارے لگتے جب سب مل کر تمہاری گاڑی کو دھکا لگا رہے ہوتے۔"
"کہانی کا اخلاقی نتیجہ۔ اللہ جو کرتا ہے اچھے کے لیے کرتا ہے۔"
بارش کے تھمتے ہی سڑک رواں ہو گئی تھی۔ ٹیکسی، رکشاؤں کے پیچھے ان کی بھاگ دوڑ پھر سے شروع ہو گئی۔ فٹ پاتھ کے نزدیک بالکل ان کے سر پر کسی گاڑی کے بریک چرچرائے۔ فضا میں چھینٹیں اچھلیں۔

www.pkdigest.com

ڈرائیونگ سیٹ سے ہارن بجایا جارہا تھا۔

"ایک اور دل جلا۔ میں ذرا پوچھ کے آتی ہوں۔ کیا تکلیف ہے۔"

بیتش کو ارادہ منسوخ کرنا پڑا۔ کیونکہ اس کی ساتھیوں میں سے دو عدد خوشی خوشی اس گاڑی کی طرف لپکی تھیں بلکہ تقریباً "بیٹھ ہی چکی تھیں۔ باقی پچھلی سیٹ پر ٹھنس ٹھنسا کر بیٹھتی' تھوڑی دیر کو افسوس کرتی کیونکہ ان کے جوتے میں لگے کیچڑ نے گاڑی کے صاف ستھرے میٹس تباہ کر دیے تھے۔

"آپ نے تو اس وقت فلمی ہیرو کی طرح انٹری دی ہے جمال بھائی!"

"اور آپ فلمی ہیروئن کی طرح اس گندے موسم میں کون سا گانا گاتی بھاگتی پھر رہی تھیں۔"

اس نے ایک اچٹتی نظر سے پچھلی سیٹ میں پھنسی بیٹھی ملیحہ سے سوال کیا تھا۔

"ہم گا رہے تھے۔ تو چھٹی لے کے آجایا لما۔ اور حد ہوتی ہے۔ آپ کیا انگریز کی طرح بارش کو گندہ موسم کہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر پہلے بارش کے بارے میں خود اس کے کیا خیالات تھے۔ چھت کی پناہ میں آکر وہ بھول بیٹھی تھی۔

"کہاں جارہی تھیں؟" اس نے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی تنویر سے تحکم بھری سنجیدگی سے پوچھا۔

"سیمینار ہے۔" اس نے لاپروائی سے کھڑکی سے باہر کھلی فضا میں دیکھتے کہا۔ "چیمبرز اینڈ کامرس" گاڑی کو گیئر میں ڈالتے وہ یک لخت ٹھٹک گیا۔

"اور کون کروا رہا ہے وہ پروگرام؟ پتا ہے؟"

"یہ تو اسپیشل برانچ کا کام ہے۔ آپ بتایئے۔" وہ ہنس پڑی۔ "ہمارا تو سبجیکٹ ہے اور ٹیچر نے کہا ہے سن کر آؤ۔"

"تم اور تمہارے ٹیچرز۔" اس نے گاڑی گھر کا لے ڈالتے ہوئے۔

"اس سیمینار کے تین مقرروں میں سے دو یہودی ہیں اور ایک ہندو۔ اس کی فنڈنگ فری میسن کر رہی ہے اور وہ آپ کو عرب اسرائیل مسئلے کا حل بتائیں گے۔ آپ جانتی ہیں فری میسن کیا ہے؟" وہ عموماً "سرکاری مسئلوں پر زبان نہیں کھولتا تھا۔

"پھر ہماری حکومت اس بات کی اجازت ہی کیوں دیتی ہے۔ ویسے بھی آنکھ بچا کر بیٹھنا تو کوئی بہادری نہیں۔ وہ آپ کو بحث کی مار دیتا ہے تو آپ بھی اس کو علم کی مار دیں۔"

"تو تم تیاری سے جارہی ہو۔ ان سے تو شاید تم بحث کر لو گی' لیکن ان پاکستانیوں کا کیا کرو گی' جو دلیری سے ان کی زبان بولیں گے۔ اور عین تمہاری ناک کے نیچے۔"

اس نے سامنے دیکھتے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ "چیزوں سے بھاگ کر گھر بیٹھ جانا مسئلوں کا حل نہیں' مانا کہ ہندو اور یہودی آپ کے خلاف بولتے ہیں۔ ان کا حق ہے' وہ آپ کے دشمن ہیں' کیوں نہ بولیں۔ agreed again "(یہ بھی تسلیم) لیکن کمال ہمارے وہ لوگ کرتے ہیں جو بڑی چابک دستی سے ان کا ایجنڈا پیش کرتے ہیں۔ خیال رکھنا ان کی لپیٹ میں نہ آجانا۔ وہ پہچانے بھی نہیں جاتے۔"

"لیکن آپ ایسا کرنے کی اجازت ہی کیوں دیتے ہیں؟" تنویر نے عادتاً "ہی بحث کی۔

وہ کچھ چپ رہا۔ "ہم کہاں کہاں ربن نہیں رکھے ہوئے۔"

کار میں کچھ دیر کے لیے سکوت طاری ہوگیا۔ "ہم پاکستان کو حکمرانوں کے ہاتھوں غرق ہوتا دیکھتے ہیں اور صبر کرتے ہیں۔ اس آس میں کہ یہ جنرل چلے جائیں گے اور منتخب لوگ آئیں گے۔ پھر اس امید پر کہ ان منتخب لوگوں

کو کوئی جنرل ہی ہٹادے کاش! ایک اور جنرل۔ ایک اور انتخاب۔ آج سے نہیں ساٹھ سال سے ہم چوہا بھاگ بلی آئی کھیل رہے ہیں۔"

وہ اسی خاموشی سے مال سے اتر کر نہر پر جارہا تھا۔

"میں جانتا ہوں تم بے وقوف نہیں ہو۔" اس نے اداس بیٹھی تنویر پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ "ڈر لگتا ہے کوئی تمہیں بیوقوف نہ بنا ڈالے۔"

بلڈنگ سے ذرا فاصلے پر گاڑی روکتے اس نے نیچے اتر کر ایک گہری نظر سے بلند عمارت کی طرف دیکھا۔ جہاں بہت سے جھنڈوں کے درمیان سادہ سیاہ جھنڈے بھی تھے۔ ایک اکلوتی نادیدہ سی آنکھ اس میں سے جھانک رہی تھی۔ تنہا آنکھ۔

"وہ آپ کو یہودی نہیں بناتے کیونکہ یہودی بنتا نہیں۔ پیدا ہوتا ہے۔ بس آپ کو الو بناتے ہیں۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟" تنویر نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔ وہ غور سے دیکھتا چونک گیا۔

"پتا نہیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ حالانکہ اسے خوب پتا تھا۔

"پندرہ صدی قبل ہمیں بتایا گیا تھا' اس دجال کے بارے میں جس کی ایک آنکھ ہے۔ آج ایک آنکھ فری میسن کا ٹریڈ مارک ہے۔"

"اس حلیے میں تو ہم بھی اس وقت مشکوک لگ رہے ہیں۔" قمیص پر پڑے کیچڑ کے دھبوں کی طرف ملیحہ نے افسوس سے دیکھا۔

"آپ کے حلیے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں آپ کی زندگی سے مطلب ہے محض۔ میں تمہیں واپسی پر نہیں لے سکوں گا۔" وہ ملیحہ سے تنویر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"اگر ایسی کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ۔ میں رضا سے کہہ دوں۔"

"کوئی پریشانی نہیں۔ آپ تو ایسے ڈر رہے ہیں جیسے اندر شیر بیٹھا ہو۔"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ ستاروں کا آنگن،	نسیم سحر قریشی	قیمت: 400 روپے
☆ درد کی منزل،	رضیہ جمیل	قیمت: 180 روپے
☆ اے وقت گواہی دے،	راحت جبیں	قیمت: 350 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت،	شازیہ چودھری	قیمت: 200 روپے
☆ امربیل،	عمیرہ احمد	قیمت: 450 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر
شائع ہوگئے ہیں

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 2216361

"ایک بات کہوں؟" رجسٹر میں اپنی آمد کا اندراج کرتے اور اپنے اپنے موبائل سیکورٹی اسٹاف کے حوالے کرتے اس نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں کہیے۔" اس نے جیسے چھپا ہوا پروگرام اور (پرنٹڈ میٹریل) کا ڈھیر سنبھالتے رسان سے کہا۔

وہ کچھ دیر چپ چاپ اس کی شکل دیکھتا رہا۔ "کچھ نہیں۔۔۔ جاؤ۔"

رنگین قیمتی شیشوں کے خودکار دروازے میں قدم رکھنے سے پہلے اس نے پلٹ کر دیکھا۔

وہ آہستہ آہستہ دور جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

یخ بستہ ہال اور سینما ہاؤس جیسے نیم اندھیرے ماحول میں انہوں نے قدم رکھا تو ملٹی میڈیا کی دودھیا برفیلی روشنی نے ماحول کو اثر انگیز بنا رکھا تھا۔ ایک خلقت تھی جو امنڈ آئی تھی۔ تیز روشنی سے نیم تاریکی میں آنکھیں عادی نہیں ہو رہی تھیں۔ کسی کو ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے وہ پچھلی نشستوں میں جہاں جگہ ملی خاموشی سے بیٹھ رہیں۔ ہال کے builtin اسپیکرز بغیر کسی گونج کے ایسے بولتے تھے جیسے کوئی آپ کے پاس بیٹھا دھیمی آواز میں باتیں کر رہا ہو۔

اسٹیج پر پاکستان کا نمائندہ تھا۔ بطور میزبان اس نے تقریری سلسلے کا آغاز کیا تھا۔

"عربوں کا سارا پیسہ امریکی بینکوں میں دفن ہے۔ کیونکہ عرب جمہوریت کے قابل نہیں اور بینکاری کے قابل نہیں۔ اسلامی ملکوں کا پیٹرول۔۔۔ پگھلے سونے کے چشمے' جو اچانک زمین سے نمودار ہو گئے۔ دنیا بھر سے لوگ اس کی حفاظت کے لیے بھاگ پڑے ہیں' کیونکہ وہ اپنے اثاثوں کی نگہبانی کے اہل نہیں۔ دنیا کی اتنی بڑی سیفانوں کا ایک پرزہ عرب میں نہیں بنا اور کسی عربی نے ان دیوہیکل ملبوں پر چلنے کارخانوں کا ایک اوزار نہیں اٹھایا۔ ایران میں تیل نکلا۔ بلوچستان میں ڈرلنگ کی جاتی تو ایران کا سارا تیل پاکستان میں dump ہو جاتا۔ آپ شاہ ایران کی دوستی پر فخر کرتے رہے۔ قوموں اور ملکوں کے اپنے مفاد اور مزاج ہوتے ہیں۔ گیس کا حصول 'سوئی' کے مقام پر وہ واحد دریافت تھی جو دنیا نے آپ کو کرنے دی۔ اس کے بعد سے اس زمین کے نیچے جو کچھ دفن ہے اس پر آپ کا اختیار نہیں۔"

ہال میں بڑے بڑے نامی گرامی اسکالرز بیٹھے تھے۔ اس نے تیل کی ساری ہسٹری بیس منٹ میں سمیٹ ڈالی تھی۔ مقرر صفحے پلٹتا جا رہا تھا اور پڑھتا جا رہا تھا۔ اتنے بڑے بڑے ناموں کے سامنے نہ اس کا اعتماد لڑکھڑایا' نہ زبان۔

اگلی تقریر مائیکل کر رہا تھا۔ سیاہ سوٹ' ڈاڑھی سے بھری تھوڑی' ناک پر ٹکی سونے کی فریم والی عینک۔ وہ دوسرا رخ پیش کر رہا تھا۔ اور مکمل تیاری سے آیا تھا۔ اس کا لیپ ٹاپ اس کے سامنے کھلا تھا۔ اسکرین پر اس کی stills لیکن مائیکل نے اس قدر ہوم ورک کیا ہوا تھا کہ اسے بہت کم آنکھیں جھکانی پڑیں۔ کون وارث ہے نیل کے کنارے صحراؤں میں چھپے خزانوں کا۔ وہ حضرت موسیٰ کے ساتھ من و سلویٰ کھاتے' وہ چلتے تو بادل ان پر سایہ کرتا۔ ان کو پیاس لگتی تو چٹانیں چشمے اگلنے لگتیں۔ بیت المقدس کے اصلی حق دار جن پر کتاب تختیوں پر کندہ حالت میں اتری۔ خداوند قدوس کی چہیتی قوم۔ ان کے سوا کون ہو سکتا ہے حق دار۔

فورم اوپن ہوا تو چاروں طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ لوگ تیل میں ان کے حریص پن اور مذہب میں ان کی ناشکری پر ان کو پھٹکاریاں دے رہے تھے۔

ایسے ملک میں جو کبھی دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک تھا۔ جس کا دفاع آج بھی گیا گزرا نہیں۔ اس زمین پر ان

کو اپنے عزائم ڈھکے چھپے بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی' ان کو حکمرانوں کی پناہ حاصل ہے۔ اور vice vessa۔ حکمران ان کی پناہ میں پھلتے پھولتے ہیں۔

ہم نے ان کو مکمل تحفظ کے ساتھ ایک پلیٹ فارم مہیا کیا ہے۔ جہاں وہ سکون سے آپ کے خلاف زہر اگل سکیں اور نوخیز ذہنوں پر مشتمل ایک عوام مہیا کی ہے' جن کے خون میں آپ کا قطرہ قطرہ یہ زہر شامل کرتے رہیں۔

مگر یہ نوجوان تھے ان میں کچھ سمجھدار اور زیرک بھی تھے۔ علم سے آگاہ۔

چائے اور سینڈوچز کے درمیان لوگوں میں گھرا مائیکل ابھی تک Pagons کی تاریخ بیان کر رہا تھا۔

"خواتین خاص طور پر۔۔۔ اور کم عمر خواتین عام طور پر ایسی خشک چیزیں پسند نہیں کرتیں۔ ویسے بھی یہ زمانہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا ہے۔ تاریخ ایک بودا اور بے کار مضمون بن چکا ہے۔ آپ کی اس مضمون میں دلچسپی کی وجہ؟"

اپنی کافی کی پیالی ہاتھ میں پکڑے۔ پہلے مقرر مختلف لوگوں سے ہوتے' اب ان کے پاس کھڑے تھے۔

"فی الحال ہمارا تو یہ سبجیکٹ ہے اور یہاں جو بحث ہوئی اس کے کنارے سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہی ملتے ہیں۔ لیکن کسی بھی مضمون میں عورت مرد کی تخصیص کیوں؟" وہ سوال کا جواب لیے بغیر آگے کی طرف جا رہا تھا کہ اس کے جملے پر ٹھٹک گیا۔

"یہ تو کسی زمانے میں ہوتا تھا۔ جب لڑکیاں کچھ اور پڑھتی تھیں 'لڑکے کچھ اور' اب تو کوئی فرق نہیں۔" پاس کھڑے کسی شخص نے لقمہ دیا تھا۔ اس نے لقمہ کو ان سنی کرتے ایک نظر چیلنج کرتی لڑکی کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔

"سوری گلف اینڈ سوری۔۔۔ میں نے تو ایسے ہی بے سوچے ایک بات کہہ دی تھی۔"

"آپ بے سوچے بات کرتے ہیں اسی لیے پاکستان کے دشمنوں کو موقع ملتا ہے' وہ سوچ سمجھ کر ہمارے پرخچے اڑا دیں۔"

اس کے چہرے پر حیرت کے آثار آئے۔ اس نے آدھی پی ہوئی پیالی واپس رکھ دی۔

"تو آپ ان لوگوں میں سے ہیں' جو بے تیغ لڑنے کے قائل ہیں۔ آپ بڑی طاقتوں سے مقابلہ کر سکتے ہیں؟"

"آپ مایوس ہیں؟" تنویر نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

"مایوس نہیں۔ میں حقیقت پسند ہوں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے میرا ملک دنیا کا عظیم ترین ملک ہو۔ لیکن ایسا ہے نہیں۔"

"تاریخ بے کار مضمون اسی لیے ہے کہ آپ کا تاریخ پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔" ملیحہ نے تلملا کر اس کی طرف دیکھا۔

"پاکستان کیوں بنایا گیا۔ بنایا جانا بھی چاہیے تھا یا نہیں' کشمکش' قائد اعظم کے بعد ہمارا ہیرو کون تھا؟ دوسرے ملکوں کو اپنے سر پر مسلط کرنے کے لیے ہم دانستہ اپنے ملک میں اکھاڑ پچھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ وہ جب کہتے ہیں ہم نظام بدل ڈالتے ہیں۔ حتیٰ کہ قائد اعظم کی تصویر بھی۔ آپ کو ضرورت ہوتی ہے تو آپ ان کی قراقلی ٹوپی اور شیروانی میں ملبوس تصاویر دفتر میں لٹکا دیتے ہیں۔ دنیا چاہتی ہے تو قائد اعظم کی تصویر بدل جاتی ہے۔ پھر ان کی تھری پیس سوٹ میں چمکتے بوٹوں والی تصویر ہماری کرسی کے پیچھے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ قائد اعظم جیسے کھرے آدمی کو بھی ہم اپنی منافقتوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

حکمران کوئی بھی ہو' وزیر' مشیر' محکوم وہی رہتے ہیں۔ ہسٹری تو ایک طرف آپ کا جغرافیہ بھی وہ نہیں رہا۔ آپ

کی اٹلس باہر بیٹھ کر ترتیب دی جا رہی ہے اور آپ سوائے مایوسی کے کچھ اور پیدا نہیں کر رہے۔" وہ خاموشی سے اس کی تقریر سنتا رہا۔

"تھینکس۔ پُرعزم اور سوجھ بوجھ رکھنے والی دانش مند لڑکیوں سے مل کر خوشی ہوئی۔" وہ مسکرایا۔ "بہت دلچسپ ہے آپ کا نظریہ۔ یہ بھی خوب ہے آپ اپنی عمر کی عام لڑکیوں کی طرح جذباتی بھی ہو جاتی ہیں۔"

اس نے کاغذات سمیٹ کر فائل سینے سے لگائی۔ پاکستان کا نام لیا اور جذباتیت کا طعنہ کھایا۔ اس فائل میں کی نمبر ایک یونیورسٹی کے قابل ترین استاد کی رائے ایک غریب ملک کے بارے میں بند تھی۔ غریب ملک؟ جس کے باسی ارب پتی ہیں۔

وہ باہر نکل کر مختلف سمتوں اور مختلف رکشاؤں میں روانہ ہوئیں۔ ملیحہ نے اس کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"تم نے غور کیا۔ یہ آدمی بھی آپ کی نہیں 'ان' ہی کی بات کر رہا تھا۔ گو بہت ڈھکے چھپے انداز میں کر رہا تھا۔ جیسے ہمارے حکمران کرتے ہیں۔"

"ہیں؟" تنویر حیرت زدہ رہ گئی۔ "مجھے تو ایسا نہیں لگا۔ ہاں ذرا غیر جذباتی سا آدمی تھا اور کچھ ملک کے حالات سے مایوس۔"

"مجھے تو لگا وہ مجمع کو مایوس کر رہا ہے۔"

فٹ پاتھ کے کناروں پر بارش کا گندہ پانی جوہڑ کی شکل میں ابھی جمع تھا۔ "ایسی کتنی ہی غلاظت ہم نے کہاں کہاں جمع کر کے نہیں رکھی ہوئی۔" انہوں نے دیکھا وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل رہا تھا۔

فٹ پاتھ پر کوئی شخص بڑے بڑے پنجروں میں لالیاں قید کیے بیچ رہا تھا کہ لوگ آئیں اور ان کو خرید کر آزاد کرا دیں۔ وہ پنجروں کے پاس ٹھہرا۔ پھر دوستوں کو چھوڑ کر ان کے پاس آ گیا۔

"آپ لوگوں کے پاس کوئی سواری ہے؟"

"نہیں۔ یہ سواریاں بہت ہیں۔ ابھی رکشہ مل جائے گا۔" پوچھا تنویر سے تھا جواب میں ملیحہ کی تیزی سنائی دی۔

"اس سے قبل کہ رکشہ ملے ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر کہیں بات کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب اگر آپ کو جلدی نہ ہو۔"

تنویر کو ہچکچاتے دیکھ کر اس نے کہا۔ "اگر آپ کی خواہش نہیں تو کوئی بات نہیں۔ ہال میں بات ادھوری سی تھی سو آپ سے بات کرنے کو دل چاہا۔"

وہ مایوس لوٹ رہا تھا کہ تنویر نے کہا۔ "کیوں نہیں۔ ہم بات کر سکتے ہیں۔"

ملیحہ کے ٹہوکا دینے کے باوجود اس نے اپنا دل میں آیا جملہ ادا کر دیا۔ اس کو غیر اخلاقی رویے کبھی اچھے نہیں لگتے تھے۔ وہ رکا۔ ایک نظر اس نے ملیحہ کی طرف دیکھا۔

"آپ کی دوست کے اندیشے درست ہیں۔ یوں فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کے واقعی نامناسب ہے۔ لیکن عجیب بات ہے ہمارے شہر میں ایسی کوئی جگہ نہیں۔ جہاں بیٹھ کر آدمی چائے کی ایک پیالی پی سکے۔ میں ماضی پرست انسان ہوں۔ کبھی یہاں کافی ہاؤس، ٹی ہاؤس ہوتے تھے۔ اب یہاں بندو خان ہے، وارث کی نہاری ہے۔ بریانی سینٹرز ہیں۔ لیکن بیٹھ کر چائے پینے کا ٹھکانہ نہیں۔"

"اصل میں پہلے لوگ ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر تجزیے کرتے تھے اب ٹی وی چینل پر آ جاتے ہیں۔"

وہ دونوں ہنس پڑے۔ ملیحہ نے ہنسنے میں بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اور جب نزدیکی میکڈونلڈ میں آئس کریم کھانے کے لیے قدم بڑھائے تو اس نے ان کا ساتھ چھوڑا بھی نہیں۔ وہ اسے چھوڑ کر جا ہی نہیں سکتی تھی۔ اپنی Sundae سنبھالتے وہ پرس نکال رہا تھا کہ تنویر نے اعلان کیا۔

"ہم اپنا بل خود دیں گے۔"

بغیر کسی بحث میں الجھے اس نے سکون سے کہا۔ "اچھی بات ہے میرا بل بھی آپ دے دیجیے۔ اس میں ایسی کیا بات ہے آپ نے غور کیا۔ امریکہ سے عدم دلچسپی کے باوجود ہم کیسے اس کے پیچھے چلتے ہیں۔"

"میرا نام نعیم ملک ہے۔" اس نے کرسی سنبھالتے کہا۔ "جرنلسٹ ہوں۔"

"یہ میری بہترین دوست ہیں ملیحہ۔ میں تنویر عباس۔"

اس نے ایک اچٹتی سی نظر ملیحہ پر ڈالی۔ "آپ کی بہترین دوست کو تعارف اچھا نہیں لگا۔"

ملیحہ چیں بہ جبیں ہو گئی۔

"بارش رکی ہوئی ہے اب اٹھ جانا چاہیے۔"

ان دونوں میں سے کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

آئس کریم قطرہ قطرہ پگھلتی کم ہو رہی تھی اور درمیان کے فاصلے بھی۔ وہ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کی بابت بات کر رہے تھے۔ ایران توران کا فلسفہ۔

اس نے بے شمار کتابیں پڑھ رکھی تھیں اور اس کی یادداشت بھی زبردست تھی۔

ملیحہ خالی گلاس میں پلاسٹک کی چمچی سے پگھلتے دودھ سے کھیلتی ان کی گفتگو میں برائے نام ہی شریک تھی۔ سیکنڈ کی سوئی بہت سُست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ کی اس گفتگو میں ملیحہ کو لگا اس پر سے صدیاں وندناتی گزر گئی ہیں۔

اٹھنے کی بات پہلے نعیم ملک نے کی۔

"آپ جائیے۔" ملیحہ نے اسی بیزاری سے کہا جو اس نے پہلے لمحے سے اختیار کر رکھی تھی۔ باہر نکل کر وہ ان کو روایتی انداز میں اپنی گاڑی میں چھوڑ آنے کی آفر دے گا۔ جو ملیحہ کو اپنے پاس سے لیے ہرگز منظور نہیں تھا۔ بس آج یہاں اسی لمحے خاتمہ ہونا چاہیے۔

"ہم کچھ دیر بیٹھیں گے۔"

"بارش ابھی بھی رکی ہوئی ہے۔" اس نے اس کا جملہ اس کو لوٹاتے اٹھتے اٹھتے کہا۔ لیکن ٹھہرا نہیں۔ انھوں نے لال سفید پٹیوں والے کپڑے پہنے میکڈونلڈ کی ڈی تک اسے جاتے دیکھا۔

"بڑا خطرناک آدمی ہے۔" ملیحہ نے جھرجھری لے کر کہا۔ "اور میں جانتی ہوں۔ میرے اس بیان کا تمہیں اعتبار نہیں۔"

"خطرناک!" تنویر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ "نہیں تو۔ بالکل بھی نہیں۔ مجھے تو بے چارہ بڑا selfless (بے چارہ) سا لگا۔"

"بڑے بڑے کان۔ زرد آنکھیں' چونچ والا چہرہ' اور جب وہ پنجروں کے پاس کھڑا تمہیں دیکھ رہا تھا تو ایک منٹ کو مجھے لگا' وہ تمہیں بھی پرندہ سمجھ رہا ہے اور پتا نہیں قید کرنا چاہتا ہے یا آزاد۔"

"come on ملی۔" تنویر نے اکتاہٹ سے کہا۔ "اچھا بھلا آدمی تھا۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" ملیحہ نے ایک طویل گہرا سانس کھینچا۔ "اس طرح تو تم نے کبھی بی ہیو نہیں کیا تھا۔ میں دیکھ رہی تھی ایک artificial (مصنوعی) آدمی سے تم اتنی آسانی سے مرعوب ہو گئیں۔ وہ جو ایسا جھوٹا ہے کہ نظر ملا کر بات نہیں کر سکتا۔ کیا بچوں والی حرکت کی آج تم نے حتی کہ اس کو اپنا فون نمبر بھی دے ڈالا۔"

"ملی۔" اس نے برا مان کر کہا۔ "Egypt کی قدیم ہسٹری پر اس نے مجھے ایک نایاب کتاب دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے اس کو date مارنے کے لیے نمبر نہیں دیا۔"

آج تم نے مجھے بہت مایوس کیا۔

"ضروری نہیں آپ عقل مند ہوں تو میچیور بھی ہوں۔"

وہ ابھی تک اپنے بیان پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"بہر کیف۔ اپنے کسی مصلحت کے تحت یہ شخص رشتہ عظمی ہو گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم اب یہ بات غلط ہے یا غلط نہیں۔"

تنویر کا رنگ جھلاہٹ سے لال ہو گیا۔

"اتنی جلدی کسی انسان کو پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔" ملیحہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "انسان ایک کتاب کی طرح ہے۔ نایاب کتاب۔ وہی والی کتاب جو وہ تمہیں دینا چاہتا ہے۔ کتنی دیر تو آپ جلد ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر فلیپ پڑھتے ہیں۔ دیباچہ دیکھتے ہیں کس کا لکھا ہوا ہے۔ پھر آخری صفحے پر کتاب کے بارے میں لوگوں کی رائے پڑھتے ہیں۔ کتاب میں کیا لکھا ہے۔ یہ تو بہت آخر میں جا کر پتا چلتا ہے۔"

وہ جھنجلا گئی۔ "تم خود بھی تو بغیر پڑھے ریویو لکھنے بیٹھ گئی ہو۔"

☼ ☼ ☼

ٹیلی فون واپس کریڈل پر ڈال کے اس نے خود کو پھر سے کمرے میں بند کر لیا۔ کھڑکی کے تنگ شیشوں سے ناک لگا کر اس نے فضا میں نمی محسوس کی۔ بارش ابھی تھمی تھی اور مزید بارش کے آثار تھے۔ اس سال بارشیں سابقہ سالوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوئی تھیں۔

"اے اللہ! بارش برسا۔ پہاڑوں پر' دریاؤں پر' کھیتوں پر' لیکن میرے گھر سے دور۔"

برسات گزری۔ ستمبر اکتوبر گزرے۔ لیکن فضا کی گھٹن اتنی بارشوں سے بھی نہیں دھلی تھی۔ بارش کے زور سے سرخ پھولوں کے بیل کے گچھے' پتی پتی بکھر گئے تھے۔ پانی کے ساتھ بہتی آتشیں ورق ورق پنکھڑیاں لیکن اندر کی گھٹن باہر کی ہوا سے کہیں زیادہ تھی۔ جیسے کسی ویران اسٹیشن پر کوئی تیز رفتار ٹرین' ایک زناٹے سے بغیر رکے چیخ مارتی نکل جائے۔ فضا کو گرد آلود' دھواں دھواں چھوڑ کر۔ انسان پر جو گزرنی ہے وہیں اچانک گزر جاتی ہے۔

ملیحہ کہتی ہے انسان لمحوں کا اسیر ہو جاتا ہے' بعض اوقات عارضی اسیر ہوتا ہے۔ لہٰذا بند باندھ کر روکنے کی کوشش مت کرو۔ ان کو گزرنے دو جیسے سوراخ میں سے پانی گزر جاتا ہے۔ ہم کسی حادثاتی جذبے کا شکار ہو کر اس کو زندگی بھر کا روگ نہیں بنا سکتے۔

حادثاتی جذبہ۔ عارضی اسیر؟

وہ گیارہ جولائی کی ایک بھیگی شام تھی۔ اگست' ستمبر' اکتوبر۔

اب وقت سے کون کہے

ہم اچانک کس طرح تبدیل ہوتے ہیں ہمیں خود بھی پتا نہیں چلتا۔ اندر آپ کے وجود میں نئے نئے جذبے سر اٹھاتے ہیں۔ اور ضدی بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑتے' سر پٹختے اپنا آپ منوانے پر تل جاتے ہیں۔ اس عارضی اور پرسکون خاموشی میں ایک خوف تھرتھراتا ہے اور آخر کار ایک وقت میں وہ گھڑی آتی ہے جس سے نجات نہیں جب سب کچھ ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔ اس کی زندگی کا Big Ben۔ جس سے فرار حاصل کرتے اور چھپتے چھپتے وہ تھک چلی تھی۔ کیا اس ٹوٹ پھوٹ کے بعد بھی اس کا وجود تسلیم کیا جائے گا۔ کیا پھر وہ سر اٹھا کر تمکنت اور استقامت سے کھڑی ہو سکے گی۔ کیا پھر اس کے گھر میں اس کی مثالیں پیش کی جا سکیں گی۔ تنویر کی طرح۔ تنویر جیسی۔

اور کتنے دن وہ اپنی چھوٹی بہن کا آئیڈیل رہے گی۔ لیکن جو بھی ہوتا ہے جلدی ہو جائے۔ جتنا وقت انتظار میں گزر رہا ہے "ایک دھند لکا ہے۔ دھند چھٹے تو کون جانے منظر حسین ہو یا کریہہ۔

اس کا جی چاہا ایک چیخ مارے اور سناٹے کا خاتمہ کر دے۔

پتا نہیں وہ بزدلوں کی طرح سب سے چھپتی 'کمرہ بند کر کے اندر دبکی کیوں بیٹھی تھی۔ باہر تو ماحول ویسا ہی مانوس' ویسا ہی تر و تازہ اور بشاش تھا۔

باورچی خانے کی سمت سے آتی قیمہ بھوننے کی خوشبو۔

ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھتا اور ہر بال پر نعرہ مارتا رضا۔ انتہائی غیر جذباتی ہونے کے باوجود کرکٹ میچ میں بھی پاکستان کی شکست برداشت نہ کرتا۔

کبھی کبھی ہنستی اس کی بہن اور اس کی عزیز دوست۔

کتابیں پڑھتے ابا۔ فلسفہ کی گتھیاں سلجھاتے اور تاریخ کی ٹوٹی کڑیاں جوڑتے۔

"وہ جو ہندی اردو کا تنازعہ تھا۔ 1867ء میں بنارس میں۔ اس وقت بنارس کے کمشنر کا کیا نام تھا۔ جس نے سر سید احمد خان سے کہا تھا۔"

کوئی یادان کے حافظے کی مدد کو نہیں آئی۔

میچ ختم ہوا تو خواتین کا پسندیدہ ڈراما شروع ہو گیا تھا۔ اماں 'کریم بی' بڑی تائی۔

اپنے پسندیدہ کرداروں کے روپ میں ڈھل کر اور ڈوب کر ڈراما دیکھتیں' رونے والوں کے ساتھ آنسو بہاتیں یا کھل کر قہقہے لگاتیں۔

"کیا نام تھا؟" ابا ہنوز حافظے پر زور دے رہے تھے۔ گو اس نام کو یاد کرنے کی کوئی فوری ضرورت نہیں تھی' لیکن جب ذہن میں کوئی چیز اس طرح اٹک جائے تو ذہن میں گرہ سی لگ جاتی ہے۔ کسی اور طرف توجہ نہیں جاتی۔

حافظے سے مایوس وہ ریفرنس کے لیے اپنی اسٹڈی میں چلے گئے۔ چند ہی منٹ بعد وہ پلٹے تو ان کے چہرے پہ بشاشت تھی۔ ڈرامے میں محو خواتین کے پاس ٹھہر کر انہوں نے بلند آواز میں اعلان کیا۔

"شیکسپیئر۔ شیکسپیئر نام ہے۔ بھلا یہ بھی بھولنے والا نام تھا۔" انہوں نے خود کو سرزنش کی۔

"شیکسپیئر نہیں ہے یہ۔ وسیم ہے۔ عنایت حسین بھٹی کا بیٹا۔ صبا حمید سے اس کی شادی ہوئی تھی۔" بڑی تائی نے ڈرامے میں ڈوبے ڈوبے کہا۔ وہ ہر صبح اخبار کے گوسپ والے صفحے کو اچھی طرح حفظ کرتی تھیں۔

ٹی وی کے رنگین سوپ دیکھتے اور خاندان بھر کی سیاست پر بحث کرتے تبصرے۔ باہر کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ سب کچھ وہی تھا۔

☆ ☆ ☆

رضا ابا کے کمرے سے نکلا تو ٹیلی فون کی گھنٹی تواتر سے بج رہی تھی۔ جب سے عثمان گیا تھا اس نے خود کو یہ ہفتہ وار ڈیوٹی سونپ دی تھی۔ اتوار کو آنا ایک ایک کے پاس ٹھہرنا۔

"کوئی کام ہو تو بتا دیجیے کریم بی۔ کچھ منگوانا ہے بازار سے؟"

کریم بی نے کچھ فرمائش تو کی تھی' لیکن فون کی کرخت گھنٹی میں ان کی لرزاں سی آواز ڈوب گئی۔ انہوں نے جھنجلا کر کہا۔ "ایک تو یہ ہر وقت ٹرٹراتا رہتا ہے۔ دن دیکھتا ہے نہ رات' اٹھاؤ' ہیلو ہیلو کرو۔ پوچھو کون' تو بند۔"

رضا نے غیر محسوس طریقے سے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔ واپس کریڈل پر رکھتے لمحہ بھر کے لیے جیسے اس کی آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر جامد ہو گئیں۔ اس کو دیوار کے پار دیکھنے میں کمال حاصل تھا۔ گو اس کو اپنی اس کرامت سے کوئی خاص خوشی محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ لاعلمی کی نعمت سے محروم تھا اور یوں بھی دیوار پار کون سے گلاب کے باغ تھے۔ آپ آر پار دیکھنے کی صلاحیت سے عاجز ہوں تو یہ آس ضرور رہتی ہے کہ اس طرف رنگ برنگے پھول کھلے ہوں گے۔ صرف ہماری رسائی وہاں تک نہیں۔

دکھ صرف نارسائی کا ہی نہیں ہوتا۔

وہ پلٹ کر اماں کی طرف چلا گیا۔ ان کی ایمبرائیڈری کے دھاگوں میں سے سبز دھاگہ کم پڑ گیا تھا۔ فریم میں لگا ان کا میز پوش جب سے ادھورا پڑا تھا۔

"بے چارے چچا عبدالعزیز گئے تو تھے دھاگہ لینے۔ ساتھ نمونے کی لچھی لے کر بھی گئے' لیکن بے چاروں کو ٹھیک سے کہاں دکھائی دیتا ہے۔ کسی اور ٹون کا سبز رنگ لے آئے غالباً" دکان دار کی بھی نزدیک کی نظر خراب ہے۔"

عبیر کو منگوانا کچھ نہیں تھا۔ لیکن اس کو ساتھ لے کر جانا تھا حمیرا کے ہمراہ احسان چپل تک۔ وہ ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی تھی کہ فرمائشوں کی حد سے نکل جاتی۔ ہماری مائیں بھی کیا ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بے ضرر خواہشات کسی کی بھی فرمائش چاند تارے توڑ کر لانے کی نہیں۔

ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بج رہی تھی۔ وہ اپنا جملہ توڑ کر بے تابی سے باہر لپکی۔ جھپٹ کر ٹیلی فون کی طرف دوڑی۔ ریسیور کی طرف بڑھتا اس کا بازو رک گیا۔ رضا ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس کھڑا اس کو بجتے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ اس کا فون اٹھانے کا کوئی ارادہ بھی نہیں لگتا تھا۔ فون ارد گرد کی کشیدگی سے بے خبر بجتا رہا۔ پھر جیسے مایوس ہو کر چپ بیٹھ رہا۔ دونوں اس کے دائیں بائیں ساکت کھڑے تھے۔

چاند تارے توڑ لانے کی بھی فرمائش تھی شاید ایک!

رضا نے فون کے آر پار دیکھا۔ خاموشی کتنی ہی دیر تک دونوں کے درمیان سرسرائی۔ فون سے نظر ہٹائی تو اس کا چہرہ سامنے تھا۔ وہ نظریں چرا رہی تھی۔

یہ چوری اس نے کب سیکھ لی اور اس کو علم بھی نہیں ہو سکا۔ اپنی غفلت پر وہ تھوڑا نادم ہوا۔

"عثمان سے بات ہوئی؟" اس نے اطمینان سے پوچھا۔ تنویر کو لگا وہ یہ نہیں پوچھنا چاہتا' لیکن جو پوچھنا چاہتا تھا پوچھ کیوں نہیں لیتا۔ لیکن شاید وہ کبھی نہ پوچھے' وہ وضع دار انسان ہے۔ کبھی کبھی اچھے لوگ کتنے برے لگتے ہیں۔ تنویر کا شدت سے جی چاہا وہ اس پر گرجے برسے۔ الزام تراشی کرے تاکہ وہ اس پر جوابا" تابڑ توڑ برس سکے۔ لیکن چپ کی مار نہ دے۔ اتنے دنوں کا جمود کسی طرح تو ٹوٹے۔ لیکن وہ ایک لفظ کہے بغیر اس سکون سے کھڑا تھا۔ جھنجلانے غصہ کرنے کی اس کی خواہش دم توڑ گئی۔

"ہوتی رہتی ہے۔" اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔ ایک طویل کشمکش میں مبتلا۔ اب اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ حتیٰ کہ اپنے پیارے بھائی کے ذکر سے بھی نالاں ہو گئی تھی۔ وہ اس سے بات نہ کرنے کو جان چھڑا رہی تھی۔ وہ کسی سے بھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوتی تھی۔ کریم بی اس کو روز کی طرح جگانے آتیں تو رات بھر کے رتجگے سے سرخ آنکھیں کھولے۔ وہ دبی زبان میں جھنجلاتی۔

معمولی معمولی باتوں سے اس کو عبیر سے چڑ ہونے لگی۔

"میرا دوپٹا پہن کر کیوں گئی تھیں؟"

"میرا جوتا کہاں پھینک دیا۔ سنبھال کر نہیں رکھ سکتیں تو مت ہاتھ لگایا کرو میری چیزوں کو۔"

دھیما لہجہ رکھنے والی۔ نرم مزاج نفاست پسند لڑکی پر کیا افتاد آن پڑی تھی آخر؟

اس کو جھنجلاتا دیکھ کر ابا باہر آئے' کچھ کہے بغیر اس کو سر سے پاؤں تک سرد نظروں سے دیکھتے۔ ابا اس سے زیادہ

www.pkdigest.com

کسی کو تنبیہہ نہیں کرتے تھے۔ اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ دادی اماں ہونٹوں میں کچھ بدبدا کر اس کی طرف چونکتی۔

"تجھے کیا چاہیے؟" رضا نے اس رسان اور اصرار سے دوبارہ پوچھا۔ اس کے سابقہ سب رویوں کو در گزر کرتے دوبارہ تلخی سے جواب دینے کی اس کی ہمت سلب ہو گئی۔

یہ رضا تھا۔

عمر بھر اس نے اس کو انگلی پکڑ کر چلایا تھا۔ اب وہ ہاتھ جھٹکے تو کیسے۔

آٹھویں کلاس میں جب اس کو ملیریا ہوا تو وہ کڑوے ذائقے سے سخت چڑچڑی ہو گئی تھی۔ تکیوں سے ٹیک لگائے جیسے شہزادی کسی چھپر کٹ سے احکام صادر کرتی وہ عثمان رضا پر حکم چلاتی۔ وہ خوشی خوشی اس کے ناز اٹھاتے پھرتے تھے۔

پھیکا آلو گوشت کھاتے کھاتے جب وہ منہ بناتی تو یہ رضا ہی تھا جو اپنی ماؤنٹین بائیک پر ہی مارکیٹ تک بھگاتا لے جاتا۔ بھیا کے خستہ سنہری سیخ کباب اخبار کے کاغذ میں رول کیے پیچھے سے اس کو تھما جاتا۔ اس کی چوری کھل جاتی جب کبابوں کی سوندھی خوشبو چھپائے نہ چھپتی اور ہوا اس مہک کو گھر بھر میں اڑائے پھرتی۔ رضا کو بد پرہیزی کروانے پر جھاڑ پڑتی اور نور کو الگ سے مزید۔

"ان پر اضافی بوجھ مت ڈالا کرو۔ ان کے حالات اب مختلف ہیں۔"

یو ای ٹی سے واپس آ کر وہ بڑی باقاعدگی سے شام کو ٹیوشن پڑھاتا۔ اپنی فیس کی ادائیگی کے بعد اپنی حق حلال کی کمائی میں وہ تینوں کو برابر کا حصہ دار سمجھتا۔ عبیر اور حمیرا کو چھوٹا ہونے کی وجہ سے بیس روپے ملتے' جبکہ تنویر کا حصہ چالیس روپے ماہانہ تھا۔ ساری دوپہر وہ رضا عثمان کی دوڑ لگاتی۔ آئس کریم کھانی ہے۔ چاکلیٹ چاہیے۔ آو چچا کا ... لے کر۔"

اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔

آج وہ اس رضا سے کیسے کہہ دے اسے کچھ نہیں چاہیے۔

☼ ☼ ☼

کتنی دیر سے وہ ساکت بیٹھی تھی۔

مکمل خاموشی اور ذہنی تاریکی میں گرفتار۔ خیالات بے ربط اور جملے اس کے اختیار سے باہر ہو گئے تھے۔ رات بھر وہ جاگتی رہی تھی۔ اور کند ذہن شاگردوں کی طرح جو سبق کو سٹر سٹروٹ کر صبح امتحان دینے جاتے ہیں۔ پیپر سامنے آتا ہے تو دماغ کا فیوز بھک سے اڑ جاتا ہے۔ وہ اس دماغی بلیک آؤٹ سے باہر نہیں نکل سک رہی تھی۔ اس کو اندازہ ہوا کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس سے بحث کرنا کتنا آسان ہے مقابلتاً" اس کے سامنے بیٹھ کر۔

پوری رات اس نے مکالمے کی مشق کی تھی۔ بات کہاں سے شروع کرنی ہے۔ وہ جب یہ سوال کرے گا تو کیا جواب دینا ہے۔ پھر اس کے جواب میں کیا کہنا ہے۔ رات بھر کروٹیں بدلتے اس نے اس کو دلائل کی مار دے کر ہرا ڈالا تھا۔ اور اپنا زاویہ نظر خوش اسلوبی سے پیش کر کے قائل کر ڈالا۔ صبح سے پہلے پہلے سب اچھا ہو گیا تھا۔ Happy Ending - لیکن یہ کسی ڈرامے کا اسکرپٹ نہیں تھا۔ جس کے دونوں طرف کے مکالمے اسی کو لکھنے تھے۔ پہلا ہی سوال جو جمال احمد کی طرف سے آیا۔ آؤٹ آف سلیبس تھا۔

"کون ہے وہ؟" اس نے پوچھا تھا۔

اس کے لفظ گونگے ہو گئے۔ رات بھر کی تیاری کے باوجود کورا ورق پھڑپھڑاتا رہ گیا اور وقت تھا کہ بھر بھری ریت

کی طرح بند مٹھی سے پھسلا جا رہا تھا۔

"تنویر! میں نے پوچھا کون ہے وہ؟"

"کون کون ہے؟" آواز تنویر کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

"وہی جس کے بارے میں تم مجھے بتانے آئی ہو اور بتا نہیں سک رہی ہو؟" اس نے میز پر کہنیوں کے بل جھکتے فرار کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا۔

"حلاوہ ازیں۔" اس نے اسی ٹھہراؤ سے کہا۔ "وہ بات جو اس کو مجھ سے آکر کہنی چاہیے۔ تم کیوں کہہ رہی ہو۔" یہ سب تو نہیں تھا رات بھر کی مشق میں۔ وہ جب سے گم صم بیٹھی تھی پیالے میں پڑا زرد سوپ بھاپ دینا بھی بند کر چکا تھا۔

"گو اب یہ کہنا بعد از وقت ہے۔ لیکن مجھے بند آنکھوں سے بھی تمہارا چہرہ نظر آتا ہے۔ اگر تم سمجھتی ہو تم بڑی کامیابی سے خود کو مجھ سے چھپاتی رہی ہو تو یہ حماقت ہے تمہاری۔ میں پچھلے تین ماہ سے تمہیں اس تکلیف سے گزرتے دیکھ رہا ہوں اور ملامت کر رہا ہوں خود کو کہ تم نے بے اختیاری کا مظاہرہ بھی کیا تو کس پر؟ مجھ پر؟"

"یہ ایک انگوٹھی ہے۔ گولڈ کا مختصر سا حلقہ۔ جس کا قطر سوا انچ ڈیڑھ انچ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ انگلی میں ہو تو رشتہ۔ باہر نکال دی جائے تو جیولر کی دکان پر رکھا محض ایک سامان۔ اس کو اتار کر میز پر رکھ دو۔ اس کے بوجھ سے نجات پا کر مجھ سے ہلکی پھلکی ہو کر بات کرو۔"

معلوم نہیں کیوں۔ لیکن اس نے نہ چہرہ ڈھانکنے کی کوشش کی' نہ سر جھکانے کی۔ چپ چاپ آنکھوں کو برسنے دیا' آنسوؤں کی لمبی لمبی لکیریں اس کے چہرے پر اس طرح بہتی رہیں جیسے شیشے پر تواتر سے پھسلتی بارش کی دھاریں۔ اس نے بھی اسے خاموشی سے رونے دیا۔ نہ وجہ دریافت کی' نہ آنسو خشک کیے' اس نے از خود ہی یہ اختیار اپنے آپ سے واپس لے لیا تھا۔ کتنی دیر تک لگاتار بہنے کے بعد آنسوؤں کے دھارے خود بخود تھم گئے۔

"آؤ اب ہم وہ باتیں کریں' جو تم سننا چاہتی ہو۔ جو نہیں سننا چاہتی وہ میں یاد نہیں دلاؤں گا۔"

"اب مجھے بتاؤ۔ اس کی کیا چیز تمہیں اچھی لگتی ہے۔ یہ نہیں پوچھوں گا تمہاری کیا چیز اس کو اچھی لگتی ہے' کیونکہ میرے خیال میں تو تم ہو ہی اچھی۔"

وہ بولی تو اس کی آواز آنسوؤں سے بھاری تھی۔

"آئی ایم سوری۔" اتنے جملوں کے بعد پہلا جملہ۔ گو وہ بھی رات کی مشق میں شامل نہیں تھا۔

پتا نہیں اس نے معذرت قبول کر لی یا رد کر دی۔ لیکن اپنے ارادوں سے وہ جواب لینے پر ڈٹا لگتا تھا۔

"ہم دونوں میں۔" وہ جھجک کر رک گئی۔ اس نے اپنے خطاب کا استحقاق تبدیل کر لیا۔

"مجھ میں اور اس میں ذہنی ہم آہنگی ہے۔ سوچ مشترک ہے۔"

"اور دل' محبت' وہ مشترک نہیں؟"

باوجود اپنی ساری ذہانت و فطانت کے محبت کا اظہار' کسی دوسرے سے اور وہ بھی اپنے منگیتر کے سامنے' اس کی ہمت جواب دے گئی۔

"میں تمہارے منہ سے سننا چاہوں گا کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔ میں ایسا ہی اذیت پسند ہوں اور اس وقت تک نہیں ہلوں گا' جب تک تم خود اس کا اعتراف نہ کرو۔"

وہ تھوڑا پیچھے ہوا۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر جیسے عمر بھر کے لیے بیٹھ گیا۔ زندگی slow motion میں گزر رہی تھی۔ کاش! وہ یہ سوال بھول جائے۔ بدل ڈالے یا کچھ اور پوچھ لے۔ لیکن وہ تو اسی طرح ایک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتے اس کو مزید مجرم بنائے دے رہا تھا۔

"وہ بہت قابل ہے۔ مجھے قابل آدمی اچھے لگتے ہیں۔"

"گویا میں قابل نہیں تھا۔ یا کم از کم اس قابل نہیں تھا۔ خیر اور کیا آپ کے صاحب یہ جانتے ہیں کہ آپ بھی کچھ کم نہیں۔ ایک دنیا مانتی ہے۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہی۔ خود ستائشی اس کی فطرت میں شامل نہیں تھی۔ لیکن اس کو ہر سوال کا جواب چاہیے تھا۔

"وہ کہتا ہے اس نے مجھے اسی لیے چنا تھا۔" اس کی آواز مشکل سے سنائی دی۔

"اور تم جاننا چاہو گی میں نے تمہیں کیوں چنا تھا۔ اصل میں' میں نے صرف تمہیں ہی نہیں چنا۔ تمہارا بیک گراؤنڈ بھی اس میں شامل تھا۔ پروفیسر انکل عباس قابل احترام نام۔ تمہاری صاف گوامی منافقت سے دور۔ جو جی میں آیا کہہ دیا۔ دن رات دعائیں کرتی اور پیچھے پیچھے کو پھوپھی تمہاری دادی۔ تم پر جان چھڑکتا تمہارا بھائی۔ گھر کا ٹھنڈا اور پرسکون مہذب ماحول۔ جس کے دروازے نہ صرف گھر کے بلکہ دل کے بھی' ہر ایک کے لیے کشادہ ہیں۔ اینڈ ناؤ آئی ایم سوری۔ میں نے وعدہ کیا تھا وہ باتیں نہیں کروں گا' جو تم سننا نہیں چاہتیں' خیر۔" اس نے وقفہ دیا۔

"اتنی معمولی سی بات پر جس لڑکی کے ضمیر پر اس قدر بوجھ ہو۔ وہ بس ایسے ہی گھر کی لڑکی ہو سکتی ہے' سو۔ Yes or no ۔ میرا پہلا سوال ابھی جواب کا انتظار کر رہا ہے۔"

"یس!"

"ہم۔ سو تم نے گھر میں کسی سے بات کی؟" اس نے بے بسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"عثمان یا رضا سے بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

وہ کچھ دیر چپ رہا۔ "تو مناسب ہے کہ میں ہی بات کروں۔ تم منہ ہاتھ دھو کر باہر آؤ۔ میں گاڑی میں تمہارا انتظار کرتا ہوں۔"

وہ اس کو وہیں چھوڑ کر کاؤنٹر پر بل پے کرنے چلا گیا۔

کتنا ہی راستہ گاڑی خاموشی سے چلتی رہی۔ پاس پاس بیٹھے دو اجنبی وجود' دو الگ الگ سمت سوچتے۔ درمیان کی گمبھیر خاموشی بڑی تکلیف دہ تھی۔ پھر اس کو جھجک کر تنویر نے توڑا۔

"آپ deserve کرتے ہیں۔ آپ کو مجھ سے بہت اچھی لڑکی مل جائے گی۔"

"کیا typical قسم کا رسمی فقرہ ہے۔ یقیناً مل جائے گی۔ میں نے کسی مایوسی کا تو اظہار نہیں کیا۔" تنویر کو اس کی ہنسی میں ہلکی سی تلخی سنائی دی۔

"اور ہاں۔ ایک بات یاد رکھنا۔ اگر کبھی کسی حادثے نے مجھے اور اس شخص کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا تو اس کی وجہ تم نہیں ہو گی۔"

☆ ☆ ☆

فضا کا سکوت ناقابل برداشت تھا۔ نہ کسی نے سوال کیا نہ جواب موصول ہوا۔

ابا کی پیشانی پر افقی سمت بل نمودار ہو گئے۔ یہ بل اس وقت آتے تھے جب وہ کسی ایسی الجھن میں مبتلا ہوں' جب وہ کسی کے ساتھ بانٹنا نہ چاہتے ہوں۔ ان کا اکلوتا بیٹا باہر تھا جس کے کندھے پہ سر رکھ کے روتے انہیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اور کیا پتہ وہ موجود ہوتا تو ان کی خودداری آڑے آجاتی۔ باپ کا عمدہ ساتھ لگائے وہ اس کے سامنے بھی اپنی کمزوری کا اعتراف نہ کرتے۔

www.pkdigest.com

گزشتہ رات بھی تنویر نے اندھیرا کر کے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ ساری رات اضطراب کی کیفیت میں دونوں ہاتھ پیچھے باندھے ٹہلتے رہے تھے۔ اس کا دل بند ہو گیا۔ وہ اپنی ایک خوشی کی خاطر آخر کس کس کے دل سے کھیلے گی کل سے اب تک جب جمال ان کے کمرے سے باہر نکلا تھا۔ اس نے ان کو لمحہ بھر کے لیے بھی پُرسکون نہیں پایا تھا۔

وہ اپنی محبوب کرسی پر جا بیٹھے' لکڑی اور کینوس کی آرام دہ کرسی۔ پشت سے ٹیک لگائے اور پاؤں پھیلائے انہیں اس مقام پر بہت آرام آتا تھا۔ ہجرت کے وقت ان کے سب سے بڑے بھائی گھر سے نکلتے اس کرسی کو تہہ کر کے سر پر رکھ کر لائے تھے۔ ساری عمر انہوں نے اس کرسی کو عقیدت سے چوما۔ اپنی آنکھوں سے لگایا' ماڈرن اولاد سے اس کی میک' اپ کے ڈیزائن اور اس کی شکل کی تضحیک بنوائی۔ لیکن جیتے جی اس کا حق تھا۔ شدید پریشانی کے عالم میں ان کو لگتا وہ پھر سے ڈیڑھ سال کے ہو گئے ہیں اور ابا کی گود میں بیٹھ کر بغیر کوئی دکھ جھیلے رو رہے ہیں۔

رضا ماربل کا Chess Board تھامے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں ہلکی سی تاریکی تھی' روشنی اور اندھیرے کے اس Shade میں ان کا مرجھایا ہوا جھکا ہوا چہرہ۔ وہ کھیلنے سے پہلے ہی بازی ہار گئے تھے' وہ بلوایا گیا تھا اور جانتا تھا کیوں بلایا گیا ہے۔ "حد ہے۔ ان لوگوں کو میں ہی ملا تھا اس پیارے آدمی کو دکھ پہنچانے کے لیے۔"

"سر! ایک بازی ہو جائے۔"

اور بغیر ان کی رضامندی لیے چھوٹی تپائی گھسیٹ کر درمیان میں رکھے بورڈ پر مہرے سجانے لگا۔

"آپ نے غور کیا سر! شطرنج کی بساط واحد سلطنت ہے' جہاں قانون چلتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا Portfolio ہے۔ جس میں کسی دوسرے کو مداخلت کی جرأت نہیں۔ مہرے کالے ہوں یا سفید' اپنی اپنی حدود میں رہ کر چلتے ہیں اور کبھی کالے جیت جاتے ہیں' کبھی گورے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں عربی کو عجمی پر فوقیت حاصل نہیں۔"

"آپ عربی مہرے پسند کریں گے یا عجمی؟"

سر ایسے مسکرائے جیسے مسکرانا بھول چکے تھے۔

خاندانوں میں روایات کی پاسداری کا بھرم اتنے فاصلے پیدا کرتا ہے۔ ہر مسئلہ اولاد کی مرضی سے حل کرنے والے' اتنے اہم مسئلے پر اولاد سے بحث نہیں کرتے۔ عثمان کہا کرتا تھا۔ یہ روایات رسمیں سب مڈل کلاس کا سرمایہ ہے۔ اپر کلاس کو ان کی پروا نہیں اور لوئر کلاس کو اس کا علم نہیں' اس وقت ابا سے اس کو بات کرنا پڑتی تو سارا طبقاتی فلسفہ نکل جاتا۔

اب انہوں نے رضا سے ہر بات کر لی تھی۔ اس ایک بات کے سوا جس کے لیے وہ بلوایا گیا تھا۔

انہوں نے بے سوچے اپنا مہرہ آگے سرکایا اور اس بے فکری سے سرکایا کہ شہ کو چیک پڑتی تھی۔ آج بادشاہ کو مات ہوتی ہے تو ہو جائے' بے شک وہ چاروں شانے چت گر جائے۔

"تم کیا مشورہ دیتے ہو؟" انہوں نے بورڈ سے سر اٹھاتے ایسے سوال کیا جیسے وہ دیر سے اس موضوع پر بات کرتے رہے ہوں۔

رضا کچھ دیر کے لیے شش و پنج میں پڑ گیا۔

لیکن عثمان نے اس سے وعدہ لیا تھا' کسی کی دل آزاری کے اندیشے سے وہ حقیقت آشکار کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔

"میں نے جو ذاتی طور پر تحقیقات کی ہیں' جو کچھ جمال کی مدد سے مجھے پتا چلا۔ پہلے تو وہ یونہی ایک معمولی سے اخبار میں کام کرتا تھا جس کا owner بھی گمنام آدمی تھا۔ ایسے لگتا ہے یہ اخبار اسی کو ملازمت دینے کے لیے

نکالا گیا تھا۔ جوں ہی اس نے اخبار چھوڑا اخبار بند کر دیا گیا۔ بظاہر یہ اتنا بڑا جرنلسٹ نہیں' لیکن صدر پرویز مشرف کے میڈیا پریس میں یہ نمایاں نظر آتا ہے۔"

بڑی بڑی میٹنگ اور کانفرنسوں میں یہ ایک کونے میں بیٹھا ہوتا ہے۔ اتنے کونے میں کہ ٹی وی کا کیمرہ بھی اس کو فوکس نہیں کرتا۔ پہلے ایسے گنتی کے لوگ تھے اور سب کی نظر میں ہوتے تھے' اب ان کی تعداد ہزاروں میں پہنچ گئی ہے۔ انتہائی حساس اداروں سے لے کر عام لوگوں کے درمیان گھومتے پھرتے۔ ان کی کوئی خاص پہچان بھی نہیں۔ اس لیے کہا نہیں جا سکتا کہ یہ الزام ہے یا حقیقت۔ یوں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ خطرناک نہیں۔ یہ بھی نوکری کی ایک قسم ہے۔ جیسے UNO ہے۔ ورلڈ بینک ہے۔ اس طرح یہ بھی ایک ادارہ ہے' مگر ظاہر ہے اچھا نہیں سمجھا جاتا اور جو اس کے اچھے پہلو ہیں' Plus پوائنٹس۔ وہ یہ کہ ماں' باپ کو ساتھ رکھا ہوا ہے۔ بہنوں کو پال رہا ہے۔ گھر کا واحد کفیل ہے۔ اور عام طور پر ایسے لوگ جو پیسہ اچھالتے پھرتے ہیں' وہ حالات بھی نہیں۔ سمن آباد میں رہتا ہے۔"

ابا کتنی دیر جیسے لفظوں کا معمہ سلجھاتے رہے۔

"میں پروفیسر عباس رشید۔ ایک محب الوطن پاکستانی۔ جس کا باپ جیل میں ختم ہوا۔ جس نے حق گوئی پر نوکری کو لات ماردی تھی۔ آج۔ آج؟"

ان کی آواز اٹک گئی۔

"اس کو یہ سب بتایا؟"

"جی بتایا۔" "اس نے بھی اعتبار نہیں کیا۔ خود ہمیں بھی تو سو فیصد یقین نہیں؟"

"تمہیں شک تو ہے نا؟"

"سر! شک کا فائدہ تو مجرم کو دیا جاتا ہے سر!"

ابا کی روشن پیشانی پر افقی سمت والے بل ابھی تک موجود تھے۔ وہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے' اولاد کو ذہنی آزادی اور خود مختاری دینے کا ان کا فیصلہ درست تھا یا غلط۔ اگر غلط تھا تب بھی وہ کسی کی آزادی سلب کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

☼ ☼ ☼

معاملات اس آسانی سے سیدھے ہو گئے۔ یا اپنی رو میں بہنے کے لیے چھوڑ دیے گئے۔ جیسے کبھی کوئی الجھن تھی ہی نہیں۔ کسی چھان پھٹک اور مزید تحقیقات کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے نعیم ملک کی والدہ جب رشتے کے لیے گھر آئیں تو نہ ان کو جوتیاں چٹخانی پڑیں' نہ لمبے چوڑے سبز باغ دکھانے کی نوبت آئی۔

نعیم ملک ٹانگ پر ٹانگ رکھے' جس صوفے پر بیٹھا تھا' اسی طرح ساکت صامت خاموش بیٹھا رہا۔ نعیم ملک کی والدہ سر کو جارجٹ کے آنچل سے ڈھانپے اپنے بیٹے کے بالکل ساتھ حق ملکیت کے احساس سے بیٹھی ایک ایک کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"کون لوگ ہیں۔ مالی حیثیت کیا ہے۔ ترجیحات کیا ہیں۔ چونکہ یہاں رہنے والے ڈگریوں کے دھنی تھے۔

"میں نے لاہور کالج سے پڑھا تھا۔" انہوں نے ذرا معتبر لہجے میں کہا۔ یہیں سے آغاز مناسب جانا۔

"اچھا؟" اماں خوش ہو گئیں۔ "کس سن میں؟"

"سن تو اب یاد نہیں۔ اتنی پرانی بات ہے۔ دوستوں کے نام؟ کہاں یاد رہتے ہیں۔ subject اتنا زمانہ گزر گیا۔ لیکن اتنے نمبر تھے کہ کالج کی پرنسپل نے مجھے گھر آدمی بھیج کر بلوایا تھا۔"

www.pkdigest.com

اماں نے حیرت سے کہا۔ "مجھے تو اپنا رول نمبر بھی یاد ہے۔ پھر وہی گفتگو پر چھائی رہیں۔ بڑے ملک رب اور نعیم ملک خاموش سامع تھے۔ بڑے ملک صاحب سے کوئی بات پوچھی جاتی تو جواب دینے سے پہلے اجازت لینے والے انداز میں بیوی کی طرف دیکھتے۔ حمیرا نے آہستگی سے کہا۔ "یہ تو ایسے اجازت لیتے ہیں جیسے شاعر اپنا کلام سنانے سے پہلے میر مشاعرہ کی طرف دیکھتا ہے۔"

"شش ش۔ چلو دونوں اٹھو یہاں سے۔" بیک وقت دونوں نے گھُرکی کھائی۔

"آئے لو۔" کریم بی نے دولہا کے سامنے چائے رکھتے کہا۔ "تم رشتہ مانگنے آئے ہو یا اُدھار چکانے میاں برخوردار! تیوری تو سیدھی کرو۔"

مہمانوں اور گھر والوں دونوں پر سکتہ طاری ہوگیا۔ کسی میں جرأت نہیں تھی جو کریم بی کو ٹوکتا۔ ان کے وقتوں میں لوگ ایسے ہی صاف گو ہوتے تھے۔

(اس وقت کسی کو علم نہیں تھا اس گھر کی صاف گوئی اور کھرے پن پر ایک فائل تیار ہو رہی ہے۔) پھر کام کاج ایسے شروع ہوئے جیسے اس قسم کے واقعات اس گھر کا روز مرہ تھے۔

گھر والوں نے بردباری اور سنجیدگی سے بگڑتے حالات کو سنبھالا دے لیا۔ کسی نے تویرے گلہ کیا نہ شکوہ کہ اس نے ان کا عمر بھر کا نظریہ مٹی کر دیا تھا۔ شادی کی تیاریاں یوں شروع ہوئیں جیسے مشین چلتی ہے۔ بغیر کسی احساس کے۔ کسی بھی دکھ سکھ سے عاری، محض پلگ لگا کر۔

گو گھر میں وہ سب کچھ ہو رہا تھا جو شادی والے گھر میں ہوتا ہے۔ تویری سہیلیاں باقاعدگی سے بازاروں کے چکر لگاتیں۔ ملیحہ نے بھی ان گزرتے واقعات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ عبیر حمیرا بھی بے سرے راگ الاپتیں تو ملیحہ ان کا ساتھ دیتی۔ عثمان اپنی ڈگری چھوڑ کر نہیں آسکتا تھا۔ لہٰذا اس کا نعم البدل رضا موجود تھا۔

www.pkdigest.com

کبھی وہ بھی باورچی خانے سے آواز لگاتیں۔ "وہ کوتا سر ویا کہاں بھول گئے"

آپا بیگم ی سے ادھر سے ادھر آتیں اپنی بیٹی کی نرم مسکراہٹ سے لوگوں کو نوازتی رہتیں۔ جمال بھی کبھی کبھی آجاتا گو اس کے والدین کو یہ رویہ پسند نہیں آیا تھا۔ انہوں نے سر عباس سے اپنے برسوں پرانے مراسم ختم کر لیے تھے۔ کبھی کبھی ہمیں نئے رشتے، پرانے رشتوں کی قبر پہ تعمیر کرنے پڑتے ہیں۔

گھر میں مہمانوں کی آمد کے ساتھ رونق کا آغاز ہوگیا۔ اگرچہ رونق کا احساس نہیں تھا۔ رشتے دار، عزیز دوست احباب، ملنے والے۔ شہریار بھی خاص طور پر پہاڑوں سے اتر کر آیا تھا۔

شاید ہی کسی بے دید منہ پھٹ رشتے دار نے سوال کیا ہو کہ ابھی سال بھر پہلے تو کسی اور سے دھوم دھام سے منگنی ہوئی تھی۔ شادی کا وقت آیا تو کہیں اور... ایسا عموماً "کیوں ہوتا ہے" یہ بھی لوگوں کو پتا ہے۔ لہٰذا ایسے دل دکھاتے سوال کرنے والے کم ہی تھے۔ اس کے باوجود اس نے خود کو کمرے کے ایک کونے میں قید کر لیا تھا۔ اس کے اپنے پاس الزام تراشی کو بھی کچھ نہیں تھا۔ چاہتی بھی تو جمال پر الزام نہیں دھر سکتی تھی۔ "کبھی ہمارا دل چاہتا ہے ذمے داری کوئی اور قبول کرلے"

جس گھر میں وہ پیدا ہوئی۔ جہاں پالی گئی۔ جہاں اس نے خوشی کے بے حساب لمحے گزارے۔ اس گھر میں آج رات اس کی آخری رات تھی۔ کل سے وہ یہاں اجنبی ہوگی۔ یوں تو پتا نہیں کب سے وہ خود کو پرایا کر چکی تھی۔ فاصلوں سے گزرتے اس کے اپنے، حالانکہ وہ مکمل طور پر روٹھی نہیں کی گئی تھی۔ وقفوں وقفوں سے لوگ اس کو قفس کے گوشے میں پوچھنے آجاتے تھے۔

"کھانا یہیں لادوں۔ میز پر تو گی؟"

"آرام کرنا ہے تو ہم اٹھ جائیں؟"

اور آپائی کی معصومانہ محبت۔ "سر میں تیل ڈال دوں؟" اس کو ان کے لہجوں کی مٹھنڈک گرویدہ کرتی تھی۔ اس میں محبت تو تھی لیکن اپنائیت نہیں رہی تھی۔ اس نے دیواریں خود سے بلند کرلی تھیں۔ کبھی کبھی وہ جھنجلانے لگتی۔ ہم لوگوں کو ان کی خواہش کے مطابق زندگی گزارنے کا حق کیوں نہیں دیتے۔ کیسی کیسی بے بنیاد باتوں پر ہماری ناک کٹنے لگتی ہے۔ خود سے الجھ کر لڑ جھگڑ کر پھر اس کو اپنے اور اپنے پیاروں کے درمیان کے فاصلوں کا خوف آنے لگتا۔ وہ دانہ دانہ تسبیح گراتی۔

جس نے بھوک میں کھانا دیا اور خوف میں امن دیا۔

اور...

ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔ لوگ اسی کی شادی کی تیاریوں میں اسی سے بچ بچ کر چل رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس کے موبائل پر اس کی نعیم ملک سے بات ہوئی وہ کل کے تصور سے اس قدر پرجوش تھا کہ وہ آج کی اداسی اس سے بانٹ بھی نہیں سکی۔

عثمان نے اسے فون کیا اور اس طویل کال میں کہیں سے ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس سے خفا ہے۔ اس کی فون کال میں آئندہ زندگی کے لیے دعائیں تھیں۔ اس کو لگا یہ محض لفظ ہیں۔ جن کے کوئی معنی نہیں۔

پھر اس آخری رات ایک طویل جمود کا خاتمہ ہوا۔ اس کے اپنے اس کی طرف لوٹ کر آئے۔ عبیرہ کریم ابا، شہریار، رضا۔ فوزیہ۔

وہ وقفوں وقفوں سے روتی رہی تھی۔ متورم سوجی آنکھیں ان سے چھپانے کی کوشش میں پلکیں جھپک جھپک کر آنسو پیتی وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔ ایک مدت بعد اس کی خواہش کے مطابق خوشیاں منائی گئیں۔ اس کو ہنسایا گیا۔ رخصت ہونے والی بہنوں کی طرح اس سے چھیڑ چھاڑ کی گئی۔

"اچھا ہے یہ بلا ہماری جائے دوجے گاؤں میں۔"

اس کے ساتھ جڑ کر بیٹھی اس کی راج دلاری، بس بات بے بات قلقل ہنستی۔

عجیب عجیب جگہوں کے نت نئے قصے سناتا شہریار۔ جو صرف اس کی شادی کی خاطر برف زاروں سے چھٹی لے کر اترا تھا۔

ہتھیلی بھر بھر کے سر میں تیل چپڑتی آپائی۔

وردہ' دُھم' واسع پیار کرتے اس کے کزن۔ اور لیڈر رضا۔

سب نے مل کر عثمان کی عدم حاضری کا ملال کیا' اور اس کو فون پر اطلاع دی کہ اس کی غیر موجودگی سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔

"کم بختو!" اس نے لڑا کا عورتوں کی طرح غراتے کہا۔ "تم میری کمی محسوس کر رہے ہو یا میری موت کا پریس نوٹ جاری کر رہے ہو۔"

اب جبکہ سب ختم ہونے والا تھا۔ سب ویسا ہی پلٹ آیا۔ ان کے ہونے کے احساس سے سرشار وہ رات بھر ان کے ساتھ جاگتی رہی۔

وہ جب رخصت ہو رہی تھی تو قاعدے کے مطابق روئی بھی نہیں۔ پھر باری باری سب اندر آئے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ایک جیسی دعائیں دیتے۔ صرف رضا نے توقف کیا' وہ سب سے آخر میں آیا تھا۔ اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"زندگی میں کسی بھائی نے رخصت کرتے یہ بات نہیں کی ہوگی' جو میں کہہ رہا ہوں۔ نہ نبھ سکے تو واپس آجانا' خود کو تختہ مشق مت بننے دینا۔ تم بہت قیمتی ہو۔"

☼ ☼ ☼

ایک مانوس فضا سے الگ ہو کر اس نے جہاں قدم رکھا وہاں ہیجان آمیز شور اور اجنبی آوازیں تھیں۔ جن سے مانوس ہونے کے لیے اس کو ایک عمر درکار تھی۔

دلہن کے گھر میں اداسی بھری پسپائی کی فضا سے نکل کر دولہا کے گھر میں فتح کا جشن منایا جا رہا تھا۔

قدیم زمانوں میں جب قلعے فتح کیے جاتے تو عورتوں کو کنیزیں بنا کر ملکیت بنا لیا جاتا تھا۔ اعلان کے طور پر پٹاخے چھوڑے جاتے اور آسمان میں آگ کی چنگاریوں سے آتش بازی ہوتی۔ گویا ایک نئی زندگی کا آغاز نہیں "آقا غلام" کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔

وہ گویا لوٹا ہوا مال تھی' جس پر مکمل حق لٹیرے کو تھا۔ اسے شک گزرا آج یہاں محض تھا اتروائی کی رسم منعقد کی جا رہی ہے۔

اس کا شک غلط ثابت نہیں ہوا۔

☼ ☼ ☼

وہ جب رسم کے مطابق گھر واپس آئی تو صحن اور کمرے مہمانوں سے اٹے پڑے تھے۔ سب سر اٹھا کر اس کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

خواہش!

اللہ کرے خوش ہو۔

اندیشے!

بچپن کی خواہشوں کے برعکس نہیں... نیلم اور رضا ابا کے کمرے میں لے گیا۔ گھر میں ایک چہل پہل مچی تھی جیسے آج وی آئی پی اس گھر میں داخل ہوئے ہوں' توانا اور آباد' باورچی خانہ' چمچوں کی کھنک' پلاؤ کے دم ہونے کی خوشبو' زعفران کی مہک اور شاہی ٹکڑوں پر اپنے ماہرانہ ہنر کا مظاہرہ کرتی بڑی تائی اور آپائی' خوشبوؤں اور آوازوں کے سنگم میں داماد کو خوش کرنے کے جتن کرتے تمام افراد۔

اس نے اپنے چہرے پر ایک خوش باش نوبیاہتا دلہن کا ماسک فٹ کیا۔ سرخ بنارسی ساڑھی میں ادھر سے ادھر پھرتی مسکراہٹوں کے جادو بکھیرتی وہ ایک بہت قسمت والی بیٹی کی طرح گھر واپس آئی تھی۔

تمام مرد حضرات ابا کے کمرے میں جمع حالات حاضرہ پر بحث فرما رہے تھے۔ شہریار کچھ دیر ان کے درمیان ٹھہرا' اپنے ابا' تایا کی نسل کو اپنی نسل کے ساتھ بحث کرتا سنتا رہا۔ سالہا سال سے ایسی کوئی خبر نہیں آئی تھی جس نے پاکستان میں خوشی کی لہر دوڑا دی ہو۔ وہی مایوسی' وہی بے اطمینانی۔ وہ سیاست کے موڈ میں نہیں تھا۔ خواتین میں بیٹھتا تو وہ بھی فرصت سے نہیں تھیں۔ ادھر سے ادھر بھاگتی۔ فضا میں رچی اداسی نے ماحول کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سوگواری سے بچنے کے لیے وہ چپ چاپ لان میں نکل آیا۔ آتی سردیوں کی نیم خنک رات میں دور سے ٹمٹماتا بلب اس کی چہل قدمی کے لیے نہایت موزوں تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ ہر نسل نے وحشت کے عالم میں اس گھاس پر چلتے خود سے باتیں کی تھیں۔

ایک مدت سے ویرانوں میں رہتے اس کو شور سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ ہاتھ پشت پر باندھے لان کا تیسرا چکر لگاتے اس کو اچانک محسوس ہوا کمرے کی کھڑکی کے فریم میں جڑا تصویر کا چہرہ وہ نہیں تھا جو اس نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ آپ اعزاز میں ہونے والی خوش رنگ رونق چھوڑ کر وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں فٹ کچھ نامانوس سی لگی۔

www.pkdigest.com

"کیا ہوا تنویر؟" اس نے پیار سے پوچھا۔
کسی وضاحت کے بغیر وہ آنسو اس کی پلکوں پر آئے اور بے اختیار بہہ نکلے۔
وہ اس گھر کی بے حد لاڈلی تھی اور سب میں مقبول۔ اچانک اس نے کھیلنے کے لیے چاند مانگ لیا۔
برف زاروں میں ڈاک کافی تاخیر سے پہنچتی تھی، لیکن جب فوزیہ نے اس شادی کے قصے کی تفصیل لکھی تو اس کو اس کا اپنے موقف پہ ڈٹ جانا اچھا لگا تھا۔
وہ ایک دوسرے کے مقابل چپ چاپ کھڑے رہے۔
"آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جاتا ہے تنویر۔" وہ نہیں جانتا وہ غلط کیا تھا جس کو ٹھیک ہونا تھا۔ اس کے سوا اس کے پاس تسلی کے لفظ تھے بھی نہیں۔
"میں جانتی ہوں۔" اس نے دھیمی آواز سے کہا۔ "نہیں ہوگا۔" کتنی دیر کے لیے وہ سناٹے میں آ گیا۔
"اس کا مطلب اتنی محنت اتنی مشقت کے بعد تم نے جو کچھ حاصل کیا وہ بے کار گیا؟" شہریار کی آواز میں دکھ کی شدت تھی۔
"جب تک مشیت نہ ہو۔ مشقتیں کسی کام نہیں آتیں۔"
کل سے آج تک اس کی عمر میں سو سال کا اضافہ ہوا تھا۔ شہریار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ذہین تو ہمیشہ سے مشہور تھی، لیکن لاابالی بھی تھی۔ دنیا کو سمجھنے کے لیے اتنی گہرائی کا علم اس میں راتوں رات کہاں سے آ گیا؟
وہ اس کے ساتھ باہر لان میں نکل آئی۔ ابا کے کمرے میں پُرجوش مباحثہ جاری تھا۔ بلب کی روشنیوں میں کھڑکی میں لرزتے سایے آپس میں الجھ رہے تھے۔ دوستانہ مباحثہ۔ وہ دونوں لان کی روش پر ٹہلتے گزرے دنوں کی باتیں کرنے لگے۔ شادی کے ہنگاموں میں اتنی مصروفیت رہی کہ بیٹھ کر لمبی چوڑی باتوں کا وقت ہی نہیں نکلا۔ اس نے وہ بے ساختہ ٹپک کر باہر نکل آنے والے ان قطروں کا پھر ذکر نہیں چھیڑا۔
وہ پھر سے مسکرا رہی تھی۔
اب اس کو زندہ رہنے کا ہنر بھی آ گیا ہے۔ پتا نہیں یہ طاقت اس میں کہاں سے آئی۔ اور اتنے تھوڑے وقت میں اس پر کیا گزری جو اس نے اپنے کل کی امید بھی چھوڑ دی۔
یہ دنیا ہے۔ یہاں جو کل ہو رہا تھا وہ آج نہیں ہے۔ اور آج جو کچھ بھی ہو وہ کل نہیں رہے گا، لیکن وہ تو اپنے کل سے بھی خوش گمان نہیں۔
اس نے شہریار سے ایسا کوئی وعدہ نہیں لیا کہ وہ ان آنسوؤں کے راز کی حفاظت کرے، کیونکہ وہ جانتی تھی وہ کرے گا۔ ضروری نہیں آپ جو کچھ جانتے ہوں وہ سب درست ہو، لیکن سب غلط ہو یہ بھی ضروری نہیں۔
گھر کا دروازہ کھلا۔
کھلے دروازے سے روشنی کا ایک راستہ تاریکی میں جگمگاتا پھیل گیا۔
عبیر کا سر باہر آیا۔
"کھانا لگ گیا ہے، اندر آجاؤ۔"

☼ ☼ ☼

اوس سے جھلملاتی گہری سبز گھاس پر۔ سفید سوت میں مڑھی آرام دہ کرسیاں، پیلے ربن باندھے یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ درمیان کی میزوں پر رکھے پھولوں کے خوش رنگ گلدستے، جن کی خوشبو کم مگر قیمت زیادہ تھی۔ فضا میں تازگی بھری نمی تھی جیسے جس کے طویل خاتمے کے بعد پانی سے بھرے بادل ٹھنڈی ہوائیں لے کر آتے ہیں۔
دیواروں سے چمٹی بیلیں اور ان میں بلبوں کی طرح جھولتے بلبولیں زندگی سارہ حق کے گھر میں تازہ دم اور ہشاش تھی۔ ابھی چند ہی دن پہلے وہ جب یہاں آئی اور کمرہ کمرہ پھرائی گئی تھی، تب بھی یہ حصہ نگاہوں سے اوجھل ہی رہا تھا۔
روبوٹ کی طرح بے تاثر چہرے لیے ٹرے میں مختلف رنگوں کے سوفٹ ڈرنکس اور جوس لیے بیرے، ہر نئے آنے والے کے سامنے جھکنے سے عزت نفس مجروح نہیں ہوتی۔ پلیٹوں میں پروئے ہوئے نتھنوں۔ سلور ڈپ بادام، اور فرائیڈ نمکین کا جو اس ترتیب سے رکھے تھے کہ ہر بیٹھے یا گھومتے پھرتے شخص کی پہنچ میں باآسانی آ سکیں۔
عبیر نے نظر گھما کر محفل میں موجود لوگوں کو دیکھا۔ حالانکہ اسے بچپن سے منع کیا گیا تھا کہ گردن گھما گھما کر لوگوں کو نہیں دیکھا کرتے۔ مگر اس کی تو سب سے بڑی تفریح ہی لوگ اور ان کے رویے دیکھنا تھی۔ یہاں چند ہی چہرے شناسا سے تھے۔ ورنہ یہاں سے وہاں تک اجنبی، نامانوس وجود۔ قیصر نے فخر سے بتایا تھا "انہوں نے صرف قریبی گنے چنے دوستوں کو بلایا ہے" وہ اس بات پر پھولا نہیں سماتا تھا کہ وہ اتنی نامور ہستی کے گنے چنے منتخب لوگوں میں آتا ہے۔ سو یہ ہجوم قریبی دوست ہیں؟ اتنوں سے تو اس کی عمر بھر سلام علیک بھی نہیں رہی ہوگی۔
"وڈے لوگ۔ وڈیاں گلاں۔"
محفل میں حمیرا کو اس کے حصے کی اخلاقیات بھی نبھانی ہوتی تھی۔ ویسے بھی محفل نواز قسم کی لڑکی تھی سو اس کو بلا کر برابر... کو آواز دے جا چکی تھی۔ اب واپسی رخصت کے آس پاس ہی ہوگی، درمیان میں ایک آدھ منٹ رک کر کچھ پوچھنے کو... کیا اچھا ہو جائے پر وہ خفا تو نہیں؟ اگر خفا نہ ہوئی تو شکر کر کے واپس چلی جائے گی۔ خفا ہوئی تو اسے ڈانٹ جائے گی۔
"تم کیا میوزیکل چیئر کھیل رہی ہو۔ کبھی اس کرسی پر نظر آتی ہو کبھی اس پر۔" پچھلی دفعہ جب وہ اسے چیک کرنے آئی تو عبیر نے اس کو جھڑکا تھا۔ اور جوابا" اس سے ڈانٹ کھائی تھی۔ "اور تم cheaters کی طرح کرسی مل کر بیٹھ گئی ہو۔ لوگوں سے ملتی کیوں نہیں۔ لوگ بڑے مزے کی چیز ہوتے ہیں۔"
"اپنے ایمان سے بتانا۔" عبیر نے اس سے پوچھا۔ "کیا حال ہے آپ ٹھیک ہیں۔ میں بھی ٹھیک ہوں، تھینک یو۔ ایک دن میں کتنی دفعہ کہا جا سکتا ہے؟"
شاہ حسین جی بھر کر ہنسی۔ وہ اس کو بوریت سے بچانے اس کے پاس آ بیٹھی تھی اور خود اچھی بھلی بور ہو رہی تھی۔
عبیر کو اس گہما گہمی میں بس اتنا ہی مزہ آتا تھا کہ اسے چپ چاپ دیکھا جائے۔ لوگ گروپ بندی کیے، ہاتھ میں لمبی stem والے گلاس تھامے پھلوں کے رس سے sip (گھونٹ) لے رہے تھے اور ایک سے دوسرے گروپ کی طرف جاتے اور سرسبز گھاس کو قدموں تلے روندتے، وہ سب بحثوں میں الجھے تھے۔ لفظوں کا چونکہ بل نہیں آتا اس لیے اس کا ہم بے دریغ زیاں کرتے ہیں۔
سامنے کھڑے لوگ مفت مشورے لٹا رہے تھے۔ فلاں کو استعفیٰ دینا چاہیے، فلاں کو معطل کر دینا چاہیے۔ فلاں کو پھانسی ہونی چاہیے۔ پر بے چاروں کی سنتا ہی کون ہے۔ خواتین کا گروپ ایک اور نوعیت کی گفتگو کر رہا تھا۔
"مبارک ہو۔ حمزہ کو citizen ship مل گئی۔"

"سعد کا کینیڈین پاسپورٹ بن گیا تھا؟"
"آپ کا بیٹا انا ٹین۔ سو بیاہ کرلایا۔ ہم تو پارٹی کا انتظار ہی کرتے رہے۔"
"اسلام آباد میں تو رہنا بہت ہی مشکل ہو گیا ہے۔ اب تو وہاں بھی خودکش دھماکے شروع ہو گئے ہیں۔"

یہ سارہ حق نے بھی کیا مجمع اکٹھا کیا ہے۔ کیا کیا ہے ان کی زنبیل میں۔ خوف زدہ سہمے لوگ، جہاز کو ڈوبتا دیکھ کر بھاگنے والے چوہے۔ اس چار دیواری سے باہر لوگ اتنے بے خوف ہیں کہ ہر ہفتے ایک دھماکے کی اطلاع سنتے ہیں۔ اموات کی گنتی کرتے ہیں، لیکن وحشت سے گھر نہیں بیٹھ سکتے۔ روزگار کمانے سڑکوں پر آجاتے ہیں، کسی اور ملک میں اتنے دھماکے ہوئے ہوتے تو ان کے شہر سنسان ہو جاتے۔ لیکن یہاں بازاروں کی رونق میں بھی کوئی کمی نہیں آئی۔"

اس پٹاری میں مظلوم بے بس عورتیں بھی جمع ہوتی ہیں۔ تیزاب پھینک کر چہرہ جھلس جانے والی۔ بجلی کے کرنٹ کھانے والی، شوہر کی ستم رسیدہ۔

جادوگر کی پٹاری ہے ان کے پاس۔ ہاتھ ڈالو اور نت نئی چیز نکال لو۔ لال رومال، سفید کبوتر، مرغی کا انڈہ، پانی کا گلاس۔

"قیصر تمہیں بلا رہا ہے۔" ثناء اس کو ہواؤں میں پرواز کرتے اچانک نیچے لے آئی۔

"ایں۔ کیوں بلا رہا ہے۔ خود ادھر کیوں نہیں آتا۔" اس نے کاہلی سے وہیں بیٹھے پوچھا۔ وہ کسی سے بات کرتا اس کی طرف پلٹا۔ اب کے اس چہرے پر جھلاہٹ بھی تھی۔ گویا آ کیوں نہیں چکتیں تمہیں کو پتا تھا۔ کیا کہے گا وہ۔

ان سے ملیے۔ یہ عبیر عباس ہیں۔ وہ جو Play تھا۔ "پردیسی" ان کا لکھا ہوا ہے۔ کیا حال ہیں آپ ٹھیک ہیں۔ میں بھی ٹھیک ہوں تھینک یو (وہی نا) بچوں والی مرعوبیت قیصر میں اور جھلتی اس کو ہے۔

وہ بیزاری سے اٹھی عدم دلچسپی سے چلی۔ لیکن وہ نہ تو متوجہ تھا نہ اس نے اس کو تکتے دیکھا۔ وہ شاید بات ختم کرے تو دیکھے۔ ہمکیات کہیں ختم بھی ہو۔

اچانک دوسرا شخص اس کی طرف پلٹا۔ وہ دونوں شاید کسی سنجیدہ موضوع پر بات کر رہے تھے اور کسی مداخلت کے موڈ میں نہیں تھے۔ ایک اجنبی لڑکی ان کی گفتگو کے درمیان مخل ہوئی تھی۔ حالانکہ اجنبی لڑکی کی مخل ہونے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔

خدا معلوم کون ہے۔ کیا چاہتی ہے۔

عبیر نادم سی ہو گئی۔ "تم نے مجھے بلایا تھا قیصر؟"

قیصر اچانک پلٹا۔ "فاروق احمد!"

اس نے تعارف ایسے کروایا جیسے پوری دنیا اس نام سے آگاہ ہو۔ عبیر نے دیکھا جس سے تعارف کروایا جا رہا تھا وہ اب اس کی طرف متوجہ بھی نہیں تھا، شاید متوجہ تو تھا مگر مخاطب نہیں تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ غالباً کہیں بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ البتہ اس کے چہرے پر سوچتی ہوئی گہری سنجیدگی طاری تھی۔

"ملی ہو پہلے؟"

عبیر نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ ملی ہوں کیا؟

"نہیں۔" اس نے سیدھے اور سپاٹ سے ایک لفظ میں سچ کہہ دیا۔ حالانکہ اس کی ٹریننگ کرنے والوں نے اس کو محفل کے آداب سکھانے کے بہتیرے جتن کر رکھے تھے۔

یوں منہ توڑ جواب دینا بداخلاقی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے ہاں شاید! اور یہ دوسرے کا دل رکھنے کے لیے لازم بھی ہے۔ مصلحتیں کیا ہوتی ہیں اور ان کے اور منافقتوں کے بیچ جو بال برابر فرق ہے، وہ اس کی سمجھ میں کیوں

نہیں آتا۔ گھول کر پلائے گئے اخلاق کے سبق اس سے رٹے نہیں گئے۔ اور غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب غلطی ہو چکی تھی۔

"ملنا چاہیے تھا کیا؟" یونہی اس کے منہ سے پھر ایک بے تکا فقرہ پھسلا۔

فاروق احمد کے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آئی اور غائب ہو گئی۔ آئی بھی تھی کہ نہیں پتا بھی نہیں چلا۔

"یقیناً۔" قیصر نے اسی مرعوبیت سے کہا۔ "اور حیرت ہے کہ تم فاروق احمد کو نہیں جانتیں۔"

پہلے اس کو حیرت تھی، وہ سارہ حق کو نہیں جانتی اور اب یہ کون ہیں جن سے ناواقفیت اچنبھے کی بات ہے۔ کوئی فلم اسٹار، ہیرو ویرو یا کوئی وزیر، وہ تو وزیروں کو بھی نہیں پہچانتی۔ اتنے محکمے نہیں جتنے وزیر ہیں۔ اور آج قیصر نے چھوٹے بھائی والا ایلچی کا رول بدل ڈالا تھا۔ آج "پردیسی" اتنا اہم نہیں رہا تھا۔

"ہو گیا تعارف۔" اس نے پلٹ کر اپنی سیٹ کی طرف دیکھا۔ ثناء کے برابر کوئی اور آبیٹھا تھا اور اس کو توفیق نہیں ہوئی کہ یہ سیٹ ریزرو ہے۔ اور وہ خود بھی اس کو بلا کر بٹھلائے بیٹھا تھا۔

اچھی بھلی بیٹھی تھی دائیں بائیں سے ایسے شاندار مکالمے کان میں پڑ رہے تھے جیسے آپ ریڈیو کے مختلف اسٹیشن سن رہے ہوں۔

"میری جگہ پر کوئی اور بیٹھ گیا۔" وہ اپنی بات کے بے معنی ہونے سے آگاہ تو تھی۔

قیصر نے جز بز ہو کر اپنا وزن ایک پیر سے ہٹا کر دوسرے پر ڈالا۔ کبھی کبھی یہ لڑکی بالکل احمقوں والی بات کرنے لگتی ہے۔

"وہ ایک میز خالی ہے ادھر۔" قیصر نے ایسے کہا جیسے وہ اس کی مدد کو آیا ہو۔

قیصر نے گھبرا کر فاروق کی طرف دیکھا۔ [illegible] اس سے قابلیت کی باتیں کرتی کرسی کا ملال لے کر بیٹھ گئی۔ جب بھی اس پر فخر کرنے کو دل چاہا ہے، مایوس کروا دیتی ہے۔

"کرسیاں کم نہیں ہیں۔ ہو گئیں تو اندر سے آجائیں گی۔" قیصر نے ناگواری سے کہا۔ ایسے جیسے اس فنکشن کا وہی تو منتظم اعلیٰ ہو۔

وہ اس کے ساتھ پھر اسی توجہ سے کسی ممکنہ پریس کانفرنس کی باتیں کرنے لگا۔ جگہ کا تعین۔ اخراجات ہم ممکن ہو گی بھی یا نہیں وغیرہ۔

اس کے پاس کرنے کو اب کچھ نہیں تھا۔ قیصر کام میں مگن ہو گیا تھا۔ دوسرے نے اس کو جانے کا اشارہ دے دیا تھا۔ سو۔ جس خالی میز کی نشان دہی کی گئی، وہ اب بھی خالی تھی۔ وہ خالی بھی اس لیے تھی کہ اس کو تیز روشنیاں spot نہیں کر رہی تھیں۔ اور لوگوں پر روشنیاں نہ پڑیں تو ان کی زندگی تاریک ہو جاتی ہے۔ بہترین جگہ۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی سوچا۔ اب حمیرا اس کو تنہا دیکھے گی تو خود ہی آئے گی۔ وہ نیم تاریکی میں بیٹھی دودھیا روشنی میں نہائے لوگوں کو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں مگن دیکھتی رہی۔

کتنی دیر پہلے سارہ حق اس سے کہتی گزری تھیں۔ "ارے الگ کیوں بیٹھی ہو۔ ادھر آجاؤ اس کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ وہاں چلی جاؤ۔ بس کھانا لگنے والا ہے ایک دو دوستوں کا انتظار ہے۔"

ایک دو مزید؟

وہ چپ چاپ بیٹھی کتنی دیر لوگوں کو خوش ہوتا دیکھتی رہی۔

"معاف کیجیے۔ آپ بڑی محویت سے بور ہو رہی تھیں۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟" اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی خالی میز کے پاس وہ کھڑا تھا۔ جس سے ابھی کچھ دیر پہلے قیصر تعارف کروا کے ناخوش ہوا تھا۔

فقرے کی ساخت کچھ عجیب سی تھی۔ ابھی وہ مکمل مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے اپنا موبائل اور پیپسی کا گلاس میز پر رکھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"یہ دوست بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ مشکل گھڑی میں ہی تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔"

اب معلوم نہیں مشکل گھڑی اس میز پر بیٹھ کر آئی تھی یا آکر بیٹھنے سے پہلے ٹل چکی تھی۔ اور مخاطب خود تھا یا وہ تھی کہ دونوں اپنی اپنی جگہ تنہا تھے۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے کرسی کا رخ ہجوم کی طرف کر لیا تھا۔ صرف تھوڑے سے پروفائل سے جو اس کو نظر آرہا تھا اس سے وہ اس کے مفہوم اور ارادوں کو جانچ کیسے سکتی۔ اس فقرے کا کوئی جواب بنتا بھی ہے یا نہیں اور جو بنتا ہے وہ دے دینا چاہیے یا درگزر کر دینا چاہیے۔ وہ ابھی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اس نے اچانک اپنا سر اس کی طرف گھمایا۔

"آپ کو پارٹیز ڈنرز بہت پسند ہیں؟" پتا نہیں سوال کر رہا تھا یا الزام لگا رہا تھا۔

"بہت۔" اس نے بلا تامل کہا۔

"ہم۔ لگتا ہے۔" اس کے تائید کرنے کے انداز میں عجیب معنی خیزی تھی۔

"اور ان پارٹیز میں کیا چیز ہے، جو آپ کو attract کرتی ہے۔"

اس نے ایک اچٹتی سی نظر عبیر کے چہرے پر پھیلی سراسیمگی پر ڈالی۔

"شاید سوال غیر ضروری ہے۔ لیکن کسی کو جاننے کے عمل سے تو اسی طرح گزرا جاتا ہے۔"

اس نے ایک لمحہ کا وقفہ دیا۔ "اس محفل میں موجود کسی کا اصرار ہے میں آپ سے باتیں کروں، آپ شاید کم گو ہیں مگر میں سر کیف ڈیوٹی پر ہوں۔"

عبیر نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ تو یہ بات ہے۔

"قیصر بچوں والی باتیں کرتا ہے۔ میری غلطی کہ میں نے اسے بتا دیا کہ میں بور ہو رہی ہوں۔"

"اپنی غلطی آسانی سے مان لیتی ہیں۔ اور میں قیصر کے حکم پر یہاں نہیں آیا۔"

"پھر آپ تفریحاً مجھے کنفیوز کرنے آئے ہیں؟"

"اتنی آسانی سے کنفیوز ہو جاتی ہیں آپ؟" اس نے ایک نظر سر سے پاؤں تک اسے دیکھا۔ "چلیے کچھ اور باتیں کرتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیے آپ کا پسندیدہ رنگ کون سا ہے، پسندیدہ خوشبو کون سی ہے۔ آپ کا اسٹار کیا ہے۔"

"بھیجنے والے نے کہا ہے میرا انٹرویو لے کر آئیے؟"

"انٹرویو بھی لے جاتے ہیں آپ کے، بڑی آدمی ہو گئیں پھر تو۔" اس نے ہشاش بشاش مجمع پر ایک نظر ڈالی۔

"سارہ حق کو کب سے جانتی ہیں؟" اس نے اسی غیر متعلق لہجہ میں اگلا سوال کیا تھا۔

"کوئی ایک ہفتے سے۔"

"کافی پرانی دوستی ہوئی نا۔" وہ اپنے انداز میں اسی طرح سنجیدہ تھا۔

"اور آپ سارہ حق کو کب سے جانتے ہیں؟" عبیر کو لگا وہ اپنی آواز کے تحکم سے اس کو زیر کر رہا تھا، ایسے میں دفاع کے بجائے جوابی حملہ بہتر رہے گا۔

"کسی کو جاننا کون سا آسان کام ہے۔ بعض اوقات آپ عمر بھر نہیں جان پاتے۔ کسی کے لیے ہفتہ بھی کافی ہوتا ہے۔"

"کافی تو لمحہ بھی ہوتا ہے۔ سنا ہے۔"

"سنی سنائی پر بھی اعتبار کرتی ہیں آپ؟"

"سنی سنائی پر ضرور کرتی ہوں۔ آنکھوں دیکھی پر چاہے نہ بھی کروں۔"

"لفظوں سے کھیلتی ہیں۔" دلچسپی کی ایک جھلک اس کے چہرے پر کوندی۔ اس نے اچانک اٹھ کر اپنا موبائل جیب میں ڈالا۔ "پھر ملتے ہیں۔"

اس کا پیپسی سے بھرا گلاس میز کے دوسری طرف اسی طرح ان چھوا پڑا تھا۔ کتنی دیر تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیوں آیا تھا اور کیوں اچانک اٹھ کر چلا گیا۔ اور لفظوں کی مار دینے کا سبب، وہ بھی یونہی اس کی بچھائی ہوئی پھسلن پر پھسلتی گئی۔ بقول کریملی۔ آنکھیں بند کر لیتی ہو جب منہ کھولتی ہو۔

وہ اسی نیم تاریک میز پر بیٹھی محفل کے برخاست ہو جانے یا کھانا لگ جانے کی اطلاع کی منتظر بیٹھی رہی۔ اس نے دیکھا اس کے عقب سے عمارت میں سے سارہ حق پھر نمودار ہوئیں۔

"یہاں بیٹھ جاؤ۔ وہاں چلی جاؤ۔" ان کی نظر پڑی تو پھر سے لوگوں میں بانٹتی پھریں گی۔ انہوں نے ابھی دیکھا نہیں تھا کہ ان کے تعاقب میں ان کا کوئی اسسٹنٹ دوڑتا آیا۔

"میڈم۔ ساہیوال والی نسیمہ بی بی آئی ہے آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"کون نسیمہ بی بی؟" انہوں نے تیز قدم اٹھاتے رک کر پوچھا۔

"وہ جس کی بیٹی اغوا ہوئی تھی۔"

"اس وقت؟" سارہ نے حیرت سے اپنے ملازم کی طرف دیکھا۔

"کہتی ہے مصیبت میں ہوں۔ بہت رو رہی ہے میڈم!"

"تو کیا میں ٹشو پیپرز بھجواؤں۔ دیکھتے نہیں یہ کوئی وقت ہے۔" وہ دبی زبان میں بول رہی تھیں۔ اسسٹنٹ بہت دیر تک چپ رہا۔

"ساہیوال سے سیدھی آئی ہے۔ اڈے سے یہاں تک پیدل۔ بھوکی پیاسی ہے، برے حال میں ہے۔"

سارہ حق نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ اس کا ملازم اس کے سامنے بک بک کر رہا تھا۔

"دیکھو یہاں کوئی لنگر نہیں کھلا۔ اگر کچن میں کچھ پڑا ہے تو کھلا دو اسے اور اب مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔ اس کو کوارٹر میں ٹھہراؤ۔ میں صبح سے پہلے کسی سے نہیں ملوں گی۔"

ان کے چہرے پر شدید تناؤ تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ گئیں۔ دودھیا روشنی کی بارش میں اپنے مہمانوں کے عین درمیان میں کھڑی ہو کر انہوں نے اپنے چہرے کا تناؤ بڑی مہارت سے دور کیا۔ ایک نرم لبھا دینے والی مسکراہٹ سے انہوں نے اعلان کیا۔

"کھانا تیار ہے۔"

باقی آئندہ شمارے میں

www.pkdigest.com

رفعت ناہید سجاد

چراغِ آخرِ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر، عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دورانِ تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ گھر کے ماحول اور بے اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف ٹی وی پروڈیوسرز کے لیے پروگرام لکھ کر اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیر اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ

www.pkdigest.com

صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی سانس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے' جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوشیں رنگ لاتی ہیں اور شو کو نا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شومیں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے' جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کرکے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے' اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے' جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۵
پانچویں قسط

کھانا لگنے کی اطلاع کے ساتھ ہی ہجوم یک لخت حرکت میں آگیا۔ وہ سب بھرے پیٹوں کے خوش خوراک مہذب لوگ میزوں کی طرف ایسے لپکے جیسے تین دن کے بھوکے تھے۔ ساہیوال سے سفر کرکے پہنچے تھے۔

عبیر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھائے اپنی اسی نیم تاریک کرسی پر پلاسٹر آف پیرس کے مجسمے کی طرح ساکت و صامت بیٹھی لوگوں کو اپنی پلیٹوں میں خوراک کے پہاڑ بناتے دیکھتی رہی' بے رنگ سے بے تاثر چہرہ لیے جیسے کسی اناڑی نے سانچہ سے نکال کر کرسی پر جمادیا ہو۔ ٹیکسلا کے کھنڈرات سے چرائے کسی بدھ کے مجسمے کی نقل کی نقل۔

طویل و عریض گھاس کا قطعہ اب خالی خالی لگ رہا تھا۔ ساری پلچل سمٹ کر اب چمچوں کی کھنکھناہٹ کے گرد ہو گئی تھی۔ کوئی اس کے پاس سے گزرا بھی تو اس کو یوں الگ تھلگ روٹھا سا بیٹھا دیکھ کر کچھ نہیں بولا۔ یہ ایلیٹ کا طبقہ ہے۔ یہاں بغیر مفاد آپ کسی سے بات نہیں کرتے۔ اس گروپ کے اندر ایک میٹر نصب ہوتا ہے جو ایک لمحے میں کیلکولیٹ کرلیتا ہے کہ مخاطب کے کپڑے' پرس' جوتوں اور ماتھے پر بجی تیوری کی کل مالیت کیا ہوگی۔ کمتر مالیت کے لوگوں کو منہ نہ لگانا ایک اَن کہا سمجھوتا ہے۔

عبیر کو چپ لگ گئی۔ مہمانوں کو دیکھتے دیکھتے' جو حکمرانوں' سیاست دانوں اور NBP اسکیل کے آخری گریڈز پر تھے۔ اب اس کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ کھانوں کے لدے پھندے ٹیبلوں کے ساتھ بھاگتے کیٹرنگ سروس والے' خالی ہو جانے والی میزوں کی طرف لپکتے۔

ایک سیاہ بو اور سفید براق کپڑوں والا ویٹر اس کے پاس جھکا۔

"آیئے میڈم!"

لیکن میڈم ہل نہیں سکی۔ یہ خواتین کی حقوق کی علم بردار انسانیت دوست' غریبوں کے کام آنے والی ایک عظیم الشان لیڈر کا دسترخوان تھا۔ وسیع اور لذیذ۔

جو اس نے سنا' کسی نے نہیں سنا تھا۔ اس نے کسی سے کچھ کہا بھی نہیں تھا۔

کون مانتا وہ شکی' وہمی قرار دے دی جاتی۔ اس کا گروپ اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ سارہ حق کے آگے بچھا جا رہا تھا۔ لوگ پلیٹیں اور نیپکن سنبھالے اپنی اپنی پسند کے لوگوں کی طرف پلٹ گئے تھے۔ ایسی محفلیں پی آر کے لیے سجائی جاتی ہیں۔ جن نئے لوگوں سے آج کچھ لوگ ملے ہیں' ان سے اگلی ملاقات ان کے گھریا جم خانہ میں ہو گی۔ اگر دونوں ایک دوسرے کو کوئی فائدہ پہنچا سکیں تو... ورنہ فرصت ہی کہاں ملتی ہے؟

اس کے دوستوں کا رول میزبانوں والا تھا۔ جب سب اپنی اپنی میزوں پر بیٹھ چکے تو وہ میز کی طرف چلے۔ حمیرا دونوں ہاتھوں میں پلیٹیں تھامے اس کی میز کی طرف آرہی تھی۔

اس کا مطلب وہ اس سے بالکل بے خبر نہیں تھی۔

پلیٹ اس کی طرف سرکا کر کرسی سنبھالتے وہ بڑی بشاشت سے اس چار دیواری میں ہونے والے واقعات پر بے لاگ تبصرہ کرنے لگی۔ وہ آج بہت سے نئے لوگوں سے ملی تھی اور پلیٹ کر پرانی کی طرف آگئی تھی۔ اس کا سفر بس اتنا ہی ہوتا تھا۔

"کیا ہوا۔ کھاتی کیوں نہیں؟"

اسے لگا اس کی پلیٹ میں پتھر پڑے ہیں' اس سے نگلے نہیں جائیں گے۔

آج کے سارا دن کی مصروفیت کھانا تھی۔ اکٹھا ہونا۔ انتظار' لوٹ مار اور اب آخری سین چل رہا تھا۔ اپنے پیٹوں کو جانوروں کا قبرستان بنانے کا۔

عبیر نے بے دلی سے پلیٹ اپنی طرف کھینچی۔ پلیٹ خوش رنگ تھی لیکن اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ قیصر بڑی تیزی سے بھاگتا ان کی طرف آیا۔

"ہمیں فنکشن ختم ہونے کے بعد کچھ دیر ٹھہرنا ہے۔ سارہ حق نے کوئی بات کرنی ہے۔" پہلا لقمہ منہ میں گیا ہی تھا کہ اس کو لگا الٹ کر باہر آجائے گا۔

"سارہ بہت سویٹ ہیں ہے نا؟" حمیرا پھر جذباتی ہو گئی تھی۔

"باہر کے لوگ چلے جائیں تو میٹنگ ہوگی۔ انتظار کرنا۔"

قیصر شادی میں مصروف لڑکی کے بھائی کی طرح ادھر سے اُدھر افراتفری میں دکھتا تھا۔ سو جس سمت سے آیا تھا' اس سے مختلف سمت اسی تیزی سے نکل گیا۔

"پھر سے؟" عبیر نے مایوسی سے سوچا۔ "اس کو پھر سے گروپ کی خاطر احکامات کی بجا آوری کرنا ہوگی۔" اور پتا نہیں یہ انتظار کتنا طول پکڑتا ہے۔ مہمانوں کو تو کوئی جلدی نہیں تھی۔ نہایت فرصت سے کھانا کھاتے۔ کافی کے گھونٹ بھرتے انہوں نے اتنی سی دیر میں کیا کچھ نہیں کر ڈالا تھا۔ ملک سے غربت کا خاتمہ کردیا تھا۔ جمہوریت نافذ کردی تھی۔ عدل و انصاف کا بول بالا ہو گیا تھا۔ 40 بائی 60 کے دیوہیکل بورڈز پر اپنی تصویریں سجی دیکھ لی تھیں۔ یہ ہی دراصل ملک کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اقتدار کس کے پاس جاتا ہے۔

سارہ حق رات کے تاریک ہونے کے قریب گیٹ کے پاس کھڑے ہو کر رخصت ہونے والے مہمانوں کو ایک مسلسل مسکراہٹ سے نواز رہی تھیں۔ انہیں بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ جیسے کوئی بھی کام ادھورا نہیں پڑا تھا۔ رات کی سیاہی میں بتدریج بجھتی بتیوں میں کائی رنگ گھاس پر اب تتی کے ہی لوگ رہ گئے تھے۔

"رضا کیوں نہیں پہنچا بھلا؟" عبیر نے محتاط انداز میں سرگوشی کی تھی۔

"میں نے منع کردیا تھا۔ اس کے بعد میٹنگ ہے۔"

www.pkdigest.com

حمیرا اس سہولت سے بیٹھی تھی جیسے میکے آئی ہوئی ہو۔ ایک نظر اس نے عبیر کے اکتائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

"تم کیا سیاست دانوں کی طرح۔۔۔ مشکل آئی اور بھاگیں۔"

لمحہ بھر کے لیے اس نے اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھا۔ "بات کیا ہے؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔ وہ اب بھی کچھ نہیں بولی تھی۔

اجنبی لوگوں کا مجمع ختم ہو گیا تھا۔ جو لوگ بچ رہے عبیر کے لیے تو وہ بھی اجنبی تھے لیکن ایسا چونکہ قیصر نے کہا تھا اس لیے اس کو یقین کرنا پڑا کہ اجنبی جا چکے ہیں اور جو بچے 'وہ اپنے ہی ہیں۔

میزوں کی صفائی کا کام تیزی سے جاری تھا۔ کراکری اٹھانے اور چادریں سمیٹنے کے لیے سفید یونی فارم والے اب مرکزی حصے میں مصروف عمل تھے گنداان سے ذرا فاصلے پر لان کے نسبتاً "خاموش گوشے" میں لان چیئرز کا ایک دائرہ بنا لیا گیا تھا۔ وہ بھی چونکہ ایک کرسی پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ اس لیے اسی دائرے میں شامل تھی۔ سارہ حق کوئی اہم بات کہنے والی تھیں اور اس کو ان خوش نصیبوں میں شمار کر لیا گیا تھا جن کے ساتھ اہم باتیں شیئر کر کے ان کو وی آئی پی ہونے کا درجہ دیا جاتا ہے۔ بات شروع کرنے سے پہلے کی ہلکی سی کھنکار۔ سب کے متوجہ ہو جانے کے بعد کا ڈرامائی وقفہ خاموشی۔ جس میں لوگ بات کی نزاکت کا احساس کر سکیں۔

"یقین نہیں آتا یہ اکیسویں صدی ہے۔ یہاں آج بھی ایک جنرل حکمران بنا ہماری جگ ہنسائی کا باعث بن رہا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ (اس کہاں سے کہاں میں انہوں نے دشمنوں کی۔۔۔ وہ کامیابیاں بھی گنوائیں جو ہمارے سروں کے مینار پر حاصل کی گئیں) ہمارا اسپورٹ دنیا میں بے توقیر ہے 'ہمارے حکمران آج بھی جمہوریت کو غیر ضروری چیز سمجھتے ہیں۔ ایسی حکومتیں فیوڈلز کو تحفظ دینے کے لیے وجود میں آتی ہیں۔ ان کو پالتے بھی ہمارے جاگیردار ہیں۔ ان کی بقا اسی میں ہے۔"

"آپ لوگ جانتے ہیں این جی اوز اور ہمارے جیسی بہت سی انجمنیں انسانیت کی بہبود کے لیے ایسے بہت سے کام کر رہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے جو کریڈٹ ہمیں دیا 'وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔"

اتنی لمبی تقریر جو مرعوبیت اور اشتیاق سے سنی جا رہی تھی ذرا دیر کو بند ہوئی۔

"ساہیوال کی ایک کسان خاتون ہیں نسیمہ بی بی۔ ان کی نو عمر بچی اغوا کر لی گئی ہے۔ ہم نے مشکل سے اس کی ایف آئی آر درج کروائی ہے ورنہ تھانہ اس کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ میں آپ سب کے سامنے یہ کیس رکھتی ہوں۔ ہم لوگ پولیس اداروں قانون۔ ان سب کا انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہر حال میں لڑکی چاہیے۔ کیا ننگا بھوکا غریب انسان انصاف کا حق دار نہیں؟"

کھٹے۔ ایک کے بعد ایک۔

تقریر کے دوسرے حصے پر' دائرے میں بیٹھے لوگ ذرا بے چین ہوئے۔

"ہر روز' کئی مرتبہ پاکستان میں Human Rights کی Violation انسانی حقوق کی خلاف ورزی) ہوتی ہے۔ ایک گیلپ کے مطابق پچھلے سال 38 ہزار سے زائد کیس رجسٹر ہوئے اور یہ صرف وہ ہیں جو درج ہوئے۔ تین گنا زائد وہ ہوتے ہیں' جو تھانے تک پہنچتے ہی نہیں ہم خبر سنتے ہیں۔ لیکن صرف ایک کان سے۔ پھر بھول جاتے ہیں۔ میں اس وقت عوام سے مخاطب نہیں۔ میں اس طبقے سے بات کر رہی ہوں جو عوام کی خیر خواہی کے کام کر رہا ہے۔"

عبیر وہاں بیٹھی بھی حسب عادت غائب تھی۔ اس کی عین ناک کی سیدھ میں سارہ حق تقریر کر رہی تھیں

لفظوں میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں کے مختلف اینگل بھنویں کھنچ کر ماتھے پہ چڑھ جاتیں۔ کبھی سکڑ کر تیوری بن جاتیں۔ آہستہ آہستہ عبیر کو ان کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ محفل میں بیٹھے بیٹھے سوچ آف کر لینے میں وہ ہمیشہ کی ماہر تھی۔ جیسے بچپن میں وہ والیوم بند کر کے قوالی سنا کرتے تھے۔ چہرہ سامنے ہے' ہونٹ ہلتے ہیں۔ چہرے کا ایک ایک مسل بول رہا ہے لیکن آواز نہیں آتی۔ اچھا خاصا قوال مسخرہ لگتا ہے۔

اس کے سامنے بیٹھی سارہ حق شکلیں بدل رہی تھیں۔ ان کی جگہ جیسے کوئی چڑیل آ بیٹھی تھی۔ باہر نکلے دانت۔ جن کی ریخیں کالی سیاہ تھیں۔ سر پر دو خم دار سینگ۔ ہاتھوں کے لمبے لمبے ناخن اس نے پڑپڑ آنکھیں جھپکیں۔ ان کی شکل مزید ڈراؤنی ہو رہی تھی۔ جیسے انہوں نے اس کو ڈرانے کے لیے چہرے پر ربڑ کا ماسک فٹ کر لیا تھا۔

نسیمہ بی بی اور اس کی چودہ سالہ بچی کہاں سے اغوا ہوئی، ممکنہ طور پر کس نے اغوا کی، فائل کیا بولتی ہے؟ واقعہ Float کر دیا گیا تھا۔ کھینی جانے والی کافی' چائے اور گرین ٹی کی ٹرالیوں کے ساتھ ساتھ بحث سفر کر رہی تھی۔

سارہ حق اپنے نکات پیش کرتے کرتے رکیں۔ ان کی نگاہ محفل میں شامل ہونے والے نو وارد کی طرف تھی۔ ان کی نظر سے سب کی نظر اس طرف اٹھی۔ وہ جگجی کہیں سے گھومتا ٹہلتا اس دائرے کے گرد آیا۔ گویا اپنے بیٹھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہا ہو۔

عبیر کے دائیں ہاتھ اعجاز کی خالی کی ہوئی کرسی اسی طرح پڑی تھی۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ایک لمحہ کو ذرا فاصلے پر ٹھہرا۔

"لو پھر آ گیا" کسی نے اس کی توجہ خالی کی ہوئی کرسی کی طرف دلائی۔

عبیر کی بیزاری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اب اگر اس نے پھر فضول بحث شروع کی تو میں اس کے دانت توڑ دوں گی۔

اسے لگا وہ کرسی پر بیٹھتے ذرا ہچکچایا تھا۔ دانت توڑ دینے کا ارادہ اس کے چہرے پر ہی لکھا تھا یا بلاوجہ ہی اس کے قریب بیٹھتے اس نے محتاط انداز اپنایا تھا۔ عبیر جیسے تناؤ کی کیفیت میں منتظر بیٹھی تھی کہ وہ پھر لایعنی سوالات کی بوچھاڑ کر دے گا۔ لیکن اس نے کرسی کو تھوڑا سا کھسکایا اور ان مذاکرات میں شریک ہو گیا' جو اس کی آمد سے قبل موضوع بحث تھے۔ جگجی نے اس کو پہچانا بھی نہیں تھا۔ وہ خواہ مخواہ اتنی دیر سے اعصاب میں کھنچاؤ لیے بیٹھی رہی۔ اس کا سارا دھیان سارہ کی بات پر تھا۔ وہ لیڈر تھیں اور لیڈر سسٹم کو کوس رہی تھیں معاشی تفریق۔ انصاف کی عدم دستیابی' جاگیرداری نظام کا تحفظ۔

ان کی کان کی لو پہ رکھا ہیرا ہر جذباتی آہنگ پر نئے لفظ کا جھپکا مارتا تھا۔ اچانک عمارت سے کوئی شخص باہر آیا بڑی تیزی میں وہ لپک کر سارہ کی کرسی کے پیچھے کھڑا ہوا۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر رکوع کی حالت میں سارہ کے کان تک آیا۔

"ایکسکیوز می میڈم!" کچھ سرگوشی میں کہا۔

ان کا رنگ لمحہ بھر کو بدلا۔ پھر جیسے بریکنگ نیوز کی طرح اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ہجوم کی طرف ایک اسرار سے دیکھا۔

"مجھے بتایا گیا ہے' ابھی ابھی ساہیوال والی نسیمہ کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ میرے علم میں نہیں تھا' وہ چند لمحے پہلے ہمارے گھر آئی تھی۔"

ان کے بیان کے سب لفظ نپے تلے اور سوچ سوچ کر ادا کیے گئے تھے۔ کیونکہ ایک رپورٹر بھی اس محفل میں

موجود تھا۔ بے شک نجی دورے کی حیثیت سے تھا لیکن وہ بہت محتاط تھیں۔ لوگ بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔ یہ عجیب سا تصور تھا' ان کی آرائشی جگمگاتی روشنیوں اور عمارت کے عظیم الشان ڈھب کے پیچھے موت کا فرشتہ بے خبری میں آیا تھا۔ کسی کو اس کے آنے کی آہٹ بھی نہیں ہوئی۔ لوگ بے ساختگی ہی میں اس طرف دوڑے جہاں اطلاع لانے والا چلا تھا۔

وہ کچھ دیر اسی طرح گم صم بیٹھی رہی۔ گول دائرے میں بچھی خالی کرسیوں کو خاموشی سے تکتی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ان کرسیوں پر زندہ جسم موجود تھے۔ پھر وہ سب بھاگ لیے۔ موت کوئی تماشا نہیں ہوتی۔ لیکن وہ بھی اٹھی اور خاموشی سے تماش بینوں میں شامل ہو گئی۔

ملازمین کے رہائشی حصوں کے سامنے آئینوں کے فرش والے صحن میں ایک کھری چارپائی پر زرد رو نسیمہ بی بی ہاتھ پاؤں سیدھے کیے سکون سے استراحت فرما رہی تھی۔

اسے لگا وہ نسیمہ بی بی کی پرانی شناسا ہے۔ کم از کم یہاں موجود سب لوگوں سے پہلے اس نے اس کا نام سنا تھا۔ یہ آگہی نئی نہیں۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے صرف اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ جو پھٹی ایڑیوں والے اپنے پاؤں سیدھے سیدھے رکھے اس سے بے خبر سو رہی تھی۔ وہ ویسے بھی سیدھے راستے چلی ہو گی۔ خواہش ہو بھی تو اس کے قدم ٹیڑھے نہیں پڑ سکتے۔ ایک طرف کو ڈھلکی گردن۔ جیسے وہ اس سارے تماشے سے تھک کے بے زار ہو گئی تھی۔ کہاں تک دیکھے؟ کیا کیا دیکھے؟ اس کی پائنتی کی طرف ایک میلی کچیلی غلیظ سی لڑکی سہمی سمٹی کھڑی تھی۔ بالوں کی رسیاں بٹی ہوئی۔ شریفے کے بیج جیسے پیلے دانت۔ لاش کی طرح کا پیلا زرد میلا چہرہ' خوف سے سنا ہوا۔ وہ نہیں جانتی تھی کیا ہوا۔ موت سے اس کی زیادہ واقفیت نہیں تھی شاید۔ نہ ہی وہ اس حتمی تقدیر سے آگاہ تھی جس میں واپسی کے راستے نہیں ہوتے۔ شاید اس کو بھی ابھی اغوا ہونے یا دنیا کے تھپیڑے کھاتے یونہی لیٹ کر جان دے دینی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے سب کچھ بدحواش تھا۔ نسیمہ بی بی کا ذکر کرتے اور آنے والی کل کے لیے بھاگ دوڑ کرتے لوگ۔

فرید الدین عطار نے اپنی مصروف زندگی سے سر اٹھا کر بے زاری سے سائل کو جواب دیا تھا۔

"اسی طرح جان دے دوں گا' جس طرح تو دے گا۔"

نسیمہ بی بی فقیر کی طرح اپنا کشکول ایک طرف رکھ کر سیدھی سیدھی لیٹ کر جان دے چکی تھی' جب پیچھے سے کوئی خواہش آپ کو پکڑتی نہ ہو تو جان دینا مشکل نہیں ہوتا۔

کسی ملازم کی خستہ سی چادر لاش کا تن ڈھانپنے اور گزرے ماہ و سال کے زخم چھپانے کو کافی تھی مگر اس نے کبھی کچھ چھپانے کے لیے بھی جتن نہیں کیے ہوں گے۔

ابھی ذرا ہی دیر پہلے ملازمین نے ڈش میں چھوڑے کھانوں کے بڑے بڑے پیک بنا کر رخصت ہونے والی کاروں کے ڈرائیورز کو دیے تھے یہ "ڈوگی پیک" کہلاتے تھے۔ نوکروں نے بڑی مہارت سے ایسی باریک ہڈیاں چن کر علیحدہ کی تھیں۔ جو کتوں کو ان کے حلق میں پھنس کر نقصان پہنچا سکتی تھیں۔ کھانا ضائع ہونے سے بچانے کے لیے کسی نے سارہ حق کو جنت کی بشارت بھی دی تھی۔ سو وہ کتے عزیز تر تھے جن کو کھا کر مرنے سے بچایا جا سکتا تھا۔ ان انسانوں سے جو بے کھائے مر گئے۔

کتنی دیر تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا' انہوں نے کیا دیکھا۔ وہ بس لاش کے گرد ساکن کھڑے رہ گئے۔ ملازمین کے بچے اپنے کوارٹروں سے نکل کر اس چارپائی کی طرف دوڑے۔ ننگے پیروں اور خوف زدہ چہروں سے وہ دیکھنے جو اس سے پہلے انہوں نے نہیں دیکھا۔

www.pkdigest.com

سب سے پہلے سارہ حق کو ہوش آیا۔

"پولیس... پولیس کو اطلاع کرو فوراً..."

ایک دم جیسے لوگ سکتے کی کیفیت سے نکلے' اچانک موبائل فونز میں جان پڑ گئی۔ بٹن پریس ہونے کی ٹک ٹک کے ساتھ ہر ایک کے ہاتھ میں انواع اقسام کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی تھیں۔ افراتفری میں لوگ کھڑی گاڑیوں کی طرف لپکے۔ کسی بھی دم صحافی اور پولیس آ پہنچیں گے۔

"صحافیوں کا اندر ارینج منٹ کرنا ہے۔ کانفرنس ہال کھلواؤ۔"

سارہ حق نے بطور لیڈر احکامات کا اختیار سنبھال لیا تھا۔ عبیر نے ان کی طرف ایک نظر اٹھائی۔ لمبے لمبے خوفناک دانتوں کی سیاہ ریخیں خون آلود تھیں۔ جیسے ابھی ابھی انہوں نے لہو کا تازہ گھونٹ بھرا ہو۔ روکتے روکتے اس کو ابکائی آ گئی' عبیر کو لگا وہ تھوڑی دیر اور کھڑی رہی تو اس کے پیر اس کا وزن نہیں سہار سکیں گے۔ بند ہوتی آنکھوں کو پوری شدت سے کھلا رکھنے کی جدوجہد کرتے اس نے اعجاز کو دوڑ لگاتے دیکھا۔ سارہ حق کے ساتھیوں نے خود ہی اپنے ذمے کام بانٹ لیے تھے۔ اب کیا فائدہ۔ اب تو وہ گئی۔ اب آپ کی جلد بازی اور بھاگ دوڑ اس کے کس کام آئے گی۔ اس نے چکراتے ہوئے سر سے سیمنٹ کے ستون کو تھاما۔ وہ جہاں کھڑی تھی' اسی برآمدے کے فرش پر بیٹھ رہی۔ سو یہ ہوتی ہے موت۔

اس کے اور زرد چہرے والی لاش کے درمیان اب کوئی نہیں تھا' سوائے نوکروں کے دہشت زدہ بچوں کے۔

ظلم ناانصافی کی انتہا۔ اغوا صرف چودہ سال کی لڑکی غریب آدمی۔

غصے میں بھرے طیش سے دانت پیسے' اس کے ساتھیوں کے جملے بھی اس کے ہاتھ سے پھسل پھسل جا رہے تھے۔ سوائے چند مانوس لفظوں کے۔ جس کو اس کے کان نسلوں سے سن سن کر عادی ہو گئے تھے۔

زمین پر نظریں گاڑے گاڑے بھی اسے احساس ہوا۔ مرروچھنولیاں کے اس صحن میں ایک طویل سایہ اس کے سامنے بچھا ہوا تھا۔ اس نے اس سائے کے وجود کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ آنے والا بے آواز قدموں سے آیا تھا۔

اسی خاموشی سے وہ اس سے چند بالشت کا فاصلہ چھوڑ کر بیٹھ رہا۔ برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر صحن میں پاؤں لٹکائے۔

"یہ زندگی ہے خاتون!" ایک ٹھہری ہوئی آواز خاموشی میں ابھری۔ "یہاں انسان اسی طرح لاشوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔"

"اف۔" اس نے لمحہ بھر کے لیے سر اٹھایا۔ "اس شخص کے وجود میں کس قدر تلخی ہے۔ موت کے ساتھ اتنا Matter of fact (حقیقت پسندانہ) قسم کا رویہ تو صرف گورکن کا ہی ہو سکتا ہے۔ اس وقت وہ خود بہت تلخ ہو رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالی۔ پھر گردن موڑ لی۔

سارہ حق لاش سے کافی فاصلے پر اپنے نوٹ پیڈ پر دائیں سے بائیں تیزی میں قلم چلا رہی تھیں۔ ایک سیکنڈ کو پین روک کر انہوں نے اس برآمدے کی طرف دیکھا۔ عبیر نے بیزاری سی محسوس کی۔ پتہ نہیں ان کی نظریں اسی کے ساتھ کیوں گھومتی ہیں۔

"لاش کو گاؤں پہنچانے کا بندوبست کرنا ہے؟" کسی نے ان کی محویت توڑی۔

پچکے ہوئے گالوں گڑھوں میں دھنسی آنکھیں' پیلے زرد باہر کو نکلے دانت۔ وہ تو زندہ بھی لاش تھی۔

"نہیں۔" سارہ نے جھنجلاہٹ سے کہا۔ "پولیس کو تو پہنچنے دو۔"

سو جب تک سارہ حق کی بات نہ ہو' وہ اپنے گھر بھی واپس نہیں جا سکتی تھی۔ اپنے علاقے میں مرتی تو آدوبکا کا

www.pkdigest.com

ایک طوفان اٹھتا۔ دور دور کے گاؤں سے عورتیں چہرے پر اوڑھنیوں کے گھونگٹ نکالے' پاپیادہ قافلوں کی صورت اس کے گھر اترتیں۔ میلوں پیچھے سے بین کرتی۔ سینہ کوٹتی۔ بال بکھیرتی۔ اور ایک دوسرے سے گلہ کرتی کہ تمہاری ساس مری تو میں دو کوس پیچھے سے روتی آئی تھی۔ میرا باپ مرا تو..."

سو جس عورت کو زندگی بھر کوئی جشن نصیب نہیں ہوا تھا' وہ موت کے جشن سے بھی محروم رہ گئی۔

ابھی ڈنر کا ہنگامہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک اور تقریب کا آغاز ہو گیا۔ زندگی میں اسی طرح ہلچل رہتی ہے۔ لاش اور اس کے قریب کھڑی بھٹی بھٹی آنکھوں والی بچی جیسے اس ساری کہانی کے کردار ہی نہیں تھے۔ وہ صرف کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون تھے۔ جیسے کسی بہت اہم حصے میں کچھ ایکسٹرا ڈال دیے جاتے ہیں۔ جن کا اصل کہانی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

کہانی کا مرکزی خیال پریس کانفرنس تھی۔ لاش نہیں۔

"لفظوں کا کھیل چونکہ آپ کو پسند ہے۔ اس موقع پر ایک سوال آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ کے خیال میں اس وقت موت اہم ہے یا وجہ موت؟"

اس نے ایک خفگی نظر نزدیک بیٹھے شخص پر ڈالی۔ اب جبکہ ہر فرد کسی نہ کسی کام میں مصروف تھا۔ وہ قطعی بے کار بیٹھا تھا۔ شاید وہ اس کی طرح محفل سے بے تکلف نہیں۔ لیکن وہ یہ جانتی تھی اس نے دونوں آپشن میں سے جو بھی چنا اور جو بھی دلیل دی۔ وہ اس کو رد کر دے گا۔

"اہم تو زندگی ہے۔"

"ہمم۔"

"یوں دیکھا جائے تو کسی ایک کے مر جانے سے زندگی کا مکمل خاتمہ نہیں ہوتا۔ یہ بچی جو لاش کے پاس کھڑی ہے۔ وہ لڑکی جو اغوا ہو گئی ہے۔ یا وہ لوگ جو پیچھے اس کے گھر رہ گئے ہیں۔ اب اہم ان کی زندگی ہے' اپنی اپنی ذاتی موت تک۔"

اس نے ایک اچٹتی سی نظر جیسے آسمان پر ڈالی۔

"بحر ہند کے کنارے بدقسمت ملکوں کے لوگ ایسے ہی چوہے کی موت مرتے رہتے ہیں۔"

وہ زندگی اور موت کے بارے میں اپنا فلسفہ بیان کر کے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"لڑکیاں گھر کیسے جائیں گی؟" اعجاز کو جیسے ایک دم تشویش لاحق ہوئی۔

"اُفوہ!" سارہ حق نے کاغذوں سے سر اٹھاتے جھلا کر کہا۔ "اعجاز! ہر وقت بڑے بھیا نہ بنا کرو۔ وہ لڑکیاں ہیں۔ بچیاں نہیں۔"

"کوئی باہر نکل رہا ہو تو پہلے لڑکیوں کو گھر چھوڑ آئے۔" اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے' ابھی کانفرنس ختم نہیں ہوئی۔" تحکم ان کی آواز میں عیاں تھا۔

حمیرا نے پتا نہیں رضا کو کیا تاثر دیا تھا۔ کتنی دیر سے وہ لاش کی سہمی ہوئی بچی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کو پروا بھی نہیں تھی کہ ان کا گھر بتایا جانا کوئی مسئلہ بن رہا ہے۔

"میں جا رہا ہوں۔" فاروق نے گھڑی پر ایک جھلتی نظر ڈال کر لاتعلقی سے اعلان کیا۔ "جس جس کو چلنا ہو چلے۔" کسی سے مخاطب ہوئے بغیر اور کسی کا انتظار کیے بنا وہ چل دیا تھا۔

اعجاز کے اشارے پر حمیرا اس کے پیچھے لپکی اور حمیرا کے پیچھے بھاگنے کے بجائے رات کے گیارہ بج کر دس منٹ پر اس نے رضا کا نمبر ملانے کی ایک اور کوشش کی۔ بیل بج بج کر تھک گئی۔

"آؤ نا عبیر!" حمیرا نے فاروق کے پیچھے قدم بڑھاتے آواز دی۔ "یہ لوگ دیر سے فارغ ہوں گے۔"

"ٹھہرو فاروق! عبیر آرہی ہے۔" اعجاز نے اسے پکارا۔

مگر اس کے بڑھتے قدم مڑ کر نہ سست ہوئے۔ حمیرا نے حیرت سے اپنی ضدی دوست کی طرف دیکھا۔

"تم چلتی کیوں نہیں؟ یہ موقع ہے خودداری دکھانے کا۔"

حمیرا کی جھڑکی کھا کر وہ ہمیشہ کان دبا لیا کرتی تھی لیکن لیکن بڑبڑانے سے باز نہیں آتی تھی۔

"اب خودداری دکھانے کے لیے بھی موقع چاہیے۔"

اعجاز نے برف کی سل چارپائی کے نیچے دھکیلتے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ فاروق اپنی کار تک پہنچ چکا تھا، عبیر اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں تھی۔ حمیرا دو انتہاؤں کے درمیان کھڑی۔ ہر دو طرف پریشانی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ گیلے ہاتھ کرتے کے دامن سے خشک کرتا عبیر تک آگیا۔

"میں نے خود رضا کو آنے سے منع کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا میں تم دونوں کو چھوڑ آؤں گا۔ پھر اچانک یہ واقعہ ہو گیا۔ چلو آؤ۔"

وہ مرے مرے قدموں سے اس کے ساتھ چلی۔

"دیکھو ذرا اس کو۔" حمیرا نے شکوہ کیا۔ "یہ ابھی سے اچھال رہی تھی ہیڈ میں جاؤں گی۔ ٹیل میں نہیں جاؤں گی۔" شدید تناؤ کے ماحول میں بھی اعجاز کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔ اس نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"ان سے ملیے۔ یہ ہماری عبیر ہیں۔"

کار کے دروازے کھلے تھے اور انتظار کرنے کے اس لمحے میں اس پر جو کوفت طاری تھی۔ وہ اس کی شکل سے برس رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ کے کھلے دروازے پہ بازوؤں سے ٹکا وہ اس کے رکتے اور اٹھتے ایک ایک قدم کو گن رہا تھا۔ اس کی ہچکچاہٹ اس کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔ حمیرا تیز قدم اٹھاتی پھر اس سے آگے ہو چکی تھی۔ اعجاز گاڑی تک عبیر کے ساتھ گیا لیکن بیٹھنے سے پہلے واپس ہو لیا۔ بہت سے کام اس کے منتظر تھے۔ اگلے اور پچھلے دونوں دروازے کھلے تھے۔ حمیرا کسی بھی بدمزگی سے بچنے کے لیے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر کھلے دروازے سے بیٹھ گئی۔ عبیر پھر فال نکالنے بیٹھ جاتی اور لے جانے والے کی ہتک ہوتی۔

فاروق نے اگلے پچھلے سب دروازوں کو بند ہوتے صرف کانوں سے سنا۔ اس نے نہ گردن گھمائی نہ بیک ویو مرر استعمال کیا۔

"چلیں؟" ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی سواری سے جیسے اس نے مشینی انداز میں پوچھا۔ حالانکہ اسے جواب کا انتظار بھی نہیں تھا۔ کیونکہ گاڑی سارہ حق کے عظیم الشان گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ ذیلی سڑک سے پھسلتی گاڑی فیروز پور روڈ پر آگئی۔ عبیر نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ رات ضرورت سے زیادہ ہو گئی تھی۔ اتنی دیر تک وہ کبھی تنہا باہر نہیں رہی تھی اور اس کے پاس انتخاب کا حق بھی نہیں تھا۔ رات کا منظر سڑک پر عجیب ہوتا ہے۔ تیز روشنیوں والے بل بورڈ پر کمپیوٹرائزڈ گرافک سے چمکتے چہروں کے اشتہارات، نارنجی روشنیوں والے کھمبوں کی چکا چوند میں تاریک حصہ تاریک تر لگتا ہے۔ چاند ستاروں کی روشنی، جہازی سائز کے بورڈ نیچے پہنچنے سے روکے رکھتے ہیں۔ بجلیاں آنکھوں کو اس طرح چندھیا دیتی ہیں کہ نہ روشنی میں سجھائی دیتا ہے نہ تاریکی میں۔

باہر جتنا شور تھا۔ اندر اتنا ہی سکوت طاری تھا۔ حمیرا نے ہی حسب عادت دنیا داری نبھائی۔ وہ ان کا تنخواہ دار ملازم تو نہیں تھا۔ اپنی زندگی میں سے وقت نکال کر ان پر خرچ کر رہا تھا۔

"آج کا دن بہت عجیب تھا۔"

اس نے تائید میں محض سر ہلایا۔

"ایسے واقعات آپ کے سامنے ایک آدھ دفعہ ہی پیش آتے ہیں۔"

دوسری دفعہ اثبات میں سر کی جنبش۔

"جب ایک ایسی موت ہوتی ہے تو لگتا ہے اس کے ذمے دار ہم خود ہیں۔"

"بلاشبہ۔"

"اور ہمارے سسٹم کا کمال دیکھیں ہم کسی کی مدد بھی نہیں کر سکتے۔"

"agreed۔" اس نے رسان سے کہا۔

عبیر نے باہر نظریں جمائے سوچا۔ اس قسم کے طویل جملوں کے مختصر جوابوں کا عموماً مطلب ہوتا ہے شٹ اپ۔ لیکن حمیرا تو لفظوں کی باریکیوں میں جا ہی نہیں رہی تھی۔ کار مانوس راستوں پر دوڑ رہی تھی، جو اندھیرے اور روشنی کے مرکز میں قطعی اجنبی دکھائی دیتے تھے۔ اس کے اندر کا انتشار بڑھ رہا تھا۔ یہی خلجان باقی ماندہ افراد کے اندر بھی سر ٹکراتا ہو گا۔ لیکن سب کے پاس اس میں الجھنے یا الجھن سے نکلنے کے اپنے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔ حمیرا خاموشی کا طلسم توڑنے کے لیے بول رہی تھی (شاید وہ کسی جواب کی منتظر بھی نہیں تھی) بس یہی اس کا تھارسس تھا۔ عبیر گھٹ گھٹ کر اور کڑھ کڑھ کر اپنی گھٹن دور کر رہی تھی (یا اس میں اضافہ کر رہی تھی) تیسرا شخص قطعی اجنبی تھا۔ اس کے مزاج سے آگہی بھی نہیں تھی۔ اس کا اور ان کا ساتھ بس یہ دو چار کلومیٹر کی ہمراہی کا تھا۔ پھر شاید کبھی ملاقات ہو یا نہ ہو۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ہر بات کی نفی کی تھی اب ہر بات کی تائید کر رہا تھا۔ اس کے اپنے اندر جیسے آگ کے گولے گردش کر رہے تھے۔ گنے چنے لوگوں کی صحبت میں رہتے۔ محبت کرنے والوں کی حفاظت اور پناہ میں دنیا کو ان کی آنکھوں سے دیکھتے جب اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں تو جھٹکا کھاتے ہیں۔ جیسے بچہ ماں باپ کی انگلی چھوڑ کر پہلا قدم خود اٹھائے تو ضرور لڑکھڑا کر گرتا ہے "وہ نیک نام ہیں۔ بہت بڑی لیڈر ہیں۔ ٹی وی دن رات ان کی واہ واہ کرتا ہے لیکن شاید جب کیمرے فوکس نہ کرتے ہوں تو نیکیاں بے کار ہیں۔ ابھی تو اس وجود پر اس نے دو ہی سر دیکھے تھے۔ منافقت سے یہ اس کا پہلا اور کھلا تعارف تھا اور اس نے جھٹکا کھایا تھا۔ اس کا بھائی صحیح کہتا تھا ہم سمجھتے ہیں "دنیا بس اتنی ہی ہے جس میں ہم رہتے ہیں اور اس کے دوستوں نے بڑی معصومیت سے ان کی سربراہی تسلیم کرلی تھی۔ نظام کی تبدیلی کی خواہش میں ہم راہ رو کے پیچھے بھاگ پڑتے ہیں۔

راستہ جیسے بہت طویل ہو گیا تھا۔ برسوں پر طاری۔ زمانوں پر محیط۔ کبھی تو منزل آئے گی۔ کار نے بڑے پارک کے ساتھ لوہے کے جنگلوں والی سڑک پر موڑ کاٹا تو اسے محسوس ہوا اب گھر آیا ہی چاہتا ہے۔ راستوں کی پہچان ہی تو اصل کمال ہے۔

گیٹ چوپٹ کھلا تھا۔ لیکن اس نے کار اندر داخل نہیں کی۔ اپنی سیٹ بھی نہیں چھوڑی۔ حمیرا نے بیٹھے بیٹھے گرمجوش ہونے کا ثبوت دیا۔

"آپ آیئے نا۔ اتریے۔ چائے پی کر جایئے گا۔"

"شکریہ۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "میں چائے نہیں پیتا۔"

کار ان ہی قدموں پلٹی۔ طویل سیدھی سڑک پر اس کی عقبی بتیاں بتدریج مدھم پڑتے پڑتے ماند ہو گئیں۔

رات بہت ہو گئی تھی۔ یہ کوئی گھر میں گھسنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ نو بجے کی واپسی کا کہا تھا اب ساڑھے گیارہ سے اوپر ہو چکے تھے۔ آج تو جی بھر کے ڈانٹ پڑے گی۔

www.pkdigest.com

ایک سی قامت، ایک سی جسامت میں ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے گھر کے اندر داخل ہوتے ان کو کریم بی نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ جب سے اختلاج قلب میں مبتلا ایک نظر گھڑی اور ایک نظر دروازے پر لگائے بیٹھی تھیں، اماں نے کئی دفعہ کہا آپ سو جائیے۔ آرام کیجیے وہ دونوں ساتھ ہیں ان کا ٹیکسٹ بھی آیا تھا مختصل میں کوئی حادثہ ہو گیا ہے ان کو دیر ہو جائے گی کریم بی کا ٹیکسٹ پر اعتبار نہیں تھا کاغذ پر لکھا خط آ جاتا تو وہ یقین کر لیتیں۔

"جڑواں سی لگتی ہیں دونوں۔" کریم بی نے ذرا بلند آواز میں خود کو ہی سنایا تھا جیسے فوجی پریڈ کرتے ہوں۔ فوجیوں پر ان کا کرش 65 سے طاری تھا۔

"اس کا مطلب آ گئیں۔" اماں نے فریم سے سر اٹھایا۔ "چلیے آپ کو بھی اطمینان ہوا۔"

اب اتنی دیر سے آنے پر کوئی ان کو ڈانٹے تو کیا ڈانٹے دل میں محبت کا ابال آ گیا تھا۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر پاؤں دھب دھب دھرتے جاتے پہلے حمیرا کی نظر کریم بی پر پڑی۔

"ہائے کریم بی!" کھڑکی سے جھانکتی کریم بی کا چہرہ کچھ اچھی کہانی نہیں سنا رہا تھا۔ "آ گئی کم بختی۔"

"سوری کریم بی!" عبیر کھڑکی کے پاس سلاخوں سے پار دیکھتی کریم بی کے پاس رکی۔ "واپسی پر سواری مسئلہ بن گئی تھی۔"

عبیر نے وارڈ روب کھولی۔ ایک اپنا اور ایک اس کا جوڑا نکال کر پلنگ پر ڈالتے وہ گھر والوں کو اپنی صورت دکھانے چلی گئی۔ حمیرا فون کر رہی تھی۔

"امی الف اتر گئی ہوں۔ بھائی سے کہیں صبح ہی آ ئے۔"

ابا بولنے کی آواز سن کر باہر آئے تو ان کا سامنا کرتے عبیر کو شرمندگی سی ہوئی۔

"تمہاری ماں پریشان ہو رہی تھی۔" اسے پتا تھا وہ کبھی نہیں کہیں گے۔ "میں پریشان ہو رہا تھا۔"

"سوری ابا!" اس نے کسی تفصیلی وضاحت کے بغیر ندامت سے کہا۔

"نہیں پھر جب تمہارا میسج آ گیا تو پریشانی ختم ہو گئی۔"

وہ کسی کے بھی سر ندامت کا بوجھ اپنی وجہ سے نہیں ڈال سکتے۔

"تمہاری ماں نے بتایا، وہاں کوئی اچانک فوت ہو گیا تھا۔"

"جی ابا!" اس نے تھوڑا سا توقف کیا۔ "میں امی سے مل آؤں پھر اگر آپ تھکے ہوئے نہ ہوئے تو ٹاپ کریں گے۔"

"ضرور۔" وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئے۔ انہیں اس کی صورت ہی دیکھنی تھی۔ گو اس کی صورت پہ بہت اطمینان بھی نہیں برس رہا تھا۔

حمیرا چونکہ داستان گو بھی اور بے صبر قصہ گو۔ لہٰذا اس کا صرف اس مختصر گفتگو سے گزارا نہیں چلتا تھا۔ وہ خواتین کے کمرے میں آئی تو وہ اپنی داستان طرازی کے کمالات شروع کر چکی تھی۔ گھر گھر کام کرنے والی ماسیوں کی طرح اس کے پاس ہر روز ایک تازہ قصہ تیار ہوتا۔ دیر سے آئے اور ایک گھڑا گھڑایا رونگٹے کھڑے کر دینے والا قصہ ساتھ لائے تھے۔ اس کے پاس سامعین کی بھی کمی نہیں تھی سامعین ٹی وی پر سنسنی خیز ڈراموں میں محو توجہ اس کی طرف کرتے تو ایک دل دہلا دینے والا قصہ اس کے پاس بھی ہوتا۔

سانپ نے کاٹ لیا۔ چھت سے گر گیا۔ گاڑی کی ٹکر۔ لیکن ہیپی اینڈنگ کے ساتھ آخر میں سب کچھ ٹھیک ہو جانا چاہیے۔

آج اس کے پاس لرزا دینے والا واقعہ تو تھا پر اس کا end (اختتام) ذرا بھی happy (خوش گوار) نہیں تھا۔ اس نے کہانی شروع کی تو موقع سے فائدہ اٹھاتے خواتین کے ریموٹ کنٹرول پر قبضہ کر لیا تھا۔ اماں کا سارا

دھیان واقعہ کی طرف تھا انہیں کنٹرول چھین لیے جانے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ سب سے پہلے اس نے اماں کا ڈراما بدلا۔ Pannelist ملک کی بدقسمتی پر گرج برس رہے تھے۔ درمیان میں بیٹھا وزیر ڈھٹائی سے جھوٹ پہ جھوٹ بول رہا تھا۔ سب اچھا ہے۔

"ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ انسان بھی کیا چیز ہے۔ ایک چھت کے نیچے۔ نہیں خیر چھت تو نہیں کھلا آسمان تھا۔ خیر ایک چار دیواری میں جشن منایا جا رہا ہوتا ہے ادھر ماتم شروع ہو جاتا ہے۔ موت کا فرشتہ آتا ہے اور کسی کو لے جاتا ہے پاس بیٹھوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اماں آپ نے کبھی لاش دیکھی ہے؟ لاش دیکھنا ایک خوف ناک تجربہ ہے۔" وہ کچھ دیر کو چپ چاپ اسی خوف ناکی کو جھیلتی رہی۔

"وہ چارپائی پر ایسے لیٹی تھی جیسے گھر سے سوچ کر چلی تھی اس چارپائی پر لیٹ کر جان دے دوں گی۔" اس نے چینل تبدیل کر دیا۔

ایتا بھ بچن خون میں لت پت لاشوں کے ڈھیر پہ کھڑا اب بھی گولیاں چلا رہا تھا۔ ایک اکیلے ہیرو نے کشتوں کے پشتے لگا دیے تھے۔

"چارپائی کے پاس کھڑی لڑکی کو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مرنے کا مطلب کیا ہوتا ہے اس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ اس کا ذاتی آئیڈیا تھا جو مرتے ہیں وہ غائب ہو جاتے ہیں جبکہ اس کی ماں سامنے ہی لیٹی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس سے بول نہیں رہی تھی۔ اس نے بتایا اس کی سہیلی کا ابا فوت ہو گیا تھا۔ پہلے سارا دن درخت کے نیچے بیٹھا سوٹے لگاتا رہتا تھا۔ اب وہ وہاں نہیں ہوتا۔ وہ گھر میں بھی نہیں ہوتا۔"

اگلے چینل سے رنگ برنگی شوخ ساڑھیاں باندھے بندیا لگائے ہر عمر کی عورتیں اکٹھی ہو کر سازباز کر رہی تھیں مظلوم بہو پر ظالم ساس نکھٹو شوہر ہر جملے پر ایک زور کی تھاپ پڑتی۔ عورتوں کے چہرے باری باری ٹی وی اسکرین پر چمک جاتے۔ کلائمکس پانچ منٹ بعد آیا۔ اس پانچ منٹ میں ایک کے بعد ایک کلوز اپ۔

"بچی نے بتایا جب کوئی فوت ہوتا ہے تو سب زور زور سے روتے ہیں۔ وہاں چونکہ کوئی نہیں رو رہا تھا۔ اس لیے کسی کی موت نہیں ہوئی۔"

"لاش کے سامان میں اس کی اغوا شدہ بیٹی کی تصویر بھی تھی۔ وہ اپنے علاقے کے زمین دار کے گھر ملازم تھی جو وہاں کا ناظم بھی تھا۔ وہیں کسی نے یہ تصویر کھینچی۔ جب وہ پچھلی دفعہ آئی تو یہ تصویر بھی ساتھ لائی تھی۔ وہ بہت دنوں بعد آئی تھی۔ کتنے دن بعد۔ یہ اسے نہیں پتہ لیکن ایک دن شرلی تھی۔ پھر ابا اس کو چھوڑ آتا تھا۔ آخری دفعہ جب وہ آئی تو وہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے ابا کے پاؤں پکڑے۔ لیکن ابا نے اسے بہت مارا اور زبردستی چھوڑ آیا۔ جب وہ اسے چھوڑ کر آیا تو اس نے ماں کو بھی مارا۔"

سمندر کی پرشور لہروں کے کنارے چٹان پر اداس بیٹھی ہیروئن نک سک سے تیار۔ سجی بنی لیکن ہجر و فراق کا گانا گاتی۔

"اس نے ماں کو کیوں مارا۔ یہ بچی کو نہیں پتا۔ سارا پیٹ کوئی انوکھی بات نہیں جس پر سوال جواب ہوں۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ داستان گو کو بھی چپ لگ گئی تھی۔

چینل پر جنگلوں میں ہانپتی اور بھاگتی ایک لڑکی اور اس کا پیچھا کرتا غنڈوں کا ایک ٹولہ۔ اچانک کہیں سے ہیرو نمودار ہوا۔

اور ہیرو صرف اسکرین پر ہی نمودار ہوتا ہے۔

اس نے ایک کلک سے پھر چینل بدل دیا۔ "اوہ!" وہ ایک دم ٹھٹک گئی۔

آدھی رات میں اس وقت سارا حق ایک چینل پر معاشرے پر گرج برس رہی تھیں۔ بہت سارے سائنگ جیتی

www.pkdigest.com

ہوئی ٹرافیوں کی طرح سامنے رکھے ایک کرسی پر غصے کی حالت میں بیٹھی (ان کا پارٹی والا ڈریس بھی تبدیل ہو گیا تھا) جاگیردارانہ نظام کے نقائص بیان کر رہی تھیں۔ پولیس 'عدالت' حکومت ہر طرف سے مایوسی کا اظہار کر کے انہوں نے کہا۔ وہ مری نہیں اس کو قتل کیا گیا ہے اور اس کا قاتل یہ نظام ہے۔ جو کسی کو انصاف نہیں دے سکتا۔ جب تک یہ نظام زندہ رہے گا لوگ قتل ہوتے رہیں گے۔"

انہوں نے نسیمہ بی بی کی بیٹی کے اب تک بازیاب نہ ہونے پر شدید غم و غصہ کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے کہا' اس کی گمشدگی میں شامل وہ لوگ ہیں جن کی جان بوجھ کر پردہ پوشی کی جا رہی ہے۔ کوئی ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ لیکن وہ انصاف اور لڑکی کی بازیابی کے لیے ہر دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ وہ پاکستان اور پاکستانیوں سے بہت ناراض لگ رہی تھیں۔

سارہ حق کی پریس کانفرنس کا دورانیہ ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ لیکن ان ہی ایک دو منٹوں میں انہوں نے ہر اہم ادارے کے پرخچے اڑا دیے تھے۔

عورت' معاشرہ' ظلم یہی وہ لفظ ہیں' جو ہم نسلوں سے سنتے آ رہے ہیں۔ یہ لفظ ہماری جینز میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہر عہد میں ہر نسل ان ہی لفظوں کو دوہرا دیتی ہے۔

اماں نے عبیر کی طرف ایک نظر ڈالی۔ پیلا پھٹک چہرہ لیے وہ ان کے درمیان لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ اس لڑکی کا دل بہت صاف ہے اور چہرہ صاف تر۔ جو کچھ اندر لکھا ہے' اس کا عکس اوپر بھی چمکتا ہے۔ کوئی برا دکھ اٹھانے سے پہلے خود اس کو برا ہو جانا چاہیے۔ کسی دکھ کے تصور سے بھی وہ کپکپا گئیں۔

"اماں!" آپ کے زمانے میں کم از کم لڑکیاں اغوا تو نہیں ہوتی ہوں گی؟" حمیرا صوفے میں ڈوبے ڈوبے مایوسی سے بولی تھی۔

اماں نے فریم سے سر اٹھایا۔

"ہمارے زمانے میں وہی کچھ ہوتا تھا" جواب ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے بھی یہی تھا۔ دعا کرو کل نہ ہو۔ کھانا کھایا تم لوگوں نے؟"

"کھانا ہی تو کھایا۔" عبیر نے عادتاً" ریموٹ پر کلک کلک کرتے جواب دیا۔

بڑی مائی نے جو موت دیکھی بھی نہیں۔ اس کے غم میں نڈھال ہو گئی تھیں۔ واپسی پر ان کا انتظار کرتی کریم بی بی یہ جان کر کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گی۔ جا چکی تھیں۔ اماں نے ماتھے پر رکھی عینک واپس آنکھوں پہ لگائی۔ غور سے ایک ایک کی شکل دیکھی' چادر سمیٹ کر کڑھائی کی ٹوکری میں ڈالی۔ اب اگلا سوپ دیکھنے کا یارا نہیں رہا تھا اور نیوز چینل بے مزہ ہو گئے تھے۔

عبیر نے آگ جلا کر دودھ کی دیگچی چولھے پر رکھی۔ رات بہت ہو گئی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی' ابا اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ان کو مائیکرو ویو میں گرم کی چیزیں پسند نہیں تھیں۔ ان کی نفاست پسند طبع اس ہلکی سی بو کو محسوس کر لیتی تھی' جو پچھلا سالن گرم ہونے سے اوون کی فضاؤں میں رہ جاتی تھی۔ ڈھک کر گرم کرنے کے باوجود ان کو کھانے میں سے بیک آتی تھی۔ گو وہ کسی سے کہتے نہیں تھے لیکن جوان کو جانتا تھا وہ جانتا تھا۔ گرم گرم ابلتے دودھ سے مگ بھرا۔ بغل میں لیپ ٹاپ سمیٹا جیسے بلیک اینڈ وائٹ فلموں کا ہیرو بغل میں کتاب دبا کر خود کو کالج کا طالب علم ظاہر کرتا تھا' وہ کمرے میں آئی تو ابا بستر پر لیٹے تھے۔ سینے تک چادر تانے۔ ایک اوندھی کتاب پیٹ پہ دھرے۔

اس نے نزدیکی تپائی پہ مگ رکھا۔ پیر سمیٹ کر اس کے بیٹھنے کے لیے جو جگہ انہوں نے چھوڑی تھی' وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ رہی۔

www.pkdigest.com

"دکھوں؟"

"نہیں' آج نہیں۔ آج میں تھکا ہوا ہوں۔"

وہ بالکل تھکے ہوئے نہیں تھے۔ ہشاش بشاش لگتے تھے لیکن وہ تو تھکی ہوئی تھی نا' اولاد کی تھکن خود بخود ماں باپ کی رگوں میں اتر جاتی ہے۔

"لیکن اگر نیند نہیں آ رہی تو کچھ دیر بیٹھو۔"

ان کے لہجے میں کچھ مختلف تو نہیں تھا لیکن کچھ تھا ضرور۔۔۔ وہ منتظر رہی۔

"کچھ غیر معمولی دیر نہیں ہوگئی آج تمہیں؟" انہوں نے طویل توقف کے بعد رسان سے پوچھا۔

"جی۔" اس نے دوبارہ تاسف سے کہا۔ "ایک حادثہ پیش آ گیا اور واپسی ہمارے اختیار میں نہیں رہی۔"

"پھر ہمیں ایسی جگہوں سے گریز کرنا چاہیے' جہاں سے واپسی بے اختیار ہو۔ علاوہ ازیں دوست تا قائم Tested ہوتے ہیں۔ یہ جو تم نے اپنی نئی دوست بنائی ہے اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

"معلوم نہیں۔" اس نے صاف دلی سے کہا۔

"تو پھر ٹیسٹ کر لو۔"

"وہ میری دوست نہیں ہیں۔ ہم آمروں کے خلاف کام کر رہے تھے۔ اپنی جگہ وہ بھی کوئی کام کر رہی ہیں' اتفاقاً ہم اکٹھے ہو گئے' میرے دوستوں کا خیال ہے' وہ ہمیں بہتر طور پر لیڈ کر سکتی ہیں۔"

"لیڈر کے انتخاب میں دوست سے بھی زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔ اس کا نقصان صرف ہمیں نہیں پوری قوم کو ہوتا ہے۔"

وہ تھوڑی دیر کو پھر چپ ہوئے۔ "تھک گئی ہو' جاؤ سو جاؤ۔"

وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو حمیرا بے خبر سو رہی تھی۔ یہ اس کا کمال تھا۔ چاہے کتنی ہی ٹینشن کیوں نہ ہوں' بستر پر لیٹتے ہی اس کو بے فکری کی نیند لپیٹ لیتی۔ عبیر ایک جگہ اٹک جاتی تو کوئی چیز اس گرداب سے نکال نہیں سکتی تھی۔ اس نے شیلف کے سامنے دو زانو بیٹھ کر ایک کے بعد ایک نثر اور نظم کی کتنی ہی کتابیں نکالیں اور اسی طرح واپس ٹھونس دیں۔ نیند کے انتظار میں وہ کمپیوٹر ٹیبل پر آ بیٹھی Messenger کھولا۔ اس کے حلقۂ احباب میں سے کوئی بھی آن لائن نہیں تھا۔ وہ یونہی شہریار کو میل لکھنے بیٹھ گئی۔ وہ اکثر اس کو بے سروپا قسم کی میل لکھا کرتی تھی جس کی حیثیت روزنامچے کی سی تھی۔

اسی لیے جو بات اس نے صبح سے اب تک کسی سے نہیں کہی تھی۔ اس کو لکھ دی۔ اس سے کچھ کہہ کر وہ ہمیشہ ہلکی پھلکی ہو جایا کرتی تھی۔ جاں نثار دوست' عزیز رشتے دار' مہربان' ایک پلڑے میں اور ایک پلڑے میں شہریار۔

وہ ایسا دوست تھا جو اس کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اعترافِ جرم کرنا ایسا تھا جیسے فادر کنفیسر کے سامنے بیٹھ کر اپنی غلطیاں گنوانا۔

"کیوں جاتی ہو ان جگہوں پر جن کا تمہیں خود بھی پتہ ہے کہ ٹھیک نہیں ہیں۔"

"دوست کہیں کنویں میں چھلانگ لگاؤ تو تم کنویں میں چھلانگ لگا دو گی۔"

آج تو وقت مروت میں گزر گیا لیکن کل سے ان جملوں کا آغاز ہو گا اور یہ اس وقت تک جاری رہیں گے' جب تک اس سے ایک اور غلطی سرزد نہ ہو جائے۔ غلطیاں بھی اس سے تھوڑی تو نہیں ہوتی تھیں۔ جب صف آرا لوگ یقین رکھتے تھے اس کے دماغ کی ایک آدھ چول ڈھیلی رہ گئی ہے' وہ اس لائن میں نہیں کھڑا ملتا تھا جہاں سے

فائز آتا ہے۔ وہ جانتا تھا وہ اپنی فطرت کی سچائی اور سادگی سے مجبور لوگوں کے ساتھ سخت سلوک نہیں کرے گی۔ وہ اس کے ہم زاد کی طرح اس سے میلوں دور اور برسوں کے فاصلے پر اس کی ہر بات کی وجہ جانتا ہے۔ لفظوں میں کہنا ضروری بھی نہیں۔

ایک طویل میل اس کو ارسال کر کے اس کے ذہن سے بہت سارا بوجھ اتر گیا۔ اس نے صرف واقعہ کی جزئیات لکھی تھیں۔

وہ خود اس سارے عرصے میں کیا سوچتی رہی۔ وہ جانتا ہو گا۔ وضاحت کی ضرورت نہیں۔

کمپیوٹر بند کر کے کمرے کی ساری روشنیاں باری باری بجھا وہ چپ چاپ اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ ہاتھ پاؤں سیدھے اور ڈھیلے چھوڑ کر۔ ساری دنیا کی فکروں اور پریشانیوں سے نجات پا کر۔ اسے لگا وہ نسیم لیلیٰ ہے اور بستر پر مری پڑی ہے۔

☼ ☼ ☼

زرد رو سیاہ ریت اٹھی اور ہر شے پر مسلط ہو گئی۔ ذرہ ذرہ برستی اور جسم میں چنگاریوں کی طرح کھبتی۔ سانس میں داخل ہوتی ریت آس پاس منڈلائی اور یک لخت تند آندھی میں بدل گئی۔ آندھی کے شور میں جھولتے درختوں کی سائیں سائیں۔ طوفان کی شدت' درختوں کو اس قدر جھکا دیتی کہ لگتا ابھی تنا تڑاخ سے ٹوٹ کر نیچے آ گرے گا۔ لیکن اگلے جھکڑ میں وہ سیدھا ہوتا اور کسی اور رخ اسی طرح رکوع میں چلا جاتا۔ خیشم کے خود رو تناور درخت اور کھجوروں کے چکراتے جھنڈ' صحرا کی ذات کا حصہ ہیں۔ کنارے کنارے کنوار گندل اور کھوکے بے ترتیب بوٹے۔ سب ہوا کی طاقت کے آگے تھپیڑے کھاتے بے بس لگتے۔

شہریار نے پلٹ کر اپنے شامیانے کی طرف دیکھا۔ تیز ہوا میں وہ اس بری طرح پھڑپھڑا رہا تھا جیسے ابھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے گا۔ حالانکہ وہ جانتا ہے وہ اس مضبوطی سے کھونٹے سے بندھا ہے کہ نہ پھٹے گا نہ اڑے گا۔ بالوں اور پلکوں پر برستی ریت نے جیسے اس کو بے جان مٹی کا تودا بنا دیا تھا۔ کبھی کبھی لال آندھی اٹھتی۔ یہ نہیں کہ سرخی کا شائبہ ہو وہ خالص لال ہے جیسے فضا میں پسی ہوئی اینٹوں کا غبار اڑ رہا ہو۔

ریت گرم سرمے کی سلائی کی طرح آنکھوں اور پپوٹوں میں گھس کر تکلیف دے رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور شامیانے میں جا بیٹھا۔ آندھی کا یہ طوفان منٹوں پر ہی محیط تھا۔ اور جب وہ نیا نیا پوسٹ ہو کر فیلڈ ایمبولینس میں آیا تو شہر شہر پھرتا اللہ کی بنائی دنیا اور اس کی مخلوق پر عش عش کرتا۔ صحرا کی خاک پھانکنے احمد پور آ نکلا تھا۔

وہاں عموماً" کوئی کام نہیں ہوتا تھا' اسی لیے اس کو بہت فرصت تھی کہ دنیا پہ غور و غوض کر سکے۔ کتنی دیر وہ چپ چاپ بیٹھا ریت پر ہواؤں کے نشان گنتا رہتا۔ جیسے دریا کے پانی پر ہوا کی تھرتھراہٹ سے لہریں بن جاتی ہیں۔ صحرا میں سلوٹ در سلوٹ دور تک بکھرا نظر آتا۔ حدِ نظر دور ریت کے میدان اس کو پانی کا کھلا ذخیرہ دکھائی دیتے۔ جس میں کھجوروں کے جھنڈ کے شفاف سائے ڈولتے تھے۔ سراب کو علامت کے طور پر استعمال کرنا اور اس کو اپنی آنکھ سے دیکھنا ایک مختلف تجربہ تھا۔ جوں جوں آپ سراب کی سمت سفر کرتے۔ سراب سمٹ کر پیچھے ہٹتا جاتا۔ پیاسا اس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے پیاس سے نڈھال ہو کر دم توڑ دیتا۔ بے ساختگی ہی میں جھجک کر اس نے پاؤں سمیٹ لیے۔ اسے لگا' اس کا پاؤں ہڈیوں اور کھوپڑیوں پر رکھا گیا ہے۔ وہ جو کبھی کسی کا سر پر غرور تھا۔

کبھی عین اس جگہ ستلج ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ یہیں کہیں صحرا کے وجود میں آنے سے پہلے سرسوتی بہتی تھی۔ دریاؤں کے دل میں پتہ نہیں کیا آتی ہے۔ وہ مستقل ایک ہی راستے پر چلتے چلتے اکتا کر اپنا رخ بدل لیتے ہیں۔ نئی دنیاؤں کی تلاش میں۔ چلو چل کر دیکھیں ادھر کیا ہے۔ کناروں پر آباد بستیاں ان کی اس راہ نوردی کے شوق میں

www.pkdigest.com

بنجر ہو جاتی ہیں۔ قدیم باشندے دریاؤں کو مقدس پانی کہتے اور اس کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ نے جب اپنی نعمتیں گنواتے پانی کا تذکرہ کیا تو بتایا کہ علاوہ رزق دینے کے یہ تمہیں پاک کرتا ہے۔

اس کے سامنے فاصلوں سے کھجور کے جھنڈ تھے۔ کھجور کی نسل بہت نازک مزاج ہے۔ ایک ہی زمین پر وہ کہیں بھی نہیں اگائی جا سکتی۔ البتہ کسی ایک جگہ درخت جڑ پکڑ لے تو اس کے ارد گرد مزید پودے اگا دیے جاتے ہیں یا از خود اگ آتے ہیں۔ درخت سے گری تازہ کھجور سے زیادہ خوش ذائقہ پھل اس نے کبھی نہیں کھایا تھا۔ کھجوروں کے علاوہ مکو کے بوٹے جس میں چھوٹی چھوٹی تلخ ذائقہ والی رس سے بھری گٹھلیاں اگتی تھیں۔ یہ اس علاقے کا پسندیدہ لیکن جنگلی پھل تھا۔ لیکن یونٹ کی وجہ سے عام لوگوں کا اس طرف سے گزر نہیں تھا للذا بوٹے سرخ مکو سے لدے رہتے۔

جیسے بچپن میں وہ عبیر وغیرہ کے ساتھ مل کر آرٹ ورک کیا کرتے تھے۔ برتن میں پانی بھر کر جلتی ہوئی سرخ موم بتی کے قطرے اس میں ٹپکاتے۔ پانی میں گرتے ہی رنگین موم کا قطرہ اسی شکل میں جم جاتا۔ پھر وہ انگلی سے بوند بوند سمیٹ کر جھاڑی کے کانٹوں میں پروتے جاتے۔ جو سب سے زیادہ کانٹوں بھری جھاڑ چن کر لاتا اب سے زیادہ سرخ اسی کا بوا بنتا۔ دور سے مکو کا بوٹا گلدان میں سجا جھاڑ لگتا تھا۔ اسے لگا وہ بہانے بہانے گھر کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر کون سا گھر؟ پتہ نہیں وہ کب سے سفر میں تھا۔ گھر ہے کہاں؟

سفر۔ جب وہ پیدا نہیں ہوا تھا اور اس کے بزرگ پا پیادہ اپنے وطن آئے تھے۔ ایک طویل تکلیف دہ سفر جہاں قدم قدم پر ایک کہانی تھی ایک المیہ تھا۔

وہ سفر جب اس کے ابا نے گھر آ کر اپنی ماں کو اطلاع دی "میری غلطی معاف کر دیجیے۔ میں نے شادی کر لی ہے۔" اور مستقل طور پر ڈی جی خان میں اپنی سسرال کے گھر آباد ہو گئے تھے۔

پھر جب ایک عرصے بعد تایا عباس اپنے چھوٹے بھائی سے ملنے ڈی جی خان گئے تھے اور بہت سا وقت ان کے درمیان گزار کر انہوں نے دیکھا۔ چھوٹی بھابی ہر وقت ماتھے پر کپڑے کی دھجی باندھے۔ پڑی پڑی کراہتی رہتی ہیں یا بیٹھی اپنے نکھٹو شوہر کو کوستی ہیں۔ گھر میں ایک افراتفری کا سا عالم تھا۔ جگہ جگہ بکھری میلے کپڑوں کی پوٹلیاں۔ زمین میں اوندھے گرے گلاس۔ مرغیاں، بکریاں اور ان کے درمیان شرمندہ شرمندہ ان کا بھائی۔ پڑھنے لکھنے کا رواج گھر میں برائے نام تھا۔ آوارہ گردی کرتا بڑا بھائی۔ جھگڑالو بڑی بہن۔ درمیان میں بھولا بھالا، معصومیت سے آنکھیں جھپکاتا بچہ ان کو بہت اچھا لگا۔ استاد ہونے کے ناتے وہ جوہر شناس بھی تھے۔ واپسی پر انہوں نے شہریار کی انگلی پکڑ کر اعلان کیا۔ "وہ اس کو ساتھ لے کر جا رہے ہیں باقی کی پڑھائی وہ ان کے گھر رہ کر کرے گا۔" ماں نے بہتیرا احتجاج کیا لیکن نہ ابا نے انکار کیا نہ شہریار نے۔ شہریار نہیں جانتا تھا وہ کیا فیصلہ کر رہا ہے اس کو سفر کا فیصلہ اچھا لگا بس۔ سفر در سفر۔

وہ جب اس طویل گیلری میں کھڑا تھا جس کے دونوں اطراف تصویریں لگی تھیں تو اس پر اجنبیت کا شدید حملہ ہوا۔ گھر غیر معمولی طور پر صاف تھا اور ایک یونٹ کی طرح وہ آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ دونوں چیزیں اس کے لیے پرائی تھیں۔ وہ اس کی انگلی پکڑے پکڑے عبیر تک آئے۔

"یہ تمہارا بھائی ہے۔ اب سے تمہارے ساتھ رہے گا۔"

جیسے گھر میں کوئی بھالو بندر آتا ہے سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ دادی اماں نے اس کا ماتھا چوما۔ عثمان اور تنویر اس کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے' اسے گھبراہٹ سی ہوئی۔ وہ بہت دور سے آیا تھا شاید واپسی اتنی آسان بھی نہیں ہوئی' اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ سب سے پہلے عبیر ہی اس کے نزدیک آئی۔ بڑے شوق سے اس نے اس کا

www.pkdigest.com

ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"یہ کون ہے ابا؟" اس نے دیکھا۔ وہ چھوٹی سی لڑکی تھی اور صرف اس کے کندھے تک آتی تھی۔

"اس کا نام شہریار ہے' یہ تمہارے چچا کا بیٹا ہے۔"

"وہ جو ڈی جی خان میں رہتے ہیں؟" اس نے ایک نو وارد کے سامنے ذرا اترا کر خود کو عقل مند ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں سب اس کو بیوقوف ثابت کرنے پر تل جائیں گے' جو اس کے گرد نیم دائرے میں جمع خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔

"آؤ میں تمہیں توتے دکھاؤں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے دائرہ توڑ کر نکل گئی۔ توتے چونکہ نئے تھے اور ابھی اس میں اس کی اپنی دلچسپی بھی نئی تھی۔

"تم رو کیوں رہے تھے؟"

اس کو شرمندگی سی ہوئی۔ اس کا خیال تھا اس کو روتے کسی نے نہیں دیکھا ہو گا۔

پھر کریم بی نے اس کا چارج سنبھال لیا۔ وہ طویل سفر سے آیا تھا۔ تھکا ہوا تھا (اور شاید اداس بھی۔ ایک تو عباس میاں بھی عجیب چیز ہیں پڑھائی کی خاطر بھلا ماں باپ سے بھی الگ ہوتا ہے کوئی)

شام میں ان کے دوست آئے۔ گھر میں جتنے لوگوں کا اضافہ ہوتا اتنا ہی وہ ہراساں ہوتا جاتا۔ وہ سب مل کر اسکریبل کھیل رہے تھے۔ وہ ان کے کھیل میں شریک نہیں ہو سکا کہ وہ ایک سرکاری اسکول کے درجہ ششم میں تھا جہاں انگریزی ابھی شروع ہی ہوئی تھی۔ لیکن ہوا یوں کہ انہوں نے اسکریبل سمیٹ دی اور کوئی دوسری بورڈ گیم نکال رکھی۔

اس کا سارا بچپن اور لڑکپن تایا کے گھر گزرا۔ اس کی امی کو سسرال سے بہت گلے تھے۔ شروع شروع میں جو نفرتیں اسکول میں سکھائی گئی تھیں اس کی عینک سے اس نے ان کو دیکھنا چاہا۔ مگر وہ تو بڑے بے ضرر نکلے۔ تائی ماں کا تصور اس کے ذہن میں ایک تند خو عورت کا سا تھا لیکن وہ تو بہت مختلف سی خاتون تھیں۔ وہ نہ بچوں کو مارتیں نہ کسی چیز سے منع کرتیں۔ حتیٰ کہ وہ بیمار بھی نہیں رہتیں۔ کبھی کبھی اس کو لگتا' وہ اسی کی طرح یہاں مہمان آئی ہیں۔ کھانا کریم بی پکاتی تھیں۔ میز پر لگ جاتا تو ان کو اطلاع دی جاتی۔ تائی بچوں کو بلاتیں' شرطیہ کہ جو پکا ہے وہی کھانا پڑے گا۔ کوئی ناک منہ نہیں چڑھائے گا' وہ غالباً "حفظ ما تقدم کے طور پر" کہتی تھیں۔ کیونکہ ان کو شاید یہ علم نہیں تھا کہ کریم بی سازش میں بچوں کے ساتھ شریک ہوتی تھیں' وہ ایسا کچھ پکاتی ہی نہیں تھیں جو بچے نہ کھاتے ہوں۔ اگر کسی کی سفارش پر بینگن پکے تو وہ از خود بچوں کے لیے آلو کی ورقیاں تیار کر دیتیں۔

ابتدائی دنوں میں وہ ان کے درمیان اجنبی سا رہا۔ رضا اور عثمان کی دلچسپیاں اس سے مختلف تھیں لیکن بہت جلد انہوں نے اس کو گروپ میں شامل کر لیا۔ چونکہ ان کا گروپ بہت لمبا چوڑا نہیں تھا اس لیے جو درمیان میں آ جاتا' وہ اس کے لیے جگہ بنا لیتے اور اس پر سب جان چھڑکتے تھے۔ اس میں ہر خوبی ہوتی اور اس کی خاطر دنیا بھر سے لڑنے پر آمادہ۔ تنویر ذرا سا مختلف تھی۔ وہ زیادہ وقت پڑھتی رہتی۔ چھوٹوں کی تو تھی ہی بڑوں کی بھی آپا بنی رہتی۔ وہ جب ڈانٹتی تو سب بڑے چھوٹے ایک ساتھ اس سے ڈانٹ کھاتے' تو شہریار بھی سر جھکا کر ان ہی کی طرح جھڑکیاں کھا لیتا۔ اس مزاج کی وجہ سے وہ آپا بیگم کہلاتی تھی۔

تایا کے گھر میں حمیرا رضا کو وہ ہمیشہ سے آتا جاتا دیکھتا تھا۔ ان کے ابا اور تایا عباس بہت پرانے دوست تھے۔ یہ دوستی شاید ان کی سابقہ نسل سے چلی آتی تھی۔ عین جوانی میں وہ بچے چھوڑ کر رخصت ہوئے تو علاوہ' ان کے خاندان کے تایا عباس نے بھی ان کی کفالت کی ذمے داری اٹھائی۔ کچھ عرصے بعد وہ خود بھی ان کی ذمے داری بن گیا' شروع میں ابا نے اس کے لیے کچھ پیسے بھیجے مگر تایا اور دادی اماں کا ڈانٹ بھرا خط جانے کے بعد وہ تائب ہو

گئے۔ گو انہوں نے یقین دلانا چاہا کہ ان کی دکان کی آمدن میں بڑی برکت ہے لیکن شاید تایا عباس کو شوق تھا چوزوں کو اپنے پروں میں سمیٹ کر بیٹھنے کا۔ عثمان سب سے بڑا تھا' تایا عباس اس کے ساتھ بوجھ بانٹنے میں ہچکچاتے نہیں تھے۔ اس کی ذمے داری تھی سب کو ہوم ورک کروانا۔

وہ اعلان کرتا۔ "چلو سب لوگ اپنے بیگز اٹھالاؤ۔ ہوم ورک کرو۔"

لیکن اس مانیٹری پر اس کا دل آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ عجیب آرٹسٹ آدمی تھا۔ سب کو پڑھنے پر لگا کر وہ اپنا چاقو نکالتا اور بڑی مہارت سے ان کی پنسلیں تراشتا تھا۔ حالانکہ سب کے پاس شارپنر تھے لیکن وہ اپنا چاقو آزماتا رہتا تھا۔ جب سب کی پنسلیں گھڑی جاچکیں تو درختوں کی ٹہنیوں کی نوکیں بنانے بیٹھ جاتا۔ وہ فخر سے کہتا۔

"تمہیں پتہ ہے یہ ریتی کا چاقو ہے۔"

ریتی کے چاقو میں کیا خوبی ہوتی ہے جو غیر ریتی کے چاقو میں نہیں ہوتی۔ یہ مرعوب کنندگان کو نہیں پتہ تھا۔ بریک ہوتی تو تنویر سب کے لیے سینڈوچز لاتی۔ سینڈوچز میں عموماً "کھیرا ٹماٹر اور برائے نام سی چکن بھی ہوتی۔

عثمان بڑی مہارت سے اپنے چاقو سے سینڈوچ کے دو برابر تکون تیار کرکے اجازت دیتا کہ اب کھالو۔

وہ کھیرا ٹماٹر نکال کر پلیٹ میں ڈال دیتا۔ چکن کا ٹکڑا منہ میں تقریباً "نگلنے والے انداز میں غڑپ کر جاتا۔ اس کے بعد مزے لے لے کر ڈبل روٹی کے سلائس کھاتا۔ تنویر کو غصہ آتا کیونکہ اس کی ہوم اکنامکس خطرے میں پڑ جاتی تھی۔

سب سے زیادہ دلچسپ چیز آپائی تھیں۔ ایسے میں جب مٹی سے کھیلنا منع تھا وہ سب کے ساتھ مل کر گیلی مٹی سے ایک عجیب کھیل کھیلتی تھیں۔ جس دن یہ کھیل ہونا ہوتا تھا' وہ بطور خاص چکنی مٹی کا ایک بورا منگواتیں۔ اس کو بڑے اہتمام سے گوندھا جاتا۔ پھر "پیر کھوڑے شاہ" کا مزار بننا شروع ہو جاتا۔ صبح سے مزار تیار ہوتا شام کو اس پر میلہ لگتا تھا۔ لوگ ان کو سمجھاتے پلاٹے سین میں بھی اسی کام آتا ہے۔ لیکن جو مزہ چکنی مٹی کے کھلونے بنانے میں آتا تھا وہ پلاٹے سین میں کہاں؟

ایک قبر تیار کی جاتی۔ جس میں ایک فرضی کھوڑا دفن کیا جاتا۔ اس کے سرہانے نیم کے درخت سے ایک شاخ کاٹ کر گاڑ دی جاتی' اس کو شاخ نہیں درخت سمجھا جاتا۔ قبر کا سائز بھی کھوڑے سے کافی بڑا ہوتا تھا۔ مگر اتنے گراف کس کون دیکھتا۔ پھر مٹی کی چار دیواری تعمیر ہوتی جس کی اونچائی مشکل سے دو انچ ہوتی۔ اسی چار دیواری میں خوانچہ فروش اور چھابڑی والے تیار کیے جاتے جو زیادہ تر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوتے۔ ان کے سامنے ان کا خوانچہ دھرا ہوتا۔ اگر کوئی چھابڑی والا کھڑا ہوتا تو اپنی چھابڑی کا سہارا لے کر۔ مٹی کے یہ باوے اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہنے سے قاصر تھے کیونکہ ذرا دیر میں ان کا سر نیچے گر جاتا اور گارے کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتا۔

ان کی ٹوکریوں میں مٹی کی ننھی ننھی رنگ برنگی سی گولیاں رکھی ہوتی تھیں۔ آپائی تیار کرتی جاتیں اور بتاتی جاتیں۔ یہ آم ہیں۔ پھر ایک گولیوں کا ڈھیر تیار ہوتا۔ یہ پالسے ہیں۔ ذرا بڑے ہو گئے گولے تو تربوز ہیں۔ انگوروں کے خوشے بھی تیار ہوتے (یہ بھی کھوڑے شاہ کی کرامات تھیں کہ ہر موسم کا پھل اسی میلے میں بکتا تھا)

ایک صاحب ڈھول بجا رہے ہوتے۔ آپ مٹی کی اس عجیب الخلقت چیز کو یہی سا میں سمجھ لیں۔ ایک اینٹ پر مٹی کا لیپ کرکے حلوائی بیٹھا ہوتا۔ حلوائی بھی جلتی کڑھائی کا سہارا لیے مٹی کی مٹھائیاں بنا رہا ہوتا۔ ایک صاحب جھاڑو کا سہارا لیے حلوائی کے کڑھائی کے پاس غالباً "جھاڑو دے رہے تھے۔ کیونکہ اس مزار پر کسی ماڈرن چیز کا استعمال ممنوع تھا' لہٰذا موم بتیوں کے بجائے چراغ جلائے جاتے۔ روئی کی بتیاں بٹ کر تیل بھرے دیوں میں آگ دکھا کر روشنی کی جاتی۔

یہ گھر بھر شخص کی تفریح کا اجتماعی مرکز تھا۔ وہ جن کو اس کھیل سے کوئی رغبت نہیں تھی انہوں نے بھی کبھی کبھی

کچھ مٹی کے اس کھیل پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ صحن میں اندھیرا کر دیا جاتا اور دیے جل جاتے۔ اس قدر شور ہوتا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ بچے گھٹنوں اس میلے کے گرد بیٹھے شوق سے اس کو دیکھے جاتے۔ وہ بھی جو اس مزار کی تعمیر میں شریک نہیں تھے شامل ہو جاتے۔

صبح ہوتی تو زیادہ تر خوانچہ فروشوں کے جسم خشک ہو کر تیخ گئے ہوتے۔ خاکروب صاحب جھاڑو کے بل گرے ملتے۔ دن میں میلہ ویران ہو جاتا۔ بس رات رات کا کھیل۔ رات گئی بات گئی' روز روز میلہ بھی نہیں لگتا تھا۔ اگلے سال یا اس سے اگلے سال جب آپائی کا دوبارہ موڈ ہوگا پھر۔

کوئی دوپہر آپائی صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص کر دیتیں۔ وہ گھر سے رنگ برنگی کترنیں اور دھاگے لے کر آتیں۔ دھاگوں اور کپڑے کی دھجیوں سے جو گڑیا تیار ہوتی' وہ بھی پیر کھوڑے کی طرح اپنی شکل آپ ہی ہوتی۔ سفید کپڑے کی رتی کی بٹ کر ایک چھوٹی سی گولائی تیار کرتیں جو دراصل گڑیا کا چہرہ ہوتا۔ سوراخ دار چہرہ جس میں آنکھ ناک کچھ نہیں ہوتی۔ جو نیچے لٹک رہی ہیں۔ وہ گڑیا کی ٹانگیں ہیں۔ ایسی ہی ایک رتی مشرق سے مغرب کے رخ جوڑ دی جاتی' جو اس کے بازو سمجھے جاتے۔ دیکھنے میں لگتا گڑیا P.T کر رہی ہے۔ سفید کپڑے کے استعمال میں ان کی منطق تھی کہ دراصل گڑیا گوری ہے۔ گورا ہونا انتہائی ضروری تھا۔ گڑیا کے قد سے لمبے بال بنائے جاتے۔ بال بھی دراصل کالے کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا۔ جس کو سر پر سی دیا جاتا۔ بند ریا کی گھگھریا جیسی چمک دار پٹی اوپر سے نیچے تک۔ یہ اس کا لباس۔ ایک گڑیا حمیرا کی' ایک عبیر کی۔ دوپہر بھر میں گڑیوں کا ڈھیر تیار ہو جاتا۔ (تنویر ایسے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے پلاٹس کے نام یاد کر رہی ہوتی۔)

بالوں کے لٹکتے کالے کپڑے کے ٹکڑے کو دیکھ کر وہ فرمائش کرتا۔ "آپائی! مجھے ایک سپرمین بنا دیں۔" آپائی اپنا مخصوص بلند بانگ قہقہہ لگاتیں۔ "میں بنا دوں؟ تم تو ہو ہی سپرمین۔"

ایک دفعہ آپائی اور کریمی نے گڑیا گڈے کی شادی کی۔ بہت دنوں یہی جھگڑا رہا کہ گڈا کس کا ہوگا۔ جس کا گڈا ہوتا وہ برتر سمجھا جاتا۔ کھیل گڈی گڈے کا بھی ہو تو لڑکے کا مالک ہونا فخر کی علامت ہوتی ہے۔ یہ کلچر بھی ہزار ہا سال سے چلا آتا ہے۔ "اپنے لیے تو بیٹے اور اللہ کے لیے بیٹیاں؟"

شادی کا یہ کھیل بعد میں ہوتا۔ بچے محض تماشائی ہوتے۔ کیونکہ انہیں گڑیا کی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں اصلی شادیوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لڑکوں کو سرے سے گڑیا ہی نہیں چاہیے تھی۔ گڑیوں کے ڈھیر سے دو ٹکڑے اٹھا کر وہ ریسلنگ شروع کر دیتے۔ اور یہ لڑائی جب تک جاری رہتی' جب تک فائٹر کا تار تار ٹوٹ کر الگ نہ ہو جاتا۔ آپائی کی ساری دوپہر کی لگن برباد کرتے ان کو ذرا حیا نہ آتی۔ اب اس کو یاد نہیں گڈا کس کے نصیب میں آیا اور شادی ہوئی بھی کہ نہیں۔ کریمی افسوس کرتیں گڑیا کی شادی ایک کلچر تھا جو اب نہیں رہا۔ اسی بہانے لڑکیاں بالیاں سلیقہ سیکھتیں۔ کپڑے سینا۔ چند کھیا پکانا۔ مہمان بلانا' ان کی آؤ بھگت۔ ان کے عہد میں نہ رسالے تھے' نہ کتابیں عام تھیں۔ نہ اسکول' نہ تعلیم' نہ ٹی وی فلمیں' کوئی تفریح بھی نہیں۔

چار دیواری سے باہر کی دنیا نامعلوم۔ بچپن گھرداری کی تربیت حاصل کرتے۔ جوانی گھرداری کی چکی میں پستے گزر جاتی۔ بڑھاپا آنے سے پہلے بیشتر عورتیں چت پٹ ہو چکی ہوتیں۔

"گڑیا کے گھر مہمان آئے ہیں بھئی۔" منی کی سب گڑیاں ماچس سے بنائے صوفوں پر سج کر بیٹھ گئیں۔ بنے بنائے کھلونوں سے انہیں یہ تصوراتی چیزیں زیادہ اچھی لگتی تھیں۔ سارہ ملک کی بوتل کا ڈھکنا دراصل آٹے کی پرات ہے۔ گڑیا بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہے۔ پرفیوم کی خالی شیشی کا ڈھکن گھڑا ہے۔

"گھڑا کیا ہوتا ہے؟" عبیر منہ کھول کر حیرت زدہ ہو جاتی۔

"گھڑے میں پینے کا پانی ہوتا ہے۔" وہ جلدی سے جواب دیتا۔ عبیر اس کو مرعوبیت سے دیکھتی۔ کتنا قابل ہے

www.pkdigest.com

شہریار۔ اس کو وہ باتیں پتہ ہیں جو اس کو نہیں آتیں۔

"کیا حال ہے بہن! گرم ہیو گی یا ٹھنڈا؟" جس گڑیا کا مکالمہ ہوتا وہ اس کو ہاتھ میں لے کر ذرا سا لہراتی اس کے بعد گڑیا لکڑی کی طرح بے جان اسی طرح اکڑی اکڑی ماچس پر پڑی رہتی۔ دوسری کے جواب دینے کی باری آتی۔

"یہ اسکول کیوں نہیں جاتیں؟" حمیرا کے پاس بھی عجیب سوال ہوتے 'سارے ڈرامے کا ناس مارنے کو۔

کچھ دیر کو تو کریمی کو کچھ نہیں سوجھتا "آج اتوار ہے۔"

"کل بھی نہیں گئی تھیں۔"

"کل ہفتہ تھا۔" انہوں نے مری آواز میں کہا۔ "تمہیں بھی تو دو دن چھٹی ہوتی ہے۔"

اسکول ان کو کہاں نصیب تھے۔ بس گڑیا سے کھیل کر اپنا بچپن دہرا لیتیں۔ بچپن محفوظ ضرور تھا لیکن بہت خوشگوار نہیں تھا۔ کھیل ختم ہوتا تو وہ ماچس سمیٹ کر پینٹری میں واپس لے جاتیں۔ عبیرہ اپنی باربی کے بالوں میں برش کرنے لگتی۔ قدیم زمانے سے واپس ایجادات کی طرف۔

رات کو سونے سے پہلے اماں بچوں کے کمرے کا چکر لگاتیں۔ کون کیا کر رہا ہے؟ وہ چاروں ایک ہی کمرے میں تھے۔ چوتھا پلنگ ڈالنے کے لیے ان کو اپنی اپنی چیزیں سمیٹنی پڑی تھیں۔ لیکن اس نے بہت جلدی اپنی جگہ بنالی تھی۔ کمرے میں بھی 'دل میں بھی۔ وہ دادی اماں کا بے حد لاڈلا تھا اگر کسی بچے کو بھی دادی اماں سے ڈانٹ پڑتی تو صرف اس کی خاطر۔ اس کو یہ مراعات صرف اس لیے حاصل تھیں کہ وہ ماں باپ سے دور علم حاصل کرنے آیا تھا۔

تائی نائلہ کے بعد کریمی آتیں۔ بچوں کا بکھیرا سمیٹتی۔ بیگز تیار ہیں چاروں کے؟

پھر وہ شہریار کے پلنگ پر بیٹھ کر اس کو اپنے ساتھ چمٹا لیتیں۔ عبیرہ دوڑ کر ان کی گود میں آ بیٹھتی۔ وہ اتنی لمبی تھی کہ اس کی ٹانگیں لٹک کر زمین تک پہنچ رہی ہوتیں۔

"کہانی۔" وہ فرمائش کرتی۔

"مجھے تو پرانی کہانیاں آتی ہیں۔ لاؤ بیٹی! نئی نئی کارٹون والی کہانیاں مجھے کیا پتہ؟"

"کریمی! کہانی۔" وہ ان کی انکساری کو در گزر کر دیتی۔ وہ منتظر رہتا۔ وہ بھولا بھالا بچہ تھا۔ اس کو بہت نصیحتوں کے بعد بھیجا گیا تھا اس لیے وہ فرمائش بھی نہ کرتا۔ لیکن خواہش کرتا کاش! وہ کہانی سنا ڈالیں۔

"ایک تھی کٹو! اس کو کہیں سے روئی کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ روئی سے اس نے کپڑا بنوایا۔ کپڑا بنوا کر رنگوایا۔ پھر درزن سے سلوایا اور پہن کر درخت کی اونچی سی شاخ پر بیٹھ گئی۔ وہاں سے بادشاہ کا گزر ہوا۔ اس نے کہا یہ تو بڑا خوب صورت پرندہ ہے چلو اس کو گھر لے چلیں (کسی خوب صورت چیز کو دیکھ کر اس کو اٹھا لینے کا تصور اہل اقتدار کے لیے نیا نہیں)

کٹو کی سواری کے لیے گھوڑا منگوایا گیا مگر کٹو نے بیٹھنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کے باپ دادا نے کبھی گھوڑے کی سواری نہیں کی تھی (باپ دادا کے رسم و رواج پر ڈٹے رہنا صرف کفار کا ہی وطیرہ نہیں تھا) ہر سواری رد کر کے جب اس کے لیے پالکی منگوایا گیا تو وہ ہنسی خوشی محل کی طرف چل دی۔

اس کہانی میں لکیر کا فقیر ہونے کا درس دیا جاتا تھا یا نہیں لیکن جب گلہری بادشاہ سے بحث کرتی تو ہر جملے کے درمیان چچ چچ کی آواز نکالتی۔ پانچ منٹ کی کہانی چچ چچ کرتے آدھے گھنٹے کی ہو جاتی۔ کہانیوں میں مزہ ہی روھم کا ہے۔

میٹرک تک وہ صرف گرمی کی چھٹیوں میں ڈی جی خان واپس جاتا اور ہر دفعہ ان لوگوں کو خدشہ ہوتا کہ اس کو واپس نہیں بھیجا جائے گا۔ کیونکہ اس کی امی دوسرے شہر جا کر کسی دوسرے کے گھر رہتے پڑھنے کے سخت خلاف

تھیں انہوں نے کئی لوگوں سے گلہ کیا' جو ان تک پہنچا بھی کہ پڑھانے کے بہانے انہوں نے اسے ملازم رکھ لیا ہے۔ لیکن ابا اپنی کم تعلیم اور بڑی دو اولادوں کی سڑک نوردی سے اس قدر گھبرا چکے تھے کہ انہوں نے ماں' خالہ' ماموں کی ہر طرح کی مخالفت کا سامنا کیا لیکن پڑھائی کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں دیا۔

وہ بہت لائق ثابت ہوا۔ اور سب سے زیادہ نمبر لیتا تھا اور سب سے کم تنگ کرتا تھا۔

امتحان کا زمانہ آتا تو ان سب کے نام تبدیل ہو جاتے۔ تایا عباس کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے ان کے کمرے کے گرد منڈلاتے۔

"ساتویں جماعت۔ اتنی دیر تک نہیں سویا کرتے۔"

"پانچویں جماعت آج سے آپ آرچی کامکس کو ہاتھ نہیں لگائیں گی۔"

"کلاس تھری! کریمی کی گود سے اتریے۔ انہیں آپ کے لاڈ اٹھانے کے سوا بھی کئی کام ہوتے ہیں۔"

شہریار دیکھتا تھا جب تایا عباس کنٹرول سنبھالے احکامات صادر کرتے تو تائی نائلہ ایسے بیٹھی ہوتیں جیسے اس سارے معاملے سے بالکل لاتعلق ہیں۔ نہ وہ دونوں منہ در منہ لڑتے تھے نہ ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ دونوں کے کنٹرول کے اپنے اپنے فیلڈ تھے اور یہ بھی نہیں کہ ان دونوں کو آپس میں کوئی گلہ ہی نہیں تھا۔

عمر بھر ہنسی خوشی زندگی تو بس شہزادہ شہزادی ہی گزارتے ہیں کیونکہ وہ کہانی کا آخری جملہ ہوتا ہے۔ اور یہاں زندگی باقی تھی۔

وہ جب بچوں کی فیس کے لیے پرس کھول کر پیسے نکالتیں تو شہریار کو خدشہ ستاتا۔ اس کی ماں نے بتایا تھا بلاوجہ باپ نے تمہیں ان پر مسلط کر دیا ہے۔ وہ بھی کون سا خوشی خوشی تمہیں رکھے ہوئی ہیں۔ اس کو لگتا۔ وہ کہیں گی ایک اضافی فیس؟ گھر کے بجٹ میں تنگی۔ بے مقصد کا بوجھ یا کم از کم ایک شکوہ بھری نظر اس پر ضرور ڈالیں گی۔ لیکن وہ اس کے تمام اندیشوں کے برعکس پرس کی زپ لگاتیں اور پھر اپنی کتاب پر جھک جاتیں۔

شروع شروع میں اس کو اس بات سے بھی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ لگتا تھا گھر میں لائبریری پیریڈ چل رہا ہے۔ تایا عباس تو ہر وقت کتابوں کے ڈھیر میں گھرے رہتے۔ دادی اماں بھی اے آر خاتون کی کتابیں منگواتیں جو ان دنوں نایاب تھیں۔ ان کی نظر میں اردو ادب صرف تین کتابوں پر مشتمل تھا۔ شمع' چشمہ' ہالہ۔ وہ ان کو ازبر ہو گئی تھیں اور لاتعداد مرتبہ پڑھ چکی تھیں۔ دادی اماں کبھی عینک لگانے کی سستی کرتیں اور دوپہر کو سونے سے پہلے اس سے فرمائش کرتیں۔ "ذرا پڑھ کر تو سناؤ۔"

"کہاں سے پڑھوں دادی اماں؟"

"کہیں سے بھی سنا دو۔ کوئی سا بھی صفحہ۔" وہ عورتوں کے خالص ادب میں نامانوس محاورے کے ساتھ اٹک اٹک کر بچے کر کے پڑھتے سر اٹھاتا تو وہ سو چکی ہوتی تھیں۔ اے آر خاتون لوری کا کام کرتی تھیں۔ بڑی تائی کے پاس رضیہ بٹ اور سلمیٰ کنول کی کتابیں۔ تائی نائلہ کے پاس رفعت سراج۔

عثمان اور تنویر famous five' Eoid blytan کی پتلی پتلی بے شمار مختلف رنگوں کی کتابیں۔ جو انہوں نے اپنی محنت سے کمائی تھیں۔ عبیرہ صرف sweet valley kids میں ڈوبی رہتی۔ وہ تب بھی ایسی ہی سادہ اور بے وقوف تھی جیسی آج ہے۔ شروع میں اس کو بہت کوفت ہوتی' جب وہ آنسو بہاتی اور سوں سوں ناک سڑکتی اس کے پاس آتی اور وہ پریشان ہو کر پوچھتا "کیا ہوا ہے؟"

تو روتے روتے کہتی۔

"انہوں نے جیسکا کو کلاس سے نکال دیا ہے۔"

وہ کچھ دیر کو ہراساں ہو جاتا۔ "کون جیسکا؟"

www.pkdigest.com

"اسٹوپڈ میری اسٹوری بک میں ہے۔" اس کو اسٹوپڈ کہنے کی اجازت نہیں تھی لیکن جس قسم کی کتابیں وہ پڑھتی اس میں یہ لفظ عام تھا) اور گھر بھر میں وہ سب سے زیادہ اس اسٹوپڈ سے ہی قریب تھی۔

دوپہر بھر وہ لوگ ماڈل ٹاؤن کی خاموش پُرسکون سڑکوں پر سائیکلیں چلاتے۔ اس کو سائیکل چلانی نہیں آتی تھی۔ لیکن جب اس کے حصے کی سائیکل آئی تو رضا عثمان نے اس کی بہت مدد کی۔ لیکن جو ہنر اس کو آتے تھے' وہ ان دونوں کو نہیں آتے تھے۔ اور وہ اس سے سیکھ بھی نہیں سکے۔ وہ گلہری کی طرح پھدک پھدک کر درخت کی سب سے اونچی شاخ پر پہنچ جاتا' وہاں سے اس کی پسندیدہ شاخ توڑ کر لاتا' جس پر عثمان اپنے چاقو کا ہنر آزماتا تھا۔ تیز سے تیز نہر میں ڈبکی لگا لیتا۔ وہ اس کو شلوار میں ہوا بھر کر شاں شاں کرتی نہر میں float کرتا دیکھتے اور مرعوب ہوتے۔ پھر گھر واپس جانے سے پہلے تیز تیز سائیکلیں چلاتے' یہ کپڑے ڈرائی کلین کرنے کا ان کا ذاتی نسخہ تھا۔ جب تک اس کے کپڑے بالکل خشک نہ ہو جاتے ان میں سے کوئی گھر واپس نہ جاتا کہ گھر والوں کو شک میں مبتلا نہیں کرنا تھا۔ آپ جتنے مرضی اچھے بچے ہوں' گھر والوں سے چوری کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہیں اور سب سے زیادہ مزہ اس چوری کا آتا ہے۔ ماں باپ کو اپنے راز میں شریک نہ کرنے کا ایک ان کہا سمجھوتا درمیان میں چلتا ہی ہے۔ ممکن ہی نہیں بھولے سے بھی ان کے منہ سے کوئی لفظ نکل جائے جو ان کا راز فاش کرتا ہو۔

"کہاں گئے تھے؟"

"ماڈل ٹاؤن پارک۔"

"کپڑوں کو کیا ہوا؟" تایا عباس' شہریار کی طرف عدم اعتمادی سے دیکھتے۔

"فوارے کے نیچے کھڑے ہو گئے تھے۔"

"کیا حماقت ہے؟" وہ گھبرا کر کہتے۔

جو حماقت انہوں نے کی تھی' وہ پتہ چل جاتی تو معلوم نہیں کیا حشر ہو۔

بہت مدت بعد ان تینوں کی موجودگی میں' جب وہ ڈاکٹر اور لیفٹیننٹ دونوں بن چکا تھا اور تایا عباس اس کے پاس اوکاڑہ آئے تو انہوں نے سکون سے کہا۔

"کتنی خوب صورت نہر ہے۔ تم تو نہر میں بچپن سے تیرتے ہو نا!"

پھر وہ ان کے درمیان رہتے رہتے ان کا حصہ بن گیا اور اپنے گھر سے ٹوٹ گیا۔ حالانکہ وہ گھر سے علیحدہ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو اپنی ذمے داریوں کا اچھی طرح احساس تھا۔ کہیں اور پیدا ہو کر کہیں اور پلنے والے خود کو بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں ڈالے محسوس کرتے ہیں۔

جب وہ پری میڈیکل میں آیا تو اماں' ننھیال سے پہلی دفعہ الگ ہو کر اس کی خاطر لاہور آ گئیں۔ بڑا بیٹا کنسٹرکشن کے کام میں پہلے دوبئی پھر امریکہ چلا گیا۔ بڑی کی شادی ماموں کے بیٹے سے ہوئی وہ بہت خوش باش نہیں تھی۔ ایک کے بعد ایک غلط فیصلے کرنے کے بعد ابا اپنی دکان سمیٹ کر لاہور آ گئے۔ صرف دو سال ہی اس کو اپنے گھر رہنا نصیب ہوا' اس نے وہ خوشگوار ماحول پیدا کرنا چاہا جس کا وہ عادی ہو گیا تھا جو اس کو اچھا بھی لگتا تھا جس سے وہ اپنے گھر کو بھی روشناس کرانا چاہتا تھا۔ لیکن خواہش کے باوجود وہ ماحول بنا نہیں سکا۔ اماں ابا ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے تھے۔ آپس کی ہر وقت کی لڑائیوں میں بچے اس قدر مفاد پرست ہو چکے تھے کہ وہ کسی کی بھی پارٹی بن جاتے جہاں سے انہیں کچھ ملنے کی توقع ہوتی۔ پیسہ چاہیے تو باپ کے ساتھ ہو گئے۔ کوئی کام لینا ہے تو ماں کی جماعت میں شامل۔ عزیزہ کے گلے ختم نہیں ہوتے تھے۔ بار بار امتحان دیتی۔ بار بار فیل ہوتی۔ کبھی بچہ نااہل' کبھی بھائی بے پروا۔ کبھی باپ ظالم۔

پھر اس کو آرمی میڈیکل کالج میں داخلہ ملا اور وہ ماضی کو خیرباد کہہ کر پنڈی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ زندگی کا ایک اور موڑ تھا۔ ایک اور سفر' ایک اور ہجرت۔

ہوسٹل جہاں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ جس جگہ نہ ماں باپ تھے نہ کریم بی نہ دوست نہ عزیز۔ پیر کوڑا۔ نہریں اور درختوں سے ماورا۔

اوکاڑہ' سیاچن' احمد پور۔

ہجرت در ہجرت۔۔۔ دریاؤں کی طرح اپنا رخ بدلتا۔ کہیں بھی قدم جما کر کھڑا نہیں ہو سکا۔

جب سب ہوم سک ہوتے جو ہاسٹل کی زندگی میں ایک مقبول بیماری ہے تو وہ فیصلہ نہ کر پاتا' وہ کس گھر کو یاد کرے اور کس فرد کو سب سے زیادہ یاد کرے۔ لیکن کسی فرد کو تو وہ سب سے زیادہ یاد کرتا تھا اور جانتا تھا ایسا کرنے کا اسے کوئی حق نہیں۔

آج چند روز بعد وہ شہر کی طرف گیا تھا۔ شہر میں اس کو کوئی خاص کام ہوتا بھی نہیں تھا' سوا اس کے کسی نیٹ کیفے میں جا پہنچا Browsing کرتا کہ دنیا سے اس کا رابطہ اس ایجاد کے ذریعے ہی رہ گیا تھا۔ spam میل بھی اس دلچسپی سے پڑھتا جیسے اسی کے لیے آئی تھیں۔ اس کی اپنی ذاتی میل تو برائے نام ہی ہوتیں۔ لیکن آج وہ خوش قسمت رہا کہ ان باکس میں چار عدد خط اس کے نام درج تھے۔

پہلا خط حمیرا کا تھا۔ اس نے اس کا بے حد شکریہ ادا کیا تھا کہ وہ بطور خاص ان کا ڈرامہ دیکھنے اتنی دور سے آیا اور ان کی اس قدر ہمت افزائی کی۔ وہ مسکرا دیا۔ حمیرا بی بی ہمیشہ کی خوش اخلاق اور سوشل واقع ہوئی ہیں۔

دوسری میل عثمان کی تھی۔ اس نے لکھا تھا وہ کسی کام سے دوبئی جا رہا ہے' اگر کچھ منگوانا ہو تو بے جھجک لکھ ڈالے۔

تیسری میل اس کی بہن کی تھی۔ اس میں بہت سے گلے اور شکوے بھی تھے۔ فرمائشیں اور پیار بھی تھا اس کا۔ مجھا گا کم از کم وہ اس کو یاد کر رہی تھی۔

چوتھی اور طویل میل عبیر کی تھی۔ کچھ عرصے سے وہ اور اس کے ساتھی کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ہیومن رائٹس کے گھسے پٹے فارمولے سے بچ کر۔ کچھ سیاسی کام' کچھ معاشرتی اقدار کی حفاظت۔ جو لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں' انہیں بہت نقصان اٹھانے پڑتے ہیں اور کسی نے اسے دکھ دیا تو وہ اسے معاف نہیں کرے گا۔

وہ اندر ہی اندر غرایا۔ حالانکہ اس سے معافی مانگنے کس کو آنا تھا۔ اور وہ چاہے بھی تو اس کو ان سے نہیں بچا سکتا۔ اس دنیا کی کشش اس پر حاوی ہے۔ اس نے سوچ لیا اب وہ کر گزرے گی۔ لیکن اس کی میل کہتی ہے وہ دکھی ہے' اس نے پہلا رہنما چنا اور ٹھوکر کھائی۔ وہ سادگی اور سچائی کی متلاشی ہے اور اسے یہ نہیں علم کہ رہنما منافق ہی ملے گا' وہ نیٹ پر آن لائن نہیں تھی۔ اس نے فون ملانا چاہا تو اسے سگنل ڈیڈ ملے۔

اسے بلاوجہ کی وحشت نے آگھیرا۔ جس طرح انسان کسی سبب کے بغیر خوش ہو جاتا ہے' اسی طرح کسی دلیل کے بغیر دکھی بھی ہوتا ہے۔ وہ دکھی کیوں تھا' اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ کتنی دیر بازاروں میں بے سبب ہی چہل قدمی کرتے اس نے اخبار خریدا اور واپس اپنی تنہائی سے الجھنے آ بیٹھا۔

جب سے اس کے گرد جھکڑ چل رہے تھے' وہ طوفانوں میں گھرا خود کو کھجور کی سوکھی شاخ کی طرح بگولوں میں چکراتا محسوس کر رہا تھا۔

پھر اس نے سامان میں رکھا آج کا تازہ اخبار نکالا اور چپ چاپ cross Words حل کرنے لگا۔

باقی آئندہ شمارے میں

www.pdigest.com

رفعت ناہید سجاد

چراغِ آخرِ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر، عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں۔ اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی ثریا ہے جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پُراعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف ٹی وی پروڈیوسرز کے لیے پروگرام لکھ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے۔ وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیر اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ

www.pkdigest.com

صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بدوجہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور ان کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے' جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کو نا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈیئنس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے' جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کرکے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے' اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان' شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے' جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ ابھارتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۶

چھٹی قسط

گوبر کی کھاد اور مردہ پتوں کی باس میں رچا گاؤں' جس میں سرِشام لکڑیوں اور اپلوں کے جلنے کی خوشبو پھیل کر بستی کی موجودگی کا پتا دیتی۔ ہر شام مٹی کے کچے' صحنوں سے گاڑھا کثیف سرمئی دھواں آسمان کی طرف اٹھ کر زندگی کا علم بلند کرتا' تندور میں پکنے والی روٹیوں کی تھپ تھپ کی مانوس آواز اور لسن کے تڑکے کی چھن' چولھوں سے بے تاب ہو کر نکلتے آگ کے شعلوں کے آس پاس ایک معروف اور غیر اہم دن کا خاتمہ ہو جاتا۔

آگ جو ابتدا ہی میں زندگی سے آملی تھی' جو آج تک ساتھ ساتھ ہے۔ حالانکہ اس سے پناہ مانگی گئی ہے۔

ساٹھ ستر ایسے دھواں دیتے گھروں کا یہ گاؤں جی ٹی روڈ سے کئی میل اندر کی طرف تھا۔ پکی سڑک سے ایک راستہ کھیتوں میں سے گزرتا۔ گھروں کی طرف آتا تھا۔ گڈا گاڑی میں جتے بیل جب بستی کا رخ کرتے تو دھول کا طوفان ساتھ ساتھ سفر کرتا گاؤں تک آتا۔ بیل گاڑی صرف وہاں تک پہنچ سکتی تھی' جہاں سر جھکائے اپنی جڑوں کو بالوں کی طرح بکھیرے جوگی جیسا برگد کا درخت صدیوں سے ایستادہ تھا۔ جس کی گھنی چھاؤں تلے گاؤں کا کلب تھا۔

حقہ سگریٹ پیتے کھانس کھانس کر بے حال ہوتے بوڑھے۔ ایک دوسرے کا حال پوچھتی اور سر سے جوئیں نکالتی ذرا دم لینے کو بیٹھی عورتیں۔ جن کی اولادیں آس پاس ہی دوڑ رہی ہوتیں۔ اپنے اوپر سے گزرتے موسموں کو خاموشی سے دیکھتا۔ وہ ان تمام خوشیوں کا ساتھی تھا' جو کبھی بھی اس بستی میں بپا ہوئیں اور ان تمام مظالم کا چشم دید گواہ تھا' جو اس بستی پر ڈھائے گئے۔ اس درخت پر آسیب بھی تھا اوپر والی چوٹی کی نرم شاخوں پر ایک پروں والا گھوڑا آبیٹھا' انہوں نے اپنی دادی سے سنا تھا اور دادی نے اپنی ماں سے لیکن وہ مہربان آسیب تھا اور اس بستی کی رکھوالی پر مامور تھا کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا کبھی کبھی' وہ مسجد میں نماز پڑھنے آجاتا۔ ایسا لوگوں نے بتایا تھا اور قسم کھا کر یہ بھی بتایا کہ۔

اس کا قد بارہ تیرہ فٹ ہے۔ اسی لیے وہ بڑی تیزی سے ایک سے دوسری جگہ سفر کرتا ہے۔ گو وہ کسی دشمن کو اس

بستی میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ اور اس کا ذاتی گھر درخت پر ہی ہے' جس میں وہ دن بھر پڑا سستی سے کسمساتا رہتا ہے۔ غالباً" اسی کابلی کے زمانے میں کبھی طاغوتی طاقتیں حملہ آور ہو جاتیں اور اپنا لوکل جن بھائی پسپا ہو جاتا۔ اسی سال آم اور کنو کے درخت کو کیڑا مار دیتا۔ بہت کم پھل اترتا۔ آموں کے جھرمٹ میں چڑیوں کی چہکار بھی کم رہتی۔ لڑکیوں پر دورے پڑتے اس سے ثابت ہو جاتا کوئی اور آسیب اس درخت پر غلبہ پا چکا ہے۔

درخت کے عقب میں غلیظ پانی کا ایک جوہڑ تھا۔ جس میں علاقہ بھر کی بھینس کیچڑ میں لت پت سستی سے پڑی اشنان کرتیں اور جب وہ گھر واپس جاتیں تو ان کو ذرا پروا نہ ہوتی کہ گارے کے لیپ میں وہ کتنی گندی لگ رہی ہیں۔

بعض کام چور کوّے اڑانے کے بجائے مزے مزے سے بھینس کی پیٹھ پر سوار ہو کر سفر کرتے۔

وہاں سب کچھ مل جل کر ہوتا تھا۔ آدھی رات کو اٹھ کر پانی لگاتے۔ گھام اور جستی میں کھڑی فصلوں کے بیچ چارہ کاٹتے' نلائی گوڈی کرتے۔ بیچ چھڑکتے گاؤں کی پکی اینٹوں کی مسجد جس کی چار دیواری بہت بلند نہیں تھی۔ بے گنبد' بے مینار کی اس غریب مسجد میں بچھی ترپال کے فرش پر سب سجدہ بھی اٹھا کرتے بہت سوں کو نماز نہیں آتی تھی لیکن سجدہ تو کرنا آتا تھا نا۔

محنتی اور جفاکش کسانوں کے درمیان اونگھتا' آنکھوں کی طرح آنکھیں بند کیے' اپنے آپ میں گم اکبر' درختوں کے تنوں سے رانجھے کی طرح ٹیک لگائے۔ بانسری کی جگہ کتاب تھامے' دنیا جہان سے بیزار دکھائی دیتا تھا۔

ہجوم میں لیکن تنہا۔ جو امام مسجد شاہ محمد کا بیٹا تھا۔ امام صاحب جو مسلمانوں کو جہنم واصل کرنے کے شوقین نہیں تھے۔ امام صاحب نے میٹرک ورنیکلر پاس کیا تھا۔ اپنے عہد کے بیشتر لوگوں کی طرح دیہات چھوڑ کر شہر کا رخ کیا کہ ایک زمانے میں نیم خواندہ افراد ڈاک خانے یا ریلوے میں ملازم ہو جاتے تھے۔ اور ایسا انگریز کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ لہٰذا انہوں نے پوسٹ آفس کی نوکری پسند کی۔ ڈاک خانے کی نوکری میں تبادلے جا بجا ہوتے ہیں' امام صاحب ہر تین سال بعد بوریا بستر باندھ کسی دوسرے شہر کے لیے تیار ہوتے۔ ایسے ہی کسی تبادلے کے دوران اکبر پیدا ہوا۔ مغل شہنشاہ ہمایوں' شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر بھاگا' سندھ کے راستے ایران جاتے امرکوٹ کے مقام پر ولی عہد تولد ہوا چونکہ موجودہ اکبر بھی دوران سفر پیدا ہوا تھا لہٰذا مسلمانوں کے عظیم ہندوستان کی ماضی کی یاد میں اس کا بھی نام اکبر رکھ دیا گیا۔ وہ ان کا ولی عہد تھا۔ والد صاحب کو تو سرے سے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ "سوری" مسلمان ہو سکتا ہے (کیونکہ مسلمان کی مسلمان سے لڑائی وہ تازہ دریافت سمجھتے تھے) اور ناموں کے انتخاب میں وہ قسمت کو بہت زیادہ دخیل سمجھتے تھے لہٰذا نہایت احتیاط اور انتخاب کے ساتھ اکبر صاحب اکبر اعظم ہوئے۔ اکبر اعظم اصلی کے ذاتی مذہبی نظریات کیا تھے؟ امام صاحب کی نظر میں وہ انگریز کا پراپیگنڈا تھا۔

دوران ملازمت شاہ صاحب شہر میں رہے لہٰذا شہر کی روایات کے مطابق اکبر صاحب اسکول داخل کروا دیے گئے اور چونکہ اکبر کے والد دنیاوی تعلیم کے بھی حامی تھے اور خود بھی مقدور بھر پڑھ چکے تھے لہٰذا اولاد کے لیے بھی تعلیم کے دروازے کھلے تھے۔ شاہ محمد صاحب دیہات کی کھلی فضا اور طاقت خوراک چھوڑ کر شہر پہنچے تھے اور اپنی خواہش سے آئے تھے لیکن شہری خوراک اور ماحول دونوں سے مکمل طور پر تعاون نہیں کر پائے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ نقل مکانی اور ہجرت ایک ہی بات نہیں ہوتی۔ نقل مکانی کرنے والے عموماً" اپنی روح ابتدائے سفر میں چھوڑ کر صرف جسم سے سفر کرتے ہیں اور اپنی روایات رہن رکھنے کو تیار نہیں ہوتے۔ لہٰذا اکبر بادشاہ اسکول میں اپنے لہجے اور حلیے سے ہنسی ٹھٹھول کا نشانہ بنتے۔

اس کو صبح اٹھ کر اسکول جانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کو میٹرک کرنا پڑا اور جب ترقی کرتے کرتے

www.pkdigest.com

شاہ محمد صاحب افسری کی پوسٹ پر پہنچے تو وہ لاہور جا چکے تھے اور مغل اعظم ایم اے کر کے فارغ ہوئے تھے۔ شہر میں گاؤں کے بے خوشی غم نہیں ہوتے۔ شدید محنت تھی' نہ فرصت کے لمحات میں کھلنڈرا پن اور یہ سب شاہ محمد صاحب کو بہت کھلتا تھا' وہ جس گاؤں کو اپنی رضا سے چھوڑ آئے تھے اس کی یاد میں آہیں بھرتے "ہمارے گاؤں میں۔۔۔"

لیکن شہر لاہور اپنے فراخ سینے میں ہر طرف سے آنے والوں کو سمیٹتا رہتا ہے' اسی لیے پھیلتا پھیلتا کئی شہر آگے نکل گیا ہے' اس شہر میں امیر سے امیر اور غریب ترین آدمی بھی پیٹ بھر روٹی کھا سکتا ہے' اپنی ضرورت کے مطابق جی سکتا ہے اور لاہور سے محبت کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہاں اس کی بے شمار مصروفیات تھیں۔ جن میں وہ ہمہ وقت گم رہتا لیکن پھر بھی ان کو پلٹ کر آتا تھا' سو جب وہ اپنے اصل کی طرف لوٹے تو وہاں بھی پرائے تھے۔ جلاوطن لوگوں کا ہمیشہ یہ المیہ رہا ہے جب وہ سارا سفر ایک اجنبی دیس میں اس آس میں گزارتے ہیں کہ کبھی تو وطن کو لوٹیں گے لیکن جب وہ گھر پلٹتے ہیں تو وہاں بھی پردیسی ہو جاتے ہیں۔

سو جب وہ گھر واپس آیا تو اس نے لاہور سے ملتان کے درمیان چھوٹے بڑے بے شمار شہر دیکھ ڈالے تھے۔ وہ گاؤں کا واحد شخص تھا جس نے اتنی سیر کی تھی اور ایک بڑی ڈگری لے کر پلٹا تھا۔ ابتدائی ایام میں وہ شہر میں Misfit تھا اور اب گاؤں میں اوپرا اوپرا تھا۔ نوکری اسے ملی نہیں۔ جو ملی بہت پسند نہیں آئی۔ نہ اس سے بیل جوتے جاتے' نہ ہل چلایا جاتا۔ مویشی چراتے' الھڑ پنے سے بھاگتے بچھڑے اس کے قابو میں نہ آتے۔ کندھوں تک آئے لمبے بالوں اور بدرنگ قسم کی جینز میں وہ اپنے آپ میں مسکراتا' سب چیزوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا۔ لوگ جانتے تھے وہ یہاں نہیں رہے گا' آخر کار واپس چلا جائے گا۔ وہ ٹورسٹ کی طرح سب کچھ اوپر اوپر سے دیکھتا۔ پھر برگد کے نیچے اپنے بزرگوں کے ساتھ پاؤں زمین میں لٹکا کر اپنے موبائل پر کچھ لکھتا اور پڑھ پڑھ کر مسکراتا جاتا۔ اونچی اونچی آواز میں باتیں کرتے بڑے بے سبب آوارہ پھرتے بچے اور دن بھر کولہو کے بیل کی طرح جتی عورتیں۔ اس نے ان کو پڑھانے کی کوشش بھی کی لیکن ماں باپ کے لیے ان کی تعلیم محض وقت کا زیاں تھی۔ سو وہ چپ چاپ بیٹھا کسی دلچسپ فلم کی طرح سارا منظر دیکھتا جاتا۔ اس کے آباؤ اجداد اس کا حصہ تھے اور اب بھی وہ اس پر اپنا حق جتانا نہیں بھولتے تھے۔

دھیمی رفتار سے چلتے لوگ۔ سست روی سے کام کرتے۔ آنکھوں پر پٹی باندھے کاہلی سے گول گول گھومتا بیل۔ گوبر سے اُپلے تھاپ کر گھر کی دیواروں پر سجاتی عورتیں جیسے کسی آرٹ ورک میں مصروف ہوتیں۔ مرد فرصت کے اوقات میں برگد کے نیچے بیٹھ کر حقہ پیتے اور اپنی اولاد اور اپنی بیویوں کو شوقیہ ہی پیٹا کرتے۔

یہ ان کا حق تھا۔ کیونکہ ان کے گھروں میں ہر عورت اور ہر بچہ اپنا فرض سمجھ کر مار کھاتا۔ پھر یہ فرض بڑے بھائیوں کو سونپ دیا جاتا۔ وہ جب چاہتے چھوٹے بہن بھائیوں کو کوئی وجہ بتائے بغیر دھن کر رکھ دیتا' زار و قطار بچہ روتا گھر آتا اور بڑے بھائی کی شکایت لگاتا تو شکایت لگانے پر از سر نو مار کھاتا۔ طاقت ور ہر اختیار رکھتا ہے اور عموماً "سینہ تان کر چلتا ہے۔ چھوٹا کمزور یا لاڈلا ہونے کا تصور بہت ہی کم ہے۔

باپ اور بڑے بھائی کو مکھن سے چپڑی روٹی ملتی ہے۔ سب سے پہلے وہ کھاتا ہے' پھر بچوں کی باری آتی ہے اور آخر میں عورتوں کی۔ چٹنگیر کی آخری روٹی۔ خشک اور سوکھی۔ خوراک کی کمی نہیں گندم کی کٹائی کے بعد سال بھر کے دانے گھر آجاتے جن کی اپنی کھیتی باڑی نہیں تھی۔ ان کو بھی کٹائی کے وقت ساتھ دینے میں حصہ ملتا۔ گھروں میں وہی پکتا جو اگتا تھا۔ دھان نہیں تو چاول نہیں پکتے تھے۔ حالانکہ پاس پڑوس میں دھان کی فصل لہلاتی تھی۔ سرسوں کا ساگ' سردیوں کی محبوب غذا تھی۔ مٹی کی ہانڈی میں کھدر کھدر پکتا سبز ملیدہ' اس کو ذرا بھی مرغوب نہیں تھا۔ گوشت پکنے کا خاص دستور نہیں تھا۔ مرغی بیمار ہوتی تو پکتی۔ انڈہ بھی کم ہی کھایا جاتا زیادہ تر مرغیاں بٹھانے کے کام آتا۔ اس کے باوجود مرد کو خوش کرنے کے لیے انڈہ مرغی اس کے حکم پر سب چٹتا تھا۔

بچے للچائی نظروں سے بڑے بھائی کو عیش کرتا دیکھتے ہیں لیکن مطالبہ نہیں کرتے کیونکہ ان کی ماں نے یہی سمجھایا ہے۔ حالانکہ کماتے دونوں ہیں اور پکاتی صرف عورت ہے لیکن پتہ نہیں پچھلی کتنی نسلوں سے ترنوالے پر مرد کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ گاؤں میں اس کا احساس نہیں اور شہر میں یہ بحث باسی ہو چکی ہے۔

گوبر کے ڈھیر میں کیچڑ میں لپی پتی بھینسوں کے درمیان اپنے ماں باپ کی پیدا کی ہوئی اولادوں کو سارا دن گود میں لیے ہلر ہلر ہلاتے۔ بغیر جانگیے کے ننگے لڑکے بغل سے لٹکائے عورتوں کو ننگا پھرانا فخر کی بات ہے۔ جن کی ناک سے بہتی بہتی گندگی نتھنوں میں جم جاتی' بڑی بچیاں بالوں کی کھلی رسیوں جیسی بٹی ہوئی لٹوں کو دونوں ہاتھوں کے میلے ناخنوں سے کھبڑ کھبڑ۔ خون چوستی جوؤں کو کھجلاتیں۔ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کد کڑے لگاتی پھرتیں' اپنی ماں سے چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر دوہتڑ کھاتیں۔

ان میں پروین بھی تھی۔

گاؤں میں چونکہ اس کو کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا' اس لیے وہ چپ چاپ یہ دلچسپ تماشا دیکھا کرتا' بس کسی کو مار کھاتا دیکھ کر اس کو ذہنی کوفت ہوتی۔

ایسے ماحول کے پروردہ لوگوں میں جو خود غرضی رچ بس جاتی ہے' وہ اس سے بہت دور تھی۔ سارا دن بچے سنبھال کر صبح سے شام تک گھر کے کاموں میں جتے رہ کر بھی وہ رات کو سونے سے پہلے ماں کی چارپائی کی ادائن پر بیٹھ کر اپنی ماں کی ٹانگیں دباتی۔ اس کے خیال میں ماں سارا دن تھکی رہتی ہے وہ ہر کام کے لیے ہاتھ پھیلا دیتی۔

"لاؤ مجھے دو۔"

معصومیت سے مسکراتی وہ صبح سے کام پر جُت جاتی۔ جب وہ درخت کے پاس پاؤں لٹکائے بستی کے لوگوں کو قطعی غیر جانب داری سے نمبر دیتا اور کاٹتا۔ وہ گھر میں جھاڑو دے رہی ہوتی۔ پھر وہ ایک ایک کے آگے چنگیر اور کسی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی قیمت: 400 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل قیمت: 180 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبیں قیمت: 350 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 200 روپے
☆ امربیل، عمیرہ احمد قیمت: 450 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر
شائع ہو گئے ہیں

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 2216361

لیے جاتی۔ پھر بھینسوں کے کام میں مصروف ہو جاتی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہر وقت حرکت میں رہتے تھے۔ ان کے پاس رکھوالی کی کچھ بھینسیں تھیں جو گاؤں کے تقریباً" ہر گھر میں ہوتی تھیں۔ زمیندار حضرات اپنی مال مویشی گاؤں میں چھوڑ دیتے۔ جہاں وہ مفت کی گھاس چرتے۔ ان مویشیوں کے پیدا ہونے والے بچوں پر قاعدے کی رو سے مالکن اور ملازمین کا برابر کا حق ہوتا۔ آدھے بچے رکھوالوں کی ملکیت پہ جاتے اور باقی آدھے مالکن کی امانت کے طور پر پالے جاتے' عام طور پر جو بچھڑا مر جاتا وہ مالکن کے کھاتے میں جاتا۔ زمینداروں کے ملازمین کی بھی ہر صبح دودھ کے حصے پر چخ چخ ہوتی۔ زمیندار اور مزارع اپنے اپنے حصے کے پورے بے ایمان تھے۔ وہ اس قدر صلح جو تھی کہ ہر صبح کو جھگڑے سے شروع کرنے پر منع کرتی اور ماں سے جواباً "کمر پر گھونسہ کھاتی۔

صبح سے شام تک ان مویشیوں کی دیکھ بھال اور چارہ کی کٹائی کر کے شام کو کھانا پکا کر وہ چھوٹے بہن بھائیوں کو کھانا کھلا کر سلاتی اور سادگی سے ماں سے مار کھاتی اور بھولپن سے پوچھتی "تھک گئی ہوتا" جب تک اس کی ماں سو نہ جاتی منع کرنے کے باوجود اس کا بدن دباتی رہتی۔

اسے اپنے اس کچے پکے اینٹ مٹی کے گھر سے بے حد پیار تھا۔ اینٹوں کے فرش پر بہن بھائیوں کے درمیان بیٹھی کھانا کھاتی' وہ اپنے حصے کا سالن بہن بھائیوں کے لیے چھوڑ دیتی۔ ارشاد بڑے بڑے نوالوں میں بے رحمی سے زیادہ سے زیادہ سالن سمیٹ لیتا۔ چھوٹے والے نواز کو صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت تھی نہ دستور۔

وہ خلوص دل سے پکارتی۔ "ابا... ابا۔"

اس کا باپ جھلا جاتا "بات کر۔ کیا ابا ابا؟"

گڑ کی ڈلی پر دانت مارتی' وہ اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیتی۔ "ابا گڑ کھائے گا؟"

وہ اماں ابا کا نام ایسے پکارتی جیسے گڑ کی ساری مٹھاس اس کے منہ میں بھر گئی ہو۔ اور جواباً "سر پر تھپڑ کھا کر بھی خجالت سے مسکراتی۔ ضرور اس سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔

www.pkdigest.com

جب ارشاد بارہ سال کا ہوا' اور قاعدے کے مطابق اسے شہر بھیجا جانے لگا تو اس نے چھوٹے بھائی کو بڑا دلاسہ دیا۔ جن جن گھروں سے یہ کھیپ تیار کر کے باہر بھیجی جاتی مقدر ان کے بھی نہیں بدلتے تھے۔

جوں ہی بڑا بیٹا کام یا ہنر کی تلاش میں باہر بھیجا جاتا۔ گھر میں ایک اور بچہ پیدا ہو جاتا۔ گاؤں میں شاید ہی کوئی بھوکا ہوتا ہو لیکن بے کار پھرتے ننگے پاؤں دندناتے بچے سیکھنے کی خاطر نزدیکی شہر میں کسی ٹائروں کی دکان پر درزی کے پاس یا چائے والے کے کھوکھے پر بھرتی کر دیے جاتے۔ گریس اور تیل سے لتھڑے کپڑوں میں کچی نیند سے جاگ کر جمائیاں لیتے' وہ سب سے پہلے اٹھائے جاتے اور سب سے آخر میں سوتے جہاں ان کا بچپن دم توڑ دیتا۔ ایسے بچوں کو کام کا معاوضہ برائے نام ہی دیا جاتا' اور دیا بھی صرف لڑکے کے باپ کو جاتا۔ لڑکوں کے ہاتھ میں پیسہ نہ دیا جاتا کہ وہ بگڑ نہ جائیں۔ اپنی کسی خواہش کو مارتے مارتے جب وہ منہ زور ہونے لگتی تو ان کو پیسوں میں ہیر پھیر کرنا بھی آ جاتا۔ پھر وہ آئس کریم یا برگر بھی انہیں کسی خفیہ کونے میں جا کر کھانا پڑتا۔ ان کی خوراک برائے نام ہی ہوتی۔ بچے شاذ ہی گھر آتے۔ لاڈلے ہوتے تو نکال دیے جاتے' ورنہ چکی کے پاٹوں کے بیچ ساری عمر پستے۔

زمین داروں کی حویلیاں اور مکانات بھی بستی کے ایک کونے میں تھے۔ لیکن عموماً" خالی پڑے رہتے۔ ان کے مکانات ان کے سر چڑھے نوکروں کے قبضے میں تھے' جو ایک طرف مالکوں کا خون چوستے دوسری طرف کسانوں کی زندگی عذاب میں ڈالے رکھتے۔ گاؤں کی لڑکیاں باہر کم ہی بھیجی جاتی تھیں اور اگر بھیجی بھی جائیں تو اپنے علاقے کے واقفین اعزاء کے حوالے کی جاتیں۔ کیونکہ وہ تیوری چڑھائے بغیر ایک جن کے مساوی کام کرتی تھیں۔ وہ بھی منہ اندھیرے اٹھنے کی عادی ہوتی ہیں۔ سارا دن کام کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہیں۔

اتفاق سے شہر سے گاؤں دیکھنے امیر لڑکیاں آئیں۔ وہ نامانوس زبان بولتی تھیں اور ہر چیز پر منہ کھول کر حیرت کا

اظہار کرتی تھیں۔ کنویں میں جھانک کر خوف زدہ چیخیں مارتیں۔ رہٹ کے ڈونگوں میں پانی سے کھیلتی۔ ڈر ڈر کر بھینسوں سے چھیڑ چھاڑ کرتیں۔ وہ تین دن حویلی میں ٹھہریں۔ اتفاق سے پروین کے حصے میں یہ ذمے داری آئی کہ وہ ان کا دھیان رکھے۔ ان کو گاؤں کے کھانے پکا کر کھلائے۔ اور یہ تماشا دکھائے کہ کیسے تندور میں جھک کر روٹی لگائی جاتی ہے (تندور میں گرے بغیر) شام کو ان کے بستر وغیرہ کرے اور ان سے گپیں لگا کر گھر واپس آ جائے۔

جب اگلی دفعہ اللہ وسایا چائے کے کھوکھے سے ارشاد کے پیسے لایا اور واپسی پر یونہی زمین داروں کی شہر والی حویلی میں سلام کرنے چلا گیا تو بڑی خوشی کی خبر ساتھ لایا۔ لڑکیوں نے واپسی پر پروین کی بہت تعریف کی تھی زمین داروں کے گھر ان کی بیٹی کی شادی تھی اور پروین بیٹی کی سہیلی بھی بن گئی تھی۔ لہٰذا ان دو تین ماہ میں جب تک گھر میں شادی کا کام تھا انہیں پروین کی ضرورت تھی۔ جواباً "انہوں نے وعدہ کیا تھا جب پروین کی شادی ہوگی اس کا سارا خرچ خود اٹھائیں گے۔ انہوں نے ایڈوانس معاوضہ بھی دیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں نوٹ ہی نوٹ تھے۔ پروین کی ماں نے جو ابتدا میں احتجاج کیا بھی تھا وہ نوٹ دیکھ کر دم توڑ گیا۔

گھر چھوڑنے کے تصور سے پروین ہراساں ہو گئی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا' یہ وقت اس پر بھی آئے گا۔ احتجاج اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ لیکن کئی دفعہ اس نے کونوں کھدروں میں چھپ کر اپنے میلے دوپٹے سے آنسو خشک کیے۔ در و دیوار کو حسرت ناک نظروں سے دیکھا اور بہت دکھ سے سوچا' ماں کی ٹانگیں کون دبائے گا۔ ابا کا حقہ کسی کو تیار کرنا نہیں آتا ابا اس کے سوا کسی کے ہاتھ کی چائے نہیں پیتا۔ بلکہ ہر کام کے لیے اسی کو آواز دیتا ہے اور وہ خود بھی اس گھر سے الگ رہ کر کیسے زندہ رہے گی۔ غربت اور لاعلمی کے باوجود وہ گھر کو ایک یونٹ رکھنا چاہتی تھی۔

"ابا... ابا۔" اس نے آواز میں گڑ کی مٹھاس پیدا کرنا چاہی لیکن وہ حلق ہی میں کہیں گھٹ کر رہ گئی۔ یہ لوگ میرے بغیر کیسے رہیں گے۔ کون اتنے دن ان کا دھیان کرے گا۔

"دل لگا کر کام کرنا' اچھا بہت تعریف کی ہے تمہاری چھوٹی بی بی نے۔ ان کو شکایت نہ ہو' ورنہ وہ واپس بھیج دیں گی۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے وہ پورا جہیز بنا کر دیں گی۔" آخری دفعہ اس نے ماں سے کہا۔

"سن لیا نا... ماں باپ کا کچھ احساس کرو۔ سارا بوجھ ہم پر ہی آ پڑا ہے۔"

ماں کے پہلو سے اسے کھینچ کر الگ کیا گیا اور تقریباً" گھسیٹتے ہوئے لے جائی گئی۔

"سارا دن لڑتے تھے مجھے تنگ کرتے تھے الگ الگ رہو گے تو سمجھ لگے گی۔" ماں نے روہانسی آواز میں کہا۔

مائیں عموماً" وہ بات کہتی ہیں' جو دل کی آواز نہیں ہوتی۔ دل کی آواز پر لبیک کہنا انہوں نے صدیوں سے چھوڑ دیا تھا۔ سب بہن بھائی اسے گڈے میں بیٹھ کر اینٹوں والی سڑک تک چھوڑنے گئے۔ اینٹوں والی سڑک پر صاحب کی گاڑی کا ڈرائیور اس کا منتظر تھا۔ وہ اور ابا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا۔ وہ پلٹ پلٹ کر دیکھتی تھی اور ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی تھی۔ لیکن گاڑی گڈے کی طرح دیر تک نظر نہیں آ سکتی' وہ ناپختہ سڑک پر ہچکولے کھاتی نظر سے اوجھل ہو گئی۔

کھانے کے وقت چھوٹے والے نے منہ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ آپا کے ہاتھ سے روٹی کھائے گا۔ ماں نے اس کی آواز سے آواز ملا کر روتے اور دونوں ہاتھوں سے کوٹتے اسے کہا۔

"کم بختو! روٹی کے لیے تو گئی ہے۔"

کتنے ہی دن گھر تو کیا سارا گاؤں ویران ہو گیا۔ اس کے بہن بھائی اس کی سہیلیاں افسوس کرتے رہے بیٹی اس طرح بھیج دیے جانے پر طعنہ زن بھی جمع ہوئے۔

"اپنے ہی لوگ ہیں۔ اعتبار والے ہیں۔ ان ہی کا نمک تو کھاتے ہیں۔" وہ بے اعتبار سے لہجے میں کہتی۔

لیکن جب گھر میں برکت نظر آئی اور کبھی گوشت بھی پکنے لگا جس کی سب سے اچھی بوٹی اللہ وسایا کو ملتی رہی تو انہوں نے اس کے بغیر دل لگا لیا۔ اس کا اپنا بھی وہاں دل لگ رہا تھا یا نہیں۔ اور دل کا لگنا کوئی ضروری چیز ہے بھی یا نہیں۔ یہ سوالات اہم نہیں تھے۔

ایک دفعہ وہ دن بھر کے لیے آئی بھی۔ سب اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس نے سارے گاؤں سے اچھے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کا جوتا ثابت تھا۔ اس کا سر دھلا ہوا تھا اور وہ ایسی بہت سی چیزیں گھر والوں کے لیے لے کر آئی جو بڑی بی بی نے بطور تحفہ اس کے گھر والوں کو بھیجی تھیں۔ بہت سے پرانے کپڑے۔ جو پرانے ہو کر بھی نئے تھے۔ جوتے۔ ایک پرانا ٹی وی بھی (لیکن ان کے گھر ابھی بجلی نہیں لگی تھی)

گھر والے چیزوں کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھتے رہے اور وہ گھر کے بکھرے وجود کو سمیٹتی رہی۔ شام سے پہلے وہ واپس ہو گئی۔ وہ چار مہینوں کی تو بات تھی بس لیکن پھر آہستہ آہستہ کام بڑھنے لگا اور اس کی واپسی کا وقفہ طول پکڑتا گیا۔

اگلی دفعہ جب باپ اسے لینے گیا تو اس نے اعلان کیا کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ شادی سر پر آگئی ہے اب وہ کچھ دن نہیں آسکتی۔ جب ماں بستر پر لیٹی اور اس کی ٹانگوں میں درد بڑھا تو اس نے پکا فیصلہ کر لیا شادی ختم ہوتے ہی وہ اس کو واپس لے آئے گی اور دوبارہ کبھی اس کو خود سے الگ نہیں کرے گی۔ لیکن ہوا یوں کہ جب باپ شہر گیا تو گھر میں شادی ہو رہی تھی اس کو اور ارشاد کو پیٹ بھر روٹی تو ملی لیکن اس ہنگامے اور مصروفیت میں پروین سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اگلی دفعہ پھر وہ اس سے ملے بغیر واپس ہوا کہ پروین چھوٹی کے ساتھ رخصت ہو کر لاہور گئی تھی۔ گھر شروع کرنے میں کچھ پیسوں کی مدد درکار تھی۔ انہوں نے اس کو لاہور پہنچانے سے انکار کر دیا۔ کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی۔ پھر چند ہی روز کی تو بات تھی۔

جیٹھ اساڑھ گزرے۔ ساون بھادوں بیتے۔ آخری دفعہ وہ پانچویں مہینے آئی تھی اور روتی گئی تھی یہ نواں چل رہا تھا۔ اب اس کو یہاں سے گئے سال سے اوپر ہو چکا تھا۔

ارشاد بھی تین ماہ سے نہیں آیا تھا۔ ماں نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ عجیب نحوست تھی وہ صبح اٹھ کر رونا ڈال دیتی اور چار جوتے کی مار کھا کر بھی چپ نہ ہوتی۔ باپ نے پھر عاجز آکر پلہ جھاڑ کر سر پر رکھا۔ آتے جاتے سارا دن لگ جاتا تھا۔

پہلے وہ ارشاد کے پاس گیا۔ وہ ذرا نزدیک رہتا تھا' وہ جب وہاں پہنچا تو سارے ورکرز چھولوں کی پلیٹ پہ جھکے مولیوں اور پیاز کے ٹکڑے پلیٹ میں رکھے اخبار کے کاغذ میں لپٹی روٹیوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے اس کو بھی کھانے میں شریک کر لیا پھر وہ چائے والے کے پاس کاؤنٹر پہ جا بیٹھا۔ میٹھی شہد دودھ پتی کے سڑپے بھرتے اس نے بیزاری سے بیوی کی شکایت کی۔

ئی اسنال والا شہر کی فضا سے مانوس تھا۔ اس کا ماتھا ٹھنکا۔ کہانی اتنی بھی سادہ نہیں جیسی اللہ وسایا کو لگ رہی تھی۔ ارشاد ایک گول ٹرے میں بارہ پیالیوں کا مینار بنا کر سامنے والی مارکیٹ میں چائے تقسیم کرنے گیا اور جب واپس آیا تو ابا اس کا انتظار کیے بغیر جا چکا تھا۔

"چلا گیا ابا؟" اس نے برکت ئی اسنال والے برکت صاحب سے لاپروائی سے پوچھا۔

"ہاں تمہاری بہن کئی ماہ سے واپس نہیں آئی۔ میں نے اس کو سمجھایا ہے لالچ میں نہ آنا اور اس کو واپس لیے بغیر گھر بھی نہ جانا۔" اس نے برکت صاحب کے چہرے پر فکر مندی دیکھی تو خود اس کو تشویش لاحق ہوئی۔

"بے ایمان فراڈیے۔" برکت صاحب بڑبڑائے "ہمارا خون چوستے ہیں۔"

اگلے دو تین دن ابا ساہیوال۔ ریتالہ خورد کے چکر لگاتا رہا۔ ان کے گھر گاؤں والے گھروں کی طرح خالی پڑے تھے۔

وہ صرف شادی کے لیے یہاں آئے اور اب لاہور کے گھروں میں واپس جا چکے تھے۔ منشی نے اللہ وسایا کے اصرار پر کچھ رقم دی اس کو مارا پیٹا۔ لیکن پروین کہاں تھی اس کے بارے میں منہ نہیں کھولا۔ وہ رات اس نے نوکروں کے ساتھ کالی بھی روتے کبھی خوشامد کرتے لیکن وہ اتنا ہی جانتے تھے جتنا ان کو بتایا گیا تھا۔ اس کی خوشامد پر بھی نہ اس کو لاہور والے گھر کا پتہ دیا گیا نہ فون پر اس کی بیٹی سے بات ہو سکی۔ صبح وہ بے کھائے پیے ہی اور غصے میں ان کے پیسے ان کے منہ پر مار کر اس نے واپسی سفر کا قصد کیا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے اور نہیں جانتا تھا ایسے موقعوں پر کیا کیا جاتا ہے۔ ملازمین میں سے کسی ایک نے اس کے کان میں کہا تھا۔

"چپ کر جاؤ۔ کسی دن تمہاری بیٹی واپس آ ہی جائے گی۔ زیادہ شور کیا تو اس کو قتل کر دیں گے۔ تم گاؤں کے رہنے والے ہو، تمہیں ان کے اثر و رسوخ کا نہیں پتا۔"

☼ ☼ ☼

وہ پچھلے تین دن سے اس راہداری پر آ بیٹھی تھی، جو دھول اڑاتی گاؤں تک ڈھلوان کی شکل میں اترتی تھی۔ اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا اور باپ کو بھی اس فیصلے پر متفق کر لیا تھا۔ اس کو یقین تھا وہ جب بھی واپس آیا۔ پروین اس کے ساتھ ہو گی۔

تندور میں درخت کی سوکھی ٹہنیاں ٹھونس کر آگ دکھاتے "آٹا گوندھتے" روٹی بڑھاتے اس کی نظریں راستے پر جمی رہتیں۔ دور سے دھندلا اور کہرے میں اس نے دیکھا۔ کوئی شخص لڑکھڑاتا قدم بڑھا رہا تھا۔

یہ کون ہے۔ کہیں اللہ وسایا تو نہیں۔ اس نے تشویش سے سوچا۔

کتنی دیر وہ ساکت نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ نڈھال تھا اور تنہا واپس آ رہا تھا۔

روٹی گدی سے پھسل کر جلتے تنور میں جا گری۔

پھر ان کی زندگی پولیس تھانہ کچہری۔ رسالہ خورد و ساہیوال کے چکروں میں گزرنے لگی۔ ساری رات روتے اور دن بھر پیروں فقیروں کے چکر کاٹتے اور تعویذ گنڈوں کی جستجو میں رہی سہی رقم اڑاتے گزرتا۔ اسے موجود بچوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے روٹی کھائی یا نہیں۔ مولوی صاحب کے پاس سبق پڑھنے گئے یا نہیں۔ گاؤں بھر کی عورتیں اس کے صحن میں جمع ہو کر اسی کو طعنہ و تشنیع کرتیں کہ پیسے کے لالچ میں اس نے اپنی بیٹی کی عزت کا پاس بھی نہیں کیا۔ غم کے ساتھ طنز کے تیر بھی وہی کھاتی۔ باپ کو کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔

ایک روز شام پڑے اکبر بادشاہ از خود ان کے صحن میں بچھی کھاٹ پر آ بیٹھا۔ گھر میں مستقل ماتم کی فضا تھی۔ وہ بچی کو جہاں چھوڑ کر آئے اب وہ وہاں نہیں تھی۔ پھر وہ کہاں تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اکبر اندازہ کر سکتا تھا۔ لیکن اپنے اندازوں کی بھینٹ وہ اس دکھی گھر کو نہیں چڑھا سکتا تھا۔

"آپ میرے ساتھ لاہور چلیں۔" باپ کے بجائے اس نے ماں پر بھروسا کرنا مناسب جانا تھا۔ "میں وہاں کچھ ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ وہاں کچھ اور بھی ایسے طریقے ہیں کہ لڑکی کا پتہ لگانا مشکل نہیں رہے گا۔"

ماں نے اعتبار تو نہیں کیا۔ شہر میں خدا کوئی اور ہوتا ہے کیا؟

ماں مایوس تھی۔ بیٹی مر گئی ہوتی تو رو پیٹ کر صبر کر لیتی۔ تعویذ گنڈے پیر فقیر اس نے کہاں کہاں کی ٹھوکریں نہیں کھائی تھیں اور اب یہ شہری بابو ایک نئی کہانی لے کر آیا تھا۔ اسے آس کا ٹمٹماتا دیا بھی نظر آتا تو وہ اس روشنی کی لکیر کی طرف دوڑ پڑتی تھی۔ ہر نئی جگہ جاتے اسے لگتا وہ یہاں سے اپنی بیٹی لے کر ہی پلٹے گی۔

وہ اس کے ساتھ ریتیرے پر بیٹھ کر پکی سڑک سے ذیلی سڑک پر آیا۔ تانگہ سے لاری اڈے اور لاری اڈے سے

لاہور سارا راستہ وہ اس کو سناتا آیا جب وہ لاہور تھے۔ جب طالب علم تھے تو کیا کام کیا کرتے تھے۔ سوشل ویلفیئر۔ Missing Persons وہ پھر ترجمہ کرتا وہ لوگ جو اچانک گم ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہاں گئے۔

"تو تو ان کو ڈھونڈ لاتا تھا؟" وہ خوشی سے گنگ ہو گئی۔

"نہیں۔" اس نے شرمندگی سے کہا۔ "ڈھونڈ کے کہاں سے لاتا۔ ہم ان کا ریکارڈ رکھتے تھے۔ یعنی کس خاندان کے لوگ تھے کیا کرتے تھے۔ کب سے گم ہیں۔ یہ معلومات اکٹھی کرتے تھے۔"

"یہ سب تو مجھے خود پتہ ہے۔ ان باتوں کا فائدہ۔"

"کبھی کبھی پتہ بھی چل جاتا گمشدہ آدمی کہاں ہے۔ لیکن ہمیشہ نہیں۔"

"اگر گمشدہ آدمی زندہ نہ ہو تو یہ بھی پتہ چل جاتا ہے؟"

اکبر کے دل میں خوف کی لہری اٹھی۔ وہ ماں تھی کیا پوچھ رہی تھی اس کو اندازہ تھا۔

"ہم لوگ اصل میں ظلم سہنے کے عادی ہیں۔ ہم پر ظلم کیا جائے تو رو دھو لیتے ہیں لیکن ظالم کے خلاف اٹھنے کی ہمت نہیں کرتے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا دن رات کی جدوجہد کے بعد ہم لڑکی ڈھونڈ کر لائے اور اس نے کورٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا یہ میرے ماں باپ نہیں۔ وکیل جج عدالت سب کے سب ظالم کے ساتھ ہوتے ہیں۔"

اس کی تقریر کے کچھ حصے اس کی سمجھ میں آئے لیکن کچھ بالکل نہیں۔ لیکن وہ جو کچھ کہتا گیا وہ سنتی گئی۔ وہ ان کے علاقے کا واحد پڑھا لکھا تھا اور جہاں لے جاتا گیا، اس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ وہ اسے ایک ایسے گھر لے گیا جو بہت بڑا تھا۔ بڑے گھر سے آنے والی آمدنی کے لالچ میں اس نے اپنی بیٹی گنوا دی تھی۔ اس نے حقارت سے گھر کی اونچائی کی طرف دیکھا۔

گھر کے باہر دربان کھڑا تھا۔ اندر کتے بھونک رہے تھے۔ دھان کے کھیتوں کی طرح سرسبز لہلہاتا گھاس۔ ایک بے حد حسین لیکن سخت چہرے والی عورت لوگوں میں گھری کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ انگریزی زبان بول رہی تھی اس لیے اس کے پلے تو کچھ نہیں پڑا۔ اکبر نے اسے سمجھایا۔ ہمیں اپنی باری کا انتظار کرنا ہو گا۔ آج کل شہروں میں وکیلوں کی ایک تحریک چل رہی ہے۔ جمعرات کے جمعرات وہ کالے کوٹ پہن کر جلوس نکالتے ہیں۔ یہ بہت مخلص لوگ ہیں۔ ایک بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔

یہاں سے ایک اور تحریک بھی شروع ہو رہی ہے۔ یہ جو نعرے مار رہے ہیں کہہ رہے ہیں "گو مشرف گو" اس کا مطلب ہے مشرف یہاں سے چلا جائے۔ اب ہمیں مخلص اور ایمان دار حکومت چاہیے۔

یہ صدر کو ہٹا کر نیا نظام لانا چاہتے ہیں۔

وہ سوچ میں گم ہو گئی۔

بیٹی کا گم ہو جانا شاید صدر ہٹانے سے چھوٹا کام ہو۔

لیکن اس کا دل نہیں مانا۔

یہاں آ کر اسے پھر سے یقین ہو چلا تھا اب اس کی بیٹی مل جائے گی۔ ایک دفعہ مل جائے تو وہ اسے سمجھا دے گی۔ وہ دو روٹیوں کے بجائے ایک سے بھی پیٹ بھر لے گی۔ باقی سب ضدی بچوں کے مقابلے میں وہ ویسے بھی کہنا ماننے والی صابر ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اس کا چہرہ آتا۔ جب اس نے اس کو آخری بار دیکھا تھا، وہ روتی جاتی تھی اور خوشامد کرتی تھی۔ اسے مت بھیجو۔ لیکن باپ نے نہ صرف اس کو مارا، بلکہ گھسیٹ کر روانہ کر دیا۔ وہ صاحبوں کا چمچہ ہے۔ انہیں خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ بدلے میں اپنے پیٹ کا جہنم بھرتا ہے۔ ہائے میری بیٹی!"

صبح سے سفر کرتے کرتے وہ نڈھال ہو گئی تھی۔ وہیں فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھتے دھاڑیں مار کر رونے لگی، سمجھانے بجھانے کے باوجود اس کا بھرم ختم ہو گیا تھا۔ اس نے پلو پسار کر بلند آواز میں فریاد شروع کر دی، اچانک

www.pkdigest.com

لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ خاتون چوکنی ہو گئی۔

صحافی، عملہ، اسسٹنٹ۔

غم زدہ عورت فرش پر بیٹھی بلند آواز میں بین کر رہی تھی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

لیکن سیاست دانوں اور صحافیوں کا گروہ اس کی طرف لپکا تھا' خاتون کا گھر تھا۔ وہ سب کو ہٹا کر جگہ بنا کر سامنے آ گئی۔

اہم کام آ گیا تھا۔ کام جو اس کی زندگی کا اصل مقصد تھا۔

"اکبر! یہ تمہارے ساتھ ہے؟"

"جی' آپ فارغ ہو لیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔" اس نے سکون سے کہا۔

"نہیں مسئلہ کیا ہے بتاؤ۔"

اس نے وہیں کھڑے کھڑے مختصراً" جو کچھ اس کو علم تھا' اور جو کچھ اس کو وہاں جانے سے پہلے اور اس کے بعد کا علم تھا۔ اس نے بیان کر دیا۔

لڑکی کا نام پروین۔

باپ کا نام اللہ وسایا۔

ماں کا نام نسیمہ بی بی۔

ایک نئی فائل تیار ہو گئی۔ پروین بی بی' بنت نسیمہ بی بی زوجہ اللہ وسایا تحصیل رسالہ خورد ضلع ساہیوال موزوں گ ب 18-72

"پریشان نہ ہو بی بی۔" اس نے پیار سے کہا۔ "لڑکی مل جائے گی۔"

"نسیمہ بی بی کو آرام سے ٹھہراؤ۔ کھانا کھلاؤ' اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔" مگر پریشان کیسے نہ ہو۔

"کوئی تصویر ہے اس کی؟"

"ایک تصویر تو ہے لیکن گھر پر ہے۔" اس نے خود سے شرمندہ ہو کر سوچا' وہ ہمیشہ ادھورے کام کرتی ہے آج تصویر ساتھ لائی ہوتی تو پروین کو ساتھ لے کر ہی جاتی۔

"اچھا اگلی دفعہ آؤ تو تصویر ساتھ لے کر آنا۔"

پھر وہ لوگ اکبر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اکبر ان کو معلومات فراہم کر رہا تھا۔

زمین دار Absentee (غیر حاضر) لینڈ لارڈ۔ لڑکی کام پر ساہیوال بھیجی گئی۔ ساہیوال سے بیان دیا گیا وہ رسالہ خورد بھیج دی گئی ہے۔ رسالہ خورد والے کہتے ہیں' وہ لاہور والے گھر میں رہتی تھی۔ لاہور والے کہتے ہیں وہ ایک دن یہاں سے خود بخود چلی گئی۔ کیا لاہور والوں نے اس کی F.I.R برائے گمشدگی لکھوائی۔ وہ اٹھارہ سال سے کم عمر تھی دیہاتیوں کو عمر کا کیا پتہ۔ وہ قانونی طور پر بالغ ہے۔ کم از کم اتنے بیانات تو ہوں جتنے لوگ ہیں۔

زمین دار صاحب ضلع کونسل کے بجائے صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑنا چاہتے ہیں۔ حالات ایسے تھے کہ الیکشن اب دور نہیں رہے۔

پھر وہ نسیمہ بی بی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "تم بے فکر رہو۔ ہم لڑکی ڈھونڈ نکالیں گے۔" خاتون بے حد خوش تھیں۔ زمیندار دشمن کی پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑا ہو رہا تھا اور ایک کمال اسٹنٹ ان کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

انہوں نے بڑے جوش میں اکبر سے کہا "کس قسم کے لوگ ہماری پارلیمنٹ میں آ جاتے ہیں۔ صرف جاگیرداری ہے ان کے پاس۔ یہ کیس ٹی وی پر آتے ہی ان کی کمپئن لے ڈوبے گا۔ میڈیا نے ٹھیک سے کوریج دی تو ضمانت ضبط سمجھو۔ پریس نوٹ تیار کرو۔" وہ اپنے عملے کی طرف پلٹیں۔

"اور تم کیا گاؤں جا کر بیٹھ گئے ہو۔ یہ کوئی آرام کا وقت ہے۔ سارے پاکستان کو تمہاری ضرورت ہے۔ یہی تو

www.pkdigest.com

وقت ہے وطن کے کام آنے کا۔ واپس آؤ اور اپنا کام سنبھالو۔"

الیکشن' میڈیا' سیٹ' ضمانت۔

گمشدہ لڑکی کا تو کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔

صحافی رخصت ہوئے۔ کمپیوٹر پر ٹک ٹک کرتا عملہ تیزی میں کچھ لکھتا اور پرنٹ آؤٹ نکالتا رہا۔

"مجھے پتا چلا ہے اکبر۔" انہوں نے قریب آ کر سرگوشی کی "لڑکی اپنی مرضی سے بھاگی ہے۔ اگر اس کی عمر واقعی 18 سال ہے اور اس نے عدالت میں تم لوگوں کے خلاف بیان دے دیا؟ ملک حکم داد کے لوگ تو خود بہت ناراض ہیں' وہ کہتے ہیں ہم نے ان کو شریف لوگ سمجھ کر کام دیا تھا یہ ہماری زندگی کے لیے عذاب بن گئے۔ کوشش کرنا رہے کیس بنے تاکہ ہماری سائیڈ مضبوط ہو۔"

صبح جب تسلی و تشفی کے ساتھ نسیمہ بی بی رخصت ہوئی تو اسے آس دلائی گئی تھی کہ شام تک وہ لوگ خود لڑکی کو گھر چھوڑ کر جائیں گے۔ وہ بڑی آسانی سے پرامید ہو جاتی تھی۔ لمحہ بھر کو اس نے اکبر سے پوچھا۔ "شام تک ہم یہیں سے اسے لے کر کیوں نہیں جا سکتے؟"

اکبر کے بجائے بی بی نے جواب دیا۔ "وہ جہاں لے کر گئے ہیں وہیں چھوڑ کر آئیں گے۔"

نسیمہ بی بی کو گھر پہنچنے کی بے چینی لگ گئی۔ وہ جب لاری میں بیٹھی اس کے ساتھ واپس آ رہی تھی تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا' جاتے وقت اکبر کا چہرہ پرامید تھا۔ واپسی پر اتنا مایوس کیوں؟ اب جبکہ سب حل ہو گیا تھا۔

ایک مدت بعد اس نے شوق سے چولہا جلایا۔ ہانڈی پر مٹی کی تازہ لیپ کی۔ ثابت مسور چڑھائے اور شام کا انتظار کرنے لگی۔ شام تک وہ اس کو لے کر آتے ہوں گے دروازے کی چوکھٹ پر ٹاٹ کا پردہ سرکا کر وہ ٹیک لگا کر بیٹھ رہی۔ پرندوں کے پروں پر جاتی دھوپ کی سنہری کرنیں تھیں۔ درختوں کے پیچھے سورج ڈوبا' موذن نے مسجد میں اذان کی آواز بلند کی اور امام صاحب اپنی جماعت لے کر مغرب پڑھانے نکلے' برگد کی چوٹیوں پر روشنی کی چمک آہستہ آہستہ ماند پڑتی گئی۔ بستی تاریکی میں ڈوب رہی تھی۔ لوگوں کے گھروں میں اکا دکا بلب جلے' جہاں بجلی نہیں تھی وہاں لالٹینوں کی چمک جگنوؤں کی طرح ٹمٹمانے لگی۔ دن ختم ہوا۔ شام ختم ہوئی۔ ایک اور انتظار ختم ہوا۔

مایوس ماں نے چوکھٹ پر پے در پے سر مارا اور بلند آواز سے رونے لگی۔

چھوٹے والے نے چپ چاپ ماں کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔ روٹی آج بھی نہیں ملے گی۔

ذرا ہی دیر میں وہ ننگے پاؤں دوڑتا گھر میں داخل ہوا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا بھاگتے بھاگتے بھی وہ پلٹ کر پیچھے اپنے تعاقب میں آنے والے لوگوں سے بچتا دوڑتا آ رہا تھا۔

"کون ہے باہر؟" ماں نے بے تابی سے پوچھا۔

وہ جواب دیے بغیر دوڑتا ہوا کوٹھری میں گھسا۔ چٹخنی سوراخ میں لگا کر اس نے خود کو اندر بند کر لیا۔ نسیمہ بی بی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے باہر اندھیرے میں جھانکا۔

مویشیوں کے باڑے کے پاس حویلی کے ملازمین غصے میں بھرے چھوٹے کو مارنے کو تیار تھے۔

اکبر ان کو روکے سکون سے پوچھ رہا تھا۔ "کیا ہوا؟"

انہوں نے چلا کر کہا۔ "اتنا بڑا پتھر اٹھا کر اس نے کھڑکی کے شیشے پہ مارا۔ شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ وہ تو اتفاق سے کمرے میں کوئی نہیں تھا' ورنہ سر پھٹ گیا ہوتا۔"

"افسوس!" اکبر نے گہرا سانس لیا۔ "وہ بس اتنا ہی انتقام لے پایا۔ ابھی ہمارے قرض باقی ہیں۔ چلے جاؤ۔ ورنہ ہم سب پتھر اٹھا کر تمہاری کھوپڑی پھاڑ دیں گے۔"

وہ بکتے بکتے واپس چلے گئے۔ اکبر چوکھٹ پہ نسیمہ بی بی کے پاس آ بیٹھا۔

"اندر چلی جاماں۔۔۔ انتظار فضول ہے۔" وہ کیا بولتا تھا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ لیکن اس کے لہجے کی سختی لوگوں کو خوف زدہ کر دیتی تھی۔ اس نے ماتھے سے کچھ گیلا گیلا پونچھا اور چپ چاپ اندر چلی گئی۔

پھر اس نے زمین دار کو چھوڑ کر بی بی کے گھر کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ گو اس دن کے بعد اس کو کبھی اس دروازے سے پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں ہوئی نہ ہی بی بی کا دیدار۔ وہ کسی نہ کسی کام سے کہیں گئی ہوئی ہوتی تھیں۔ وہ اکبر سے کہتی میں انتظار کروں گی۔ سرونٹ کوارٹر کی قطار میں سے کسی ایک گھر میں اس کو چھوڑ کر وہ چلا جاتا۔ اس نے بھی نسیمہ بی بی کی طرح اپنی جدوجہد ختم نہیں کی تھی۔ پھر جب وہ دونوں مایوس ہوتے تو پلٹ آتے۔ ان ڈیڑھ دو سالوں میں وہ ادھ موئی ہو گئی تھی۔ لوگ اپنے ساتھ افواہوں کے ٹوکرے لے کر آتے۔ کسی نے پروین کو لیلیٰ میں دیکھا تھا۔ لاہور میں امیر لوگوں کا ایک بازار ہے (اس کو سمجھایا جاتا) وہاں وہ ریشمی کپڑوں اور زیورات میں بیگم بنی گھوم رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا لیکن پہچانا بھی نہیں۔

کوئی اطلاع لاتا۔ وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔ اس کا رنگ کالا سیاہ ہو گیا ہے اس کی گود میں چند ماہ کا بچہ بھی تھا۔ یہ اتفاقی ملاقاتی یہ ضرور کہتا کہ اس نے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ پہلی اطلاع پر بھی اور دوسری پر بھی یقین کر لیتی اور تڑپ تڑپ کر روتی۔

کتنے ہی چکر اس نے اکبر کے ساتھ پولیس اسٹیشن کے لگائے۔ لیکن وہ اتنی سی لڑکی کو بازیاب کرانے سے قاصر رہے۔ وہ گھر والوں کے اس بیان پر اصرار کرتے تھے کہ وہ کسی نوکر کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

نسیمہ بی بی سکتہ رسیدہ خورد موزوں گ۔ ب۔ جاہل ہونے کے باوجود اتنی احمق نہیں تھی کہ جملوں کی تہہ تک نہ پہنچ سکتی۔

جو رقم اس کو جہیز میں دینے کے لیے جوڑی تھی پائی پائی اس کی تلاش میں ختم ہو گئی۔ ماں دن رات باپ سے پٹتی تھی۔ بچے دہاڑیں مار کر روتے۔ کتنے کتنے دن گھر میں روٹی نہ پکتی وہ آدھی رات کو اٹھ کر پاگلوں کی طرح دروازے کی طرف دوڑتی۔ باپ غم سے ادھ موا ہو تا تو بیوی کی دھنائی کر کے غم دور کرتا۔ اس دن بھی وہ روز کی طرح پٹی لیکن جیسے اس کا ضبط ختم ہو گیا۔

"میں اپنی پروین کو لے کر واپس نہ آئی تو میرا مرا منہ دیکھو۔"

بھوں بھوں روتے اس نے گٹھڑی بنائی۔ اس میں کچھ سامان ٹھونسا۔ گٹھڑی اور چادر سر پر ڈالی اور چھوٹی والی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

میڈیا جوش میں آگیا۔ یہ کیس نسیمہ بی بی کیس کہلاتا تھا اور اس کی وجہ شہرت سارہ حق تھیں۔ دن میں جتنی مرتبہ خبرنامہ نشر ہوتا ٹی وی پوری تفصیل سے ساری کہانی سناتا اور اس بات پر واویلا مچاتا کہ حکومت ابھی تک لڑکی کو تلاش نہیں کر سکی۔ حکومت چاروں طرف سے گھری ہوئی تھی۔ گمشدہ لوگوں کے لیے بدنام۔ پھر کیمرہ پلٹ کر سارہ حق پر آجاتا۔ جو حکومت پر گرجتی برستی۔ اس ملک میں ہونے والی ناانصافیوں کی تفصیل بیان کرتیں۔ میڈیا نے سارہ حق کی مدد سے ساری ریسرچ خود ہی کر ڈالی۔ لائبریری فائل میں وہ گھر دکھایا جاتا جہاں اس کا باپ اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ گھر کس کا تھا۔ علاقے کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ اس کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ساری تاریخ ضروری و غیر ضروری میڈیا نے کھنگال ڈالی تھی۔

ماں کی موت سے صرف چھٹے دن پروین بی بی برآمد کر لی گئی۔ جب سارہ حق اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر اس نے صحافیوں کے چبھتے ہوئے سوالوں کے جواب دیے تو حکومتی اراکین چکرا گئے۔ بدنام کرنے کی

سازش کی جارہی ہے۔ لڑکی جھوٹی ہے۔ لیکن جھوٹی لڑکی ان دو سالوں میں جو کچھ اس پر گزری، سر جھکائے آنکھیں نیچے کیے ایسے بیان کرتی رہی جیسے یہ سب اس پر نہیں کسی اور پر گزری تھی۔ کبھی آنکھیں اٹھاتی تو پھٹی پھٹی وحشت زدہ بے رنگ آنکھیں خلاؤں میں دیکھتی۔ کون سے لفظ بولنے چاہئیں۔ کہاں چپ رہنا چاہیے۔ کس جگہ سر سری گزر جانا چاہیے۔ وہ ان سب سے ماورا ہو چکی تھی۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی ایک قطار میں اس کی کرسی کے پیچھے کھڑے حیرت سے کیمرہ اور چکا چوند کر دینے والی روشنیوں کو گردن گھما گھما کر دیکھ رہے تھے۔ ان کو اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ وہ سب مل کر اپنی ماں کو روسکیں۔

زمین دار پکڑا گیا۔ کتنے دن جیل رہا۔ رہا بھی کہ نہیں یہاں تاریخ خاموش ہے۔ البتہ اس کو اپنی پارٹی سے ٹکٹ نہیں مل سکا۔ سارہ حق کو شہرت نے آسمان پر پہنچا دیا۔ دن رات کیمرے ان کے گرد ہوتے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک غرور بھرے وقار کے ساتھ آگے آگے چلتیں، جب بھی کہیں کسی عورت کے ساتھ زیادتی ہوتی ان کی ماہرانہ رائے ضرور لی جاتی۔ عورتوں کے حقوق کے لیے ان کا نام مستند ٹھہرا۔ غیر ملکی چینل سے ان کے انٹرویو نشر ہوئے۔ جہاں وہ امریکن لہجے میں کڑک کر بتاتیں "یہ صرف ایک ہی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ پاکستان میں ایسے واقعات بھرے پڑے ہیں۔ حکومت دانستہ خاموش رہتی ہے کیونکہ ظالم حکمرانوں کی پناہ میں پلتے ہیں۔ یہاں کسی غریب کو جینے کا حق نہیں۔ ہم بے حس قوم ہیں۔"

انڈین نیوز نے پاکستان میں ہونے والے ایسے واقعات کو خوب ہی اچھالا اور بار بار یاد دلایا اگر پاکستان نہ بنا ہوتا تو انڈیا میں رہتے لوگوں کے ساتھ ایسی زیادتیاں نہ ہوتیں۔ انڈین ٹی وی پر نظر آنے کے شوق میں مبصرین اور ماہرین کے منہ میں جو آیا بکتے گئے۔

سارہ حق نے ساری دنیا کا چکر لگایا۔ ہر فورم پر اپنی مخصوص گھن گرج سے پاکستان میں ہونے والے واقعات کھول کر بیان کیے۔ یہاں کی عورت غلام ہے۔ تعلیم سے محروم۔ اپنے حقوق سے بے خبر۔ قیدی عورت ہے۔ جاگیرداری نظام میں ایسے کھیلوں کو قانونی پناہ حاصل ہے۔ پاکستان میں کسی کو انصاف نہیں ملتا۔

"UTube" پر بڑے بڑے دردناک کیپشن کے ساتھ یہ ویڈیو چلتی رہی اور امید کی آخری کرن صرف سارہ حق رہ گئیں۔

دنیا میں ایسے شور ہوا جیسے لونڈیاں صرف پاکستان میں رہتی ہیں۔ ان کے ملکوں میں تو عورتیں راج کرتی ہیں۔

سارہ حق نامور ہو گئیں۔

پاکستان بدنام ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

رضا منسٹری سے نکلا تو جھنجھلایا ہوا تھا۔ این او سی کے حصول کے لیے یہ اس کا اسلام آباد کا تیسرا چکر تھا۔ گو اسلام آباد لاہور سے برسوں کی مسافت پر نہیں تھا، لیکن جب آپ کسی ایسے کام پر نکلیں جس کے مکمل ہونے کے کوئی امکانات نہ ہوں تو یہ مختصر سفر بھی طویل لگنے لگتے ہیں۔ جب وہ فون کر کے پتہ کرتا تو معلوم ہوتا اس کے کاغذات تیار پڑے ہیں، وہ جب چاہے آکر وصول کر سکتا ہے اور جب وہ بھاگم بھاگ کبھی کار سے، کبھی Daewoo سے اور بسا اوقات خوف ناک حد تک مہنگی ایئر لائن سے اسلام آباد پہنچتا تو پتہ چلتا۔ کاغذ تو مکمل ہی ہیں بس اور اس بس کے بعد کبھی نہ حل ہونے والے مسئلوں کی ایک اور قطار کھڑی ہوتی۔

منسٹری کو کسی کام کے لیے کسی کی جلدی کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ ان کے اپنے مسائل ختم ہونے میں نہیں آتے۔ ان سے بات کرو تو اپنی مصروفیت کی ایک طویل داستان آپ کو سننے کو ملے گی۔ صبح منہ اندھیرے اٹھ کر

انہوں نے دفتر کا کیا کیا کام کیا اور رات بارہ بجے جب وہ گھر لوٹے تو ان کی بیوی نے کیسے سواگت کیا۔ اٹھارہ گھنٹے کام۔ بیس گھنٹے کام۔

(حیرت ہے پاکستان میں اتنے گھنٹے مسلسل کام ہوتا ہے اور وہ پھر بھی ترقی نہیں کر سکا؟) ہر وقت کوئی نہ کوئی VIP کہیں نہ کہیں جانے کو تیار کھڑا ہوتا ہے اور اس کا جانا اس قدر ایمرجنسی میں ہوتا ہے کہ منسٹری کا پورا عملہ صرف ایک شخص کو جہاز میں بٹھانے کے لیے مصروف عمل رہتا ہے۔ ملک میں شہری کم ہیں VIP زیادہ ہیں۔ لہٰذا شہریوں کے کام کی طرف کون متوجہ ہوتا ہے۔ اس کو اگلے ماہ کے پہلے ہفتے ریاض میں ہونا تھا۔ ایک تو سعودیوں کا عجیب بے پروا انداز۔ اس پر پاکستان کا محکمہ۔

"آپ فائل چھوڑ جائیں۔" سیکشن آفیسر نے اسی بے نیازی سے کہا تھا۔ جو فیڈرل گورنمنٹ کا پروونس کے ملازمین کے ساتھ ہتک آمیز رویہ رہا تھا۔ کم تر درجے کے افسر۔

اس نے بڑبڑا کر کہا۔ "یہاں عام آدمی کے ساتھ کیا حشر ہوتا ہوگا۔"

"تو گویا آپ خاص آدمی ہیں۔" کسی نے شانت لہجے میں مگر بڑی دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"میرا مطلب۔" وہ بجائے اس کے کہ مداخلت بے جا پر اس پر چڑھ دوڑتا، خود سے شرمندہ ہو گیا۔

"میری کوئی بیک گراؤنڈ ہے۔ میری ڈگری ہے۔ میرا ایک محکمہ ہے جس نے مجھے یقین دلا رکھا ہے میں افسر ہوں۔ جو میری بیک پر کھڑا ہے۔ ایک اجنبی انجان آدمی تو یہاں آکر پاگل ہو جاتا ہوگا۔"

"شکر ہے آپ نے کہا میری ڈگری ہے۔ آپ نے پڑھے لکھے ہونے کا دعوا نہیں کیا۔ اصل میں یہاں کوئی بھی خادم نہیں۔ سب کسی نہ کسی کے افسر ہیں۔ مسئلہ کیا ہے بائی دے وے۔"

"سعودی عرب آئل فیلڈز میں ایک چھوٹا سا کورس ہے۔ دس دن کا۔ جب تک وہ کورس ختم نہ ہو جائے میں محکمانہ الجھنوں سے نکل نہیں سکتا۔"

"بلاشبہ۔۔۔ آپ حق پر ہیں تو آپ کو طویل انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر کام وقت پر کروانا ہے تو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ سفارش۔۔۔ اور سفارش نہیں ہے تو رشوت۔ یہاں رشوت کو پیسہ کہتے ہیں۔ آپ کی فائل میز پر پڑی پڑی سڑ جائے گی لیکن کبھی ایک جگہ سے دوسری میز تک نہیں پہنچے گی، آپ پیسے دے جائیں تو فائل کو پہیے لگ جائیں گے۔ ہم نے اخلاقی جرائم کے بھی پیار کے نام رکھ دیے ہیں Pet names۔"

"کام اصل میں سیکشن آفیسرز اور کلرک کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جانتے ہیں دفتر ان کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ ابھی کسی نے سیکشن آفیسر کو بلا کر آرڈر کیا "ان کے لیٹر ٹائپ کرو۔" اس نے مؤدبانہ کہا۔ "وہ تو ابھی دو منٹ میں ہوا جاتا ہے جناب! لیکن ان کی فائل میں کچھ سقم ہے۔ امگریشن والے ان کو ایئرپورٹ پر ہی روک لیں گے۔ ہم جواب دہی کرتے پھریں گے۔"

پھر "کچھ سقم" کی اس نے اتنی تفصیل اور باریک بینی سے نکات بیان کیے کہ ایڈیشنل سیکرٹری کا سر گھوم گیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ میرے ساتھ مل کر کلرکوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اس کے بعد ہراساں میری فائل ہاتھ میں تھامے۔

"واقعی آپ کا انکم ٹیکس ریٹرن نہیں لگا ہوا۔"

"آپ کی بینک اسٹیٹ منٹ کہاں ہے۔ آفس کا نو آبجیکشن سرٹیفکیٹ بھی موجود نہیں۔ اپنے Documents تو پورے کریں نا۔"

"اصل میں ہمارے آفیسرز کام نہیں جانتے۔ ان کو کلرکوں پر تکیہ کرنا پڑتا ہے اور کلرک بڑی آسانی سے کام کو الجھا دیتے ہیں۔ ان کے گورکھ دھندے سے آپ نکل کر تو دکھائیں۔"

www.pklegest.com

"لیکن یہ ہمارا ملک ہے۔ ہمیں اس سے گلے ہیں، جو اپنوں سے ہوتے ہیں۔ اتنی خرابیوں کے باوجود بھی اسے چھوڑ کر نہیں جایا جا سکتا۔ کہاں جائیں، کیوں جائیں۔"

"ہاں سسٹم کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ گلے رہنے ہی میں لگا رہنا چاہیے۔"

وہ مسکرایا۔ "لفظوں سے کھیلتے ہو اور بڑے مانوس جملے بولتے ہو۔ ہماری تمہاری خوب نبھے گی۔"

اگلے دو گھنٹوں میں کہ اس کی بینک Statement کا فیکس آ گیا۔ انہوں نے لاؤنج میں بیٹھ کر سارا نظام ساری سیاست ساری بیوروکریسی کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ "اس ملک کی اصل خرابی بار بار فوج کا آنا ہے۔ وہ جب آتی ہے ہم اس کو سیلوٹ کرتے ہیں۔ وہ جب تک موجود رہتی ہے ہم اس کے کارناموں کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں۔ وہ نکال دی جاتی ہے تو پھر اس کو یاد کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ سیاسی حکمرانوں کو ہم مہینوں میں اڑا دیتے ہیں۔"

"لیکن ہمارے سیاسی حکمران چور بازاری بھی بڑی مچاتے ہیں۔"

"وہ نہیں مچاتے؟ اوجھڑی کیمپ نے جہاں پنڈی اسلام آباد کے سینکڑوں لوگ مار دیے، وہاں ان کو ارب پتی بنا دیا۔ فرق صرف اتنا ہے وہ بندوق لے کر آتے ہیں۔ ایک طبقہ پیدا کرتے ہیں، جو سیاست دان کہلاتا ہے۔ الیکشن جیت کر آتا ہے اور فوجی حکمرانوں کے گن گاتا ہے۔ وہ کیا کسی کے نمائندہ ہوں گے، جو اپنے مفاد کے لیے حکومت کرتے ہوں۔"

"یہ بتاؤ اس جنرل نے آزاد ٹی وی کیوں دیا۔"

"شاید اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کے گلے کاٹیں گے۔ ہر سیاسی جماعت دوسرے کی کردار کشی کرے گی۔ سو وہ بچ نکلے گا۔"

"اور چیف جسٹس بحال ہو جائیں گے۔"

وہ ان کی بحالی کے لیے دلائل دینے لگا۔ وہی کہی سنی باتیں جن کو دہرا کر ہم مطمئن ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگلا بھی نہ مجبور ہے نہ بحالی کا فیصلہ کرنے میں مختار۔

پھر انہوں نے اپنی اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کو درمیان میں گھسیٹا۔ اس اس website پر بحث کی، جہاں سے انہوں نے انفارمیشن لی تھیں۔ کسی زمانے میں اخبار کی خبر مستند مانی جاتی تھی۔ اب لوگ سچائی کا دعوا کرتے ہیں تو Site کا حوالہ دیتے ہیں۔

رضا نے سوچا۔ پتہ نہیں ہم ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یا ایک دوسرے کو جان رہے ہیں۔ لیکن آدمی بہرکیف دلچسپ ہے۔ جو سوچتا ہے سکون سے کہہ دیتا ہے۔ تلخ بات کہہ اور سن کر بھی اس کے چہرے پر ایک اطمینان رہتا ہے۔

"کسی جگہ پیدا ہونے سے زمین آپ کی ملکیت نہیں بنتی۔ سو وہ تب ہی آپ کی ہوتی ہے، جب آپ اس سے پیار کرتے ہیں۔ ہمارا وطن نظام الدین اولیاء کی دیگ ہے۔ جو آتا ہے کھاتا ہے خوش قسمتی سے دیگ پھر بھی خالی نہیں ہوئی۔"

پاس سے گزرتے کسی شخص نے بیزاری سے مکالمہ سنا۔ ٹی وی نے ہر کمرے کو نیوز روم بنا ڈالا ہے۔ جہاں چار جوان اکٹھے ہوں، سیاست شروع ہو جاتی ہے۔ حالانکہ کم بخت سیاست کی اسپیلنگ ہی نہیں جانتے۔

"ساحر صاحب کہتے ہیں مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے، سو وہ بستیاں اور پھر ویران ہو جاتے ہیں جہاں لوگ بھوکے ہوں۔"

"انڈیا سے زیادہ بھوک کہاں ہوگی۔ سو بنیا قوم ہے۔ بھوک بھی بیچ کر کھا لیتے ہیں۔"

باتیں، باتیں محض لفاظی حتی نسل میٹریلسٹک لوگ۔ پاس سے گزرتا گزر کر چلا گیا۔

وہ جب ایک دوسرے سے الگ ہوئے اور اپنے اپنے راستوں پر پلٹے تو جیسے برسوں پرانے دوست تھے۔ باوجود موبائل نمبر ایکسچینج کرنے کے انہوں نے وعدہ نہیں کیا کہ ایک دوسرے سے ملتے رہا کریں گے۔ لیکن ان کے مقناطیسی حلقہ ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔ کچھ لوگ ملتے ہیں ان سے شعاعیں پھوٹتی ہیں جو آپ کو خیرہ کر دیتی ہیں۔

وہ دوسرے وزٹ پر اسلام آباد آیا تو اس کا خیال تھا اس سے مل کر جائے گا۔ فون کیا تو وہ کسی میٹنگ میں تھا۔ اس نے کہا شام کو آئے گا۔ شام کو خود اس کی اپنی کوئی مصروفیت تھی۔ علاوہ ازیں اس کو NOC مل گیا تھا اور کورس شروع ہونے میں بہت دن باقی نہیں تھے۔ لہٰذا باقی کا وقت اس کو تلاش کرنے کے بجائے اس نے اپنے ٹریول ایجنٹ کے ساتھ گزارا اور ٹھیک پانچ دن بعد وہ جدہ کے لیے فلائی کر گیا۔

چونکہ عثمان کی واپسی ہو چکی تھی لہٰذا اب اس کی باری بنتی تھی۔ عمرہ کے دوران کس کس کے لیے کون کون سی دعا منگوانی ہے وہ اپنے موبائل کے Note pad پر لکھتا جاتا اور کس کس کو کیا چاہیے To do کی لسٹ میں 'زندگی کتنی عجیب ہو گئی ہے اماں نے دعائیں لکھواتے سوچا' گھڑی جیبی ڈائری 'جنتری' قلم' کاغذ سب غیر اہم ہو گئے اس پانچ انچ لمبے کالے ڈبے میں سب کچھ بند ہے۔ شاید ایک نسل ایسی آئے جسے پین ہاتھ میں پکڑنا بھی نہ آتا ہو۔ مگر اس سے کچھ فرق پڑے گا کیا؟

تنویر سے ملنے اور اس کو اطلاع دینے وہ بطور خاص ان کے گھر گیا۔ معلوم نہیں کیوں وہ وہاں جانے سے بہت کتراتا تھا۔ لیکن آپائی کا اصرار تھا اور وہ ٹال نہیں سکا۔

وہ جتنی دیر ان کے گھر بیٹھا۔ وہ کسی نہ کسی کام میں الجھی نظر آئی۔ باورچی خانے کے دروازے سے اس کی مصروف کمر مستقل حرکت میں تھی۔ ساس کے لیے انار چھیل کر رس نکالتی۔ چھان کر نمک چھڑک کر وہ ایک اکلوتا گلاس ٹرے میں سجا کر ان کے درمیان آ بیٹھی۔

شوہر کے لیے سیب کی قاشیں بناتی چھلکے اور بیج نکال کر پھانک پھانک اس کو تھماتی۔

"بھائی کو چائے کا تو پوچھو۔" ساس نے اچھی تربیت نہ ہونے پر جیسے واضح بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ اس نے ایک پھانک رضا کو تھماتے مشینی انداز میں پوچھا۔

"تم چائے پیو گے رضا؟" جیسے کوئی پروگرام فیڈ کر دیا جاتا ہے مشین کسی جذبے کے بغیر لفظ اگلتی رہتی ہے' رضا کو ہمیشہ لگتا تھا وہ جب کسی چیز کی آفر دیتی ہے تو اس کے بدبداتے ہونٹ دعا کر رہے ہوتے ہیں۔ کاش! وہ انکار کر دے اور کاش! اس کے میکے والوں کو اچانک کوئی ایسا کام آپڑے کہ وہ آناً فاناً اٹھ کر روانہ ہو جائیں۔

"نہیں' بس اب میں چلوں۔"

"ارے نہیں ایسے کیسے چلوں؟" ساس تڑپ کر اٹھیں "ہمارے ہاں بے کھائے پیے بھیجنے کا رواج نہیں۔ یہ تو اپنی اپنی تربیت ہوتی ہے بھئی۔" پھر ایک ٹھنڈی آہ۔

"اسماء!" انہوں نے دروازوں کے اس طرف کچھ دکھائی نہ دینے والے حصے میں کسی وجود کو پکارا۔

"بھئی یہ تمہاری بھائی کے بھائی آئے ہیں۔ کچھ لے کر آؤ۔"

"آپ کیا کھائیں گے؟" وہ جن کی طرح ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ نمودار ہوئی۔

"کچھ نہیں بی بی۔" اس نے بیزاری سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔

"نہیں میں آپ کے لیے جوس نکال کر لاتی ہوں۔" وہ اس کو ٹھنک کر بولتے دیکھ کر ٹھٹک گیا' واری صدقے ہوتی اس کی ماں' دیوانہ وار نثار ہوتا اس کا بھائی۔ وہ زمانہ شناس انسان تھا دنیا کو اس نے بہت غور سے دیکھا تھا۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم کو کچھ منگوانا ہے تنویر۔ کل شام میری فلائٹ ہے۔"

"اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔" تنویر کے بجائے اس کے شوہر نے تڑپ کر کہا۔

"عیش کرتی ہے۔ آپ کی بہن بڑی خوش نصیب ہے۔"

اس نے خوش نصیب عورت کے حساں نصیب چہرے کی طرف دیکھا اور شوہر کی طرف پلٹ گیا۔

"آپ کو کچھ منگوانا ہے اگر آپ خوش نصیب نہیں ہیں تو؟" وہ مسکرایا۔

"میں تو ہر وقت جاتا رہتا ہوں۔ میرے پاسپورٹ تو ویزوں کی Endosment سے بھرے پڑے ہیں۔"

مرغے کے بانگ دینے سے پہلے کی طرح اس نے سینہ پھلایا اور کلغی اکڑائی "جرنلسٹ ہونے کا یہی تو فائدہ ہے۔"

سب سے بڑی فرمائشی لسٹ خوش نصیب کی ساس نے ہی لکھوائی اور اس کی ترتیب بھی کچھ آپس میں میل نہیں کھاتی تھی۔

امام السیدس کی قرآن کی سی ڈی۔ سونے کی چین جس میں آیت الکرسی' کا پینڈنٹ ہو۔ عجوہ کھجوریں۔ ایک جی شوک گھڑی۔ ایک فوڈ سپلیمنٹ ان کے گھٹنوں کے لیے انہوں نے احتیاطاً" یہ بھی بتایا کہ یہ کوئی میڈیسن نہیں جو Prescription پر ملے۔ ایسے ہی مل جاتی ہے۔

جوں جوں ان کی لسٹ بڑھتی جا رہی تھی تنویر کا رنگ پھیکا ہو رہا تھا۔ ان کا خیال تھا وہ کورس پر نہیں شاہ کا مہمان خصوصی بننے جا رہا ہو۔

وہ گھر سے نکل رہا تھا تو اس نے سنا۔ اس کی ساس غصے سے کہہ رہی تھیں "کھوتا ہی ہے تو بھی' وہ تجھے لگا کر بات کر کے گیا اور تجھے سمجھ ہی نہیں لگی۔"

اور یہ بھی عجیب بات تھی وہ دو ہفتوں بعد براستہ دوبئی پلٹا تو ساس کی ساری لسٹ اس کے ڈیوٹی فری شاپ والے تھیلے میں بھری تھی۔ پلاسٹک کے جس بیگ پر قطرینہ کیف کی شکل بنی تھی۔

"ارے واہ!" عنبر نے تھیلا بلند کیا "ان کی فلم انڈسٹری تو ابیسی کا کام کرتی ہے۔"

"اس میں کیا ہے؟" حمیرا نے اندر جھانکا۔

"تمہارے لیے نہیں ہے۔" اس نے جھپٹ کر لفافہ تنویر کو تھما دیا۔

"یہ تمہاری ساس کے لیے ہے۔"

اس کے چہرے پر خجالت سی آ گئی۔

"تم خود کیوں نہیں دے دیتے۔"

"نہیں وہ میری کیا لگتی ہیں۔ یہ چیزیں میں ان کی نہیں۔ تمہاری خاطر لایا ہوں۔" اس نے اکھڑے لہجے میں کہا۔

"ان کو گنوا دینا۔ سب کچھ ہے۔ اور ہاں میں نے ایک دفعہ تم سے کچھ کہا تھا۔ یاد ہے نا؟"

اس کا رنگ اڑ گیا۔ کتنی دیر وہ چپ رہی۔

"مجھے بھی کچھ کہنا ہے رضا! نعیم کی امی نے پوچھا ہے میں اسماء کے سلسلے میں تمہاری خواہش معلوم کروں۔ ان کا خیال ہے میں تم سے یہ منوا سکتی ہوں۔"

باقی آئندہ شمارے میں

www.pkdigest.com

رفعت ناہید سجاد

چراغ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی تجزیے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادی اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر، عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی ورک سینٹر کے ذریعے روزگار کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا چاہتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیر اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی تمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ

www.pkdigest.com

صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔
گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اہل خانہ کے ساتھ بطور رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔
عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ تائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔
ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کو نا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کرکے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔
ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جس کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۷
ساتویں قسط

فورٹریس سے خرید ایک اس نے احتیاط سے پچھلی سیٹ پر رکھا پھر سیدھا جا کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ سبز رنگ کے چمکتے ہندسے بتاتے تھے وہ پانچ سے بہت پہلے ماڈل ٹاؤن پہنچ جائے گی۔ سلور رنگ کے چمکتے دلوں والے ریپر میں اس نے بڑے قرینے سے ڈبہ پیک کیا تھا۔ سلیقہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ نہ اضافی اسکاچ ٹیپ کی بھرمار نہ فالتو کاغذ۔ نئی گاڑی کی مخصوص خوشبو پر حاوی ہلکی مہک والا اسپرے جو اس نے اے سی کے Vent کے سامنے ایک ہلکی سی پھوار کی شکل میں گرایا تھا فضا میں رچا بسا ہوا تھا۔
"واپسی کب ہوگی؟" ڈیڈی نے اس کو پورچ سے نکلتے دیکھ کر ٹوکا تھا۔
پچھلے دنوں میں یہ پہلی دفعہ نہیں تھا کہ ان کو شک ہوا۔ وہ ماڈل ٹاؤن جارہی ہے اور انہوں نے اس کو روک کر کوئی سنجیدہ سوال نہ کیا ہو ورنہ تو کیچنگ جاتے بھی یہ سوال انہوں نے نہیں کیا۔ وہ اس کو جتا دینا چاہتے تھے اور وہ بھی بھی اتنی احمق نہیں تھی کہ ان کے ڈھکے چھپے لفظوں کے معنی نہ سمجھتی۔ اپنی تمام تر آزادی اور خود مختاری کے باوجود وہ بھی ان کی حکم عدولی کی جرات نہیں کرسکی۔ اس کو کپڑے پہننے کی آزادی تھی، وہ آف سلیوس پہنے اسکن ٹائٹ جینز چڑھائے اپنی مرضی سے دوست بنائے، پیسوں سے کسی کی مدد کرنی ہے تو جی کھول کر کرے (اور کھل کر اس کی تشہیر بھی) ان کی عین ناک کے نیچے جس سے مرضی افیر چلائے، ان افیرز سے وہ چشم پوشی کرسکتے تھے لیکن اس سے آگے نہیں۔
وہ اس کو ڈی کلاس ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ وہ جس گھر کے پیچھے لپک کر جارہی تھی، انہوں نے سنا تھا اس سارے گھر کی کل قیمت اس کے استعمال میں آنے والے غسل خانے سے بھی کم تر تھی۔ انہوں نے اس کی ریشمی گاڑی کو اپنی Ray Ben کے عقب سے جھانکتے سوچا۔ یہ اس گھر کی طرف لپکی جارہی ہے جو اس کے Waste سے بھی حقیر تر ہے۔

کیا ہے اس کی بیک گراؤنڈ، ایک ماسٹر کا بیٹا بس۔ سب پڑھانے والے ان کے نزدیک ماسٹر تھے اور ماسٹر کوئی عزت چیز نہیں۔ سنا ہے آج کل ان کو انیس بیس گریڈ بھی دیے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ ماسٹروں کو کون گریڈ دیتا ہے۔
انہوں نے پلٹ کر اپنے سیکورٹی گارڈ کی طرف دیکھا۔ "بے بی پر نظر رکھنی ہے۔" ان کی آواز بڑبڑاہٹ سے زیادہ نہیں تھی جو دانتوں میں پس کر رہ گئی تھی۔
"یس سر!"
"اور مجھے رپورٹ کرنی ہے۔"
"یس سر!"
اس نے ٹوکیو سے لائی سیاہ رنگ کی سی ڈی جو اس نے استاد رئیس خان کے البم کے خود لی تھی، پلیئر میں لی۔ فورٹریس کی طرف مڑتے اس نے سوچا۔ آج جانے کا ارادہ کینسل کردے یا چلی جائے لیکن شاید اس کو پس نہیں جانا چاہیے، اس کو مقابلہ کرنا ہوگا، اپنے حق کے لیے جنگ لڑنی ہوگی۔
اس نے ایک بار بھی ہتھیار ڈال دیے تو اس سے بڑے میدان میں اسلحہ پھینک کر ہاتھ کھڑا کرکے شکست کو ماننا ہوگا۔ ابھی تو اس کو یہ بھی نہیں پتا شک کی یہ فضا پیدا کرتے اس کا باپ الکحل سے آزاد تھا یا نہیں۔
اس کو بات کہنے کی عادت ہے، دنیا کو اس کے حکم پر رک جانا پڑتا ہے۔ اس کی بیک پر ایک عظیم الجثہ جاگیر ہے جس میں عرصہ گزرنے کے بعد پلاٹوں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ ہر پانچ سال بعد ایک نیا پلاٹ پھر وہ فوجی حکومت میں بھی رہا۔ علاوہ ازیں جب بھی فوجی ٹولہ حکمران بنتا ہے، ایک سیاسی جماعت ضرور تشکیل دیتا ہے اور قسمت سے بیٹا اس کا نام مسلم لیگ رکھا جاتا ہے جس میں شہری اور سابق جنرل سب ہی اکٹھے ہوجاتے ہیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ ستاروں کا آنگن،	نسیم سحر قریشی	قیمت: 400 روپے
☆ درد کی منزل،	رضیہ جمیل	قیمت: 180 روپے
☆ اے وقت گواہی دے،	راحت جبیں	قیمت: 350 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت،	شازیہ چودھری	قیمت: 200 روپے
☆ امر بیل،	عمیرہ احمد	قیمت: 450 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر
شائع ہوگئے ہیں

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 2216361

سو جب نئے جرنیل نے نیا مارشل لاء لگایا تو اس کے پاس وزارت کا پورٹ فولیو بھی آگیا۔ سو سونے پر کئی قسم کے سہاگے تھے۔ جس سے اس کے کپڑوں کے ساتھ گردن کے کلف میں بھی اضافہ ہو گیا۔

وہ اس وزنی بیگ کے ساتھ بیک یارڈ کے لان میں اتری تو موجود لوگوں نے دیکھا، باوجود قابو پانے کے اس کا چہرہ اترا اترا تھا۔

"ثریا بیگم! اچھے کی امید رکھیے۔" عثمان نے لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور محاورہ پھینک کر ہنس دی۔

"اپنی طرف سے تو میں بڑی جلدی آئی تھی لیکن یہاں تو سب ہی مجھ سے پہلے موجود ہیں۔" اس نے چہرے پر بشاشت بکھیری۔ "اور ابھی میں کیا کیا چیز ہے دیکھنے کو؟"

"یہ جمال صاحب ہیں، اپنے رضا بھائی ہیں، عبیو اور حمیرا ہیں، ہماری آپا آئی ہیں۔"

"اس کا مطلب سب اچھا ہے، گویا تم ریڈیو پاکستان ہو۔" رضا نے فیصلہ سنایا۔

"اور بی بی! آپ نے کتنی چینی جاپانی سیکھی۔ سی ہاؤ کے علاوہ۔" جمال نے پوچھا۔

وہ ڈیڑھ ماہ پاکستان سے باہر رہی تھی۔ کسی ٹروپ کے ساتھ بیجنگ سے ہوتی وہ ٹوکیو گئی۔ یہ ساری مراعات بھی اس کو اپنے ابا کے اونچے شملے کے طفیل نصیب ہوئی تھیں۔ اس کا استقبال بھی اس طرح ہوا جیسے پردیس سے آئے اپنے سے کیا جاتا ہے۔ وہ اس سے ٹروپ کے ووکل اور ڈانسرز کے بارے میں تفصیلات طلب کرنے لگے۔ اس کو وہاں بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ پاکستان میں اچھے ڈانسرز کی شدید کمی تھی۔ اس پر چناؤ کا اختیار بھی اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ جس جس کو ممنون کرنا حکومت کے انٹرسٹ میں تھا، ان کو طائفے میں شامل کر لیا گیا لیکن جو آڈیشن میں کامیاب رہے لیکن گمنام آرٹسٹ تھے لسٹ سے خارج کر دیے گئے۔

ثریا کی جھنجلاہٹ اور احتجاج کسی کام نہیں آیا۔ وہ ووکل پر بنی تھی۔ یہ مہربانی بھی اس کے ابا کے نام سے ہی ہوئی۔ جو ایک دو اچھے آرٹسٹ اس نے اپنی مرضی سے زبردستی شامل کر لیے تھے۔ ایک دن پہلے جب پاسپورٹ اس کے حوالے کیے گئے تو اس میں وہ ایک دو بھی کوئی وجہ بتائے بغیر نکال دیے گئے تھے۔ ہم پیچھے رہ جانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے۔

"ابتدا سے بڑے ایکسپرٹ ڈانسرز آئے تھے، ان کے سامنے ہمارے لوگ جیسے کوتے اڑا رہے تھے۔ ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"آپ خود مقابلے میں فن کے بجائے سفارش لے کر گئے تھے پھر مقابلہ کیا ہوتا۔" حمیرا نے دبے انداز میں اپنا دفاع کیا۔

"اس پر انہوں نے اعلان کیا کہ ثریا مختار کی سربراہی میں جو ٹروپ گیا تھا، وہ بری طرح ناکام لوٹا ہے۔ شکست کی ذمہ داری ثریا مختار پر عائد ہوتی ہے۔"

اس شام گھاس پر رکھے اسپیکرز پودوں کے پیچھے سے ابھرتی ہلکی روشنی میں ایک نامانوس زبان میں موسیقی اگل رہے تھے۔ موسیقی کی کوئی زبان نہیں ہوتی، ابتدا میں اوپری اوپری لگتی ہے۔ چینی تھیٹر میں استعمال ہونے والے آلات اور لفظوں کے نہ سمجھ میں آنے والے سر۔ یہ بھی پتا نہیں چلتا کوئی اداس دھن ہے، انتظار ہے اور کون جانے چینی اس طرح خوشی مناتے ہوں۔

موسیقی کی لہروں سے آگے رکھی ٹرالی کے اوپر والے تختے چیز سے ڈھکے تازہ گری برف رنگت والے کیک کے ساتھ بہار دے رہے تھے۔ دہی بھلے، آلو چھولے، سموسے، تین تختوں کی ٹرالی کا انچ انچ رنگ برنگی چیزوں سے اٹا ہوا تھا۔ وہ عبیر اور حمیرا کے نزدیک بیٹھی لمبی تقریر کر رہی تھی۔ چین کیا تھا، ٹوکیو میں کیا دیکھا، چین سے آئے

pkdigest.com

لوگ وہاں کی ترقی کے بارے میں عجیب عجیب داستانیں بیان کرتے ہیں۔ وہ جنوں کی قوم ہے، عام مخلوق نہیں۔ لوگوں کے سوالات رضا کی طرف بھی پلٹ رہے تھے۔ عربی شیخ کیسے لوگ ہیں، وہاں کیا ہوتا ہے۔ چینی نسل اور ماڈرن عرب کے کلچر کا فرق۔ چین و عرب ہمارا۔ لوگ ان معلومات پر بڑی توجہ سے نظر جمائے تھے جو اس ملک کا پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ، میڈیا تک نہیں آنے دیتا۔

کسی وجہ کے بغیر عثمان نے خود کو اکتایا ہوا محسوس کیا۔ وہ جب داخل ہوئی اس کے چہرے پر ایسی اداسی تھی جس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ اس کو اپنی مایوسی کا اعلان کر دینا چاہیے۔ جس جنگ کو اس نے لڑے بغیر ہار دینا ہے اس کے لیے سامان حرب جمع کرنے کی کیا ضرورت۔

اس نے ٹرالی اپنے نزدیک کھینچی اور ڈھابے والوں کی طرح چائے دانی سے قدرے اوپر سے چائے مگ میں انڈیلنے لگا۔ چائے کی بھاپ ذرا دیر کو پیالی سے اوپر نظر آئی اور ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ بالکل ابن طلال کی طرح جو اس تقریر میں عدم دلچسپی کی وجہ سے ذرا دیر کو عثمان کے چہرے پر بیزاری سے برسا تھا اور ثریا کی نظروں سے بچ نہیں سکا تھا۔ اس نے لفظ روک کر اس کو چائے بناتے دیکھا۔ چار عورتوں کی موجودگی میں آخر اسے کیا ضرورت تھی چائے بنانے کی۔ زندگی خانوں میں تقسیم ہو تو زیادہ منظم لگتی ہے لیکن لوگ اس کو اپنی زندگی میں تبدیلی لانے کا نہ حق دیتے تھے نہ تبدیلی پسند کرتے تھے۔ ایسے لکیر کے فقیر لوگ ڈیڈی کو کیسے پسند آ سکتے ہیں۔ لمحہ بھر کو اس نے خود کو باپ کی طرف داری میں کھڑا محسوس کیا اور اسی ایک لمحے میں جمال نے اس کے چہرے پر آئی اکتاہٹ کو کیچ کیا۔ سو یہ یوں ہے! اس کی آنکھوں سے ڈیجیٹل کیمرہ نہ لگا ہوتا تو شاید یہ تاثر اس کی نظروں سے چوک جاتا۔

اس نے بٹن پریس کیے بغیر کیمرہ واپس نم آلود گھاس پر رکھ دیا۔ عثمان اور ثریا کے مابین ہلکا سا کھنچاؤ اس نے محسوس کیا۔ دل میں کبھی کی کچل دی گئی محرومی نے پھر سر اٹھایا۔

"کیوں؟ آخر کیوں؟ لوگ کیوں شروع کرتے ہیں وہ کہانی جس کو آخر تک لے جانے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ کس قدر غیر دلچسپ ہوتے ہیں یہ ادھورے قصے۔" بڑی بیزاری سے اس نے کرسی پر پہلو بدلا۔

ایک اور المیہ۔۔۔ وہ دونوں اس کے مقابل بہادر ہیں شاید وہ اس کو جھیل جائیں گے۔

لیکن اس المناک کہانی کی ہیروئن تو خود اپنی جگہ مظلوم نظر آتی تھی۔ وہ دوہرے دباؤ میں تھی۔ ایک طرف یہ قبیلہ تھا، گھاس پر چوکڑی مار کر بیٹھے، کٹے ہوئے بتوں کے ٹھنٹھ پر جمے۔ لان میں اترنے والی سیڑھیوں پر ایسے شان سے ایستادہ جیسے سادہ اینٹ سیمنٹ نہ ہو، سنگ سرخ ہو۔ کرسیاں تو خالی پڑی تھیں۔ اس نے عثمان کی بنائی ہوئی پیالیاں اٹھائیں اور ایک ایک کے حضور پیش کرنے لگی۔ وہ ان سے الگ تھلگ تھی پھر بھی کوئی دیوانہ وار کھینچتا ان کے درمیان لا بٹھاتا تھا۔ عبیرہ نے جیسے اپنا حق سمجھتے پیالی پکڑی۔ تھینک یو کہا اور یونیورسٹی کی اس تنظیم کا قصہ سنانے لگی جنہوں نے اس کی آزاد خیالی پر اس کو للکارا تھا۔ وہ لڑکوں کے درمیان بہت گھومتی ہیں ان دونوں کو اپنے رزلٹ سے کوئی اچھی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

وہ پیالی لے کر درخت کے تنے پر بیٹھی حمیرا کی طرف چلی۔ یہ سادگی نہیں، ثریا نے فیصلہ کیا، لاعلمی ہے، جہالت ہے۔ وہ ڈیڈی والی طرف بھی کھنچتی تھی۔ ان سب کے درمیان صرف ایک کی خاطر وہ ان سب کو برداشت کرتی تھی۔ حالانکہ وہ ایک بھی ان سے علیحدہ نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی کا فیصلہ آزادی سے لیکن تنہا کرنے کو اس نے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اتنے کمزور لوگ ہیں ایک دوسرے سے الگ جی بھی نہیں سکتے۔ جس حادثہ پیدائش یا اتفاق نے ان کو یکجا کر دیا اور وہ اس کو نبھائے چلے جا رہے ہیں، الگ ہو کر کوئی دنیا بسانے کا تصور انہیں خوفزدہ کرتا ہے۔ وہ جانتی تھی، وہ اٹھ کر اس کے ساتھ کبھی نہیں جائے گا۔ ہاں وہ اپنی دنیا چھوڑ کر ان کے درمیان آ بسے تو اسے خوش دلی سے قبول کر لیا جائے گا لیکن وہی قربانی کیوں دے، اس لیے کہ وہ عورت ہے یا اس لیے کہ اس کی گروپ کی کشش

www.pkdigest.com

اسے کھینچتی ہے۔ دونوں حالتوں میں وہ قصوروار نہیں۔

چائے کی پیالی سے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرتے اس نے سب کے ساتھ گھر میں بجنے والی ایک بیل سنی۔

"یہ کون ہے؟" حمیرا نے حیرت سے بلند آواز میں پوچھا۔

"بھلا یہ بھی کوئی کوئز ہے۔" ثریا اپنی جھنجلاہٹ سے نکلی نہیں تھی۔ "کوئی بھی ہو سکتا ہے۔"

"جب بیل بجتی ہے تو اصل میں ہمیں پتا ہوتا ہے یہ کس کی بیل ہے۔" حمیرا نے اسی رسان سے کہا۔

وہ اس کی جھنجلاہٹ سے ذرا بھی جز بز نہیں ہوئی تھی اور اس کے اسی رسان بھرے انداز نے اس کو مزید تپا دیا۔

"ہمیں۔۔۔ ہم سب۔۔۔"

وہ سب "ہم" ہیں، صرف ایک وہی "تم" ہے۔ آخر وہ اس کو کیا جتانا چاہتی ہے اور باقی لوگ اس کو ٹوکتے کیوں نہیں کہ وہ بھی ہم میں سے ہے۔ کم از کم عثمان کا احتجاج تو بنتا ہے لیکن شاید وہ بھی جانتی ہے اور سب بھی کہ وہ ان میں سے ایک نہیں۔

"کتنی کے تو لوگ ہیں جو اس دروازے پر دستک دیتے ہیں۔" حمیرا کا چہرہ کسی اندرونی خوشی سے ہر وقت دمکتا تھا۔

"دودھ والا ہے، پانی ملا کر لایا ہے، سڑک کا جمعدار کوڑا مانگ رہا ہے، ساتھ والوں کا ملازم میکرونی کا بھرتہ پکا کر لایا ہے، بی بی اٹالین فوڈ پکانا سیکھ رہی ہیں، ہمیں کھانا پڑتا ہے، اس میں ہمارا قصور بھی نہیں۔"

آپا نے ہنسی سے لال ہو کر دوپٹہ منہ میں ٹھونس لیا۔ (سب ہنس رہے تھے، بات ہنسی کی ہوگی نا!)

"کتنے نمک حرام لوگ ہو تم، کبھی خود بھی کچھ پکا کر بھیجنے کی زحمت کی ہے۔" رضا اٹھتے ہوئے بولا۔

"اور اس میں بھلا ہنسنے کی کیا بات۔" اس نے چڑ کر سوچا۔ "ان لوگوں کا حس مزاح بھی مایوس کن ہے۔"

اس کے باپ نے چہرے پر سختی لیے اس کو رخصت کیا تھا۔ وہ بڑی امید سے ان کے درمیان آئی تھی۔ بھانپ لیے جانے کے باوجود کسی نے اس کی دل جوئی نہیں کی تھی، اس نے بھی نہیں۔ وہ اپنی ذات کی دنیا آباد کیے شاداں و فرحاں بیٹھا تھا۔

"عبو بی بی! میری چائے برف ہو چکی ہے۔" جمال نے اپنی پیالی اسے پکڑاتے کہا۔ "ذرا زحمت کیجئے اور مائیکرو ویو میں ایک منٹ کے لیے گھما لائیے۔"

وہ کسی بھی سیکنڈ کی تاخیر کے بغیر اٹھی۔ جس مؤدب انداز میں مخاطب کی گئی تھی، اسی تعظیم سے جھکی اور اس کی پیالی لیے اندر چلی گئی۔ بہ مشکل ہٹا کر اس نے پرچ پیالی اوون میں ڈالی۔ اس کی ہدایت کے بموجب ایک منٹ کے لیے پروگرام کیا ہی تھا کہ اس کو لان سے آنے والی آوازوں میں ایک نئی آواز کا اضافہ سنائی دیا۔

"ایسا کون ہو سکتا ہے، جس کو رضا اندر لیے چلا آیا اور وہ بھی آج کے دن۔ دفتر کے ساتھیوں کو وہ گھر بھر میں نہیں لیے پھرتا۔" اس ایک منٹ کے بعد بجنے والی ٹن سے پہلے اس نے سنا، رضا تعارف کے مراحل میں تھا۔

جمال۔۔۔ ثریا۔۔۔ عثمان۔۔۔

وہ چائے کی گرم پیالی لیے باہر آئی اور اپنی جگہ جم سی گئی۔

"کوئی عجب نہیں۔" اس نے حمیرا کو کہتے سنا۔ "کسی دن بیل بجے اور بش ہمارے گھر آ جائے اور ہم سوچیں، آہ اس کو کہیں دیکھا ہے۔"

چونکہ جانے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں تھی، آپ کسی سے کہیں بھی مل سکتے ہیں۔

لیکن کیوں۔۔۔ وہ چائے کی پیالی تھامے لان میں اترنے والے برآمدے میں رکی کھڑی تھی۔ آنے والا کرسی پر

www.pkdigest.com

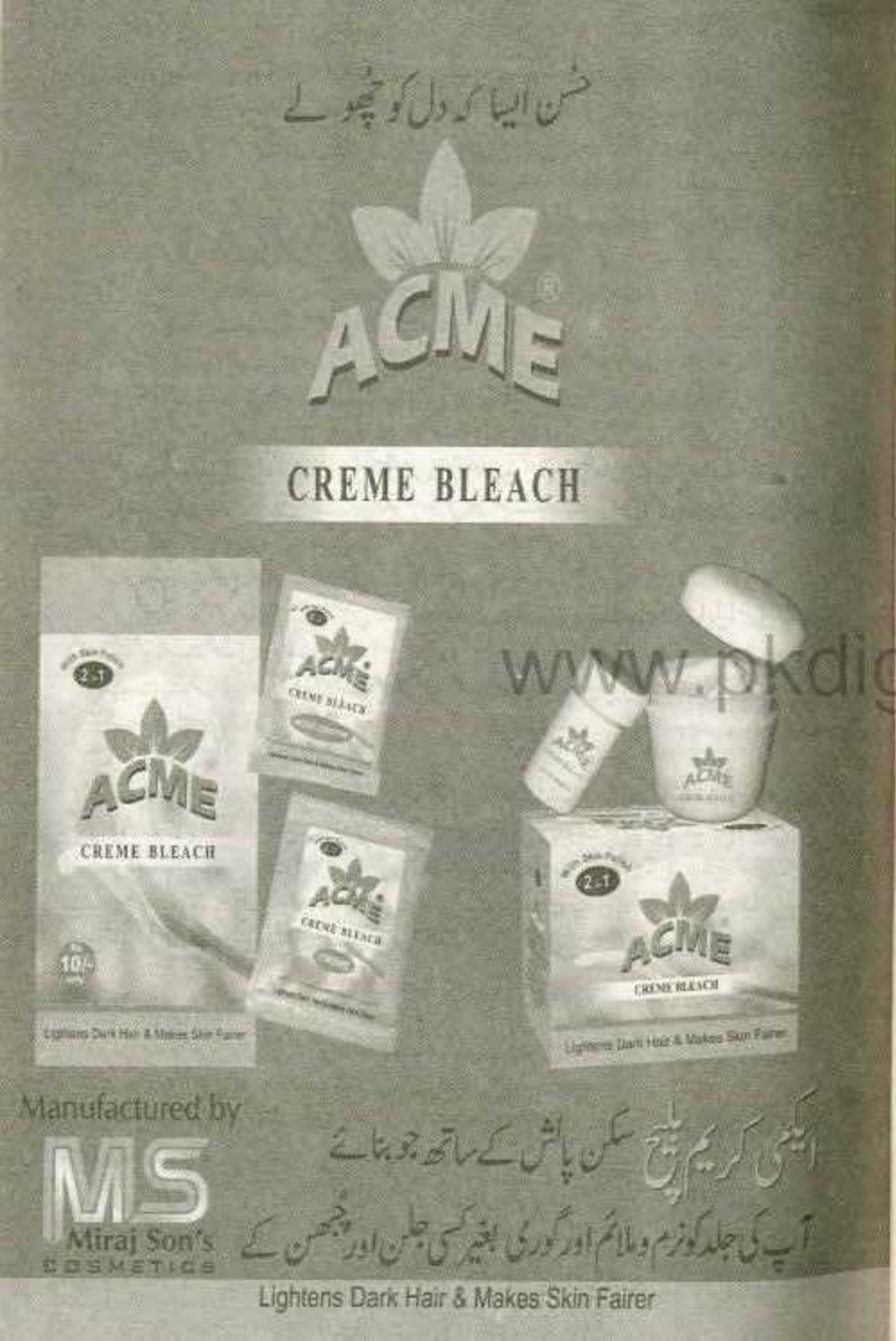

HRC 02-10 KD
AKS PROCESS
www.pkdigest.com

تقریباً "بیٹھ ہی رہا تھا کہ پھر سے احتراماً" کھڑا ہو گیا۔

"ہاں ہم لوگ ملے تھے' سارہ آپا کے ہاں۔" اس نے حمیرا کا آخری فقرہ سنا۔

"پھر تو دعا ہے کہ حوالہ خوشگوار ہی ہو' جہاں یہ دونوں ہوں' وہاں خیر کی خبریں عموماً" نہیں ہوتیں۔" عثمان نے اعلان کیا۔

"یہ اصل میں "سوشل ورکر" ہیں۔" رضا نے جتا کا انداز میں کہا۔ "سب سے ملتے ہیں' کام وام کچھ نہیں کرتے اور یہ جو بجلی کے کھمبے کی طرح کڑی کھڑی ہیں' یہ ہماری عبیرہ ہیں۔"

"پھر تو یہ کرنٹ بھی مارتی ہوں گی۔" آنے والا دوبارہ اطمینان سے اپنی کرسی پر بیٹھ رہا۔

"ہاں اگر گیلا ہاتھ لگ جائے تو۔" جمال نے مطلع کیا۔

"لیکن میں نے تو دستانے پہنے ہوئے ہیں۔" ہاتھ دکھاتے اس کا چہرہ بے حد معصوم تھا۔

"اس کا مطلب لوگ کسی کا لہو آپ کے ہاتھ پہ تلاش کر رہے ہیں۔" عثمان بھی درمیان میں کودا۔

"میں تو چکرا گیا ہوں' لگتا ہے کسی debating سوسائٹی میں چلا آیا ہوں۔"

"شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ بھانڈوں کی بستی میں چلا آیا ہوں۔ تمہارا چہرا کہاں ہے۔" رضا نے آواز دی۔

"آؤ عبیرہ! ان سے ملو' فاروق احمد۔ ویسے تو تم سوشل ہو' تم نے مجھ سے یہ موقع بھی چھین لیا کہ میں ایک اچھے آدمی سے تمہیں ملواؤں۔"

"یہ جو پے در پے مجھ پر وار ہوئے ہیں' اس سے مجھے فکر ہے میں اپنا زرہ بکتر کیوں چھوڑ آیا۔"

"بس یہی تو ہے' اس برادری میں بیٹھیں گے تو زرہ اتار کر ورنہ خوامخواہ چبھتا رہے گا اور بی بی! میری چائے مجھے دیجئے' یہ پھر سے ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

سب سے پہلے ثریا ہی کو ہوش آیا' اس نے مہمان کو با تکلف احترام دیتے' پیالی اپنی طرف کھینچی۔

"آپ کے لیے چائے بناؤں؟"

"جی ضرور۔"

(اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو) ثریا نے ٹی کوزی اٹھاتے سوچا۔ صرف ایک اس جملے کے اضافے سے وہ مہذب لوگوں کی لسٹ میں آ جاتا لیکن ان کے درمیان آنے والے بھی جنگلی ہی ہوتے ہیں یا شاید دنیا میں جنگلیوں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے محسوس کیا وہ نووارد تھا لیکن ان کے درمیان اس اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے ہمیشہ سے ان کا حصہ رہا ہو' صرف وہی ان کا حصہ نہیں بن سکی۔ جلیے سے وہ ان سے زیادہ خود اس سے قریب تر لگتا تھا لیکن شاید کوئی ذہنی ہم آہنگی جو اس گروپ کا خاص اسٹنٹ تھی' ان دو چار جملوں میں ہی وہ ان کے ساتھ بہہ نکلا تھا۔

"کیا کرتے ہیں آپ؟"

وہ پیالی لے کر اٹھ ہی رہی تھی کہ کسی نے ہاتھ بڑھا کر پیالی پکڑی اور اس کو تھما دی۔ کرٹسی بھر رہ گئی۔

"آپ کا اگر انٹرویو کیا جائے تو آپ کو اعتراض تو نہیں ہو گا۔" حمیرا نے سوچا۔

"کچھ ضروری سوال ہیں' ایک دفعہ ہی نمٹا لیے جائیں تو اچھا ہو پھر جو ہم قسطوں میں آپ سے سوال کرتے رہیں گے' سارے شک ایک دفعہ ہی رفع ہو جانے چاہئیں۔"

"سو میں شکل سے مشکوک لگتا ہوں' کوئی تنکا نظر آیا میری اس داڑھی میں جو سرے سے ہے ہی نہیں۔"

"تم نس مکھ آدمی ہو یا بور۔" پہلا سوال عثمان کی طرف سے آیا۔

"میں دوسروں کو کمال کا بور کر سکتا ہوں لیکن خود کبھی بور نہیں ہوتا' جہاں بیزاری کا امکان ہو' وہاں سے اٹھ جاتا

ہوں۔"

"گویا اب اٹھنے والے ہو۔"

"سیاست سے کتنی دلچسپی ہے؟" ثریا کے سوالات کی نوعیت ذرا مختلف تھی۔

"الیکشن میں کھڑے ہونے کا ارادہ نہیں۔"

"اگر کھڑے ہو گئے تو کتنے ووٹ ملیں گے۔" حمیرا نے پوچھا۔

"گھر والوں کے سوا باقی سب کے۔"

"ایمرجنسی کا خاتمہ کب ہوگا۔"

"یہ انٹرویو ہے کہ پریس کانفرنس؟" اس نے احتجاجاً ہاتھ کھڑے کر دیے۔

"یار! واقعی بتاؤ نا ایمرجنسی ختم ہوگی' الیکشن ہوگا' کون جیتے گا' الیکشن فیئر ہوگا' پاکستان کا کیا بنے گا۔"

وہ سب سنجیدہ ہو گئے' آپائی نے یک لخت آواز بلند کی۔

"پاکستان قائم رہنے کے لیے بنا ہے' اسے کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ مودب ہو کر ان کی طرف پلٹا۔ "لیکن آپائی! اس یقین کی وجہ؟"

"یقین کی وجہ نہیں ہوتی' ایمان ہوتا ہے۔"

"سنی سنائی پر تو آپ کا بھی اعتبار نہیں' کیوں؟" اس نے کرسی پر پہلو بدل کر ذرا معنی خیزی سے پوچھا۔

ثریا کو اس جملے میں کچھ چھپا ہوا نظر آیا لیکن جو چھپا ہوا تھا' وہ صرف محسوس ہو سکتا تھا' وہ کیسے دیکھتی۔

اور کس اعتماد سے نووارد نے ان کو آپائی کہا تھا جیسے وہ ان کا حصہ تھا' انہی میں رہتا تھا۔ بے تکلفی کے درجہ وار مراحل ہوتے ہیں۔ وہ اتنے سالوں بعد بھی ان کو آنٹی کہتی تھی۔ وہ ابھی تک سیڑھیاں عبور نہیں کر پائی تھی' جہاں سے پہنچ کر اس چبوترے تک پہنچتی' جہاں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ براجمان اوپر تک آنے کے لیے اس کا ہاتھ بھی نہیں تھامتا تھا۔

"یہ جنرل چلے جائیں گے پھر کوئی مارشل لا نہیں آئے گا۔"

"یہ خوش فہمی تو ہمیں ہر جنرل کو بھیج کر ہوتی ہے۔"

وہ پھر سے ملکی سیاست پر بحث کر رہے تھے۔

ایمرجنسی' این آر او' الیکشن' عدلیہ بحالی تحریک' خودکش حملے' امریکہ۔

جب تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں' ہم نظام کی تبدیلی سمجھ کر خوش فہم ہو جاتے ہیں۔ تبدیلی محض شکل میں آتی ہے اور کچھ نہیں بدلتا۔

فاروق نے ایک لمحہ کے لیے سر اٹھایا' اتنے بہت سے لوگوں میں سے وہ جانتا تو کسی کو بھی نہیں تھا' کچھ سے واقف ضرور تھا لیکن اس آسمان کے نیچے نم ہوتی خنکی میں اپنائیت کا ایک عجیب احساس ابھرتا تھا۔ گھاس سے لے کر لوگوں تک کسی نے ان پر سخت محنت کی تھی۔ پوری گھاس میں ایک بھی جنگلی پتی نظر نہیں آئی تھی اور اس قطعہ گھاس پر بیٹھے لوگوں میں تصنع کی ذرا سی بھی ملاوٹ نہیں تھی۔ ایسے لوگوں میں بیٹھے آپ خود off guard ہو جاتے ہیں۔

تڑتڑ بولتی اور جھک جھک کرتی لڑکی کو اس نے سابقہ ملاقات میں تو اتنا خاموش نہیں پایا تھا' سوالوں کی بوچھاڑ میں سے ایک سوال بھی اس کی طرف سے نہیں آیا۔ حالانکہ سب سے زیادہ تیروں کی بارش اسی کی طرف سے متوقع تھی۔

ہجوم سے رخ پھیرے وہ ایک سی ڈی کور اٹھاتی بڑی محویت سے گلوکاروں کے نام پڑھ کر وہ اگلی ڈسک اٹھالیتی۔

گانا تو اس نے ایک بھی منتخب نہیں کیا تھا۔ اس اجنبیت بھری رکھائی کی بظاہر کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اس اجنبیت کے احترام میں ایک دفعہ بھی اس نے تخاطب کی جسارت نہیں کی۔

اس نے آخری گھونٹ بھر کر پیالی واپس پرچ میں رکھی۔

"اب آپ لوگ بھی باری باری اپنا تعارف کروائیے تاکہ میں آپ پر حملہ آور ہو سکوں۔ اس کے بعد تیراندازی ختم۔ لیڈیز فرسٹ اینڈ فرام رائٹ ٹو لیفٹ۔"

وہ کرسی پر تن کر بیٹھتے ایسے بولا جیسے پہلے دن کی کلاس لینے لگا ہو۔

ثریا وہ لیڈی تھی جو فرسٹ آتی اور ہمیشہ آتی تھی۔ اس کے دکھ ابھی تازہ تھے' وہ اپنا تعارف کرانے لگی۔ پرفارمنگ آرٹس' ٹروپ' ٹوکیو تک کا سفر' طبلہ سارنگی کے ریکارڈ میں اس کی دلچسپی' تھیٹر' ایک ذاتی آرٹ فلم بنانے کی خواہش' پچھلے سمسٹر سے اس سمسٹر تک وہ انڈین فلم میں کام کرنے کی تمنا سے اپنی ذاتی فلم تک ترقی کر چکی تھی۔

وہ بڑے دھیان اور توجہ سے اس کو سنتا الجھتا رہا۔ ان سب میں کیا چیز مشترک ہے' کون سی چیز ان کو یکجا رکھتی ہے' ان میں سے کسی نے بھی اسے نہیں ٹوکا۔ وہ جب ایران توران کی باتیں کر رہی تھی تو اس نے محسوس کیا' وہ سب بڑی دلچسپی اور غور سے اس کی ہر بات سن رہے تھے۔ شاید یہی چیز مشترک ہو۔ وہ سب کسی کی دل آزاری نہیں کرتے ورنہ ہر شخص علیحدہ علیحدہ اپنی دنیا آباد کیے بیٹھا ہے۔

"کیا یہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی ambition ہے یا اس سے بھی اوپر کچھ ہے؟" بظاہر بے مقصد کیے گئے سوال نے جیسے کہیں تیر چلایا تھا' وہ کتنی دیر چپ رہی۔ کچھ اوپر بھی ہوگا لیکن وہ جان کر کیا کرے گا۔

"نہیں' اس سے زیادہ بڑی کوئی حسرت نہیں۔"

"حسرت تو محرومیوں کی ہوتی ہے' ابھی تو تکمیل کا وقت بھی نہیں آیا۔"

حمیرا کی باری آئی تو اس نے اپنے ارمان گنوانے شروع کیے' کسی بہت اچھی پولیٹیکل پارٹی میں شمولیت ایسی پارٹی جس کے الیکشن جیتنے کے کوئی امکان نہ ہوں۔"

"تو آپ کا ہیرو عمران خان ہے۔"

عیبو نے دیکھا شمع اس کی طرف آیا چاہتی ہے' اچانک اس کو ٹرالی میں پڑی اس چائے کا خیال آیا جو کب کی پی جا چکی تھی۔ اس نے ٹرالی گھسیٹی اور پہیوں سے سرسبز گھاس کو روندتی کچن کی طرف چلی گئی۔ حمیرا کے درخت کے ٹھنٹھ پر بیٹھی گھاس کی سبز ڈنڈی زمین سے گھسیٹ کر نکالتی' چباتی' اس کا رس چوستی اس قدر محو تھی کہ اس نے اپنے سائے کے اٹھ کر چلے جانے پر غور بھی نہیں کیا۔

فضا میں کچھ اسرار ہو تو جیسے اس کی جبلت اس کو بھانپ لیتی تھی۔ کوئی وجہ بھی نہیں تھی کہ ثریا کی نگاہ اٹھی۔ اس نے محسوس کیا۔ مہمان اس کے اٹھ کے چلے جانے کو اپنی ہتک کی طرح محسوس کر رہا تھا اور اس توہین کے اظہار پر آمادہ بھی نہیں تھا باوجود اپنے بے ساختہ ایکسپریشن کے اس نے خود پر قابو پا لیا تھا' اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے آخر؟

ایسے وقت میں جب سب کے سب اپنی دنیا میں گم ایک ساتھ بولنے کی کوشش میں مگن ہوں' کسی کو فرصت سے پڑھنے کا یہ نادر موقع تھا۔ اس کی شکی طبیعت گتھیاں سلجھانے میں لگ گئی۔ جہاں تک وہ کسی نتیجے پر پہنچی تھی' وہ ایک دوسرے کو رسمی سے زیادہ نہیں جانتے تھے۔ جب گاڈ فادر سکن سارہ آپا کے ہاں کسی ملازم عورت کی وفات ہوئی تو وہ چونکہ بھلی خاتون تھیں اور چونکہ بہت اندھیرا ہو گیا تھا' سو ان کے کہنے پر یہ صاحب ان دونوں کو گھر چھوڑنے آئے تھے۔

ایسا ہی کچھ واقعہ اس نے سنا تھا یا اس سے ملتا جلتا کچھ اور۔۔۔ لیکن اس میں کوئی اہم بات نہیں نکلی تھی۔ یہ زمانہ نہ داستانوں کا ہے نہ مثنوی تحریر کرنے کا۔ جب شہزادے کسی فصیل کو دیکھ کر غش کھا جاتے تھے' اب تو غزل بھی ٹوٹ ڈھٹلا ہو چکی ہے' سوائے گلوکاروں کے کسی کے کام نہیں آتی۔ تو اس مختصر سی اندھیری ملاقات میں کیا افسانوی ٹچ ہو سکتا ہے۔

موصوف خود بڑے ہشیار زمانہ شناس آدمی لگتے ہیں' وہ جو اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کا ملال اترا تھا' کسی خوش گفتاری میں لپٹا کہیں دور دھندلا گیا تھا۔ لیکن وہ ایک لمحہ بھی آیا کیوں' یا کچھ ایسا ہے جو اسے معلوم نہیں۔ اس اندھیری مختصر ملاقات جس کا دورانیہ دس پندرہ منٹ سے زیادہ کیا ہو گا۔ شاید راستے میں وہ آئس کریم کھانے یا کوک پینے ٹھہر گئے ہوں۔ چونکہ اس وقت مائیک اس کے سامنے نہیں تھا اور روشنیاں اس کو spot نہیں کر رہی تھیں لہٰذا اس نے تسلی سے ان کا مطالعہ فرمایا۔ کیا تھا؟

یہ بھی عجیب بات ہے جب آپ کسی کو پڑھ رہے ہوں تو خود کو سلیمانی ٹوپی میں محفوظ سمجھتے ہیں اور آپ کو پتا بھی نہیں چلتا اور کوئی آپ کو پڑھتے ہوئے خوب پڑھ رہا ہوتا ہے۔ دنیا بھی ایک لائبریری کی طرح ہے' کتابیں شیلف میں کھلی پڑی ہیں۔

جمال چونکہ خلیج سے آیا ہوا تھا اور بڑی فرصت سے چھٹی گزار رہا تھا۔ لہٰذا جب ثریا ہاتھ میں بنڈل تھامے اندر داخل ہوئی تو سب سے پہلے اس کی نظر پڑی تھی اور اس ایک نظر میں اسے بھانپ لیا تھا' ان کے چہروں پر گرم جوشی کے بجائے ایک سرد مہری سی چھائی تھی۔ سو ان کے درمیان کچھ ٹھیک نہیں چل رہا تھا۔

جمال کو یہ سوچنا کچھ اچھا بھی نہیں لگا تھا' لیکن اس نے سوچا تھا۔

ایک اور ادھوری کہانی۔۔۔ ایک اور فضول المیہ۔

وہ وہاں بیٹھی اب فاصلوں پر نظر آتی تھی۔ زندگی میں کوئی فیصلہ کرنا کتنا دشوار ہوتا ہے' پھر اس فیصلے میں تبدیلی لانا اس سے بھی کٹھن۔ وہ دونوں پہلی والی تکلیف سے تو گزر چکے تھے' اب شاید زیادہ والی تکلیف سے گزر رہے تھے۔ ان میں کیا چیز مشترک تھی' جب انہوں نے ایک دوسرے کا ساتھ چنا۔

اور جب انہوں نے ایک دوسرے سے بے زاری محسوس کی تو وہ مشترکہ شے کہاں رہ گئی تھی۔ اس کو عثمان بہت پیارا تھا۔ اگر کسی نے اس کو دکھ پہنچایا تو اس کو اچھا نہیں لگے گا۔ لیکن شاید اس کو جھیلنا پڑے۔ یہ اس کی ملازمت کا حصہ تھا اور وہ آنے والے دکھ کو فضا میں سونگھ رہا تھا۔

گروپ اپنی اپنی جگہ بیٹھا کسی پرجوش بحث میں مشغول تھا۔ حالانکہ گھر کے آنگن میں ہونے والی اس سیاسی گرما گرمی سے سوائے بدمزگی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن لوگ کبھی بحث کرنا بند نہیں کرتے۔ ایک ناکارہ پرزہ ایک عضو معطل ہوتے بھی لوگ اپنی رائے دے کر اپنا حق ادا کر دیتے ہیں۔ آنگنوں میں ہونے والی یہ سیاست فضا میں تحلیل ہونے کے باوجود کبھی کبھی ایوانوں میں ہلچل ضرور مچا دیتی ہے۔

کسی وجہ کے بغیر عبیرہ نے اتنی دیر لگائی۔ کچن میں برتن سمیٹتے' سنک میں دھوتے وہ باہر سے آنے والی پرجوش آوازوں کا شور سن رہی تھی۔ شکر ہے کسی نے اس کو اٹھتے اور کھسکتے دیکھا نہیں' اور کسی نے اس کی عدم موجودگی پر واویلا نہیں کیا۔ بحث جاگیرداری نظام پر آگئی تھی اور عروج پر تھی۔ وہ کیوں اٹھی اور کیوں خود کو شریک نہیں کر سکی وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ سوائے اس کے کہ اس گھر میں جو کچھ ہوا' اس کے خیال میں وہاں موجود سب لوگ اس سازش کا حصہ تھے۔ بقول عثمان' حوالہ خیر کا تھا بھی نہیں۔ سو ان میں سے کسی کا ساتھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ ممکنہ حد تک دیر لگا کر واپس آئی تو ثریا مہمان سے مخاطب تھی۔

"جاگیرداری ہم نے ایک سیاسی نعرہ سنا لیا ہے۔ جہاں جاگیرداری کا لفظ سنا ایک ظالم آدمی کا تصور ذہن میں آیا۔

آپ کو کتنا عجیب لگے گا کوئی آپ کے پرخچے اڑانے لگے تو۔"

"میرا جاگیرداری سے کیا تعلق؟" وہ بوکھلا گیا۔

ثریا کو لگا وہ اپنی جاگیرداری ڈس اون کر کے خود کو ڈی کلاس کر رہا ہے' شاید اس لیے کہ جن لوگوں میں بیٹھا ہے ان سے الگ نظر نہیں آنا چاہتا۔ جس طرح ایک ٹھگ دوسرے ٹھگ کو پہچانتا ہے' اس طرح ایک جاگیردار دوسرے کی نظر سے بچ نہیں سکتا۔ حالانکہ وہ کوئی مہر ساتھ لیے نہیں پھر رہا۔

جس وقت حمیرا' عثمان اور رضا بحث میں کسی کو بولنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے' عبیر خاموشی سے سن رہی تھی۔ ثریا ہر ایک کو الگ الگ جانچنے کی کوشش میں مگن۔ اس کی موسیقی اس شور میں دب گئی تھی۔ کہیں دور اس کے دل کی آواز بھی۔ عین اس لمحے SMS کی بیپ سن کر عثمان نے اعلان کیا۔ "بی کریم کی طرف سے پیغام ہے۔ انہوں نے وارننگ دی ہے کھانے پر کوئی لیٹ نہ ہو۔"

"آج رات ہمارا کھانا اسی ایف میں ہے۔ آپ کو بھی شمولیت کی دعوت دی جاتی ہے۔" جملے کے اگلے حصے میں رضا نے اضافہ کیا تھا۔

"گویا اس ٹرالی بھرنے کے بعد کھانا بھی؟"

"آج اصل میں آپائی کی سالگرہ ہے۔"

"اوہ۔۔۔ ابھی برتھ ڈے آپائی۔ میں سمجھا آپ ہر روز اپنی اسی طرح خاطر مدارات کرتے ہیں۔"

کچھ دیر کو وقفہ دے کر وہ رکا۔

"وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ کچھ انوکھا پن ہے آپ سب میں۔۔۔ میں چلتا ہوں۔ اگر آپ کو کہیں جانا ہے تو!"

"سوچ لو۔ چلے گئے تو اپنا بہت بڑا نقصان کرو گے۔ وہاں تمہاری ملاقات ایک ایسے خوبصورت آدمی سے کروائی جائے گی کہ جن سے نہ ملنے کا تمہیں عمر بھر رنج رہے گا۔" جمال کے لہجے میں ہلکا سا تحکم تھا۔

"اگر تمہارے پاس وقت ہے تو "

"وقت تو میرے پاس وافر ہے' اور بہت سے رنج ہیں میری زندگی میں۔۔۔ لیکن اگر تم لوگ اصرار کرتے ہو تو ضرور ملنا چاہیے' اب بتاؤ وہ ہیں کون؟"

"پروفیسر عباس رشید' عثمان اور عبیر کے فادر۔"

عبیر نے پرس کا نسمہ کندھے پہ لٹکاتے یونہی نظر اٹھائی۔ اسے لگا پروفیسر کے نام پر اس کے چہرے کا رنگ ذرا دیر کو بدلا تھا۔

"تم ان سے مل کر نسلوں کا فرق محسوس نہیں کرو گے۔ وہ بڑی آسانی سے خود کو adjust کر لیتے ہیں۔ ادب احترام کی بے جا مد۔ نصیحت آمیز تقریریں۔ ماضی کی داستانیں۔ کسی بھی روایتی بزرگ کے برعکس تم ان میں ایسا کچھ بھی نہیں پاؤ گے۔"

"آجائیں آپائی۔"

آپائی نہ صرف تالے لگا رہی تھیں' بلکہ کھینچ کھینچ کر ان سے کشتی لڑ رہی تھیں۔ ان کو ہمیشہ شک رہتا' تالہ ٹھیک سے بند نہیں ہوا۔

"کریم بی کا دوسرا میسج۔" عثمان نے نعرہ لگایا۔ اور میں اتنا بہادر نہیں کہ سہ سکوں۔ سو میں نے نہیں پڑھا۔"

وہ سب دو' دو' تین' تین کے ٹکڑوں میں باہر آنے کے لیے نکلے تو جیسے بارات ہی منتظر تھی۔ ثریا' حمیرا کے ساتھ چلتی باہر نکلی۔ عثمان ان دونوں کی گفتگو میں مداخلت بے جا کر تا بے سبب خوش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رضا کی گاڑی ایسی جگہ کھڑی تھی جس کو ہلائے بغیر گاڑیاں حرکت میں نہیں آسکتی تھیں' وہ چابی لہراتا باہر نکل گیا۔

ایک عبیر بچی تھی اور کسی وجہ کے بغیر وہ تنہا اور سست قدم ہو رہی تھی۔ اس نے ایک سایے کو اپنے پاس ڈولتے محسوس کیا۔

"میرا یہاں آنا شاید آپ کو مناسب نہیں لگا' بظاہر۔"

"مجھے کیوں نامناسب لگے گا۔" عبیر نے بغیر اس کی طرف پلٹے کہا۔ "جیسے کہ آپ نے کہا اس کی کوئی وجہ بھی نہیں۔"

"اور مجھے علم بھی نہیں تھا یہ دنیا اتنی چھوٹی ہے۔ ایک مختصر سے AXIS پہ گھوم رہی ہے۔ یہاں آپ لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔"

"مجھے تو لگا آپ کو علم تھا۔"

وہ مسکرا دیا۔ "اب میں ریلیکسڈ ہوں۔ پچھلی دو' تین مختصر ملاقاتوں میں آپ حملے سہتا رہا ہوں۔ وہ دو ملاقاتیں تھیں یا تین۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔"

"پتا نہیں' میں نے گنتی نہیں کی۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر عثمان کی طرف پلٹی۔

"ہم پیدل جا رہے ہیں یا کاروں پر جائیں گے۔"

پیدل چلنے کے تصور سے ثریا بوکھلا گئی تھی' واقعی اس کو اس پار کا خوف لاحق ہوا۔

"شاید میں آپ لوگوں کا مزید ساتھ نہ دے سکوں۔"

"بڑی جلدی حوصلہ ہار گئیں آپ۔" جمال نے لفظوں کو چبا کر کہا۔

"مجھے جانا ہی ہو گا۔ شاید مزید حوصلہ بھی نہ سہار سکوں۔" اس نے موبائل پر وقت چیک کیا اور کسی بھی جواب دہی کے بغیر نکل گئی۔

"ہوا کیا؟" جمال نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں جمال بھائی۔ یہ ہماری سنڈریلا ہیں۔ جب گھڑیال ایک خاص گجر بجاتا ہے' ان کو گلاس سلیپر سیڑھیوں پر پھینک کر دوڑنا پڑتا ہے۔" حمیرا نے شانت ہو کر کہا۔

جمال سے زیادہ فاروق نے دلچسپی لی۔

"ارے واہ تو پھر میچنگ جوتا تلاش کرنے کون جاتا ہے۔"

"شش۔۔۔ تم ان خواتین کے ساتھ زیادہ عرصہ رہے تو اسی قسم کی باتیں کرنے لگو گے۔"

"لیٹ ہونے پر کریم بی کی تیسری اور لاسٹ وارننگ۔" عثمان نے موبائل سب کی نظروں کے سامنے لہرایا۔

"یہ جو خاتون وارننگ دے رہی ہیں ایک عدد بن بلایا آدمی آنے پر ایک' دو' تین تو نہیں کر دیں گی؟"

"یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" رضا نے گھر کے دروازے پر ہر ذمہ داری سے ہاتھ جھٹک لیے۔ "وہ کسی کو کچھ بھی کہہ سکتی ہیں۔ ان کے صرف دو ایسے لاڈلے ہیں جنہیں وہ کچھ نہیں کہتیں۔ ایک عبیر' دوسرا شہریار۔"

"اور یہ شہریار کون ہے۔ یار تم لوگوں کے دوست تائیوان کی کل آبادی جتنے تو ضرور ہوں گے۔" فاروق نے گھر کے دروازے پر رک کر پوچھا۔ "اور سب میں سے ان دو کے استثنیٰ کی وجہ؟"

"تم بھی سوال بہت کرتے ہو۔" عثمان نے تنبیہہ کی۔

"بھی؟"

"ہاں بھی۔ تم بھی۔ اور بے جا سوالوں پر کریم بی سے سخت جھاڑ پڑتی ہے۔" گویا جتنی دیر کھانا کھایا جاتا رہے گا۔ اتنی دیر منہ پر انگلی رکھنی ہو گی اور بیس دفعہ لکھنا ہو گا ہم آئندہ کوئی سوال نہیں کریں گے' مس۔"

www.pkdigest.com

گیلری سے گزرتے پاپا کی لائبریری میں داخل ہونے سے پہلے وہ دونوں اطراف لگی قدیم تصویریں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"واہ کیا آرٹ گیلری ہے! کس زمانے کی پکچرز ہوں گی اندازاً؟"

"بہت بہت پرانی۔ یہ دادا کی نوکری کا زمانہ تھا۔ غالباً سن 46ء، 45ء۔"

وہ سب بڑی دلچسپی سے تصویروں کے گرد رک گئے۔

"ان تصویروں کے گرد ہمارا بہترین وقت گزرتا ہے۔ یہ ہمارا ماضی نہیں، لیکن ہم یہاں کھڑے ہو کر خود کو اس کا ایک حصہ تصور کرتے ہیں۔ پھر ہم ایک کھیل کھیلتے ہیں کہ ہم ان میں سے ایک ہوتے تو کیسے سوچتے۔"

وہ بردباری سے تن گیا۔ "اس کا مطلب ابھی تک تمہارا بچپن گیا نہیں۔ ممکن ہے تم بھی کھیلتے ہو ان نصف صدی قبل کی تصویروں سے؟"

وہ بھنویں اچکا کر ایک تصویر کو بغور دیکھتا بولا۔ "ارے واہ۔ یہ خاتون ضرور اپنے وقت کی جون آف آرک رہی ہوں گی۔"

"اس۔ یہ بھی کیا عجیب بات ہے۔ اس گروپ میں جو شامل ہوتا ہے وہ جیسے دوسرے کے ذہن سے سوچنے لگتا ہے۔ آپا کی برتھ ڈے گرل تھیں، خواتین کے ہجوم میں شامل ہو گئیں۔ وہ سب سر کے کمرے میں چلے گئے۔

عیبو، حمیرا، کریمی بی کی مدد کو میز سجانے آ گئیں۔ ہر چیز اپنے اصل پر پہنچ گئی تھی۔

حمیرا میز کے سلسلے میں زیادہ سلیقہ دکھا رہی تھی۔ آج ایک نیا مہمان شامل تھا۔ بات ہانڈی روٹی کی تھی۔ سارا فلسفہ، ساری دانشوری پس پشت ڈال کر وہ سلاد کے لیے ماہر کک کی طرح کٹنگ بورڈ پر شیف نائف تیزی سے چلاتی رہی۔ کریمی بی کی بڑبڑاہٹ کا کہیں خاتمہ بھی نہیں تھا۔

"کیسے لوگ ہو تم۔ پتا بھی ہے سر آٹھ بجے کھانا کھا لیتے ہیں۔ یہ ٹماٹر کے پھول کہاں سے سیکھے۔"

"ہم کیا کرتے کریمی بی! آپا کی نے تیار ہونے میں دیر ہی اتنی لگا دی۔" حمیرا نے معصومیت سے کہا۔

"اے لو اب یہ جھوٹ بولنا کہاں سے سیکھا۔"

"سب کچھ آپ سے سیکھا کریمی بی! میرا مطلب ٹماٹروں کے پھول سے ہے۔"

"یہ اچھی رہی۔ اب الزام تراشی کر لو۔" وہ بڑبڑاتی واپس آ گئیں۔

"یہ لو۔ جہاں جہاں ڈونگے لگانے ہیں لگا دو اور مہمانوں کو بلا لو۔" وہ باورچی خانے میں واپس جا چکی تھیں۔

سر کے پیچھے مہمانوں اور گھر والوں کا ہجوم اندر آیا۔

کریمی بی چنگیر میں گرم پھلکا روٹی کھانے کے کمرے میں داخل ہوئیں اور لمحے بھر کو رک گئیں۔

"وعلیکم السلام۔ تمہیں کہیں دیکھا ہے میاں! ارے، تمہیں آنا کہاں۔ تم پہلے بھی بچوں کے ساتھ گھر آئے تھے؟" کریمی بی اپنی طبیعت کے شکی پن سے باز تو آ نہیں سکتی تھیں۔

"نہیں۔" "شاید شہریار کے دوست ہو۔"

"کریمی بی!" اماں نے ذرا سی سرزنش سے ان کی طرف دیکھا۔

"یہ پہلی دفعہ ہمارے ہاں تشریف لائے ہیں اور ان کی اسی طرح خاطر کرنی چاہیے جیسے کسی پہلی دفعہ آئے مہمان کی کی جاتی ہے۔"

"یہ گرم روٹی لو بیٹا۔" انہوں نے بڑی فراخدلی سے گرم چنگیر مع روٹی اس کی طرف بڑھاتے کہا۔

"لیکن کہیں دیکھا ضرور ہے۔ پہلے شاید تمہاری داڑھی تھی۔ کہاں دیکھا ہے؟" وہ واپس پلٹتے بھی بڑبڑا رہی تھیں۔ "کم بخت حافظہ۔ آخر یاد کیوں نہیں رہتا؟"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

رفعت ناہید سجاد

چراغِ آخرِ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمے ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادی اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ نور، عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی نور ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ نور کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر پابندی کا اصول لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پراعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونیورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

www.pkdigest.com

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے۔ وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیر اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے امرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ تبائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کر دیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کو نا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کرکے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۸

آٹھویں قسط

وہ برق رفتاری سے پھلکا لے کر واپس آتیں اور پھرکی کی طرح گھوم کر پلٹ جاتیں۔ جیسے باورچی خانے میں ماموں اللہ بخش مصروف تھے۔ وہ محض ان کے چھوکرے کا کام کر رہی تھیں۔ لیکن جتنی مرتبہ بھی کھانے والوں کے درمیان آتیں، ان کی آنکھوں سے بے اعتمادی چھم چھم برستی۔

"یہ سب گھر والے مجھ سے کیا چھپا رہے ہیں اور کیوں چھپا رہے ہیں۔ میں نے اس کو کہیں دیکھا تو ہے۔"

شاید رشتے کا کوئی سلسلہ ان بچیوں میں سے کوئی۔

"لیکن نہیں، اول تو اتنی بڑی بات پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی۔ پھر اس گھر کی لڑکیاں اس نیت سے پیش بھی نہیں کی جاتیں۔ گو بظاہر اس میں کوئی برائی بھی نہیں۔ دنیا میں یونہی چلتا ہے۔ دنیا دیکھے بغیر دنیا کو سمجھنے کا دعوا ان کا خوب تھا۔ پتا نہیں کیسے بیٹیاں بیاہیں گے میاں عباس۔ ہر معاملے میں تو ان کی خودداری آڑے آجاتی ہے۔"

انہوں نے اگلی روٹی بھی بے خیالی میں اس کی پلیٹ میں رکھتے ایک چوری کی نظر کی۔

"لڑکا ہے تو اچھا، پر جانے یہ لوگ اسے کہاں سے اٹھا لائے ہیں۔"

بزرگ اور قابل احترام خاتون، مگر شک نے ان کی شکل کو کس قدر مسخرہ بنا دیا تھا۔ وہ بھی جیسے بے جانے بوجھے شرارت میں اپنے ساتھیوں کا حصہ بن گیا۔

"آپ تو لوگوں پر یقین نہیں رکھتیں؟" فاروق نے نہایت سنجیدگی سے ان سے سوال کیا تھا۔

"مجھے کیا پتا، وہ کیا ہوتا ہے۔" اپنی کم علمی پر فخریہ مسکراتے انہوں نے غور سے کہا۔ ناچاہتے بھی مسکراہٹ

یہاں سے وہاں تک پھسلی جیسے اینٹوں کی قطار پہ کسی نے پہلی اینٹ کو دھکا دیا ہو۔

"کریم بی!" اماں نے گلا کھنکار کر بڑی مہارت سے میز پر نظر گھمائی۔ "دہی نہیں رکھا۔"

"ہائے کیوں نہیں رکھا، یہ کیا پڑا ہے۔"

"او وہاں سوری رکھا تو ہے۔"

کسی خواہش کے بغیر انہوں نے چمچہ بھر دہی اپنی پلیٹ کے کونے میں انڈیلتے کریم بی کی طرف دیکھا۔ گو وہ اماں کی بہت تابع نہیں تھیں، لیکن جب اماں ان سے اپنی مرضی منوانے پر آجاتیں تو کسی ایک کو تو ضد چھوڑنی ہوتی۔ کریم بی شاید کچھ کم ضدی تھیں۔ بس وہی ایک شکست کا لمحہ جس کی مرعوبیت میں وہ اپنا محکمۂ جاسوسی وہیں چھوڑ کر پلٹ گئیں۔ مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اماں کی ہنرمندی پر سب زیرلب مسکرائے، "تایا" بھی۔

"اصل میں کریم بی رائے دینے میں خود مختار ہیں۔ اور ہم میں سے کسی کی جرأت نہیں کہ انہیں کچھ کہہ سکیں۔"

اماں کی معذرت میں کریم بی کے لیے یوں ایسا سہم تھا، وہ کب کیا کہہ دیں انہیں کون روک سکا ہے۔

وہ کسی سے مخاطب نہیں تھیں، لیکن فاروق کو لگا یہ بیان بطور خاص اسی کے لیے ہے۔ وہی ایک مزاج نا آشنا وہاں موجود تھا۔ (لیکن وہ کیوں تھا اب تو وہ خود بھی یہ سمجھنے سے عاجز تھا۔)

فاروق نے پلیٹ پر جھکا سر ایک خفیف جنبش سے اوپر کیا اور کسی کی طرف بھی بالخصوص نا دیکھتے سامنے والی دیوار سے کہا۔

"ان کا قصور نہیں۔ کبھی ہوتا ہے، ہمیں لگتا ہے یہ چہرہ شناسا ہے۔ بعض چہرے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

ایک مرتبہ عبیدہ نے اپنے بچپن میں کسی محفل میں جنرل ضیاء کو دیکھا۔ وہ بھاگ کر ان کے پاس گئی۔ "انکل! انکل! آپ ٹی وی پر خبریں پڑھتے ہیں نا۔"

"اور میری حماقت دیکھو، مجھے کافی بچپن لگا، یہ شاید عقل والی تھی۔"

جمال نے رضا اور عثمان کے حملوں سے نکلتے سرکی طرف دیکھا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہو گئے ہیں

☆ ستاروں کا آنگن،	نسیم سحر قریشی	قیمت: 400 روپے
☆ درد کی منزل،	رضیہ جمیل	قیمت: 180 روپے
☆ اے وقت گواہی دے،	راحت جبیں	قیمت: 350 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت،	شازیہ چودھری	قیمت: 200 روپے
☆ امربیل،	عمیرہ احمد	قیمت: 450 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

"جیسے بعض جملے سنے ہوئے لگتے ہیں۔ کبھی کوئی بات کرے تو لگتا ہے یہ بات پہلے بھی اسی طرح ہوئی تھی، بلکہ مخاطب ہو سو وہی جملہ بولتا ہے جو آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے سر؟"

"کیا کہا جاسکتا ہے۔" سر نے سنجیدگی سے کہا۔ "انسانی دماغ بڑی پیچیدہ مشین ہے۔"

"لیکن اس وقت تو کریم بی کی مشین انتہائی بوسیدہ ہو چکی ہے۔"

حمیرا نے ڈونگا کھسکاتے تقریباً سرگوشی میں کہا تھا۔ ایسی کسی جگہ جہاں سر عباس ہوں، مسخریاں رضا کارانہ طور پر ممنوع تھیں۔ لیکن آج تو سالگرہ تھی وہ بھی آپا بی کی۔ گو اس گھر میں کسی اور کی سالگرہ منانے کی کوئی روایت نہیں تھی۔ پر بھرے کے بغیر شاید وہ جی بھی نہیں سکتے تھے۔ ہم جب بھی کسی سے پوشیدہ کوئی جملہ بولتے ہیں، جس سے بولتے ہیں وہ سنے نہ سنے، جس سے چھپایا جارہا ہو وہ خوب ہی پکڑ لیتا ہے۔

سر عباس نے ایک تہدیدی نظر ڈالی اور واپس پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کسی کی سادگی اگر آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تو بہرکیف وہ قابل گرفت چیز نہیں۔"

دادی اماں نے اپنے آپ میں گم جھریوں بھرا چہرہ اٹھا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پہ ہلکی سی ناگواری کی جھلک بھی انہوں نے بھانپ لی تھی۔ ان کے بیٹے کے خلاف مزاج کیا ہو، کس کی مجال ہوئی۔

"غیبت کر رہے ہو۔" دادی اماں نے بچوں کی طرف شک سے دیکھا۔

اچانک سب ہی حتی المقدور اس بحث یا غیبت میں حصہ لینے لگے۔ سوا سر عباس کے، انہوں نے گلاس منہ سے لگاتے ہوئے ایک ثانیہ کے لیے غور سے تو اماں کی طرف دیکھا۔ کریم بی کا شکی ہونا مسلّم، لیکن وہ اتنی سٹھیائی ہوئی نہیں تھیں کہ ان کے بیان کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا۔ انہوں نے گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔

"میرا خیال ہے میں چلوں۔ اللہ آپ کو بچوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔ سالگرہ مبارک۔"

آدھا خطاب ان کا عمومی اور میز کے گرد بیٹھے سب ہی لوگوں کے لیے تھا۔ بقیہ آدھا آپا بی سے مخصوص کر کے وہ روشنیوں اور خوشیوں کی محفل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ آپا بی بدستور مسکراتی رہیں۔

www.pkdigest.com

"کھانے کے بعد فرصت ہو تو میرے کمرے میں آنا۔"

انہوں نے کسی کو مخاطب کیے بغیر دعوت عام دی تھی۔ جس میں نئے بھی تھے، پرانے بھی۔ ان کے گھر اور کمرے کے دروازے سب ہی کے لیے کھلے تھے۔ کرسی واپس میز کے نیچے کھسکاتے وہ پلٹ گئے۔

عبیو نے ان کو جاتے دیکھا۔ ان میں دنیا داری، رسمی دکھاوا کم کم ہی تھا۔ موڈ میں ہوتے اور فرصت ہوتی تو کھانے والوں کے ساتھ دیر تک بیٹھتے۔ کچھ پڑھ رہے ہوتے تو سرے سے کھانے کے لیے آتے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے خود کو کبھی کسی کے لیے مشروط نہیں کیا تھا۔ اٹھ جانے کا مطلب کسی کی توہین بھی نہیں ہوتی تھی۔ سو ان کے ہر موسم، ہر مزاج سے خوب آگاہ تھے۔ نیا فرد شاید مانوس نہ ہو۔ بہرکیف اس کو مانوس ہونا چاہیے۔ وہ اٹھے تو میز کے گرد بیٹھے لوگ احتراماً کھڑے ہوئے۔

"بیٹھو بیٹھو کھانا کھاؤ۔"

کریم بی باورچی خانے سے کسی نئے ڈونگے کے ساتھ داخل ہوئیں۔

"تو میاں عباس چل دیے اور بی ثریا کہاں رہ گئیں۔ تم نے تو کہا تھا وہ تمہارے ساتھ ہیں۔"

یہ سوال بھی کریم بی کی طرف سے آیا تھا۔ ایسا ہر سوال، جس کے گرد ایک کھوپڑی اور دو ہڈیاں ہوں عموماً کریم بی کی اختراع ہوتی تھیں۔ حالانکہ انہیں خود سوالوں سے چڑ تھی۔ کتنی دیر خاموشی رہی۔ ہر شخص جواب کی ذمہ داری دوسرے کے کندھے پر ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ کیوں چلی گئی؟ یہ سوالیہ نشان ایک بہت اہم بیان سے منسوب تھا۔ اپنے اپنے طور پر اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کا انہیں پورا حق تھا۔ لیکن اس رائے کو فیصلے کے طور پر سنا دینے کی

کسی میں ہمت نہیں تھی۔

"شاید میں آپ لوگوں کا مزید ساتھ نہ دے سکوں۔"

"ہنہ۔" حمیرا نے ہنکارا بھرا۔ "پتا نہیں اس کا مسئلہ کیا ہے۔ لوگوں کو چونکا دینے کی خواہش، جب شمع آگے آگے بھاگی جارہی ہو تو پروانہ اس کے پیچھے دوڑ بھی لگاتا ہے یا نہیں۔ یہ عجیب ٹریجڈی ہے۔ شمع دوڑتے میں مڑ مڑ کر بھی دیکھتی ہے اور جب مڑ کر دیکھتی ہے اور پاتی ہے کہ اس کا پیچھا نہیں کیا گیا تو وہ رک جاتی ہے، پلٹ آتی ہے۔ پھر سے اسٹارٹنگ پوائنٹ پر کھڑی پھر سے سیٹی بجنے کی منتظر۔ یہ دوڑ تو روز ہوتی ہے۔"

"شاید میں آپ لوگوں کا مزید ساتھ نہ دے سکوں۔" عبیو نے جتا کر ادا کیے گئے جملے میں معنوں کی پرتیں کھولنی شروع کر دیں۔ کون کون شامل ہے لوگوں میں Minus one اور اس سمیت۔

آج کے دن مزید یا مزید کبھی نہیں۔

کیا اسے اس جملے کو کوئی عملی جامہ پہنانے کا ارادہ ہے یا بس اس نے کہہ دیا اور سب نے سن لیا۔

عبیو کے پاس تو ہمیشہ سے سوال ہی تھے۔ آج تک تو اس کو اپنے کسی سوال کا جواب ملا نہیں تھا۔

عثمان نے اس جملے کو ایسی بے پروائی سے سنا تھا جیسے وہ اس کا مخاطب تھا ہی نہیں۔ اور اس کے چٹان جیسے چہرے پر کوئی لکیر ایسی نہیں تھی جو اس کے اندر کی درازیں کھولتی ہو۔ اس وقت سے اب تک باضابطہ لفظوں میں ادا کرنا تو دور وہ جیسے اس سوچ سے بھی بھاگ رہے تھے۔ آج انہوں نے ہر بچکانہ مذاق کر لیا تھا۔ جس پھکڑپن پر مسکرانا توہین سمجھتے اس پر بھی کھل کر ہنس لیے تھے، لیکن بچ کر جاتے کہاں۔

کریم بی کا سوال سامنے تھا اور جواب کی منتظر اماں تھیں۔ کتنی ہی طویل خاموشی کے بعد رضا نے جیسے اس جملے کو کاندھا دیا۔

"وہ چلی گئیں۔ شاید ان کو دیر ہو رہی تھی۔"

"دیر بھی تو تم لوگوں کی طرف سے ہوئی۔ مجھ سے تو انہوں نے شیر خرما کی فرمائش کی تھی۔ تب تو ایسا کچھ نہیں کہا۔"

"شیر خرما تو بہرکیف کھایا جائے گا کریم بی۔" عثمان نے ان کی طرف تشفی کی نظر ڈالی۔ شاید ان کی خواہش تھی شیر خرما بنے، وہ کھائیں۔ یہ منصوبے میں شامل نہیں تھا۔

"یہ کیسی بات ہوئی۔" کسی وجہ کے بغیر کریم بی اداس ہو گئیں۔

ہائے غریب نے کس شوق سے شیر خرما بنوایا۔ کبھی کبھی وہ خود بھی اس کے بہت خلاف ہو جاتی تھیں۔ پھر ان کو لگتا کوئی گرہ سی ہے اس کے ذہن میں اٹکی ہوئی، جو اس کے ساتھیوں کو دکھائی بھی نہیں دیتی۔ وہ خود بھی نہ کھول سکتی ہے نہ کاٹ پھینکتی ہے۔

"ایسی اول جلول باتیں ہم سے تو کرو نہیں۔" وہ اسی اداسی میں خفا ہوتی بولیں۔

"میں نے بطور خاص اس میں کشمش نہیں ڈالی۔ ان کو کشمش پسند جو نہیں۔"

"ہم ان کے گھر بھجوا دیتے ہیں۔ اسی بہانے ہم ان کا گھر بھی دیکھ آئیں گے۔" وہ ہنس رہا تھا یا ہنسنے کی کوشش۔ کسی نے بھی رواداری میں پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔

"اصل میں وہ وہاں سے اٹھیں تو ہمارے ساتھ چلنے کو تھیں۔ پھر کوئی فون آگیا یا اطلاع۔ یا کوئی خیال۔ انہوں نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔"

جمال جھوٹ کو سچ میں لپیٹ کر کہانی بناتے کہیں سے بھی جھوٹا نہیں لگ رہا تھا۔

"لیکن اتنی جلدی گئیں کہ معذرت کا فون بھی نہ کر سکیں۔ شاید وہ جاتی ضرور ہوں گی۔"

"اور جاتے جاتے سیڑھیوں پر اپنا جوتا گرا گئیں۔" عبیر نے لقمہ دیا۔
ان کو جو تھوڑا سا اعتبار آیا تھا' وہ اس بے سر پیر کے آخری جملے سے جاتا رہا۔
"آج یہ کچھ زیادہ ہی شوخیاں دکھا رہے ہیں۔" "اماں اور کریم بی نے بہ یک وقت سوچا تھا کوئی ناراضی ہوئی' ان کی تم میں سے کسی سے۔"
اماں کو کون ٹہلا سکتا تھا۔ وہ کریم بی نہیں تھیں۔ وہ عثمان سے مخاطب ضرور تھیں' لیکن دیکھتی کسی اور طرف تھیں۔
"معلوم نہیں اماں!"
"وہ جب یہاں آئیں تب ہی ان کا مزاج نارمل نہیں تھا۔" رضا نے تسلی سے گفتگو کا سرا پکڑا۔
"پھر وہ جتنی دیر بیٹھی رہیں۔ کسی بے چینی کا شکار لگتی تھیں۔ وہ ابھی کسی ٹرپ سے واپس آئی تھیں اور اٹھتے وقت جو فقرہ انہوں نے بولا وہ آخری ملاقات کا اعلان لگتا تھا۔ لیکن کوئی بات نہیں' وہ کل پرسوں پھر آجائیں گی۔"
اماں کا دل اور زبان بہ یک وقت مچلے' جو خیال کوندا تھا' اس کو زبان کی نوک تک لاتے انہوں نے روک لیا۔ گو منہ آئی بات کو روکنے کی مہارت طویل مشق کے باوجود ان سے کبھی نہیں ہو سکی۔
ان کے درمیان ایک اجنبی بیٹھا تھا۔ جس کو اس واقعہ کا علم ہی نہیں تھا۔ وہ انتہا اس کے سامنے ہوئی' جس کی ابتدا سے وہ بے خبر تھا۔ ان کو ثریا بیگم قطعی پسند نہیں تھیں۔ اگر ان کے بیٹے کو وہ چکا نہ لگے تو یہ ٹریجڈی دراصل خوش کن خبر تھی۔ لیکن پتا نہیں اس عثمان کے اندر کیا ہے۔ کون خبر لا سکا۔ ایک سمجھ دار لڑکے کو محض اولاد ہونے کی وجہ سے احمق سمجھ لینا تو کوئی بات نہ ہوئی۔
کچھ دیر کو خاموشی سرسرائی۔ اجنبی شخص نے خود کو درمیان میں ٹھونسا ہوا پایا۔ دونوں بزرگ خواتین جن میں سے ایک دادی اماں اور ایک تائی تھیں' آپ کی جا چکی تھیں۔ مددگار خاتون باورچی خانے میں کچھ کھٹر پٹر کر رہی تھیں اور ایک خطرناک نجی مسئلہ زیر بحث تھا۔ جس مسئلے کو کونوں کھدروں میں حل کرنا چاہیے تھا۔ وہ دھڑے سے محفل میں زیر بحث تھا۔ شاید اسی لیے وہ خاتون جو وجہ بحث تھیں' خفا ہو کر چلی گئیں۔ محض ایک بیان جاری کر کے۔ ہر بند کے پیچھے ایک ریلا ہوتا ہے۔ کبھی رس رس کر نکلتا ہے۔ کبھی سر پٹختا ہے اور پاش پاش کر کے سب کچھ بہالے جاتا ہے۔ یہاں وہ کچھ ہوتا ہے' جو کہیں کم ہی ہوتا ہے۔
"چلیں۔ ہمیشہ کی طرح بھلے مانس رضا نے حالات اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کی۔
"سر کمرے میں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"
اچانک ہی میز خالی ہوئی اور لوگ منتشر ہو گئے۔ رضا کا جملہ جیسے لاٹھی چارج تھا۔ تایا ابی سالگرہ اور اس قدر عمدہ دعوت کے باوجود بھی ہو گئیں۔ ان کو ثریا پسند نہیں تھی۔ گو اس میں ذاتی پسند ناپسند کہیں نہیں آئی تھی۔ انہوں نے اسے قبول لیا تھا۔ جب رضا نے ایک دن ان کو عثمان اور ثریا کے بارے میں بتایا۔ جب سے وہ اس کی آنے والی بہو کی طرح بطور خاص خاطر مدارات کرتی تھیں۔ اندر سے نئی پلی کوزی نکال کر چائے دانی پر رکھتیں۔ چمچہ اس کے سامنے رکھنے سے پہلے کچھ نہیں تو اپنے دوپٹے سے ہی رگڑ کر چمکا دیتیں۔ پلیٹیں اس کے سامنے بڑھاتیں۔
پھر جب نائلہ نے (کہ ان کی عزیز ترین دوست تھی) کتاب پڑھتے سر اٹھا کر بے فکری سے بتایا کہ ان کو ثریا کا مزاج پسند نہیں تو انہوں نے اس کو وہیں خارج کر دیا۔ نائلہ ماں ہے۔ وہ کیسے غلط ہو سکتی ہے۔ نائلہ انسان بھی ہے کہ نہیں۔ یہ ان کے رجسٹر میں درج نہیں تھا۔ تایا کا جی بہلانے کو ان کے آگے لڈو رکھ دی گئی' لیکن اپنے باریک بالوں کا جوڑا بناتے انہوں نے اسے رد کر دیا۔ اماں نے عینک سر پر رکھی اور فریم اٹھا کر کشیدہ کاری شروع

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
اپریل کے شمارے کی ایک جھلک
اپریل 2010 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

"مجھے چاہتا نہیں ہے کوئی" زہرہ ممتاز کا مکمل ناول
"کہیں یہ دل" سدرہ سحر عمران کا مکمل ناول
ثمرہ بخاری' رخسانہ نگار عدنان' میمونہ خورشید علی اور نازیہ جمال کے ناولٹ
سیما بنت عاصم' ام ثمامہ' مدیحہ جہانگیر اور نعیم ناز کے افسانے
شعاع کے ساتھ قارئین سے رابطے
آپ کی پسندیدہ مصنفہ فرحین بلال کی شادی کا احوال
عالیہ بخاری اور راحت جبیں کے ناول
ٹی وی فنکارہ کلثوم سلطان کی یادیں
معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ دستک
نبی کی باتیں اور دیگر مستقل سلسلے
شعاع کا اپریل کا شمارہ آج ہی خرید لیں

کردی۔ بڑی تائی کے ڈرامے کے منظر اور دادی کے تسبیح کے دانے ایک ساتھ چلے۔ عبیو اور حمیرا کریم بی کی مدد کو جا چکی تھیں۔ برتنوں کا ایک ڈھیر سنک میں جمع تھا۔

انسان بھی عجیب چیز ہے۔ ہر حادثے سے گزر کر پھر شروع ہو جاتا ہے۔ ایگشن۔ سین ون۔

کریم بی۔ دیگچیوں کے ڈھکن اٹھائے بڑی سی پلیٹ کے مختلف کونوں میں چچا عبدالعزیز کے کوارٹر میں بھجوانے کے لیے سالن نکال رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ڈوئی اور اختیارات دونوں تھے۔ کوفتوں کا شوربہ اور خشک بھنڈیاں گڈمڈ ہو گئیں تو انہیں پروا نہیں تھی۔ گو ان کو ہدایت تھی کہ پہلے سالن ان کے کوارٹر میں بھیجا کریں سلیقے سے ٹرے لگا کر جیسے کسی انسان کو کھانا دیا جاتا ہے۔ مگر اتنی بے ایمانی تو وہ اپنا حق سمجھ کر کرتی تھیں۔ پہلے گھر والے اور مہمان تو کھالیں۔ میاں عبدالعزیز کا کیا ہے جا بارہے گا کھانا۔ وہ سارا دن کرتے بھی کیا ہیں۔ (پھیرے لائے تو ہرا دھنیا بھول گئے۔ دوبارہ بھیجا تو فالتو پیسے دے کر آ گئے۔ بیٹھے بیٹھے بڑی بی بی یا حقہ گڑگڑا لیا۔ حالانکہ وہ سراسر بہتان تراشی کر رہی تھیں۔)

چچا عبدالعزیز اور کریم بی تقریباً "ایک ہی ساتھ اس گھر میں داخل ہوئے تھے اور کم و بیش ایک ہی درجے پر فائز یکساں احترام دیے جانے کے باوجود دونوں ایک دوسرے کو یکساں ہی ناپسند کرتے تھے۔ اس فرق کے ساتھ کہ چچا عبدالعزیز جو ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر اپنی زندگی سے قانع تھے مگر کریم بی کو اپنے ماضی کے کچھ حصوں سے سخت اختلاف تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ان کو دہرا کر ان میں سے غلطیاں نکالتی رہتی تھیں۔ ہر ایسی کہانی جیسے ان پر لکھی گئی تھی۔ وہ کسی کردار کو رو تا دیکھ کر تقدیر کا گلہ ایک طویل آہ کی صورت بھرتیں۔ گھسے پٹے مکالمے ان کی روح کھینچ لیتے کتنی دیر دوان پر سر دھنتیں۔

کریم بی نے کہیں سے سنا تھا۔ ان کی اپنی منظور نظر کہانیاں لکھتی ہے۔ گو ان کے زمانے میں کہانی لکھنے والی عورتوں کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ کہانیاں چھپ کر پڑھی جاتی تھیں۔ صرف بہشتی زیور پڑھنے کی اجازت تھی اور اجازت دینے والوں نے شاید خود بھی نہیں پڑھا تھا۔ منصور خیری برادران عورت کے ایسے قصے بیان کرتے کہ روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔ اور ایسے میں کوئی بھلی بی بی کتاب پڑھتے پکڑی جاتی تو مجرم ٹھہرتی اور سزا کے طور پہ اس کی فوری شادی کر دی جاتی۔

وہ بھی کوئی عورت ہوئی جو لوگوں کے عشقوں کے قصے پڑھے۔ عیبوں کو چھپانے کا حکم ہے۔ عورت بذات خود ایک عیب تھی لہٰذا پوشیدہ تھی۔ ایسے خفیہ ماحول میں پل کر بھی کریم بی کو یقین تھا ان کی زندگی میں کچھ نہ کچھ فلمی ضرور ہے۔

"کبھی میری بھی کہانی لکھو۔" عبیو سے التجا کرتیں۔

وہ گڑبڑا جاتی۔ "میں کہانیاں تو نہیں لکھتی۔ ڈرامہ لکھتی ہوں۔ وہ بھی یونہی سا ہوتا ہے۔"

"چلو پھر ڈرامہ ہی لکھ دو۔ یونہی سا۔"

"کیا ہے آپ کی کہانی؟" وہ اپنا اسکرپٹ چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔

"لکھو بیٹی میں گیارہ سال کی عمر میں بڑے رام پور میں پیدا ہوئی۔"

"جی۔" وہ ششدر ان کی طرف دیکھتی۔

"بس بیٹی۔" وہ آہ بھرتیں۔ "پیدائش اس دن ہوتی ہے جب آپ کی آنکھ میں پہلا آنسو آتا ہے۔ یہ وہ تاریخ ہے جب میرا نکاح چالیس سالہ شخص سے ہوا جو دو ہی سال میں مجھے چھوڑ گیا۔"

کریم بی چچا عبدالعزیز کو کھانا پہنچا کر آئیں تو حمیرا برتنوں سے فارغ ہو چکی تھی۔ عبیو کافی کے بیچ چمچے سے رگڑ کر جھاگ پیدا کر رہی تھی۔ کریم بی کو کام میں جلدی پسند نہیں تھی۔ جو کام آرام آرام سے ہو سکتا ہے اس میں جلد

باڑی کی نیا صورت۔ انہوں نے حمیرا کی دھلی ہوئی پلیٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک دم کنڈم کر دیں۔ دن بھر میں کھانا ہوتا وہ دن کریم بی کے لیے عید ہوتی تھی۔ صبح سے کھانا پکنا شروع ہوتا اور پہلا نوالہ ٹوٹنے تک بچ جاتا۔

ساری رات باورچی خانہ سمیٹا جاتا۔ برتن دھل کر خشک کر کے واپس الماریوں میں جاتے۔ اس رات چین کی نیند سو نہیں سکتا تھا کیونکہ رات بھر کریم بی کے ہاتھوں چینی بازیگروں کی موسیقی جاری رہتی۔

فریج میں بچی ہوئی خوراک ذخیرہ کی جاتی۔ ان کا خیال تھا دعوت کا کھانا دعوت والے روز مزہ نہیں دیتا۔ اگلے دن ہے۔ سو وہ ایسی مومن تھیں جو کل کے رزق کے لیے فکر مند تھیں۔ شیشے کے ڈبوں میں کھانا بھر کر پلاسٹک Wrap چپکاتے انہوں نے خود سے کہا۔ "پتا نہیں کہاں دیکھا تھا اس کو؟"

"کریم بی آپ یوم الست پر تو ملاقات ہوئی ہو گی۔" عبیر نے برق رفتاری سے کافی پھینٹتے ہاتھ روک کر کہا۔

"کافی بن رہی ہے یا پائے پک رہے ہیں۔" عثمان نے دروازے پہ استادہ ہر ایک کو مصروف دیکھا۔

"خود ہی تو کہا تھا اچھی ہو؟" عبیر بڑبڑائی۔

"مگر یہ کب کہا تھا کہ برازیل چلی جانا۔"

"بڑا العذاق۔"

کریم بی نے خفا ہو کر کہا عثمان گھبرا گیا۔

"لیکن کریم بی میں نے تو عبیر کی بات کا جواب دیا تھا۔"

"میں نے بھی تو عبیر ہی کی بات کا جواب دیا ہے۔" فریج کا دروازہ دھپ سے بند کر کے مطمئن ہو گئیں۔

وہ جب کچی مٹی کے رنگ جیسی سنہری بھاپ والی کافی سے بھرے مگ کی ٹرے لے کر کمرے میں پہنچی تو مختصر سے کمرے میں لوگ اپنی اپنی پسند کی نشست سنبھالے کافی کے بجائے ـــــ سر کے لیکچر میں محو تھے۔ کشن بچھی اسٹولز کھڑکی کی چوکھٹ جس کا جہاں جی چاہا۔

ان کی یہ کتاب کسی ہفت روزہ میں چھپ رہی تھی۔ اس مرتبہ ان کا چیپٹر 76ء کے الیکشن تھے۔ الیکشن فوری بعد کے حالات میں تاریخ کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ ہر آنے والے نے واقعات کو اپنی سہولت کے مطابق کیا۔ سچ کیا تھا۔ توہمات کے انبار میں دب کر رہ گیا۔

دھاندلی ہوئی۔ دھاندلی بالکل نہیں ہوئی۔ اکا دکا ہوئیں۔ پھر ایک منافق کی طرف سے نافذ کیا گیا نظام۔ جس نظام سے دلچسپی تھی نہ دھاندلی سے۔ پتا نہیں ایسے لوگ کیا کرنے آپ پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ کہتے ہیں سال اس ملک میں بے ایمانی کا راج رہا۔ چالیس سال اس ملک میں زیادتیاں ہوئیں۔ پچاس سال سے یہ سازشوں کا شکار ہے۔ ساٹھ سال سے ایک لمبی لکیر۔ ہر دس سال بعد گنتی بڑھ جاتی ہے۔ حساب ٹھیک ہو ہے۔ تاریخ درست نہیں ہوتی۔

جب جمال نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے ٹرے پکڑی تو نہ وہاں بیٹھنے کی جگہ تھی نہ اس کا کوئی ارادہ۔ جانے نہیں کب کی اپنی جگہ آپا کے پیروں کے پاس بچھے کشن پر بنا چکی تھی۔ اب اس کو بیٹھنا بھی چاہیے وہ نہیں جانتی لیکن جب سخن طراز آپا ہوں اور عثمان نے اس کے لیے سمٹ کر جگہ بھی بنا ڈالی ہو تو جائے فرار بچتی ہی کہاں؟ کی تقسیم کے دوران بحث ذرا دیر کو تھمی لیکن پھر سے سوالوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ وہ عثمان کے برابر ایک سائز کے چھوٹے اسٹول پر بیٹھی بت کی طرح ساکت ننھے ننھے سپ لیتی رہی۔

حالات بدلیں گے؟

تبدیلی آئے گی؟ چہروں کی؟ نظام کی؟

www.pkdigest.com

کوئی صبح آئے گی جب اجالوں کی نوید ملے؟
لوگ محض سوالوں کی زد میں تھے۔ جیسے ہر مسئلے کا حل ابا ہی چھپا کر بیٹھے ہوں۔
اگلا سوال فاروق کی طرف سے آیا تھا۔ جیسے اچانک انہیں احساس ہوا کوئی اور بھی ہے۔
"آپ کیا کرتے ہیں؟"
"میں لکھتا ہوں۔" اس نے مختصر لیکن دھیما جواب دیا۔
"فکشن؟" اس نے محض نفی میں سر ہلایا
"ابھی یہاں آنے سے پہلے جب بچوں نے مجھے فون کیا اور آپ کو ساتھ لانے کی اجازت مانگی تو وہ آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔"
ان کی آواز میں اس کی تعریف سے زیادہ اپنے بچوں کے لیے فخر تھا۔ ایک غیر محسوس سی سرخی اس کے چہرے پر جھلکی اور غائب ہو گئی۔ زرہ نوازی' مہربانی جیسے کسی رسمی جملے کی اس سے نہ توقع تھی' نہ اس نے اظہار کیا۔
"میں آپ کی نسل کو بہت Fascinate کرتا ہوں۔ میری طرح اور بہت لوگ ہیں جن کو 70ء کی دھائی پر رشک آتا ہے۔"
سر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے۔
"یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کی تاریخ کا بہترین زمانہ وہ سمجھا جاتا ہے جب پاکستان دولخت ہوا۔ صرف ایک اسی بات سے اندازہ لگا لیجیے' ہمارا باقی ماضی کیا تاریک رہا ہو گا۔"
وہ کچھ دیر تاریکی میں ڈوبے رہے۔
"دس دس سالہ طویل مارشل لاء کے کئی دور۔ مریض' پانچ بینم پاگل حکمران' ظالم آقا۔ میری پشت پر آج تک ان پانچ کوڑوں کے نشان ہیں' جو جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے پر میری پیٹھ پر داغے گئے۔ اس نے ہم بے وقوفوں کو یقین دلا رکھا تھا کہ ہمیں کوڑے مار کر وہ دراصل اسلام نافذ کر رہا ہے۔ اس کے ساتھی فخر سے ان مظالم کو اسلام میں جائز قرار دیتے تھے۔ جاہل ملا مذہب کا ٹھیکے دار تھا۔ F.A/F.Sc سیکنڈ ڈویژن پاس بوٹوں والے اداروں کے سربراہ تھے۔ بے انصاف عدلیہ۔ میں نہیں جانتا قرآن میں جو لکھا ہے کہ شہد کی مکھی کو وحی آتی ہے اس کا کیا مطلب ہو گا لیکن مجھے اعلا عدلیہ کے سربراہ کا جنازہ یاد ہے جس پر شہد کی مکھیوں نے حملہ کر دیا اور جس کا کفن تار تار ہو گیا تھا۔ ہر بڑا ادیب' شاعر' دانشور ملک بدر ہوا۔ ریڈیو' ٹی وی کے ایک سے ایک اعلا یا بین ہوئے یا نوکری سے نکال دیے گئے۔ ہیروئن کے سر پہ ڈوپٹہ ڈھکا اور یوں اسلام کا نفاذ ہوا۔
اور یہ سب اس لیے تھا کہ ہم نے مارشل لاء ختم کرنے کی جدوجہد کی تھی۔ وہ طویل مارشل لاؤں کے درمیان ایک چار سال کی مختصر مدت کو سراہا تھا۔ اپنے ہیرو سے محبت کرنے کی سزا پائی۔ اس سزا کا سلسلہ ہیرو کے بعد بھی ختم نہیں ہوا۔ ہم وہ نسل جس پر آپ فخر کر رہے ہیں' نہ تین میں تھے نہ تیرہ میں۔"
سوالات ختم ہو گئے۔ فخر سرنگوں ہوا۔ لوگ گونگے ہو گئے۔
"آپ ہماری طرف مت دیکھیے فاروق صاحب! ہم تو آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ بس بہت ہوا۔ ہم اندھیروں کی آخری نسل تھے۔"
وہ یوں اٹھا جیسے روشنی مستعار لینے چلا ہو۔
"اجازت دیجیے۔ میری تمنا ہے ان سب کی طرح آپ کا ہاتھ میرے سر پر بھی رہے۔"
تمنا کی تکمیل کا انتظار کیے بغیر وہ ان سے رخصت ہوا۔ کونوں کھدروں میں بکھرے خالی مگ ٹرے میں جمع کرتے عثمان نے بے تکلفی سے کہا۔

"ٹھہرو یار! کیا جلدی ہے؟"
"ضرور ٹھہرتا۔ اگر صبح طلوع اسلام آباد نہ پہنچنا ہوتا۔"
"یقیناً" تمہاری کافی بدمزہ تھی۔" اس نے عبیر کو آگاہ کیا۔
"نہیں تمہاری کمپنی بور تھی۔" حمیرا کا حافظہ اس کی مدد کو آیا۔
"انہوں نے کہا تھا نا! وہ جب کسی جگہ بور ہوں وہاں نہیں ٹھہرتے۔"
"لیکن نہیں۔ وہ اتنا بور نہیں کہ ہمارے ساتھ بور ہو۔"
وہ سب جب ان کی اسٹڈی سے باہر نکل رہے تھے۔ اس نے لمحے بھر کو ٹھہر کر دوبارہ سر کی طرف دیکھا۔ ان کو جانے کی اجازت دے کر وہ ان سے بے نیاز ان سب کی طرف پشت کیے دیوار میں نصب اپنی کتابوں والی شیلف میں کسی کتاب کی تلاش میں گم ہو چکے تھے۔
اس کو لگا ان کی پشت سے پانچ روشنیوں اور نور کے دھارے پھوٹ رہے ہیں۔ اس جگمگ کرتی چراغاں میں وہ چندھیا گیا۔

☼ ☼ ☼

چھن چھن کر برستی چاندنی کھلی فضا میں درختوں کی چوٹیوں پر جھلملاتی پتوں سے چھن کر زمین پر اترتی اسی طرح جگمگا رہی تھی۔ چچا عبدالعزیز کے کوارٹر سے ان کے عہد کا کوئی اداس دھن والا مایوسی سے بھرا گیت کھلی فضا میں تیرتا وہاں تک آیا جہاں وہ اس کو رخصت کرنے برآمدے تک آئے تھے۔
"بعض دھنیں کیسی عزیز ہوتی ہیں۔ وہ آپ کو اداس کر دیتی ہیں لیکن اس اداسی میں ایک انوکھی سی خوشی ہوتی ہے۔"
حمیرا پتھر کی ٹھنڈی سیڑھیوں پر دونوں گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر بیٹھ رہی۔
باری باری جیسے لمحہ موجود کے سحر کی گرفت میں آتے' جو جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ رہا۔ فاصلوں سے ایک دوسرے سے دور مختلف سمتوں میں رخ کیے۔ چاندنی ان کو بھگوتی رہی۔
بھلا نا بھلانا۔ یہ راتیں۔
موسیقی بھی کس قدر پریشان کرتی ہے۔
مستی کا عالم' یہ کھوئے سے ہم تم۔
پنکج ملک کی بھرپور آواز ہوا کی لہروں میں اسرار گھول رہی تھی۔ آواز میں عجیب تاثیر ہوتی ہے۔ ایک ہی سُر ایک ہی آواز لیکن مختلف لوگوں کو مختلف جہانوں میں لے جاتی ہے۔ عبیر نے ابا کے کمرے کی بند کھڑکی کی طرف دیکھا۔
پردوں اور شیشوں کے پیچھے سے جھلکتی ہلکی روشنی چاند کے سامنے مدھم ہو گئی تھی' اس نے سوچا پتا نہیں ابا اس وقت کیا سوچ رہے ہوں گے۔
نیم تاریکی میں بکھری چاندنی میں جمال نے اوپر کی سیڑھی سے پاؤں نیچے لٹکائے۔ اسے کسی چیز کا قلق نہیں تھا۔ ماضی تھا جو خوش اسلوبی سے گزر گیا۔ وہ اس عورت کو جھکی عورتوں کی طرح بھرمشقت میں جتے چھوٹی چھوٹی باتوں پر چڑچڑ کرتے دیکھا تو بہت مرتبہ سوچتا۔ اس نے کبھی اس عورت سے محبت بھی کی تھی۔ کیا وہ محبت اب بھی دل میں کسی جگہ سر اٹھاتی ہے؟ محبت شاید پانے کی خواہش تک توانا رہتی ہے' پھر کھو دینے کے اندیشوں سے زندہ ہو جاتی ہے۔ وہ محبت کہیں کسی کونے میں موجود تھی۔ لیکن وہ اسی عورت سے تھی' آج والی عورت نہیں۔ محبت کے

AKS PROCESS

وہ چند دن اس نے حنوط کر کے ان کو محفوظ کر لیا تھا۔ آج بھی جب وہ عورت اسے نظر آتی ہے تو اس کے دل میں کہیں کوئی محبت نہیں جاگتی۔ ہاں جب وہ پچھلے دنوں کو پلٹ کر دیکھتا ہے تو محبت وہاں موجود ہوتی ہے۔

اس نے وسل پر گانے کی دھن دھرائی۔

یہ بوندوں کی رم جھم۔

اونچے چھتنا ور درختوں کی اوٹ سے ڈوبتا چاند۔ کچھ دیر اس کی اداس دھن کے ساتھ چہرے پر چھائی اداسی کے ساتھ جھلملایا۔ پھر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

اس سے ذرا فاصلے پر نچلی سیڑھی پر عثمان نے سب کی طرف دیکھا۔ وہ بچپن سے ان چہروں کو اپنے اردگرد دیکھتے رہنے کا عادی تھا گو ان میں ایک نیا چہرہ شامل ہوا تھا اور ایک پرانا نکل گیا۔ شطرنج کے مہروں کی طرح بکھر کر بیٹھے نہ وہ کسی کو مات دینا چاہتے تھے نہ کسی فتح کے منتظر تھے لیکن کبھی کسی نے گھوڑے کی مرضی بھی معلوم کی ہے۔ کیا پتا اس کی خواہش ساڑھے تین گھر چلنے کی ہو یا وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سستا کر جگالی کرنا چاہتا ہو۔

عثمان ایسا ہی گھوڑا تھا۔ اس کی دوڑ جس کے ساتھ لگی وہ اس سے آگے نہیں نکل سکتا تھا۔ آج بھری محفل میں جو وہ سب کو لیکن دراصل صرف اسی کو پیغام دے کر گئی تھی، اس کے پیچھے ڈھائی گھر بھی نہیں چلا اور اس نے جاتے جاتے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ لیکن اپنا پیغام اس تک پہنچا گئی تھی۔

"وہ کھوئے سے ہم تم۔ ہمارا پنکج ملک اپنی بھاری بھیر آواز میں بچوں کی سی لاپروائی سے لوگوں کا نقصان کیے دے رہے تھے۔

عثمان نے گھاس کے قطع سے پرے بے رنگ شکستہ دیواروں سے چمٹی بیلوں کو بے معنی انداز میں دیکھتے کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ بعض دفعہ ہم ایسے سحر میں گرفتار ہوتے ہیں کہ اسے توڑ کر طلسم پارہ پارہ نہیں کرنا چاہتے لیکن اندر ہی اندر بڑی خاموشی سے ہمارا وجود ریزہ ریزہ ہوتا رہتا ہے۔

فاروق ایک ٹانگ اوپر والی سیڑھی پر لٹکائے دوسری ٹانگ سے نچلی سیڑھی پر اپنے وجود کا وزن ڈالے بوالوں میں گم تھا۔ وہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھا نہیں تھا لیکن جانے کا کہہ کر گیا بھی نہیں۔ وہ ان سے پہلی دفعہ ملا۔ وہ محض چند منٹ کے لیے آیا لیکن ایک طویل وقت سے ان کے ساتھ تھا۔ کبھی کبھی ہمیں لگتا ہے کہ ہمیں واقعی پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

"یوں دیکھا جائے تو..." فاروق نے سوچا "سب کے انٹرسٹ جدا جدا ہیں لیکن اکٹھے بیٹھے اپنے علیحدہ وجود قائم رکھے بھی وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں جیسے پزل کے ٹکڑے الگ نظر آنے کے باوجود ایک مکمل تصویر بناتے ہیں۔"

وہ ان کے درمیان پہلی دفعہ آیا اور شاید آخری بھی یوں بار بار آنے کی بظاہر کوئی وجہ بھی تو نہیں لیکن پیارے لوگ ہیں۔ وہ جمال صاحب ہیں جو بی بی کرتے پگڈنڈیاں چھوڑتے ہیں۔ سیڑھی پر ایسے بیٹھے ہیں جیسے خواتین موٹر سائیکل کے پیچھے۔

رضا ہے۔ ذمہ دار سنجیدہ اس کو ہر ایک پر فخر ہے۔ اپنی ماں سے لے کر بک بک کرتی ان لڑکیوں پر۔ اپنے دوست پرُ دوست کے والد پر معلوم ہوتا ہے اس کے حصے میں صرف ذمہ داریاں آئی ہیں اور ذمہ داریوں پر فخر ابھی کچھ دیر پہلے اسے بتایا گیا تھا کسی رشتے دار خاتون کی سالی (یا نند وہ جو بھی ہوتی ہے۔) سے اس کا رشتہ آیا اور لوگوں کو خدشہ تھا کہ وہ اتنا پیارا بے وقوف ہے کہ آمادہ ہو جائے گا۔ اسے لوگوں نے مشکل سے روک رکھا تھا۔

یہ عثمان ہے۔ ستون سے کمر ٹکائے اور اپنے چمکتے جوتوں والے پاؤں دور تک پھیلائے گانے کے ساتھ بول دُہراتا۔ وہ نہیں جانتا کیا قصہ تھا۔ جب سنڈریلا اپنا جوتا گرا کر بھاگی تو وہ اس کے پیچھے لپکا کیوں نہیں۔ (لیکن اس کو

لگا۔ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔) اس نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

وہ حمیرا ہے، جس نے سب سے پہلے پنکج ملک کو سن کر سیڑھیوں پر چوکڑی ماری تھی۔ وہ خاموش بیٹھے بیٹھے اچانک فلسفی بن جاتی ہے۔ ایک اہم جملہ بولتی ہے اور ہر اہم فقرے کی داد کی توقع اپنی دوست سے کرتی ہے۔ بے سمجھ سی، سادہ لڑکیاں لیکن دوستوں کی محبت نے ان کو بہت اہم بنا دیا ہے۔

کیا وہ ان سے آج ہی ملا تھا؟ یا زمانوں سے ان کے ساتھ تھا۔ وہ ان کے مزاجوں سے کیسے کس طرح آگاہ ہو گیا تھا؟ وہ کیا چیز تھی جو ان کے درمیان سے اجنبیت ختم کر دیتی تھی۔

اس نے اہم جملے بولنے والی حمیرا اور اس کی دوست کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک صلح جو ہے اور دوسری کمان میں تیر تانے ہر وقت حملے کی منتظر رہتی ہے۔ سوائے آج کے دن کے۔ اس نے اس طرف دیکھا۔ آج، آخر آج کیا ہوا تھا۔

اچانک کسی گھبراہٹ نے اس کو آن گھیرا اور تھوڑی دیر وہ یہاں کھڑا رہا تو پتھر کا ہو رہے گا۔ اور وہ پتھر کا ہونے نہیں آیا۔ وہ وحشت سے ٹھہرے ہوئے منظر میں ایک دم اٹھ کر کھڑا ہوا۔

"سوا ب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔" وہ سرعت سے ان کے درمیان سے نکل گیا، جیسے دیوار میں گڑھی فوٹوگراف میں سے مستقل نظر آنے والی کوئی شکل اچانک نکل کر چلی جائے۔ جگہ خالی خالی چھوڑ کر۔

"ارے واہ!" عثمان نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ "یہ بھی کھسکا ہوا ہے۔"

سیڑھیوں سے پرے برآمدے کے پار گھر کے دروازے کے دونوں پٹ ایک جھٹکے سے کھلے۔ روشنی کا ایک راستہ برآمدے سے سیڑھیوں تک بچھتا گیا۔ درمیان میں کریم بی کا سراپا روشنی میں گڑھی ایک فریم کی طرح نمودار ہوا۔

"ارے ہاں یاد آگیا۔ اے لو میاں تم وہی تو ہو جو اس دن کہتے تھے۔ میں میاں عباس کے بچپن کا دوست ہوں اور اچانک بھاگ لیے تھے۔ کہاں گیا؟"

انہوں نے سیڑھیوں پر بیٹھے لوگوں کی طرف نگاہ گھمائی۔ "پھر چلا گیا؟"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو — راحت جبیں — قیمت: 225 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں — فائزہ افتخار — قیمت: 500 روپے
☆ محبت بیاں نہیں — لبنیٰ جدون — قیمت: 250 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

رفعت ناہید سجاد

چراغ آخر شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادی اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پُراعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونیورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

www.pkdigest.com

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے، وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیر اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اصرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کو نا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کرکے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

انہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جس کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

٩

نویں قسط

آئے دن کے بم دھماکے جن کی تعداد میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا جارہا تھا جیسے کسی نے پٹاخہ چھوڑا ہو۔ یہ دنیا کا واحد ملک ہے، جہاں ایک خودکش حملے میں سو جانوں کے زیاں کے باوجود بازار آباد رہتے ہیں اور سڑکوں پر ٹریفک اسی تیزی اور معمول سے بستا رہتا ہے، جیسے یہ حادثے زندگی کا حصہ نہ ہوں۔ سلولائیڈ پر چلتے ہوں۔ یہی واقعہ کسی پیٹ بھرے ملک میں پیش آتا تو دہشت اور خوف سے لوگ گھروں میں مقید ہوجاتے۔ لیکن پاکستان جان بچانے کی خاطر گھر بیٹھ جانے جیسی عیاشی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگر جینا ہے تو روز مرہ کی مشقت لازم ہے روٹی کے لیے باہر نکلنا ہے۔

آج ملک میں ایمرجنسی نافذ ہوئے بیس دن گزر چکے تھے۔ جاڑوں کی مرجھائی دھوپ اور زرد رو چاندنی اس بار بار گزرنے والے واقعہ کو ایک دفعہ اور گزرتا دیکھ رہی تھی۔ کیا کوئی کہیں خاتمہ ہے؟ یا ہم اسی چکر کے گرد گول گھومتے رہیں گے۔ آنکھوں پر پٹی باندھے کولہو کے بیل کی طرح کوئی ہمیں ہنکاتا جاتا ہے۔ صرف ہمارے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی ٹن ٹن بتاتی ہے سفر جاری ہے۔ سفر ختم نہیں ہوا منزل دور ہے۔ منزل ہے بھی کہ نہیں؟

قیصر نے آج صبح ہی بڑے کرب سے بتایا تھا۔ آج سارہ حق بھی گرفتار کرلی گئی ہیں۔ مال پر جلوس کے دوران ان کے ساتھ بہت سے اور بھی گرفتار ہوئے کالے کوٹوں والوں سے جیلیں بھر گئی ہیں۔ یوم سیاہ سے اب تک ہر روز قیامت کی ایک گھڑی گزرتی ہے۔ لیکن یہ قیصر کی معصومیت ہے کہ ان سارے گرفتار شدگان میں اس کو تڑپایا تو صرف سارہ حق کی گرفتاری نے۔

یوم نجات سے یوم سیاہ تک۔ پتا نہیں اس سارے عرصے میں کتنی آہنی فصیلیں گاڑی گئی ہیں۔ رینگتی، سسکتی ہچکیاں لے کر زندگی کرتی۔ نام نہاد جمہوریت بار بار جھٹکے کھا کر رک جاتی جیسے وہ Trains رکتی تھیں جو نئے وطن میں آنے والوں کو لے کر چلی تھیں، چلتی تھیں اور رکتی تھیں۔ پھر جھٹکے کھاتی تھیں اور نیم شکستہ بدنوں کو نڈھال حالت میں لے کر داخل ہوتی تھیں۔ ایسے میں جب ابھی حواس بحال بھی نہ ہوئے تھے، آپ نئی جگہ سے ٹھیک سے مانوس بھی نہ ہوپائے تھے کہ پھر مارشل لاء کا دھکا لگا تھا۔ ایسے ہی دھکے آقاؤں سے کھاتے تو وہ اپنی زمین پر منہ اٹھا کر جینے کے مشکل سے قابل ہوئے تھے۔ دس سال من مانی کرتے اور من مانیوں کے جشن مناتے ہم ایک اور مارشل لاء میں داخل ہوگئے۔ جیسے ایک سرنگ سے نکل کر ٹرین کسی اور تاریک سرنگ میں سے گزرنے لگتی ہے۔ حکمران اس تاریکی کو روشنی بتاتے ہیں۔ عدالتیں ظلم کو انصاف کہتی ہیں۔ پیچھے کی طرف بھاگتے خوشامدی۔ قصیدہ پڑھتے ہجو بیان کرتے۔ بارہ سال اس دور سے گزر گئے۔ "آدھا ملک گنوا کر ہتھیار پھینک کر۔" پھر ٹرین نے وسل دی۔ سفر شروع ہوا چھوٹے اسٹیشنوں سے جنکشن تک گیارہ سال کا ایک اور طویل آمرانہ عہد۔ نصف حصہ ایمرجنسی، مارشل لاء، جیل، 'Abdo'، دھاندلی، چور بازاری، لوٹ مار، غنڈہ گردی، بقیہ نصف زندگی سے بے زار اونگھتی سسکتی اکتائی ہوئی زندگی گزارتی ایک اور ناکارہ جمہوریت۔ لوٹنے والے کو ترستی۔

سفر در سفر ایمرجنسی در ایمرجنسی آنے والا آتا بھی مارشل لاء سے ہے، جاتا بھی مارشل لاء سے ہے۔ فرعون سمجھتا تھا وہ خدا ہے اس کو قائم رہنا ہے۔

وہ آتا ہے تو اس کو یقین ہوتا ہے وہ فرعون ہے۔ اس کو دنیا کے خاتمے تک رہنا ہے۔ پھر جہاز گرتا ہے یا موڑ دیا جاتا ہے۔ دوسرا کوئی فرعون نئے خدا کے روپ میں۔ ہم نسلوں سے مایوس ہیں۔ امید بندھتی ہے لیکن پھر نیا آدمی نئی مایوسی لے آتا ہے۔

www.pkdigest.com

پرانی نسل کے سب افراد جیل میں تھے۔ ہر سنا ہوا نام گرفتار تھا۔ ایسے میں وہ لوگ سڑکوں پر آئے، جنہوں نے کبھی زمین پر قدم نہیں رکھا تھا۔ پاکستان میں لوگوں نے ان سے کبھی کوئی امید بھی نہیں لگائی تھی۔ امیر گھروں کے امریکن زدہ نوجوان انگریزی بولتے، اردو میں اٹکتے پھڑ ابر گر پڑے لیکن بے حد قابل بہت زیادہ پڑھے ہوئے۔ ملکی حالت پر کڑھتے جن کا جذبہ حب الوطنی قطعی مشکوک نہیں تھا۔

ایک وہ طبقہ بھی تھا جس نے فرار حاصل کرلیا تھا۔ وہ کب کے ملک چھوڑ کر جاچکے تھے۔ آسائش کی محفوظ زندگی گزارتے امریکہ، کینیڈا میں بیٹھے پاکستان کے فٹ پاتھوں پر چلتے "ٹریفک کے قانون نہ جاننے والوں" کا تمسخر بناتے، خود کو انٹرنیشنل شہری سمجھتے، انڈیا اور اسرائیل کا دفاع کرتے۔ وہ سات سمندر پار سے پاکستان کو تمیز سکھاتے رہتے تھے۔

ایسے وقت میں اس ناگہانی کے خلاف پہلا جلوس lums سے نکلا، پھر قائداعظم یونیورسٹی کے استاد اور شاگرد شریک ہوئے اور پورا ملک احتجاج کے لیے کھڑا ہوگیا۔ کراچی میں خاموشی تھی۔ یہ وہ شہر تھا جس نے ہر عہد میں ہر مارشل لاء کے خلاف علم اٹھایا اور پہلی گولی کھائی تھی۔ اب وہ مصلحت پسند ہوگئے تھے۔ چونکہ ان کا اقتدار مارشل لاء سے منسوب ہوتا تھا لہٰذا وہ مارشل لاء کے خلاف کارروائی کا حصہ نہیں بنتے تھے۔

سرحد میں خودکش دھماکے تھے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح مظلوموں کو ذبح کرتے۔ ناموس کے نام پر تخریب قتل کرتے۔ بلوچستان زندگی کرنے کو ترس رہا تھا۔ ایسے میں بچوں کی طرح محفوظ اور معصوم دارالحکومت بھی سرگرم تھا۔ کبھی لال مسجد، کبھی سپریم کورٹ۔ جس جگہ کسی کے باہر آنگن میں اگا پھول کوئی نہیں توڑتا تھا، وہاں بے گنتی

جانوں کا زیاں کیا گیا۔
ٹی وی بند ہو گئے تھے۔ حالانکہ لوگوں کی واحد امید اب ٹی وی رہ گیا تھا۔ کوئی اینکر پرسن کسی امید کا یقین دلاتا ہے۔ کسی کل کی کوئی اچھی آس اور پھر سے مایوس قوم جینے کی خواہش میں جاگ اٹھتی ہے۔
الیکشن ہو گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔
اگر الیکشن نہ ہوا؟
اور اگر سب ٹھیک نہ ہوا؟
عبیر کتنی دیر سے اعجاز کے برابر بیٹھی آنے والوں کا انتظار کرتی تاریخ کا صفحہ بن گئی تھی۔
اعجاز نے کوئی ہنگامی میٹنگ بلوائی تھی۔ اس کی خواہش تھی رزلٹ کے فائنل ہونے سے پہلے وہ اپنے گروپ کے لوگوں کو اکٹھا کر کے آئندہ کے لائحہ عمل سے آگاہ کرے۔ مایوسی بھری فضا سے نکلنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا۔ اپنے حصے کی اینٹ لگانے کا۔ اسے ایک چھوٹی سی تقریر کرنی تھی۔ اور وہ اس تقریر کو کسی ہائیڈ پارک میں نہیں لے جا سکتا تھا۔ ممکن ہو اور سب جمع ہو گئیں تو کیمپس ہی بہترین جگہ تھی مگر یونین اور الیکشن کی بندش کے بعد بیس سالوں سے یونیورسٹی پر مختلف گروہوں کا قبضہ تھا۔ الیکشن چاہے ملک میں ہوں یا اداروں میں لوگ اپنے اپنے اعمال کے لیے کسی کے آگے جواب دہ ہوتے ہیں۔ لیکن جب یہ طریقہ بند ہو جائے تو طاقت ور چھا جاتا ہے۔
قبضے کی ہوس اقتدار کی خواہش ظلم و زیادتی سے ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ جہاں قانون نہ ہوں وہاں جنگل کے قانون چلتے ہیں۔ جو سب سے ظالم ہے اختیارات اس کے اور اختیارات والے اپنی ڈوئی سے بے اختیاروں کو ہانکتے جاتے ہیں۔ کسی بھی جگہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بڑی سے بڑی تقریب منعقد ہو تو وہ سینہ تان کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔
"آپ نے ہم سے اجازت لی ہے؟"
یونیورسٹی میں کوئی اپنی سالگرہ کا کیک بھی ان کی اجازت کے بغیر نہیں کاٹ سکتا' ان کو اپنے نظریات کے حامی استادوں کی تائید حاصل ہے۔ STC میں کسی فنکشن کا تصور محال تھا۔ آڈیٹوریم خواب و خیال ہوا۔ "جلاوطن" ایک معجزے کی طرح V.C کی اسپیشل اجازت سے چلایا گیا لیکن جتنی دیر جاری رہا منتظمین خوف سے کانپتے رہے۔ کوئی دروازہ کھول کر اندر آتا تو لگتا اس کے پیچھے نعرے مارتا ایک جلوس ہے' جو ڈرامے کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ لیکن چونکہ وی سی صاحب پہلی سیٹ پر براجمان تھے' لہٰذا لوگ جو اس نیت سے داخل ہوتے تھے۔ مؤدب" آخری سیٹوں پر بیٹھ رہے تھے۔
لیکن اس کے بعد سے ایک تسلسل کے ساتھ دھمکی آمیز لہجوں میں ان کو ان کے انجام سے ہم کنار کرنے کی اطلاعات موصول ہوتی رہتیں۔ جس پر عملی جامہ پہناتے ان کو ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔
کینٹین میں چونکہ لڑکے لڑکیوں کے لیے الگ الگ نشست گاہیں تھیں' لہٰذا کسی میٹنگ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سنا ہے 77 تک لڑکے لڑکیاں ایک ہی جگہ بیٹھتے تھے لیکن کیونکہ اب ان کے اخلاق خراب ہو چکے ہیں یا ان کے خراب ہو جانے کے اندیشے ہیں' لہٰذا ان کو ایک دوسرے سے دور کر دیا گیا ہے۔ اگر ڈپارٹمنٹ سے باہر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ گھومتے نظر آئیں تو ان کی ٹانگوں کو ان کے دھڑ سے الگ کر دینے کی خوشگوار اطلاع دی جاتی ہے اور اطلاع کنندہ جانتا تھا کسی بھی وقت اس کی یہ ٹانگیں اس کے وجود کا حصہ نہیں رہیں گی۔ ان کے ہیڈ کو بھی وقتاً "فوقتاً" ایسی دھمکیاں ملتیں لیکن پتا نہیں وہ کس جرأت سے شعبے میں ایسوں کا عمل دخل روکے ہوئے تھے۔

امتحانات کے دوران ٹانگیں توڑ دینے والے گم نام خطوں اور Messages کا انبار لگ گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس ذہنی کوفت سے وہ امتحان کی تیاری مکمل توجہ سے نہیں کر سکی۔ کبھی خط عثمان کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ پھاڑ کر پھینک دیتا۔ ایسے خطوط ڈاک سے آتے تھے اور طالبہ کے بجائے اس کے کسی گھر والے کے نام ہوتے۔ اس میں تفصیل سے بتایا جاتا ان کی بہن (یا بیٹی) بے راہ رو ہو چکی ہے۔ وہ ہر وقت نامحرموں کے درمیان گھری بے حجابانہ پھرتی ہے۔ آپ کی ناقص تربیت نے اپنی پوری نئی نسل کو تباہ کر دیا ہے۔ آپ کی بیٹی تو جہنم میں جلے گی ہی۔ ایسے ماں باپ بھی کروڑہا سال دوزخ میں جلائے جائیں گے' جو اپنی اولاد کی اصلاح کرنے سے قاصر رہے۔ لہٰذا ایسے مرتدوں کا قتل 'جائز اور واجب ہے۔
کبھی ڈاک میں صرف ایک سوال لکھا ہوتا۔
"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟"
اگر وہ بتانا بھی چاہتی تو کسے بتاتی۔ خط تو ہمیشہ گم نام ہوتے۔ بھیجنے والے چلمن کے پیچھے سے دشنام طرازی کرتے۔
ایسے ہی خط رضا بھی پھاڑ پھاڑ کر آگ دکھاتا رہتا تھا۔
عبیر کیمپس پہنچی تھی تو اعجاز نہر کنارے' اداس بلبل کی طرح تنہا ٹہنی کے بجائے بینچ پر بیٹھا پھونس کی ہٹ سے چائے پی رہا تھا۔ وہ اس کے آنے پر بجائے خوش ہونے کے مضطرب سا ہو گیا تھا۔
"میرا خیال ہے مجھے میٹنگ بلانے کے بجائے میسجز کر دینے چاہیے تھے۔"
اس نے چائے کی پیالی پر آئی ملائی والی جھلی کو پھونک مار کر ایک طرف کرتے گھونٹ بھرا۔
"لیکن تم دونوں کے فون بند پڑے تھے۔ رضا نے بھی حسب عادت فون نہیں اٹھایا۔ میں تمہیں منع کرنا چاہتا تھا کہ مت آؤ۔"
"لیکن کل رات ہی کو تمہاری ای میل تھی کہ آؤ اور ہاں بہت فضول میسجز آ رہے تھے میں نے سم تبدیل کر لی اور رضا میٹنگ میں ہو تو سیل آف کر دیتا ہے۔" اعجاز کا چہرہ ہلکا سا پیلا ہوا۔
"امتحان ہو جانے کے بعد وہ لوگ کہتے ہیں تم آؤٹ سائڈر ہو۔ ہم یہاں آئے تو وہ ہمارا منہ سجا دیں گے۔"
"ہائیں! تم ڈر رہے ہو؟"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
شائع ہو گئے ہیں

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبیں قیمت: 225 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 500 روپے
☆ محبت بیاں نہیں لبنیٰ جدون قیمت: 250 روپے
منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

www.pkdigest.com

"ہاں! میں ڈر رہا ہوں۔"
اس نے پیالی واپس پرچ میں رکھتے بڑے شانت لہجے میں کہا۔
"میں ہر وقت ان کے آس پاس رہتا ہوں اور روز کچھ نہ کچھ ہوتے دیکھتا ہوں۔ حمیرا کیوں نہیں آئی؟"
"وہ نہیں آسکتی تھی۔ اس نے اپنی امی کو کہیں لے کر جانا تھا۔ جلوس میں بہرحال وہ موجود ہوگی۔"
"پھر تمہیں بھی تنہا نہیں آنا چاہیے تھا۔"
"تمہیں کیا ہو گیا ہے اعجاز؟ تم رضاکارانہ طور پر ہی پتھر کے زمانے کی طرف جا رہے ہو۔ میں خود آتی اور خود جاتی ہوں۔ کہاں ہیں باقی سب لوگ۔"
"تم دیکھ رہی ہو اس وقت صرف میں اور تم بیٹھے ہیں۔ حالانکہ کئی لوگوں نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔"
"ہیں تو انہوں نے وعدہ کیوں کیا تھا کیا واقعی کوئی بھی نہیں آئے گا؟"
"نہیں آجائیں گے۔ چھ یا سات تو آجائیں گے۔ ہمیں یہاں سے اتنے ہی لے کر چلنا تھا۔ لیکن ان کی تعداد سینکڑوں تک نہیں پہنچے گی۔"
"کیا وہ سب بزدل تھے؟ قیصر کہاں ہے وہ کیوں نہیں آیا؟"
"کیمپس کی طرف گیا تھا۔ پریویس کے کچھ لڑکے اس کے ساتھ آرہے تھے۔ آتا ہی ہوگا۔"
"یاد کرو اعجاز! جب ہم نے "جلاوطن" شروع کیا تھا لیکن آخر میں سب ٹھیک ہو گیا۔"
"لیکن یہ اس طرح نہیں ہے۔ کچھ کو فیل کرنے سے ڈرایا گیا ہے۔ کچھ کے ماں باپ کو ایسی خوف ناک دھمکیاں دی گئیں کہ انہوں نے اپنے بچوں کو کمرے میں بند کر دیا۔ کچھ کو عمر بھر روزگار نہ ملنے سے آگاہ کیا گیا اور اس میں کچھ غلط نہیں۔"
کھوکے والا لڑکا بھاپ اڑاتی چینی اور ملائی سے تر بتر چائے کا چھوٹا سا کپ اس کے لیے لایا تھا۔ کتنی دیر سے چائے کی وہ پیالی ان دونوں کے درمیان بنچ پر رکھی بھاپ کو فضا میں گم کیے جا رہی تھی۔ نہر کے آر پار رواں سڑکوں پر ٹریفک کا طوفان مچا تھا۔ نہر کا پانی گدلا اور کیچڑ بھرا تھا۔ درخت کی ٹوٹی شاخیں خشک پتوں اور گھاس پھونس کا ڈھیر اس کی سطح کے اوپر اوپر تیر رہا تھا۔ جس میں ہوا بھرے پلاسٹک کے خالی تھیلے پچکے ہوئے غبارے کی طرح ڈول رہے تھے۔ گڑگڑ کرتی شور مچاتی گاڑیاں اس تیزی سے گزر رہی تھیں جیسے کسی ویڈیو گیم کا منظر۔ بس ریموٹ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ (ریموٹ ہی تو ہاتھ میں نہیں) کبھی کبھی ہارن کے تیز شور میں جملہ ان سنا رہ جاتا۔ چاروں طرف گنجان آباد بستیاں تھیں۔ اپنے گھروں سے نکلتے اور پلٹ کر گھروں کو واپس آتے لوگوں کا اژدہام۔
وہ بنچ پر بیٹھی سڑکوں پر ٹریفک کی اس تیزی کو دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ ان کے دو چار ساتھی آئے اور رعشہ زدہ لڑکھڑاتی ٹانگوں پر قدم جما کر بیٹھ رہے۔ اعجاز کاغذ کھول کر بیٹھ گیا۔ "ایک جلوس نکالنا ہے۔ پُرامن کسی تشدد کی (روک تھام) کے بغیر۔ کسی بھی قیمت پر اشتعال میں نہیں آنا۔ ہم ایک تاریخ رقم کریں گے۔ بلا اشتعال احتجاج۔"
وہ نقشہ کھول کر سمجھا رہا تھا کہاں سے گزرنا ہے۔ مال کے کس حصے میں محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اسمبلی چیمبر اور گورنر ہاؤس سے بچ کر نکلنا ہے، ہم پر پتھراؤ ہر قیمت پر ہوگا۔ لڑکیوں کا کیونکہ، جلوس کے اس حصے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے وہ عورتوں کے حصے کی طرف جائیں گی۔ مینار کے پاس اگر سارہ حق باہر ہوتیں تو وہ بہتر طریقے سے لیڈ کر سکتی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ یاد رکھنا پولیس عورت ہو یا مرد وہ بے دریغ بال کھینچتے ہیں۔ دو ہتڑ مار کر دبوچ میں ڈال دیتے ہیں اور لے جا کر حوالات میں بند کر دیتے ہیں۔ بے وجہ گرفتاری پیش نہیں کرتی۔ ہماری تعداد پہلے ہی مختصر ہے۔ سارہ حق نے اپنے موبائل سے عبیر اور حمیرا کے لیے کہ Message

بھیجا تھا، عام طور پہ وہ موبائل چھین لیتے ہیں۔ سارہ حق کا چھینا ہوتا تو ان کی زندگی مشکل ہو جاتی۔
"کیا انہوں نے یہ پیغام ہمارے نام بھیجا ہے؟" عبیر نے حیرت سے پوچھا۔
"نہیں بس انہوں نے کہا تھا اپنی ساتھی لڑکیوں سے کہہ دینا۔"
"تب ٹھیک ہے۔" عبیر نے اطمینان کا سانس لیا۔
لڑکوں کا گروپ نقشے پر جھک گیا۔ لڑکیوں کے گروپ میں اپنے پروگرام پر مکمل اتفاق نہیں تھا۔ اس میں سے کچھ بڑی سڑک پر پولیس کا سامنا کرنا چاہتی تھیں۔ اختلاف در اختلاف۔ گروہ در گروہ۔
عوام کا ہجوم "لیڈر کا ہجوم" کوئی ایک لیڈر پیدا نہیں ہوتا، جو عوام کو ساتھ لے کر چلے۔ اپنے اپنے طور پر جدوجہد کرتے عوام۔ اپنے اپنے اقتدار کی جنگ لڑتے گروہ سب شیر کی طرح اپنے اپنے مخصوص دائروں میں راج چاہتے ہیں۔ دیہاتوں میں جاگیردار کا راج۔ ان کی شان میں گستاخی کرنے والوں پر کتے چھوڑ دیے جاتے ہیں، جو ان کے گوشت کو ہڈیوں سمیت بھنبھوڑ ڈالتے ہیں۔ کسی غدار کی اس جسارت کے بعد سارے گاؤں کو کان ہو جاتے ہیں پھر وہ کسی کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے۔ اپنا حق کیا ہے وہ ازل سے بے خبر ہیں۔ شہروں میں وزیروں مشیروں کے دھڑے ہیں اور یہ یونیورسٹی ہے۔ یہاں کا جاگیردار، طالب علموں کا ایک مخصوص طبقہ ہے۔ پورا ملک چھوٹے چھوٹے جنگلوں میں بٹا ہوا ہے۔ ہر بڑا سانپ چھوٹے سانپ کو نگل رہا ہے۔
اچانک ہی عقب سے ایک بھگدڑ، ہانپتا لڑکا ان کے نزدیک ٹھہرا۔ وہ اطلاع لایا تھا، قیصر کو کسی نے بہت مارا۔ اسے شدید زخمی حالت میں لڑکے ہسپتال لے گئے۔
کسی کے سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے کیا سنا تھا۔
وہ جہاں کھڑے تھے اسی طرح ہسپتال کی طرف بھاگ نکلے۔
اعجاز اس اطلاع لانے والے سے کیا پوچھتا رہا۔ واقعہ کیا تھا۔ سب اس کے کان تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ حادثے کس طرح ہو جاتے ہیں۔ ایک دم اچانک "آنا فانا" وارڈ زخمیوں سے اٹا اٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس میں وہ زخمی بھی شامل تھے، جو مال سے پولیس کے ڈنڈے کھا کر لائے جا رہے تھے۔
برآمدوں میں زخمیوں اور بے ہوش مریضوں کے پاس سے گزرتے انہیں ہر چہرے پر قیصر کا گمان ہوتا۔ وہ چلے آئے تھے پتا نہیں اطلاع لانے والا درست تھا یا کسی افواہ کے پیچھے لپک پڑا تھا۔
اور کون جانے وہ کم اطلاع لایا ہو اور ان زخمیوں میں کہیں انہیں اس کا چہرہ ملے ہی نا۔
سب سے پہلے عبیر ہی کی نظر اس پہ پڑی۔ اس کے چہرے پہ اس قدر گھاؤ تھے کہ وہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی پہچانا گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اپنے نزدیک سے گزرتے دیکھا لیکن روکا نہیں۔ کیونکہ وہ مکمل بے ہوش تھا۔
ہسپتال والوں نے ابھی تک اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ یہ ایک پولیس کیس تھا۔ ڈاکٹرز نے انہیں آگاہ کیا۔
"ایسے کیس یہاں آئے دن آتے ہیں۔ یہ دو گروہوں کی آپس کی لڑائی کا نتیجہ ہے۔ سنا ہے کوئی دنگا فساد ہوا تھا۔ جس کو زیادہ چوٹ لگی وہ ہسپتال آگیا۔ جب تک پولیس نقصان کا تعین نہ کرے، مریض کو ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا۔ بے خطا، بے قصور دونوں میں سے کوئی نہیں تھا۔"
"جب ہم ایسے کسی مریض کو ٹریٹ کرتے ہیں اور وہ دوران آپریشن مر جائے تو آپ جیسے لوگ ہم پر چڑھائی کر دیتے ہیں۔"
"قیصر کی لڑائی ہوئی؟" اس نے آپریشن تھیٹر کی طرف دوڑتے اور اسٹریچر پر گھسیٹ کے لے جائے جاتے، قیصر

www.pkdigest.com

کو حیرت سے دیکھتے سوچا۔

"لیکن وہ تو بہت صلح جو اور امن پسند آدمی ہے۔ اس نے زندگی بھر کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس نے تو ظلم کرنے والوں کا بھی ہاتھ بھی نہیں روکا۔ وہ تو بچوں کی طرح معصوم۔ ابھی متاثر ہونے کی اسٹیج سے باہر نہیں آیا تھا۔"

وہ تو ایسا بھولا لڑکا تھا' جب اس سے بھی کم صحت والے کسی ڈاکو نے اس کا موبائل چھینا تو اس نے بغیر کسی مزاحمت کے اس کو موبائل اور پرس دونوں تھما دیے تھے۔ وہ کہتا تھا اسے لڑنے کا طریقہ نہیں آتا۔

وہ ہراساں حالت میں ڈاکٹروں اور نرسوں کے پیچھے دوڑتے۔ پھر پلٹ کر پولیس تک آجاتے۔ پولیس آگئی تھی۔ نامعلوم ملزم کے خلاف FIR درج ہوگئی۔ انصاف سے ہم اس سے زیادہ کچھ توقع بھی نہیں کرتے۔

پولیس کہتی تھی۔ دو فریقین کی آپس میں لڑائی ہوئی تھی۔ دوسرا فریق کہاں تھا۔ دوسرے فریق کو کتنی چوٹیں آئیں۔ یہ بیان میں درج نہیں تھا۔

وہ ہسپتال کے بیرونی برآمدوں میں خون آلود دیواروں سے ٹیک لگائے ہولے ہولے لرزتی رہی۔ کیا واقعہ ہوا کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا۔ لڑکے لوگ خون' دواؤں اور انجکشن کے حصول میں چہار طرف بکھر گئے تھے۔ قیصر کے گھر اطلاع ہوئی یا نہیں' کسی کو اس کے گھر کا علم تھا؟ اس کے پاس ایسی کوئی معلومات نہیں تھیں۔ لانے والوں نے دیکھا۔ برآمدوں کے پاس گھاس پر کوئی اوندھے منہ گرا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جا بجا خون کے دھبے تھے اور ان دھبوں کو دور کرنے کے لیے اسے برساتوں کی حاجت بھی نہیں تھی۔ چہرے پر گہرے کٹ اور نیل کے داغ تھے' جیسے اسے کسی سخت چیز سے بے دردی سے پیٹا گیا ہو۔ (لیکن کیوں)

وہ تو صرف فرسٹ سیمسٹر کے لوگوں کو لینے کے لیے نہر کنارے سے اٹھ کر گیا تھا۔ لیکن پھر اپنے ڈیپارٹمنٹ سے کئی فرلانگ دور کسی دور افتادہ شعبے میں وہ اوندھے منہ کیے پایا گیا۔ پولیس کا مزید بیان تھا کہ مارنے والے ایک سے زیادہ تھے' انہوں نے اس کے چہرے پہ گھونسے مارے۔ ان کے ہاتھوں میں کوئی دھات کی چیز تھی جس سے اس کے چہرے کی کھال جگہ جگہ سے کٹ گئی تھی۔ اس کی ناک اور منہ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

جب انہوں نے اسے پوسٹ آپریشن یونٹ میں شفٹ کیا۔ ڈاکٹر اعجاز کو بتا رہا تھا کوئی فریکچر نہیں لیکن چوٹیں بے شمار ہیں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ شام تک ٹھیک ہو جائے گا۔

ڈاکٹر کو اس سے غرض نہیں تھی کس نے پیٹا' کیوں مارا' وہ مظلوم تھا یا ظالم اسے کس سمت میں کھڑا کیا جائے وہ خود بے ہوش تھا اور واقعہ کی حقیقت بتانے سے قاصر۔

ایک طرف کھڑا چپڑاسی چاچا بشیر تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے اس کے زخمی ہونے کی اطلاع پاس سے گزرنے والے لڑکوں کو سب سے پہلے دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ برآمدے میں کسی کی لاش پڑی ہے۔ انہوں نے ہلا جلا کر دیکھا تو سانس باقی تھی' جب لڑکوں نے اپنے استادوں کو اطلاع دی اور ہسپتال لے کر چلے تو چاچا بشیر بھی ساتھ آگیا تھا۔

"لڑکی کا چکر ہوگا۔"

چکر لڑکی کا نہیں تھا کوئی۔ وہ جانتی تھی لوگوں کی قیاس آرائیاں بے مقصد تھیں۔ ہم مظلوم کا ساتھ دینے کے بجائے کتنی آسانی سے ظالموں کی صف میں آکھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے واقعات کیمپس میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

اس نے دیوار سے ٹیک لگائے اعجاز کی طرف دیکھا۔ اس کا ابھی تک قیصر کی بہن سے جہلم میں رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ اعجاز نے اس کا سُتا ہوا پیلا چہرہ دیکھا۔

"تمہیں گھر چلے جانا چاہیے۔"
"اس کو ہوش تو آجائے۔"
"ڈاکٹر کہتا ہے اسے رات تک ہوش نہیں آئے گا۔"
ٹیوبز اور پٹیوں میں جکڑے اس کے پاس بنچ پر بیٹھتے' عبیر نے خواہش کی کاش کاش!
اعجاز اس کے قریب ہی بیٹھا رپورٹ تیار کر رہا تھا۔ اپنا لکھا ذرا سی بلند آواز میں دہراتے۔
"لوگوں کو پتا ہے ہم ڈرتے نہیں۔ لیکن ایک قیصر کو زخمی کر کے ہمیں دکھی تو کیا ہی ہے۔ ہمارے ساتھیوں کو بھی پیغام بھیجا ہے۔ عبرت کا پیغام کہ ان کی خواہش اور اجازت کے بغیر کسی نے ہمیں جوائن کیا تو ان کا یہی حشر ہو گا۔ وہ خود بھی اس حکومت کے حامی نہیں لیکن آپ کو حکم دیتے ہیں کہ آپ کو جو کچھ کرنا ہے' ان کی مرضی کے عین مطابق اور جھنڈے کے نیچے آ کے کرنا ہے۔" پھر وہ زیر لب بڑبڑاتے کچھ لکھنے لگتا جو اس تک نہیں پہنچا۔
"تم ذرا دیر کور کو میں یہ خبر Fax کر کے ابھی واپس آتا ہوں۔ پھر تم واپس گھر چلی جانا۔"
عبیر نے اس کو سنا یا نہیں۔ اس کی پوری توجہ چھوٹی سی ڈبیہ میں کرتے کلوزکے قطروں کی طرف مرکوز تھی۔
"کوشش کرنا گھر میں کسی کو اطلاع نہ ہو۔ گھر والے ایسی خبروں پر فکر مند تو ہوتے ہی ہیں۔ بدگمان بھی ہو جاتے ہیں۔"
"جس کسی نے بھی یہ حرکت کی ہے۔ اس نے آج ہمارے جلوس کو تو کھوٹا کیا ہی ہے لیکن ایک طرح سے وہ اس جلوس کے خلاف ہی ہوئے۔ انہوں نے آمروں کو فائدہ پہنچایا۔"
"ہاں! منافقوں کا یہی کمال ہوتا ہے۔ وہ وقت کا انتظار کرتے ہیں۔ اگر تحریک زور پکڑ جاتی ہے اور آمر کو ہٹا دیا جانا' یقینی نظر آ رہا ہو تو وہ تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ یہی تحریک بے جان ہو جائے تو آمر کے ساتھ حکومت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ تحریک پر ڈنڈے برساتے ہیں۔"
وہ لکھا ہوا کاغذ چوکور تہہ کر کے قمیص کی جیب میں ڈال کر چلتا بنا۔
"میں پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"
وہ کب سے کمرے میں اکیلی تھی۔ باہر وقت گزر رہا تھا' یا کسی ایک جگہ ٹھہر گیا تھا۔ اندر قطرہ قطرہ برستی حیات بخش پانی کی گھڑی تھی۔ اکا دکا اس کے ساتھی دروازہ کھول کر جھانکتے۔ نیل زدہ سوجی آنکھوں کے بند پپوٹوں کو دیکھ کر واپس ہو جاتے۔ اتنے بڑے حادثے کو اس نے کتنی دیر تک تنہا جھیلا تھا۔ اپنے ایک اچھے دوست کو زخموں سے چور چور دیکھا تھا۔ اس کے اپنے اعصاب بھی لوہے سے نہیں بنے تھے۔ لیکن اعجاز اسے یہاں کیسا بلانکا کی طرح کھڑے رہنے کا حکم دے گیا تھا۔ وہ بغیر حرکت کیے جب سے پتھر کی طرح ساکت اس کے بند پپوٹوں کے پیچھے زندگی کے آثار دیکھنے کی خواہش میں حکم کی تعمیل کر رہی تھی۔
پھر کوئی ساتھی دروازہ کھول کر اندر آیا۔ چونکہ اندر زیادہ لوگوں کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ لہٰذا وہ صرف ایک نظر دیکھ کر یا عبیر سے دریافت کر کے کہ آیا اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ واپس چلا جاتا۔ آنے والا دبے قدموں اور بے آواز آیا تھا لیکن واپس جانے یا سوال کرنے کے بجائے چپ چاپ اس کی پشت پر آ کھڑا ہوا تھا۔ بے ارادہ ہی اس نے گھوم کر دیکھا اور لمحے بھر کو ساکت ہو گئی۔
آنے والے کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ کسی گہری سوچ میں غرق وہ اس کی طرف دیکھتا۔ کسی سے مخاطب بھی نہیں تھا کتنی طویل خاموشی کے بعد اس نے دھیمی آواز میں پوچھا تھا۔
"آپ اکیلی کیوں بیٹھی ہیں؟" سوال کرتے بھی وہ مخاطب کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ تشویش بھی اس نوعیت کی نہیں تھی جو باہر سے آنے والے عموماً اس سے کر رہے تھے۔

"اعجاز واقعے کی رپورٹ لے کر اخبار گیا ہے۔ آتا ہو گا۔"
"جب یہ حادثہ پیش آیا آپ وہاں موجود تھیں؟"
"نہیں۔" اس نے کسی طوالت میں جائے بغیر مختصر سا جواب دیا۔
"اور پھر اس وقت آپ یہاں تنہا کیوں موجود ہیں۔ یہ بھی عجیب تماشا ہے۔ آپ آمرِ وقت کے خلاف جلوس نکلی ہیں وہ بھی کسی کی انگلی پکڑ کر۔"
کہتے ہیں اورنگزیب کے زمانے میں سپہ سالار ریشم و اطلس کے لبادے پہن' زیورات سے لدے پھندے' چار کہاروں کے کندھے پر سوار پالکیوں میں بیٹھ کر میدان جنگ میں اترتے تھے۔
کیا وہ اپنے بھائی سے کہے۔ "ذرا مجھے کندھوں پر سوار جلوس تک چھوڑ آؤ۔ مجھے حکومت ہٹانی ہے۔"
"پولیس انکوائری کر گئی؟"
ماتھے پر ناگواری کی شکنیں ڈالے وہ مریض سے زیادہ تیماردار کی تفتیش کر رہا تھا۔ پچھلے سوال کا جواب لیے بنا وہ اگلا سوال اس پر ٹھونس دیتا تھا۔
"برآمدے میں کھڑے رہنے سے اعجاز نے بہتر سمجھا کہ میں مریض کے پاس بیٹھ جاؤں۔"
"درست! آپ کا MBBS کا فائنل ہو گیا۔"
لمحے بھر کے لیے حیرت سے اس نے اس کی طرف دیکھا۔ یہ کیا احمقانہ سوال تھا۔ کیا اس کو یہ بھی علم نہیں وہ کیا پڑھ رہی ہے۔ یا شاید گفتگو تمسخر کی طرف مڑ گئی تھی اور وہ خود غالباً "MBBS" کر چکا تھا۔ کیونکہ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اس کی فائل کھول کر رپورٹس میں غرق ہو گیا تھا۔
فائل واپس ہینگر میں اٹکاتے وہ سنجیدگی سے اس کی طرف پلٹا۔
"چلیے اٹھیے۔"
اس کو علم نہیں تھا وہ کیوں اس کے ساتھ تابعداری سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کبھی کبھی اس کے فیصلے ایسے ہی بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ پرس کاندھیہ کندھے پر لٹکاتے وہ اٹھی اور ایسے چلی جیسے سوتے میں مریض چلے۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر عبیر کو باہر نکلنے کا موقع دیا۔
دو قدم اس کے پیچھے دھرتے وہ باہر برآمدے میں منتظر کھڑے لوگوں کے پاس رکا۔
"کوئی Improvement نہیں' تم اندر جاؤ میں ابھی واپس آتا ہوں۔"
"چلیے۔"
ایک ہی جملے میں اس نے بہ یک وقت کئی لوگوں کو نمٹایا۔ اس کے انداز میں ایسا تحکم تھا' جیسے اس کا کہا ٹالا ہی نہیں جا سکتا۔
"کس طرح جائیں گی آپ؟"
OPD کے فٹ پاتھ پر بیٹھے مریضوں کے لواحقین سے ٹکراتے قدم بچا بچا کر چلتے وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا آ رہا تھا۔
"رکشہ سے۔" یقینی جواب تھا۔
وہ ہسپتال کا گیٹ چھوڑ کر باہر نکلے' درختوں کے پیچھے کی سروس روڈ پر اس کے ہمراہ چلتا کتنے ہی خالی رکشاؤں کو سرے سے نظر انداز کرتا سیدھا چلتا گیا۔ پتا نہیں اب اسے کون سا رکشہ پسند آتا ہے۔ اعجاز کو تو شاید کوئی بتا ہی دے کہ اگر وہ عرشے پر کھڑی نہیں پائی گئی۔ جہاں اسے کھڑے رہنے کا حکم دیا گیا تھا تو اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ اس کا ذہن جیسے نیند کی کیفیت میں تھا اور آنکھیں مایوسی سے لڑتے لڑتے تھک چکی تھیں۔

www.pkdigest.com

AKS DIGITAL

پتا نہیں اسے ہوش آئے گا یا نہیں اور کون جانے وہ بچے گا بھی؟ جن لوگوں نے اسے اس حال میں پہنچایا وہ کہاں جمع ہو کر فتح کا جشن منا رہے ہوں گے۔ انصاف کہاں سے ملے گا۔

سڑک سے ایک طرف وہ کتنی دیر تک اور کتنی دور تک اپنے آپ میں گم پیدل چلتے رہے۔ عبیرہ کا سارا دھیان زخموں اور پٹیوں میں جکڑے قیصر کی طرف تھا۔ کتنی دیر کی کشمکش کے بعد اس نے گہرا سانس کھینچا۔

"اب کیا ہوگا؟"

عبیرہ نے کسی گم سی کیفیت میں خود سے پوچھا۔

"اللہ کرم کرے گا۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کی آواز مدھم تھی۔ جیسے اسے یقین تھا یہ سوال دیر سے سہی لیکن پوچھا ضرور جائے گا۔

ایک اور طویل خاموشی' چند اور قدم۔

"کس قدر ظلم ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔"

"آپ کو لگتا ہے یہ ظلم ہوا؟ کیا آپ اس ظلم سے لڑنے کے لیے نہیں نکلے؟ ہم بھی غلط ہوتے ہیں۔ ہم سے نمٹا بھی غلط طریقے سے جاتا ہے۔ اپنی بہت ساری غلطیوں میں ٹھیک کیا ہے؟ اس کا تو فیصلہ کرنا ہے۔"

وہ چپ ہو گیا تھا۔ اچانک کوئی کھڑ کھڑ کرتا رکشہ پاس سے گزرتا تو اسے لگتا' وہ ہاتھ دے کر روک لے گا لیکن وہ پلٹ کر رکشہ کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا جیسے کسی سواری سے اسے کوئی سروکار نہ ہو۔

پتا نہیں وہ اس سڑک کنارے خستہ حال فٹ پاتھ پر کب سے چل رہے تھے اور ان کو کہاں تک چلنا تھا۔ عبیرہ وقفوں سے کوئی سوال تو ضرور کرتی تھی لیکن ایسے جیسے کوئی اونچی آواز میں سوچتا ہو۔ کسی سے جواب کی توقع کے بغیر۔ وہ جواب دیتا تھا لیکن یوں جیسے کوئی سوال کرنے والا نہ ہو۔ ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر اپنی اپنی ذات میں گم' پتا نہیں وہ کب سے چلتے تھے اور کہاں تک چلے گئے تھے۔

"ہم زیادہ تر برے موقعوں پر کیوں ملتے ہیں؟"

فاروق نے اسی طرح فضا میں دیکھتے جیسے کوئی مخاطب نہ ہو' خود سے سوال کیا۔

"ایک بات بتائیں گے؟"

وہ خود فراموشی کی کیفیت سے نکلے بغیر دھیمے سے بولی تھی۔

"اس دن اس حلیے میں ہمارے گھر آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کریم بی کو تو آپ لوگ CID میں بھرتی کروادیں۔ یہ ان کے Talent کا زیاں ہے کہ وہ بغیر کشش کے شیر خرمہ بنائیں۔"

"آپ بات ٹال رہے ہیں؟" وہ چلتے چلتے ٹھٹھک کر رک گئی۔

"لیکن آپ خفا نہیں لگ رہیں۔ صرف سوال کر رہی ہیں۔ وہ بھی ازراہ تجسس۔ زیادہ سوالات مت کیجیے۔ اس دن عثمان' رضا بتا رہے تھے کریم بی کو سوالات بھی پسند نہیں ہیں۔"

وہ اسی طرح رک کر کھڑی رہی۔ فاروق اپنی بات کی روانی میں دو چار قدم آگے نکل گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر ضدی بچوں کی طرح اڑی کرتے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔

"کسی دن شاید آپ کو خود وجہ پتہ چل جائے۔ شاید میں ہی بتا دوں۔ یا شاید میرے اس طرح آنے کی وجہ پوچھنا آپ کے لیے اہم ہی نہ رہے۔ آپ رک کر سڑک پر کھڑی ہو گئی ہیں۔ کچھ بچوں جیسی حماقت نہیں۔"

"آپ کی گاڑی کہاں ہے؟" اس کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

"ہسپتال کی پارکنگ میں۔"

www.pkdigest.com

"کیا مطلب؟ پھر آپ اتنی دور تک پیدل کیوں چلے آرہے ہیں؟"

"آپ نے کہا تھا آپ رکشہ لیں گی۔ آج حمیرا بھی نہیں ہے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھیں گی تو لوگ سمجھیں گے میں آپ کا ڈرائیور ہوں۔ علاوہ ازیں آپ نے شاید نوٹ نہیں کیا ہم پچھلے بیس منٹ سے چل رہے ہیں۔ کار یہ فاصلہ شاید دو منٹ میں طے کرلیتی۔"

"اور آپ نے اس وقت کو طول دے کر کیا کمال کر ڈالا۔" اس نے بد مزاجی سے بڑبڑا کر پوچھا تھا۔

"لمحے کا کافی ہونا آپ کی منطق ہے میری نہیں۔" ایک جھٹکے سے عبیر نے اپنے چہرے پر حدت محسوس کی۔ شاید گالوں پر خون چھلکا تھا وہ واقعی خود کو تماشا بنا رہی تھی۔ کچھ سوچے بغیر غیر محسوس طریقے پر قدم بڑھاتے وہ پھر اس کی ہمراہی میں آگئی۔

"آج یہاں ایک معروف سڑک ہے، جس پر سے گزرنے والی گاڑیوں کی رفتار کسی سرپھرے کے سروے کے مطابق 840 فی منٹ ہیں۔ نہر یہاں ہمیشہ سے بہتی آرہی ہے۔ جانے کن کن زمانوں سے موجود ہے۔ کسی زمانے میں یہاں کچی راہ داری ہوتی ہوگی، جسے نہر کی پٹڑی کہا جاتا ہے۔ ٹریفک کے اس اژدہام کے بجائے چرچوں کرتی بیل گاڑیاں چلتی ہوں گی۔ جن پر آوارہ کتے دیوانہ وار بھونکتے ہوں گے۔ یہاں جو ایک عظیم الشان کالونی کا دیو ہیکل گیٹ ہے، گیہوں کے کھیت ہوتے ہوں گے۔ عین اس جگہ جہاں وہ پیلا مکان ہے، کسی کے کھیتوں کی حد شروع ہوتی ہوگی۔ جب کسان صبح صبح اٹھ کر اپنا ہل اور بیل لے کر کھیتی باڑی کے لیے نکلتا ہوگا تو یونہی ہمراہی کے لیے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی چل دیتا ہوگا۔ ابھی اجالا پھیلا نہیں ہوگا اور ان قدیم درختوں پر طوطے شور مچاتے ہوں گے۔ اس کی ہمراہی کے لیے آتا اس کا کوئی ساتھی کسان اس کا کوئی عزیز یا کوئی پسندیدہ خاتون..... یونہی دوسراہٹ کے لیے چند قدم ساتھ چلتے۔" اس نے رک کر گہرا سانس لیا۔

"واقعی لمحے اہم ہوتے ہیں۔ لمحوں میں ہم صدیوں سے گزر آتے ہیں۔"

تیز دھار طوفانوں کی طرح گزرتی ٹریفک کے درمیان میں گزرتے رکشہ کو دفعتاً" ہاتھ پھیلا کر روکتے عبیر کے لیے دروازہ کھولتے اس نے ڈرائیور کی طرف جھک کر کہا۔

"ماڈل ٹاؤن۔"

اس سے قبل کہ وہ رکشہ میں بیٹھتی۔ ان ہی قدموں پلٹ کر وہ اس راستے پر واپس ہولیا، جہاں سے پیدل چلتا آیا تھا۔

واپسی کا سفر کسی ساتھی کسان، کسی عزیز، کسی پسندیدہ خاتون کے بغیر شاید زیادہ خوش گوار نہ ہو۔

☼ ☼ ☼

"مائی ڈیر شہریار! پچھلے ہفتے تمہارے کہنے کے مطابق فوزیہ کا اکاؤنٹ کھلوانے اس کو بینک لے کر گئی تھی۔ اتفاق سے وہ ID کارڈ کی کاپی لے جانا بھول گئی۔ ان دنوں بہت سی چیزوں کی احتیاط کی جارہی ہے۔ حالات بھی کچھ اچھے نہیں۔ زبانی ضمانت کے باوجود اس کا اکاؤنٹ نہیں کھل سکا۔ کچھ مینجر سے اس کی تلخ کلامی بھی ہوئی لیکن نتیجہ کچھ وصول نہیں ہوا۔ اگلے دن پھر اس کو لے کر جانا تھا لیکن اس دن ایک بہت بڑا حادثہ ہوگیا۔ تم قیصر کو جانتے ہو نا۔ وہ جو ہمارے اسٹیج پلے میں سیلانی بنا تھا۔

اس دن ہمیں اسمبلی چیمبر کے سامنے جلوس نکالنا تھا۔ پرامن (اور پرامن رہنے کی ہدایت ہمیں سر فیصل سے اعجاز تک ایک ایک فرد نے دے دی تھی)۔ اسی دن یونیورسٹی سے ایک بڑا جلوس نکلنا طے ہوا تھا۔ طے ہوا تھا کہ ہم سب خواتین یہاں سے چھوٹے چھوٹے گروپ کی شکل میں اور مختلف وقتوں میں مال تک پہنچیں گے۔ جلوس

کے لیے ہمیں ایک جگہ اکٹھا ہونا تھا۔ البتہ اعجاز وغیرہ کا مال سے آگے گورنر ہاؤس تک جلوس میں شرکت کا ارادہ تھا۔ اس دن کا یہ جلوس دراصل ترقی پسند (تم ترقی پسند سمجھتے ہونا) کی طرف سے کال کیا گیا تھا۔ اس میں رجعت پسند شامل نہیں تھے۔ اس دن ان کا جلوس نکالنے کا کوئی منصوبہ بھی نہیں تھا۔

قیصر فرسٹ سیمسٹر کے لوگوں سے ملنے گیا، جنہوں نے اسے ڈپارٹمنٹ آنے کو کہا تھا۔ وہ ابھی سیڑھیوں کے پیچھے ہی تھا کہ اچانک کہیں سے 8-7 لڑکے اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے اسے زبردستی گھسیٹ کر پاس کھڑی ایک کار میں ڈالا اور اپنے ڈپارٹمنٹ سے بہت دور ہاسٹل کی طرف نکل گئے۔ قیصر کے کسی سوال کا جواب انہوں نے نہیں دیا۔ قیصر سمجھتا رہا کوئی چور ڈاکو ہیں (اور وہ ٹھیک سمجھ رہا تھا) انہوں نے اسے وہاں لے جاکر ایک کمرے میں لاک کردیا۔ بشیر نامی پیون کو تالے کے باہر حفاظت کے لیے کھڑا کیا۔ احتیاطاً" اس کو وہ تین تھپڑ بھی مارے۔ وہ بوڑھا آدمی لڑکھڑا کر گرا تو اس کو دھمکی دی۔ یہاں پہرے داری کے لیے کھڑے رہو۔ اگر یہ بھاگا تو تمہاری خیر نہیں۔ پھر وہ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس تو چلے گئے اور جانے کہاں سے پندرہ بیس اجنبی چہروں اور اجنبی حلیوں والے لوگ آگئے، جنہوں نے کمرے میں گھس کر اس کو مکوں گھونسوں اور راڈوں سے اتنا مارا کہ وہ نیم جان بے ہوش ہوکر گر گیا۔

چپڑاسی بشیر نے اس کی یہ حالت دیکھی تو لوگوں کی مدد سے ہسپتال پہنچایا۔ چپڑاسی کتنے دن چپ رہا پھر اس نے منہ کھول دیا۔ وہ کہتا ہے یہ یہاں کا روز مرہ ہے۔ یہ لوگ خود نہیں مارتے۔ پہلے کمرے میں بند کرکے تالا لگا دیتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ پھر باہر سے کچھ لوگ آتے ہیں۔ جن کو کوئی نہیں پہچانتا کیوں کہ وہ طالب علم نہیں ہوتے۔ وہ مل کر اس کی ہڈیاں توڑ دیتے ہیں۔ آج تک کوئی ثبوت نہیں ملا۔ جن پر شک کیا جاتا یا جن کے ساتھ آخری دفعہ اس کو دیکھا گیا ہو وہ عموماً" واردات کے وقت ہیڈ کے کمرے میں یا لائبریرین کے ساتھ کسی کتاب کی تلاش میں پائے جاتے۔

www.pkdigest.com

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی قیمت: 400 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل قیمت: 180 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبیں قیمت: 350 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 200 روپے
☆ امر بیل، عمیرہ احمد قیمت: 450 روپے

شائع ہوگئے ہیں
خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

پولیس اس معاملے سے ہمیشہ کی طرح لاتعلق رہی۔ اس نے وہی بیان دیا جو یونیورسٹی میں ہونے والے ہر ایسے حادثے پر دیتی ہے۔ قیصر جہاں زخمی پایا گیا اس شعبے کا طالب علم نہیں تھا لیکن وہ کسی لڑکی کے تعاقب میں اکثر یہاں آتا تھا۔ اس لڑکی نے اس کی شکایت لگائی۔ اس کو کئی مرتبہ منع کیا گیا اور سمجھایا گیا لیکن وہ باز نہ آیا حتیٰ کہ لڑکی کے بھائیوں نے منصوبہ بنایا اور ملزم کی خوب ہی درگت بنائی۔

وہ لڑکی کون تھی عموماً اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ بدنامی کے خوف سے وہ پولیس کے سامنے پیش بھی نہ ہوتی۔ (کم از کم پولیس کے بیان میں یہی لکھا ہوتا ہے) بھائی یونیورسٹی میں کیسے داخل ہوئے۔ ان کو کیسے پتا چلا قیصر اس وقت کہاں ہوگا۔ یہاں بھی پولیس کا ریکارڈ خاموش ہے۔ اب چونکہ یہ معاملہ خاندان کی عزت اور وقار کا ہے' لہٰذا محکمہ عزت و ناموس کی خاطر خاندانی معاملے میں مداخلت نہیں کرے گا۔

قیصر بہت دن زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ہم دن رات اس کے لیے دعائیں کرتے رہے۔ پھر اس کے والدین اس کو لے گئے۔ انہوں نے جاتے ہوئے بیان دیا کہ یہ محض ایک حادثہ تھا' جس میں کسی کی بدنیتی کا کوئی دخل نہیں۔ وہ کسی کو نہیں پہچانتے۔ ان کا کوئی دشمن نہیں۔ اور انہوں نے کسی کے خلاف پرچہ نہیں کٹوانا۔ حالانکہ چاچا بشیر نے ان لڑکوں کی جو اغوا کر کے لائے تھے۔ V.C سے نشاندہی کر دی تھی۔ V.C ان کے خلاف ایکشن لینا چاہتا تھا۔ چاچا کہتا تھا جان چلی جائے۔ جان ہے بھی کتنے دن کی۔ لیکن ظلم کے خلاف آواز ضرور اٹھاؤں گا۔ ایک عمر سے زیادتی ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ اب نہیں سہا جاتا۔

قیصر کے والدین نے کوئی FIR درج کرانے سے انکار کر دیا اور قیصر کو کسی شناخت پریڈ کی اجازت نہیں دی۔ انہوں نے کہا انہیں قیصر کے رزلٹ سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ جب بھی آئے چاہے نہ بھی آئے۔

بڑا اچھا موقع تھا اگر بزرگوں نے حسب روایت بڑی نہ دکھائی ہوتی۔ اب وہ جب تک گرفتار نہیں ہوں گے اپنے عزائم سے باز نہیں آئیں گے۔ اور یہ پیغام تو انہیں خوب دیا گیا کہ وہ جو بھی چاہے کرتے رہیں' ان کی کوئی پکڑ نہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اتفاق سے ہی اگلے روز چاچا بشیر ہسپتال داخل ہوئے۔ وہ کلاس رومز کی چھت کے جالے صاف کر رہے تھے کہ وہ سیڑھی سے نیچے گرے۔ ان کو جگہ جگہ چوٹیں آئیں۔ حتیٰ کہ ان کے دائیں ٹانگ کی ہڈی کئی جگہ سے ٹوٹ گئی۔ ان کا اصرار تھا۔ ان کا یہ بیان کسی جھوٹ یا مصلحت پر مبنی نہیں ہے۔

شہریار! میں نے وہ چند گھنٹے جب قیصر موت سے قریب اور زندگی سے دور ہسپتال میں داخل تھا۔ اس کے پاس بیچ پر تنہا بیٹھ کر گزارے (اعجاز نیوز دینے چلا گیا تھا) میری زندگی کا خوف ناک ترین تجربہ تھا۔ ایک زخموں سے چور چور پٹیوں میں جکڑا آنکھیں بند کیے مخصوص وقفوں سے سانس لیتا تھا۔ وہ شخص آپ کا دوست بھی ہو تو بہت عجیب محسوس ہوتا ہے' شہریار کہ کیا وہ اگلا سانس لے گا' یا جب اس کا سینہ اوپر ہوا تو وہ آخری سانس تھا۔

میرے ساتھ حمیرا بھی نہیں تھی۔ میں نے دل سے دعا مانگی۔ یا اللہ کوئی مدد بھیج۔ اے کاش! مجھے اس خوف ناک تنہائی سے بچا۔

اے کاش! اے کاش۔"

اچانک ٹائپ کرتا اس کا ہاتھ رک گیا۔

اس نے کسی وجہ کے بغیر ادھورا ہی خط Send کر دیا۔

(باقی آئندہ)

رفعت ناہید سجاد

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ اُن کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد اُن کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے۔ جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر، عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دورانِ تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں۔ اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی [illegible] ہے۔ ایک بیٹی [illegible] کی عمر [illegible] ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر [illegible] کا اصول [illegible] ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پُراعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونیورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

www.pkdigest.com

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث اس کی علمی [illegible] ہے۔ فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے، وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔ عبیر اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے امراو کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ آپا جی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کر دیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کو نا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۱۰
دسویں قسط

www.pkdigest.com

سردی کے شدید موسم میں مری مری دھوپ کھڑکیوں کے شیشوں سے جگہ بناتی پھٹی ہوئی دری کے فرش پر برفی کے ٹکڑوں کی صورت ایک قطار میں بچھی ہوئی تھی۔ قیصر کو رخصت ہوئے چھٹا دن تھا اور اس نے کسی سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

دوسرے دن جب وہ پتھر کی طرح ساکت پڑا تھا، بند آنکھوں کے پیچھے اس کے پپوٹوں میں بھی حرکت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھلتی نہیں تھیں۔

تیسرے دن جب اس نے آنکھیں کھولیں۔ چوتھے روز جب سامنے کھڑے شخص پر اس کی نگاہ ٹکی اور اس نے بے ساختہ مسکرانے کی کوشش کی اور ڈاکٹروں نے اطمینان کا اظہار کیا کہ وہ کوما میں نہیں گیا، اس دن بھی اور اگلے تمام دنوں میں جب تک وہ وہاں رہا، وہ سب اس کے آس پاس تھے۔

وہ سب ایک قیامت سے گزر رہے تھے۔ دعائیں درود وظائف۔ لوگوں کے ہاتھوں میں تسبیح تھی، بدبداتے ہونٹ اور جھکے سروں سے وہ بارگاہ الٰہی سے سوائے اس کی زندگی کے کچھ نہیں مانگ رہے تھے۔ جنہوں نے اس کو اس حال میں پہنچایا، ان لوگوں سے انتقام کی خواہش۔ ان کے برے حشر کا انجام۔ اس وقت ان کے ذہنوں میں کچھ نہیں تھا۔

بہت سے وہ لوگ بھی جو اس گروپ کی سرگرمیوں سے ناخوش اور دوسرے گروپ سے ہمدردیاں رکھتے تھے۔ دعا میں شریک تھے۔ وہ یہ ماننے سے انکاری تھے کہ ان کے ساتھیوں نے کسی کو اس انجام تک پہنچایا ہوگا۔ جن لوگوں کا نام لیا جا رہا تھا۔ ان کے کردار کی قسمیں کھائی جا رہی تھیں۔ ان کے کسی اور جگہ پائے جانے کی شہادتیں

موجود تھیں۔

"وہ تو اس وقت خود اس کے ساتھ فلاں ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا۔"

"میں اور وہ تو اس سارا دن رجسٹرار کے کمرے میں بیٹھے رہے۔"

پتا نہیں ہم زیادہ معصوم ہیں یا دشمن زیادہ مکار ہیں۔

لوگ آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ دو چار منٹ ٹھہر کر۔ وہ معلوم نہیں کیوں اپنی طبیعت سے مجبور شام تک وہاں موجود رہتی۔ کمرے میں قیصر کی والدہ بیٹھی ہوئی تھیں اور کوئی ایک اور ان کے ساتھ کسی بھی ضرورت کے لیے لیکن خاموش اور دم بخود۔ کوئی مریض کو پوچھنے آتا تو پہلے سے بیٹھا از خود باہر چلا جاتا۔ مریض آنے اور جانے والوں سے بے خبر آنکھیں بند کیے ساکت پڑا تھا۔ ایسے ہی کسی کے لیے جگہ چھوڑ کر وہ کمرے سے باہر آئی تو اس کا ذہن شدید طور پہ تھک چکا تھا۔

یہ چوتھا روز تھا اور ہر دن مایوسی پہلے سے بڑھ رہی تھی۔ نیم اندھیرے سے ایک دم تیز روشنی میں آنے سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ یا ثنا حسین اور اعجاز کے درمیان کھڑی سارہ حق نے اس کو آنکھیں بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ بعض چہرے ہم دیکھنا نہیں چاہتے لیکن جب بھی بند آنکھیں کھولتے ہیں انہیں ہی سامنے پاتے ہیں۔

(سو وہ جیل سے باہر آ گئی ہیں۔ یہ جیل جانا اور باہر آ جانا بھی خوب مشغلہ ہے۔)

لیکن وہ کبھی بھی کسی پر نظر رکھنے سے چوکتی نہیں تھیں۔ انہوں نے اسے دور سے آتے دیکھا اور دیکھ لیے جانے کو جتایا۔

"بہت تھکی تھکی لگ رہی ہے عبیر۔"

گویا اندر تو پر فضا نظارے تھے۔ ٹھاٹھیں مارتے دریا اور لہراتے درخت تھکنے کے بجائے اسے تازہ دم باہر آنا چاہیے تھا۔

"ہاں تھک گئی ہے عبیر۔" اعجاز نے محبت سے کہا۔ "اس کو کہتے بھی ہیں ایک دن نہ آؤ لیکن واقعی رہا بھی نہیں جاتا۔ دھیان ادھر ہی لگا رہتا ہے۔"

"اب آ ہی گئی ہو تو چلو کینٹین سے چائے پی آتے ہیں۔ بہتر Feel (محسوس) کرو گی۔" ثنا نے ہمدردی سے کہا۔

"ڈیڑھ گھنٹے بعد انجکشن ہے ایک اور مریض بھی Severe ہے وہاں، مجھے خوف ہے، وہ لوگ ٹائم بھول نہ جائیں۔"

"قیصر کے گھر والے ابھی تک پہنچے نہیں؟" سارہ حق نے چونک کر جتا دینے والے انداز میں کہا۔ وہ ہر دفعہ مختلف ڈھنگ سے بات کرتی تھیں۔ چونک جانے کا اظہار، پریشانی کی ایکٹنگ۔

"آ گئے تھے۔ اسی رات پہنچ گئے تھے۔ اس کی بہن جہلم میں تھیں لیکن والدین اٹک کے کسی دور دراز گاؤں سے آئے تھے، سو ان تک اطلاع پہنچانے اور ان کو پہنچنے میں وقت لگا۔ ہم اسی لیے تو باہر کھڑے ہیں کہ قیصر کے گھر والے اندر ہیں۔"

"اب بھی ہے کوئی اندر؟ پھر تم انجکشن کے لیے کیوں پریشان ہو؟" وہ پریشان کیوں تھی؟ اس کا جواب ان میں سے کسی کے بھی پاس نہیں تھا اور تھا تو سارہ حق تک اس کا پہنچنا مشکل تھا۔

ایسے وقت میں جب ہنسی لوگوں سے دور دور تھی، سارہ حق مسکرائیں۔

"ایسا لگتا ہے، عبیر آپ سب کو بے حد پسند ہے۔ وہ آپ کی دوست کہاں ہے۔ کیا نام ہے بھلا اس کا!"

حالانکہ جس دوست کا وہ نام بھی بے دردی سے بھول گئی تھیں، اسی نے آنکھیں پھاڑ کر مرعوبیت سے اس

سے پوچھا تھا۔

"تم سارہ حق کو نہیں جانتیں!"

"وہ لیڈر ہیں۔ لیڈر جس کو بلاتا ہے وہی جاتا ہے۔"

اور وہ جو اندر موت اور زندگی میں کس طرف جائے گا کا کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ کہتا تھا وہ Punctual (پنکچوئل) ہیں۔ وہ کسی کو نہیں بھولتیں۔ بہت بڑا نام ہے۔ "اور لیڈر بجن بے پروا ہیں۔"

"میں ذرا اندر اس کو دیکھ آؤں۔" وہ دو قدم چل کر رکیں۔ "میرے ساتھ آنا اعجاز۔"

اس نے ان کو اندر جاتے دیکھا۔ ان کے ہاتھ اور ہونٹ مسلسل حرکت میں تھے۔ احتجاج۔ جلوس۔ خفیہ میٹنگ۔ پورے پورے جملے تو نہیں لفظوں کے کچھ سرے اس کے ہاتھ آئے۔ پھر وہ اپنی آواز سمیت معدوم ہو گئیں۔ اعجاز تابع داری سے سن رہا تھا۔

دو سے زیادہ افراد کو مریض کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی اور اندر لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اسے واپس چلے جانا چاہیے تھا۔ اگر یہ Protest اور جلوس قیصر کے لیے ہے تو وہ اس میں ضرور شرکت کرے گی لیکن اگر ان کا الیکشن اسٹنٹ ہے تو وہ ٹھیک آدمی کو ساتھ لے گئیں۔ یوں دیکھا جائے تو اور زیادہ ٹھیک آدمی تو آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔

دور مینار پر لگی گھڑی بند پڑی تھی۔ سستی میں اس نے موبائل بھی نہیں نکالا لیکن سامنے آسمان کے بدلتے رنگ بتاتے تھے کہ کچھ ہی دیر میں شام اترنے والی ہے۔ اب اس کو گھر پہ ہونا چاہیے۔ اس نے خود کو نصیحت کی۔ پاس بنے سیمنٹ کے ایک ٹوٹے بنچ پر بیٹھے اس سے فیصلہ نہیں ہو سکا کہ وہ اعجاز کا انتظار کرے یا بس چلی جائے۔

سورج کا گولہ انار رنگ ماند کرتا درختوں کے جھاڑ کے پیچھے آہستگی سے نیچے اتر رہا تھا۔ سامنے گھاس پر کسی مریض کا خاندان چادر بچھائے کھانا کھا رہا تھا۔ نزدیک ہی ایک بزرگ تیز ہوا سے بچاؤ کے لیے گرم چادر میں لپٹے گہری نیند سو رہے تھے۔ پتا نہیں کب سے انہیں مریض کی طرف سے اچھی خبر نہیں ملی تھی کہ وہ جاگتے رہے اور بھوکے تھے۔ جس برتن میں کھایا تھا اس کو دھو کر پاس کے نلکے سے اپنی پیاس بجھاتے۔

وہ پھر اکٹھے ہو کر بیٹھ رہے۔ فضا میں ٹھنڈ بڑھ رہی تھی۔ پتا نہیں وہ اور گھاس پہ بیٹھے باقی لواحقین رات کہاں بسر کرتے ہوں گے۔ قیصر کے گھر والوں کے لیے جو کھانا وہ گھر سے لائی تھی وہ لنچ باکس اندر ہی پڑا تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر لیکن بالکل اجنبی قیصر کے والد نے اسے چھوا بھی نہیں تھا۔

قیصر کے گھر والے اور دوست ان ہی بنچوں اور گھاس کے میدانوں کے آس پاس منڈلاتے رہتے۔ کسی کے گھر سے کھانا آ جاتا۔ کوئی تھرماس بھر چائے لے آتا۔ سارا دن کے تھکے ہارے مایوس مگر پھر بھی پُر امید مختصر سی خوراک پیٹ میں اتار کر پھر مایوسی کا شکار ہونے لگتے۔ اعجاز اور سارہ حق نے پتا نہیں اندر اتنی دیر کیوں لگا دی۔ اس کا دل وسوسوں کا شکار ہونے لگا۔

ایک نظر اس نے ہاتھ میں تسبیح لیے قیصر کے والد کو دیکھا۔ ان کی پشت اس کی طرف تھی۔ وہ اضطراری کیفیت میں ٹہلتے اس سے بہت فاصلے پر تھے۔ وہ جانتے تھے وہ اندر سے آئی ہے۔ لیکن وہ خود سے کوئی سوال نہیں پوچھتے تھے اس نے سوچا ان کی نظر سے بچ کے وہ جاتے جاتے قیصر کو ایک بار اور جھانک آئے۔

وہ اندر آئی تو آئی سی یو کے باہر اس کے دوستوں کی غیر معمولی چہل پہل نے اس کو لرزا دیا۔ لاؤنج کے باہر اسے سارہ حق کے ساتھ ایک شناسا وجود کا احساس ہوا۔ اس کی پشت عبیر کی طرف تھی۔ وہ یوں ایک جھپاکے میں اسے شاید پہچان بھی نہ سکتی۔ کسی مانوس آہٹ پر اس شخص نے پلٹ کر دیکھا۔

یہ کس وقت آیا تھا اور اس کو اندر جاتے اس نے کیوں نہیں دیکھا اور یہاں ایسا کیا ہے۔ جو لوگ پلٹ کر نہیں آتے۔ کسی کونے سے اچانک اعجاز نمودار ہوا۔ اس نے دیکھا اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

"گڈ نیوز عبیر۔ ابھی فاروق نے قیصر کو آواز دی تو اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں پہچان تھی۔ اس نے اپنی والدہ کو بھی پہچانا اور مسکرایا۔ لیکن ابھی وہ دہشت کے اثر سے نکلا نہیں۔"

اس نے شیشے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ پہلے جیسی کیفیت میں ساکت پڑا تھا لیکن کبھی کبھی پلکیں جھپکتا اور آنکھیں کھول لیتا۔

اندر کافی لوگ جمع تھے۔ وہ چپ چاپ واپس آ کر سبزہ زار میں بنی سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھ گئی۔ امید اور اندیشوں کی ملی جلی فضا ابھی تک اس سے دور نہیں ہوئی تھی۔

اس نے اعجاز کو میڈیکل اسٹور کی طرف دوڑ لگاتے دیکھا۔ قیصر کے والد صاحب نے اعجاز کو دوڑتے اور اسے نم آلود آنکھوں سے باہر آتے بھی دیکھا۔ بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ بنا سوال کیے وہ اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ ان کے اکلوتے بیٹے میں کیا دیکھ کر آئی تھی سوال کا حوصلہ ان میں ختم ہو گیا تھا۔

"اس کو ہوش آ گیا ہے۔"

اچھے طالب علموں کی طرح جن کو سبق فر فر یاد ہوتا ہے۔ اس نے کھڑے ہو کر مؤدب لہجے میں جملہ الٹ دیا۔ والد صاحب نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا البتہ قبلہ رخ چادر گھاس پر بچھائی اور مغرب کا انتظار کرنے لگے۔ وہ اپنے بیٹے کی صورت دیکھنے سے پہلے اپنے اللہ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔ شاید نفل شکرانے کے لیکن سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ وہ وہیں قبلہ رو بیٹھے اس کا شکر بجالاتے رہے۔

وہ چپ چاپ ان دونوں کو ایک دوسرے سے لاعلم اپنی اپنی ذات میں گم اداسی سے دیکھتی رہی۔

وہ وقت سے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"کیا خود کو اس طرح تھکا لینے سے مریض ٹھیک ہو جاتا ہے۔" اس نے بغیر گردن گھمائے اس کو بنچ کے دوسرے کونے پر بیٹھا محسوس کیا۔

"نہیں۔ لیکن ہر ایک کی پکار میں وہ تاثیر نہیں ہوتی کہ مریض آنکھ کھول دے۔"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

☆ ستاروں کا آنگن، نسیم سحر قریشی قیمت: 400 روپے
☆ درد کی منزل، رضیہ جمیل قیمت: 180 روپے
☆ اے وقت گواہی دے، راحت جبیں قیمت: 350 روپے
☆ تیرے نام کی شہرت، شازیہ چودھری قیمت: 200 روپے
☆ امر بیل، عمیرہ احمد قیمت: 450 روپے

شائع ہو گئے ہیں
خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

www.pkdigest.com

"اس کا آنکھیں کھول لینا تو یقیناً" آپ کو اچھا لگا۔ میری آواز پر کھولنا شاید پسند نہیں آیا۔ سب محض اتفاق ہوتے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ اعجاز کی بات میں آ گئیں۔"

"مجھے لگ رہا تھا' وہ زندہ نہیں بچے گا۔" اس کے والد بہت زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ اس نے اپنی آواز مزید دھیمی کر لی۔

"مجھے بھی۔"

عبیر نے کن انکھیوں سے اس کے والد کی طرف دیکھا۔ ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ انتظار بھی کیسی چیز ہے۔ وہ سجدۂ شکر ادا کرنے میں جلدی کرنا چاہتے تھے اور ہر روز با قاعدگی سے ڈوب جانے والے سورج کو آج نہ کوئی جلدی تھی۔ نہ ان کی بے تابی کا کوئی احساس۔

"دنیا بہت سی چیزوں کے آگے کتنی بے بس ہے۔" یہ پہلی دفعہ نہیں تھی کہ وہ اس کے قریب بیٹھی تھی اور خود سے مخاطب تھی۔

"تسمیعلی بی کی وفات۔ اس کی بیٹی کا اغوا۔ زخموں سے چور چور قیصر ہمارے مشکوک رزلٹ اور سورج ہے کہ غروب ہونے میں نہیں آتا۔"

"آپ دنیا کو محض اپنے حوالے سے دیکھ رہی ہیں۔ یہ تو خود غرضی ہے۔"

"میرے ابا کی خواہش تھی میں پی ایچ ڈی کروں۔"

"کیا ہو تا پی ایچ ڈی کر کے۔"

"خواہشیں پوری ہو جائیں تو کیا ہوتا ہے۔" وہ جھنجلا گئی۔

"کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے سوا کہ ایک خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ اچھا' تھوڑی دیر کے لیے تصور کیجیے اور یہ کھیل تو ویسے بھی آپ لوگوں کی بہترین وقت گزاری ہے۔ کہ آپ وہ نہیں جو ہیں۔ برسوں پرانی کوئی خاتون دراصل آپ ہیں۔ اس خواہش میں فنا ہو رہی ہیں کہ آپ کی چنری کو دھنک رنگ میں رنگ دیا جائے۔ نیلا' پیلا' کاسنی' نارنجی۔ بڑی منتوں مرادوں اور انتظار کے بعد وہ دوپٹہ آپ کو مل بھی گیا۔ آج برس ہا برس بعد اس خواہش کے تکمیل پا جانے کی کہیں کوئی حیثیت ہے۔"

وہ مزید چڑ گئی۔

"دھنک رنگ دوپٹہ اور پی ایچ ڈی ایک برابر ہوتے ہیں۔"

"نہ نہ۔ بات چیزوں کی نہیں خواہش کی ہوتی ہے۔"

"پہلی دفعہ جب میں نے آپ کو دیکھا تو مجھے لگا تھا کہ آپ جھکی ہیں۔" اس نے اکتاہٹ سے منہ دوسری طرف پھیر کر فیصلہ سنا دیا۔

"وہ پہلی دفعہ نہیں تھی۔ مگر خیر آپ نے تو شمار ہی نہیں کیا تھا۔" اس نے ٹوکا۔ وہ خاموش رہی۔

"آج کچھ دیر نہیں ہو گئی۔ روزانہ تو آپ اس وقت سے بہت پہلے چلی جاتی تھیں؟" کچھ دیر کے سکوت کے بعد اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کو کیسے پتا؟"

سوال کے جواب میں سوال اس کا عمر بھر کا وتیرہ رہا تھا۔

سارہ حق باہر آ رہی تھیں۔ شکر ہے کہ ابھی دور تھیں۔ اگر اس کا آخری جملہ سن لیتیں تو خفا ہو جاتیں۔ ان کو مردوں کی یہ فکر مندی سخت ناپسند تھی۔ لڑکیاں خواہ مخواہ کیوٹ بننے کی کوشش کرتی ہیں۔

ان کا رخ بتدریج اندھیرے میں ڈوبتے پس منظر میں بنچ پر پتھروں کی طرح ایستادہ دو مجسموں کی طرف تھا۔

www.pkdigest.com

حالانکہ ان کی کار اور ڈرائیور بالکل دوسری سمت منتظر اور مستعد تھے۔ وہ لمحہ لمحہ قریب ہو رہی تھیں۔

"شکر ہے اب قیصر کی طبیعت ٹھیک ہے۔" یونہی جیسے بات برائے بات سلسلہ شروع کیا۔

"اس کی پہچان واپس آ گئی۔ حالانکہ Brain (دماغ) سخت رسک میں تھا۔"

"پہچان ہی تو واپس نہیں آئی اس کی۔" اس نے بڑبڑا کر سوچا۔

"چلا جائے؟" انہوں نے عبیر کو سرے سے نظرانداز کر کے فاروق کی رائے مانگی تھی۔ عموماً "shorts" Big کیڑے مکوڑوں کو منہ نہیں لگاتے کہ وہ ان کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔

"پتا نہیں اب وہ اس کو ڈسچارج کب کریں گے۔"

"پتا لگانا کون سا مشکل کام ہے۔"

اتنی دیر کی خاموشی کے بعد مہمل سا جواب ان کو شک میں ڈال گیا۔ وہ ان سے مخاطب نہیں تھا شاید۔

"چل رہے ہو؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"میں اپنے بارے میں کسی کیوں کا جواب نہیں دیا کرتا۔"

ثنا اور جاوید اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ فضا میں سناٹا چھا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور جب قیصر کے والدین نے اس کے دوستوں سے برہمی کا اظہار کیا اور اس کو بغیر کسی اجازت یا اطلاع کے ساتھ لے گئے تو ابھی وہ اس قابل نہیں ہوا تھا کہ اپنے لیے درست یا غلط فیصلے کر سکے۔ سب کچھ اس کی مرضی اور خواہش معلوم کیے بغیر ہوا۔

اپنے چھوٹے سے آفس میں بیٹھے وہ سب بے حد رنجیدہ تھے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا یہ کوئی سوشل کلب تھا یا طالبانہ سرگرمیوں میں سے کوئی چیز یا ہم نے مقاصد حاصل کر لیے کہ ہم اس طرح تتر بتر ہو کر بکھر جائیں۔"

قیصر کو رخصت ہوئے چھٹا دن تھا اور وہ لوگ اس سے رابطے کے لیے فکر مند تھے۔

"لیکن وہ چاہتا تو کانٹیکٹ تو کر ہی سکتا تھا نا۔"

"تم جانتے ہو وہ کس قدر فرماں بردار ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔"

"اس کا مطلب ہے آج سے قیصر کا چیپٹر کلوز (باب ختم) ہوتا ہے۔"

"چیپٹر ختم کرنا کتنا مشکل کام ہے۔" عبیر نے سوچا کتاب ختم ہو بھی جائے تو انسان ورق پلٹ پلٹ کر پڑھتا رہتا ہے۔

"وہ ہم سے رابطہ تو کر ہی سکتا تھا۔ کیا وہ بھی ہمیں ہی قصوروار سمجھتا ہوگا۔"

سارہ حق رہا ہو کر باہر آئیں تو بہت برہم تھیں۔ وہ بنام اسٹیٹ مقدمہ کرنا چاہتی تھیں۔ گمنام لوگوں کے خلاف۔ سنہ سی قیصر۔ چاچا نذیر تو تھا ایک گواہ لیکن وہ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود چاچا کو بھی پیش نہ کر سکیں۔

سارہ حق نے اعلان کیا "وہ ایک بڑا جلوس نکالیں گی۔ باوجود اس کے کہ ان کے حقائق کا تجزیہ کبھی جذباتی نہیں ہوتا تھا" انہوں نے دعوا کیا ان کی تحریک طوفان کا رخ موڑ دے گی۔ حالانکہ طوفان بڑے اطمینان سے کناروں میں بٹھائے جام ہاتھ میں لیے ڈٹا ہوا تھا۔

دوسری انتہا پر ایک اور طوفان تھا۔ داڑھی کے سائز اور ٹخنوں کے اوپر یا نیچے نہ رکھنے پر زنع کرتا ہوا۔

وہ لوگ جو دو انتہاؤں پر نہیں تھے۔ ان کے لیے ایک نیا نظام پیش کیا گیا تھا۔ اعتدال پسند اسلام۔

سب دین الٰہی کے پیروکار ہیں۔ کسی کو بھی ایمان اصلی حالت میں قبول نہیں۔ فضا پر ایک نامعلوم سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ لڑے بغیر جنگ ہار گئے تھے۔ وہ اس کے لوگ تھے اور اس کو لے جانا چاہتے تھے۔ کون روک سکتا تھا۔ ان کا خیال تھا گاؤں سے جو بھولا بھالا بچہ یہاں پڑھنے بھیجا گیا تھا غلط صحبت میں پڑ کر خراب ہو گیا۔

"وہ غلط صحبت" کو بھی خونخوار نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔ ان کو یقین تھا اس پر جو الزام لگایا گیا وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ وہ یقیناً "کسی لڑکی کے پیچھے گیا تھا اور یقیناً" اس لڑکی کے بھائیوں نے اسے مارا تھا۔ اپنے ہاتھ پاؤں تو تڑوائے ہی تھے۔ ان کی ناک بھی کٹوا بیٹھا تھا۔

اور آخر اس کو جانا ہی تھا۔ وہ چلا گیا۔ یہاں رہ کر کرتا بھی کیا۔ اس مرتبہ تو وہ ڈگری بھی نہیں لے سکتا تھا۔ ظالم کہاں کہاں سے نہیں گھیرتا۔ آپ کے لیے کوئی راستہ کھلا نہیں چھوڑتا اور آپ اس کے ظلم کو داد و تحسین پیش کرتے ہوئے اس کا فیصلہ قبول کر کے میدان خالی چھوڑ جاتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

اس اکلوتی کرسی پر سارہ حق بیٹھی تھیں جس کی چار میں سے ایک ٹانگ چھوٹی تھی۔ اس میز کے سہارے جس کے نیچے اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ جس پر ذرا زور دینے سے وہ See-saw کی طرح جھولتی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگائے ایک میلے چیکٹ کشن پر بیٹھے عبیر نے ان کی طرف دیکھا۔

ان کو نوجوان نسل کی بڑی سخت ضرورت تھی۔ انہوں نے قیصر اور اسی قسم کے بہت سے لوگ پال رکھے تھے۔

"وہ چلا گیا" جس کا ملال انہوں نے اتنے سارے لفظوں میں کیا کہ لفظوں کی بھرمار سے صداقت مشکوک ہونے لگی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد وہ باقی بچے فعال ممبران کی طرف واپس آ گئیں۔ وہ اپوزیشن کا حصہ تھیں۔ کسی بھی سیاسی جماعت سے منسلک ہوئے بغیر ایک انقلاب کی امیدوار۔ جمہوریت کی حامی۔

"جمہوریت ہی ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔"

پتا نہیں ہم جمہوریت کسے کہتے ہیں۔ صرف ووٹ دینے کو؟

سارہ حق گروپ کو تسلی دینے کی خاطر ایک بھرپور تقریر کر رہی تھیں۔ پتا نہیں کسی کی دل جوئی ہو رہی تھی کہ نہیں۔ لیکن انہیں تقریر ازبر تھی۔ وہ ایسے جملے سہولت سے بولتی تھیں۔

ایک قرارداد مذمت پاس کرنے کے بعد انہوں نے جیسے تقریر کے اختتامی الفاظ بولے۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ لڑکے آپس میں لڑ ہی پڑتے ہیں۔ ہم اداسی کی فضا سے عزم کی طرف آتے ہیں۔"

انہوں نے خود ہی طے کر لیا تھا۔ وہ سب کی لیڈر ہیں۔ انہیں حکم دینے اور روک لینے دونوں کے اختیارات ہیں۔ گویا اداسی اور عزم سارہ حق کے حکم کے تابع ہیں۔

ان کے پاس حکومت گرانے کا ایک طویل پروگرام تھا۔ وہ مختلف لوگوں میں ڈیوٹیاں تقسیم کرنے لگیں۔ عبیر نے دیوار سے ٹیک لگائے گردن گھما کر تخت شاہی پر جلوہ افروز "احکامات صادر کرتے ملکہ عالیہ کو دیکھا۔

"لیکن ہمارے جس ساتھی کے ساتھ ظلم ہوا اس کے بارے میں آپ نے کیا کیا۔"

"میری تاریخ مظلوموں کی مدد سے بھری ہوئی ہے۔"

"گھر سے بھاگی لڑکیوں کی ہمت افزائی کے سوا بھی آپ کے کریڈٹ پر کچھ ہے۔ بالفرض وہ مظلوم ہیں تو بھی۔"

عبیر کے لہجے میں ایسی تلخی تھی جس کی وہ عادی نہیں تھیں۔

www.pkdigest.com

"ساتھی تو تمہارا تھا۔ تم لوگوں نے کیا کیا۔" انہوں نے لمحہ کی تاخیر کیے بغیر آنکھوں میں خونخواری بھر کے اسے دیکھا۔

"واقعی! ہم نے کیا کیا۔ سوائے ملال کے۔" اس کی آنکھوں میں شکستگی ابھری۔

انہوں نے عبیر کو پسپا ہوتے دیکھا تو اور شیر ہو گئیں۔ ان کا خیال تھا جنگ کا یہ میدان دیر تک چلے گا۔

☆ ☆ ☆

پھٹا ہوا کھلا لفافہ ہوا سے اڑ کر فرش پر گر گیا۔ لیکن اندر سے نکلا کاغذ ابھی تک عبیر کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بند شیشوں اور ایک طرف سرکے ہوئے پردوں سے باہر مرجھائی دھوپ پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ کریم بی گھاس پر بکھرے پھل چنتی پھر رہی تھیں۔ موٹے موٹے بیل درخت کی بلندی سے گرتے اور فرش سے ٹکراتے ہی کھیل کھیل ہو جاتے۔ وہ اس کا حلوہ پکایا کرتی تھیں کیونکہ بیل کا پھل دل کے لیے مفید ہوتا تھا۔ یہ ان کی اپنی حکمت تھی یا ان کے ابا جو کسی زمانے میں حکیم ہوا کرتے تھے ان کے نسخوں کی کوئی کتاب ان کے ہاتھ لگی تھی۔

دھوپ تاپنے کے لیے اماں اور عثمان کرسیاں ڈالے مونگ پھلی ٹونگ رہے تھے۔ ابھی تنویر کالج سے واپس آئی تھی۔ اندر آنے کے بجائے وہ وہیں بیٹھ رہی۔ بیل چن چن کر جھولی میں بھرتی کریم بی اپنا کام روک کر بڑی دلچسپی سے ان کی باتوں میں وقفہ وقفہ سے شریک ہوتیں۔ وہ کیا باتیں کر رہے تھے اس تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ لیکن ان کے چہروں پر بکھری شگفتگی بتاتی تھی، وہ کسی خوشگوار موضوع پر بات کر رہے تھے۔ تنویر کو تو مسکرائے مدت گزر جاتی۔ جب وہ بھولے سے ہنستی تو آس پاس جیسے نرم پھوار گرنے لگتی۔ اب تو اس کی ہنسی بہت بہت دن بعد ہو چلی تھی۔ جب سے اس کے کالج میں ڈے کیئر کھلا تھا، وہ گڑیا کو چھوڑنے بھی نہیں آتی تھی۔ جن کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوں۔ وہ بھی یہ گلہ نہیں کرتے تھے کہ اتنے اتنے دن کیوں نہیں آتی۔

وہ اب ان سب ہنستے کھیلتے لوگوں میں سے اس کھلے کاغذ سے پھلا دکھ کس کو پہنچائے۔ کون کون اس صدمے سے دوچار ہو۔

جب قیصر بے کسی کی حالت میں پٹیوں اور ٹیوبوں میں قید جیسے کبھی آنکھ نہ کھولنے کے لیے لیٹا تھا تو اس کے اندر اتنا غصہ بھرا ہوا تھا کہ اس کا شدت سے جی چاہتا تھا وہ جائے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک کو اتنے ٹھڈے مارے کہ لہولہان کر دے۔ ایک ناحق ظلم اس پر بھی ہوا لیکن وہ کس کو ٹھڈے مارے۔ ہم شاید زیادتیاں سہتے رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ سارہ حق کے بقول۔

کچھ بھی فیصلہ کیے بغیر اس نے بیڈ سے پاؤں نیچے اتارے۔ کابلی سے پنجوں کو چپل میں گھسیڑا۔

بہرکیف اس کو یہ سب کسی تک تو پہنچانا تھا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ وا کر کے اس نے باہر بیٹھے لوگوں کی طرف ایک نظر دیکھا۔ بڑی خوش دلی سے مسکراتے اس نے عثمان کے ہاتھ ہلانے کا جواب ہاتھ ہلا کر دیا۔

اپنے کمرے سے نکل کر گیلری سے گزرتے وہ کسی وجہ کے بغیر ٹھٹک گئی۔ بہت ساری دھوپیں جیسی پیلی ہوئی تصویروں کے پاس رکی۔ کیا ان سب میں سے کسی نے دھنک رنگ چنری اوڑھی ہوئی ہے۔ کالی سفید دنیا میں رنگ صرف تصور اتی ہی ہوتے ہیں۔ وہ جون آف آرک سے قریب تر ہوئی۔

"ہیلو جون۔ ہاؤ آر یو آپ پی ایچ ڈی کرو گی۔ آؤ ہم دونوں اپنی اپنی خواہشوں کو ایک دوسرے سے بدل ڈالیں۔"

وہ جب بھی اس گیلری سے گزرتی۔ دادی یا پڑدادی جون کے پاس ہمیشہ ٹھہرتی۔ وہ جیسے اس کے بچپن کی سہیلی تھی۔ اس کی طبیعت کا غصہ۔ اس کی چیلنج کرتی آنکھیں اور اس کی غیر معمولی شباہت۔ کیمرے کے لیے مسکراتی لیکن مسکراہٹ کا ساتھ نہ دیتا اس کی آنکھوں کا دکھ۔

قدیم تصویروں سے اس کی عجیب کیمسٹری ملتی تھی۔ ابا کے کمرے میں لگی قائداعظم کی واحد پورٹریٹ بھی ہر دفعہ اپنا تاثر بدل لیتی۔ کبھی ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک ہوتی۔ کبھی وہ اس کو سرزنش کرنے والے انداز میں گھورتے۔ کبھی محض محبت سے مسکراتے۔ بعض اوقات تصویر کے برابر چلتے اسے لگتا، قائداعظم نے اس کے ساتھ ساتھ گردن گھمائی ہو۔

ہمیشہ کی طرح ان کے دروازے سے پہلے اس کا سر اندر آیا پھر سالم وجود۔ وہ اپنے گھر کے ٹی وی پر الیکشن کمپین کے سلسلے میں ہونے والی گما گمی دیکھ رہے تھے۔ اس وقت جب سب کسی نہ کسی کے ساتھ گروپ بنا کر خوش گپیوں میں مشغول ہوتے۔ وہ تن تنہا ہیٹر کے قریب گھٹنوں پر کتاب اوندھائے ٹی وی کے خبرنامے میں گم تنہائی محسوس نہیں کرتے تھے۔ کبھی وہ تنہا ہوئے تو ہجوم میں۔

اسکرین سے نظریں ہٹیں تو اس کے ہاتھ میں کھلے لفافے سے ہوتی اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔

"آؤ دیکھو۔"

انہوں نے کسی بھی بے صبری کا مظاہرہ نہ کرتے سکون سے کہا۔ وہ کھلا کاغذ لے کر اندر آئی ہے تو ضرور کچھ دکھانا ہی ہو گا۔ پھر افراتفری کاہے کی۔

"ہیٹر کے پاس آجاؤ۔ سردی زیادہ ہے یا شاید ہمیں ہی اس عمر میں لگتی ہے۔"

"دسمبر بھی تو آگیا ہے۔" اس نے رسان سے کہا۔ "مجھے سردی بہت اچھی لگتی ہے۔"

"مجھے دسمبر اچھا نہیں لگتا۔ پینتیس چھتیس سال گزر گئے مگر دسمبر کی اذیت ختم نہیں ہوتی۔"

پہلے سے اذیت میں مبتلا شخص کو وہ مزید اذیت میں کیسے ڈالتی۔ تکلیف دہ وقت۔ دراصل ہم اپنے دکھ کو چھیننا دے کر پھر سے تازہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کو بھولا بھی تو نہیں جا سکتا۔

"بلیک آؤٹ۔ ہر طرف اندھیرا۔ جنگ بڑی خوفناک چیز ہے۔ جب وہ سرحدوں سے آپ کے سروں تک آجائے۔ جہاز ہمارے اوپر سے دندناتے شیلنگ کرتے اور سکون سے واپس چلے جاتے۔ ہم نے ان کے تعاقب میں جھپٹتے اپنے جہازوں کی آوازیں نہیں سنیں۔ پہلے کچھ دن اینٹی ایئر کرافٹ چلتے رہے۔ پھر وہ بھی اس یکسانیت سے بے زار ہو گئے۔ وہ اطمینان سے ہماری سرحدوں میں داخل ہو کر بمباری کرتے اور جیسے بے فکری سے ٹہلتے ہوئے واپس چلے جاتے۔"

وہ ایک بڑے دکھ کی بات چھیڑ بیٹھے تھے۔ اس کو اپنا موجودہ دکھ سطحی لگنے لگا۔

"ہم یہ سب آسمان پر ہوتا دیکھتے اور زمین پر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔"

اس نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔ ہم آج چھتیس سال گزار کر بھی زمین پر کچھ نہیں کر سکتے۔ اب بھی جہاز ہماری بستیاں الٹا کر چلے جاتے ہیں۔

کبھی دشمن سامنے صف آرا ہوتا ہے تب اس کی کوئی پہچان بھی ہوتی ہے۔ پھر وہ آپ کی اپنی صفوں میں آشامل ہوتا ہے اور پہچانا نہیں جاتا۔

"مجھے آپ سے ایک بات کہنی تھی۔" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا رزلٹ اچھا نہیں آیا۔ سی گریڈ"

ان کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں آیا جس سے وہ اپنی بات کا کوئی ردعمل دیکھ سکتی۔ ان کے کان اس کی بات پر لیکن آنکھیں ٹی وی اسکرین پر مرکوز تھیں۔

"شاید اس دفعہ میں نے محنت نہیں کی تھی۔" اس نے الزام اپنے کندھے پر لینا چاہا۔ سسٹم سے تو وہ پہلے ہی دکھی تھی۔

www.pkdigest.com

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔" انہوں نے ریموٹ اٹھا کے ٹی وی بے آواز کر دیا۔

"کچھ خط آئے تھے میرے نام گمنام۔ انہوں نے لکھا تھا' وہ تمہاری ایکٹیوٹیز سے ناخوش ہیں اور یہ بھی لکھا تھا' تمہیں اپنے ارادوں سے باز کر لوں ورنہ برے نتائج کے لیے تیار رہوں۔ ایک خط میں لکھا تھا۔ میرا بہت لحاظ کرتے ہیں اس لیے مجھے آگاہ کر رہے ہیں۔ دوسرے خط میں لکھا تھا وہ میری اولاد سے اس کے سوا اور کچھ توقع نہیں کرتے۔"

دنیا سے الگ تھلگ۔ لیکن کس قدر باخبر۔ اس کا منہ رنگ گیا۔

"میں نے تم سے ذکر نہیں کیا تاکہ تمہاری پڑھائی پر اثر انداز نہ ہو۔"

ہم ہمیشہ بڑوں سے کچھ نہ کچھ چھپاتے آئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں کامیاب رہے ہیں۔ حالانکہ وہ ہمیں کامیاب بنانے میں ہمارا بھرپور ساتھ دے رہے ہوتے ہیں لاعلمی کا کھیل کھیل کر۔

اسے لگا یہ خط اس کا بچپن تھا۔

جیسے وہ ایک مٹھی میں شار بنر چھپا کر دونوں بند مٹھیاں آگے کر کے پوچھتی تھی۔

"بتایئے کس میں!"

ننھی سی مٹھی کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان سوراخ سے لال رنگ کا شار بنر شرارتی بچے کی طرح جھانک رہا ہوتا تھا۔ "ابا مجھے ڈھونڈو۔"

لیکن وہ اس مٹھی کو قطعی نظر انداز کر کے خالی مٹھی پر ہاتھ رکھ کرتے۔

"اس میں۔"

ان کے اپنے ہاتھ میں ایک پھٹا ہوا لفافہ تھا لیکن وہ ان کی شکست پر بچپن کی طرح کھلکھلا کر نہیں ہنس سکی۔

"حمیرا کا کیا بنا؟"

"حیرت کی بات کہ اس کا اے گریڈ ہے۔"

"اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رزلٹ دشمنی کی وجہ سے ایسا نہیں آیا ہے۔ اگر دشمنی کرتے تو دونوں سے کرتے۔ میں ان کو مدت سے جانتا ہوں۔ برس ہا برس میں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے۔ تمہارے ایک ساتھی کو زخمی کر کے۔ تمہیں اتنا برا رزلٹ دے کر انہوں نے اصل میں پیغام مجھے ہی دیا ہے۔ میں Seerecy Branch کو بھی جانتا ہوں۔ وہ بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کریں گے۔ گریڈ کچھ اہم نہیں ہوتے۔ وہ بی اور سی ہوں یا 20-19 اگر تم نے وہ کر لیا جو کرنا چاہتی ہو یا اس کی طرف قدم بھی بڑھایا تو جان لو' تمہیں تمہارا کریڈٹ مل گیا۔"

وہ کس استقامت سے آواز میں کسی لرزش کی آمیزش کے بغیر اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

"اعجاز کے ساتھ کیا ہوا؟"

"پاس ہو گیا۔ لیکن اس سے کہا گیا اس کو رزلٹ کارڈ اس وقت تک نہیں دیا جائے گا جب تک وہ تھیٹر سے ہونے والی آمدنی کا آڈٹ نہ کروا لے۔ کیونکہ اس نے 500 اور 1000 روپے کے ٹکٹ بیچے۔ اس کام کے لیے اس نے یونیورسٹی کی زمین اور اس کے وسائل سے ذاتی فائدہ اٹھایا۔"

"لیکن تمہارا تو ٹکٹ پچاس سے اوپر تھا ہی نہیں۔ کروالو آڈٹ۔"

"لیکن اس سے پہلے ہی پوری یونیورسٹی میں اس کے چور ہونے کے پوسٹرز چھپ گئے ہیں۔"

"الزام سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ وہ جلد یا بدیر غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ بدترین عہد میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔"

"ابا! اب میں ڈاکٹریٹ نہیں کر سکوں گی۔"

www.pkdigest.com

"کیوں نہیں کر سکو گی۔ یہ زمانہ بہت مدت نہیں رہے گا۔"
"لیکن یہ زمانہ بہت مدت سے تو ہے۔"
"وہی تو تمہیں بدلنا ہے۔"
وہ کتنی دیر ان کے کمرے میں کرسی پر جامد ساکت بیٹھی رہی۔ وہ بھی چپ چاپ بغیر آواز کا ٹی وی دیکھتے رہے۔ جنرل کا حامی ٹولا سب سے مشکل کام کر رہا تھا۔ اس کا سیاسی دفاع۔ ان کے پاس دلیل نہیں تھی۔ لہٰذا ان کو بے آواز سنا جا سکتا تھا۔
آج وہ صدمے سے چور چور تھی اور اس کو پہلی دفعہ احساس ہوا' غم صرف ذاتی ہوتا ہے۔ لوگ آپ کے ساتھ مغموم تو ہو سکتے ہیں لیکن آپ کے غم کی نوعیت تبدیل نہیں کر سکتے۔
وہ وہاں سے اٹھی تو خواتین کی محفل میں آ گئی۔ خواتین کلب بڑی خوش دلی سے اپنی کسی نہ کسی سرگرمی میں مصروف ملتا۔ کتنا اچھا ہوتا ہے یہ زمانہ جب آپ اپنا سارا ماضی گزار کر خوشگوار اور ناخوشگوار یادیں سمیٹے ایک محفوظ سرمایہ ساتھ لیے زندگی بسر کرتے ہیں تو آپ کو مستقبل کے اندیشے نہیں ڈراتے۔ جو حد سے حد ہونا تھا ہو چکا۔ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔
ہر چھوٹا بڑا بھولا بھالا کام اس قدر اہم ہوتا ہے کہ سارا گروپ اپنے انفرادی شوق چھوڑ کر نہایت سنجیدگی سے متحد ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔
سیمنٹ کا چبوترا جو کبھی صحن کلچر کا حصہ تھا' رنگ برنگی چیزوں سے لدا ہوا تھا۔ چینی' ڈبل روٹی' دودھ' پیتل کے تسلے' زعفران کی ڈبیا۔
چبوترے کے نیچے صحن کے دروازے کے پاس جہاں کبھی پیر مکوڑے کا میلہ لگا کرتا تھا اینٹوں سے ایک عارضی چولہا تعمیر کیا گیا تھا۔ بڑی تائی نے اپنی امی سے شاہی ٹکڑوں کا ایک نادر نسخہ سیکھا تھا جو دراصل ان کو واجد علی شاہ کے طعام خانے سے چوری کر کے پہنچایا گیا تھا۔
بڑی تائی چیزیں سونگھ سونگھ کر ایسے رد کر رہی تھیں جیسے واجد علی شاہ نے شاہی ٹکڑے بنانا ان سے ہی تو سیکھے تھے۔
"اونہہ! نقلی زعفران۔ اصلی زعفران تو سونے کے بھاؤ ملتا ہے۔ ڈبیا کھلتی تو سارا باورچی خانہ مہک اٹھتا اور پیکٹ کے دودھ سے بھی کبھی شاہی ٹکڑے بنے ہیں۔ دودھ تو رمضانو کی بھینسوں کا گاڑھا میٹھا خوشبودار۔"
ہر چیز رد کر کے بھی شاہی ٹکڑوں کا اہتمام جاری تھا۔
"تنویر کہاں ہے؟" عبیر نے چاروں طرف دیکھا۔
"وہ تو چلی گئی۔ میں ڈبل روٹی کے مزید سلائس تل کر لاؤں۔"
"ہاں۔ خوب سرخ کر کے لانا۔"
"واہ خوب!" اس نے حیرت سے سوچا۔ "بھلا باہر سے باہر واپسی کا مطلب؟"
راکھ مٹی کی تہہ پر سلگتے کوئلوں کی ایک پرت۔ کریم بی کی زبان میں "لگن" چولہے پر ٹکا کر دوسرے طشت سے ڈھکتے۔ ڈبل روٹی کے توس دودھ کے بستر میں استراحت فرما رہے تھے (آخر کو شاہی جو ہوئے) بڑی تائی مہارت سے چمٹا پکڑے انگارے اوپر والے لگن پر دو زنی اینٹوں کے اردگرد ایک ترتیب سے رکھ رہی تھیں۔ کبھی اوپر والے انگارے نیچے چولہے میں چلے جاتے۔ نیچے سے تازہ دم انگارے اوپر والوں کی جگہ لینے کو موجود۔
عثمان نے کچھ دیر ٹھہر کر بڑی دلچسپی سے سارا تماشا دیکھا۔ "یہ ہماری آخری نسل ہے۔ جس میں ہم زوال پذیر تاریخ کی جھلک دیکھتے ہیں۔ پھر یہ لوگ معدوم ہو جائیں گے۔"

"یہ کام اوون میں نہیں ہو سکتا؟"
"ہٹاؤ' ساری عمر ہو گئی ہمیں پکاتے۔ یہ اون وون تو ابھی کل کی ایجاد ہیں۔ اللہ مارے انگریزوں کو شاہی ٹکڑوں کا کیا پتا۔" کریم بی ماضی میں کھو گئیں۔
"ہمارے وقت میں تو سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے بھی پکتے تھے۔ بچی ہوئی روٹیاں صحن میں رکھ کر خشک کی جاتیں۔ پھر ہاون دستے میں کوٹ کر گڑ کے شیرے میں۔" تصور میں ان کی انگلیاں شیرے میں لت پت ہو گئیں۔
"ایسی چیز تھی کہ ہفتوں اس کے انتظار میں روٹیاں سکھائی جاتیں۔"
"وہ یقیناً" فقیری ٹکڑے کہلاتے ہوں گے اور یہ کیا ہے سلور رنگ میں؟ آپ کو پتا ہے' میڈیکل سائنس نے چاندی کے ورق اور زردے کے رنگ کو زہر قرار دیا ہے۔"
جھکی ہوئی بڑے اشتیاق سے چولہے میں دہکتے انگاروں کو جھانکتی اماں دفعتاً سیدھی ہو گئیں۔
"تم اپنے کمپیوٹر پر بیٹھو۔ خبردار جو ہمیں کوئی نصیحت کرنے آئے تو۔"
"یعنی آپ زہر کھائیں اور میں خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہوں۔ نہیں اماں آپ کے بنا میرا جینا بے کار ہے۔ کب تک تیار ہوں گے؟"
اماں نے عثمان کو دوسرا کڑوا سا جواب دینے کے لیے تیر کمان سنبھالا تھا کہ ٹھٹک گئیں۔ عثمان کے پیچھے سے جھانکتی ہمیشہ ہنستی آنکھیں۔ آج بجھی بجھی سی تھیں۔ لمحے بھر کو چولہا چوکا بیک گراؤنڈ میں رہ گیا۔ اس کا بھائی مسخرے لطیفے کر رہا تھا۔ باپ کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی لیکن پتا نہیں کیوں ماں بیٹی کے درمیان عجیب سا تکلف بھرا فاصلہ تھا۔ جس کو پاٹنے کی کوشش دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں کی تھی۔ تنویر کو سمیٹتے انہوں نے اس کو بکھیر دیا تھا۔ گو وہ کبھی تنہا نہیں ہوئی۔ اس کے باپ بھائی' دوست احباب اس کو گھیرے رکھتے اور ان کو وہم ستاتا تھا کہ ان سب نے تنویر کو دل سے واپسی کا راستہ نہیں دیا تھا۔ ان کی بیٹی میکے میں پردیسن سی اکھڑی اکھڑی آتی تھی اور ویسے ہی اجنبی اجنبی چلی جاتی۔
مگر یہ بھی کیسی حیرانی کی بات ہے' اس نے اپنے ساتھ گزرنے والی اس کہانی کا ذکر سب ہی سے کیا بس ایک ان سے نہیں۔ اس کو لگتا تھا شاید وہ اس کو سمجھ نہیں سکیں گی۔

☆ ☆ ☆

"کہانی تو کچھ بھی نہیں تھی۔ ایک تو تم لوگ قصے کہانیوں کے بڑے شوقین ہو۔ بس وہ ایک Planted (متعین) آدمی تھا۔"
حمیرا کے کسی سوال کے جواب میں ٹی وی سے کان اور اون سلائیوں سے نظریں ہٹا لیں۔ عبیر اپنی دوست کی برابر والی کرسی پر بیٹھی تھی لیکن سنتی تو ہو گی نا۔
"اس کو داخلہ بھی پریوس کے بجائے فائنل میں ملا۔ جس دن داخل ہوا بس اس پہلے دن وہ کلاس میں آیا۔ آ کر سب سے آخر میں بیٹھ گیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنا تعارف کراتا۔ ٹیچر نے اس کا تعارف کرایا۔
ٹیچر نے لیکچر روک کر کچھ خوف' کچھ مرعوبیت کی کیفیت سے اسے دیکھا۔ پھر ہم نے کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی اور اسے بھول گئے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں اس نے امتحان بھی دیا کہ نہیں۔ کیونکہ وہ قطعی غیر اہم آدمی تھا۔ لیکن جب رزلٹ آیا تو اس نام نے ٹاپ کیا۔ جس کی ہم صورت بھی بھول بیٹھے تھے۔ اس کے مجھ سے تین نمبر زیادہ تھے۔ جب ہم ریسرچ کر رہے تھے۔ ہم نے اس کو اپنے درمیان نہیں پایا۔ جب تھیسس لکھا گیا' وہ کہیں نہیں تھا۔ لیکن رجسٹروں میں اس کی حاضری سو فیصد تھی اور اس نے نہایت اعلا پرچے کیے تھے۔ لہٰذا قانون کے

www.pkdigest.com

مطابق ڈیپارٹمنٹ کی واحد خالی پوسٹ پر لیکچرر بھرتی کر لیا گیا اور وہ سلیبس پڑھانا شروع کر دیا جو اس نے دو سال میں خود کبھی نہیں پڑھا تھا۔

وہ دراصل ایک شخص نہیں تھا۔ ایک ٹولا تھا۔ خدشہ تھا کہ ٹاپ میں نے کر لیا تو یہ سیٹ مجھے مل جائے گی اور شاید میں ان کے مفادات میں رکاوٹ بنوں یا ان کو من مانی کرنے دینے میں ان کا آلہ کار نہ بنوں' سو سارا گروپ متحد ہو گیا۔ ہم ایسے موقعوں پر ہمیشہ متحد ہو جاتے ہیں۔

جب ہم پر کوئی واردات گزرتی ہے ہم سمجھ لیتے ہیں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایسا کب نہیں ہوا۔"

شیطان اور اس کے چیلے مصروف کار رہتے ہیں۔ یہ لوگ مختلف ناموں سے ہر عہد اور ہر نسل میں موجود رہے ہیں۔

نہ زیادتی کرنے والوں کا زمانہ نیا ہے۔ نہ ظلم سہنے والوں کی فطرت بدلی۔ ایک کے پاس احساس نہیں۔ دوسرے کے پاس احتجاج نہیں۔

"شاہی ٹکڑے لو حمیرا! یہ بڑی تائی کا نسخہ ہے جو انہوں نے واجد علی شاہ سے سیکھا تھا۔"

عنبر کو لگا سینے پہ رکھا ایک بھاری طشت ایک اینٹوں بھراوزنی لگن خود بخود سرک گیا ہو۔ اندر والے انگارے اوپر آ گئے ہوں۔

☼ ☼ ☼

سارا دن بے مقصد مٹر گشتی کرتے' سیاسی جلسوں کی رونقیں دیکھتے قوم کے خادموں کے نام اور پوسٹروں پہ لکھے اشعار پر سر دھنتے وہ ابھی شہریار کو اسٹیشن چھوڑ کر واپس آئے تھے۔ وہ اسی طرح آتا تھا۔ اچانک بے اطلاع تھوڑے سے وقت کے لیے اور اس محدود وقت کو اسے بہت سے خانوں میں تقسیم کرنا ہوتا تھا۔ اپنا گھر' نانیا کا خاندان اور آخر میں رضا وغیرہ سے ملتے واپسی کا سفر اختیار کرتا۔

عنبر کی نظر پڑی تو وہ چچا عبدالعزیز کے ساتھ خورد رو گھاس اور بے ترتیب اگے جنگل میں اپنی ماہرانہ رائے کا اظہار کر رہا تھا۔ جیسے وہ یہیں کا حصہ تھا۔ کبھی کہیں گیا ہی نہیں تھا۔ کھڑکی کھول کر اس نے دیکھا اور بے ساختہ سی چیخ ماری۔

"ارے تم کیسے آئے۔"

"بس یونہی اتفاقاً" سامنے سے گزر رہا تھا۔ سوچا تمہاری خیریت پوچھتا چلوں۔"

اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"میں یہاں خیریت سے ہوں اور خداوند قدوس سے آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ بس پوچھ لی؟ اب جا رہے ہو واپس۔"

اب باقی تمہارے خط میں مجھ سے کیمرہ ادھار مانگنے کا ذکر ہو گا۔ نیچے لکھنا رول نمبر 113 جماعت ششم۔"

اس کے ماتھے پر لکھا تھا' اس کا رزلٹ وہاں تک پہنچ گیا ہے۔ حالانکہ اب وہ کامیابی سے باہر نکل آئی تھی۔ ایک واقعہ ہونا ہی تھا اور ہو گیا بس۔ اور کتنی دیر تک جان کا روگ بنایا جا سکتا تھا۔ زیادتی برداشت کر لینے کے بارے میں اس کی فلاسفی کچھ اور تھی۔ لیکن عملی زندگی میں اسے پتا چلا' اب سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا برداشت کر لو یا فرار ہو جاؤ۔ حالانکہ نہ اس سے برداشت ہوتا تھا نہ بھاگا جاتا تھا۔ کسی دن تو وہ سب ان لوگوں کو تبدیل کر سکیں گے۔ راستے انفرادی مسائل کے حل کے لیے نہیں اجتماعی دکھوں کے لیے تلاش کرنے چاہئیں۔

شہریار نے کھڑکی کے فریم میں جڑا اس کا چہرہ دیکھا۔

کچھ مدت پہلے یہاں اس کھڑکی اور اس فریم میں اس کی بہن کا چہرہ تھا۔ سب کچھ اپنی من مانی سے کر کے ہر فیصلے کو رد کر کے۔ بہت سوں کا دل دکھا کے وہ یہاں تنہا کھڑی تھی۔ دو بے ساختہ ٹپک آنے والے آنسوؤں کے ساتھ' من چاہا ملنے کے بعد اسے پتا چلا' اس نے چاہا ہی غلط تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔

جب اس کو حمیرا کی میل ملی۔ اس میں لکھا تھا' جتنی محنت اس نے اے گریڈ لینے کے لیے کی تھی اس سے کہیں زیادہ محنت ڈیپارٹمنٹ نے اسے سی گریڈ دینے میں کی ہے۔

اس کے لیے اپنا رزلٹ کتنا اہم تھا۔ زندگی میں ارادوں کی تکمیل کے لیے لیکن۔ "میں نے اپنے اللہ کو ارادوں کے ٹوٹ جانے سے پہچانا ہے۔" پڑھائی۔ مزید پڑھائی۔ لمبے لمبے منصوبے۔ بڑے بڑے ارادے اور جب وہ سب ملیا میٹ ہو جائیں تو ایسی ہی ایک بے ساختہ سی خوشی سے بھری چیخ کے ساتھ "آنا تیرا مبارک تشریف لانے والے۔" ٹائپ استقبال اور یہ ایسی ہی ہے۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس کی آمد کی خبر پھیلی۔ لوگ کونوں کھدروں سے نکلے اور اس کے استقبال کو لپکے۔

"کس قدر سوکھ گیا میرا بچہ۔" کریم بی نے رقت سے کہا۔ دادی اماں کا دل دہل گیا۔

"ہڈیاں نکل آئیں۔ جب یہ کیا نام اوپر برف والے محاذ پر گیا تھا۔ تب بھی سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔"

"رنگت کیوں اتنی سیاہ ہو گئی۔ چاند سا چہرہ کملا کر رہ گیا۔" بڑی تائی فق ہو کر بولیں۔

"جاؤ واپس۔ پہلے اپنا یہ سب کچھ ٹھیک کرو' پھر آنا۔" عثمان نے کہا۔

"آپ خواتین کو اس میں کوئی خوبی بھی نظر آ رہی ہے۔ یا سب خرابیاں ہی اکٹھی ہو گئی ہیں۔"

"ہمارے کلچر میں خواتین اپنائیت کا اظہار اسی طرح کرتی ہیں اور اس کا کوئی برا بھی نہیں مانتا۔ اتنا برا ہو گیا؟ کمزور ہو گیا؟ یہ اپنی شکل کا کیا کیا؟"

فوزیہ کو وہ ساتھ تو لے چلا آیا تھا۔ لیکن اس کو ان لوگوں کی بے ربط' ٹوٹ پھوٹ باتیں کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتی تھیں۔ جتنی دیر گھر میں اس کی آمد کا جشن منایا جاتا رہا۔ اس پر سناٹا طاری رہا۔ اس کو عجیب لگا' تایا عباس جیسے سنجیدہ مدبر آدمی بھی اس کی آمد پر ایسے کھل اٹھتے تھے کہ ان سے اپنی خوشی چھپائی نہیں جاتی تھی۔ معلوم نہیں ان سب کا Interest (مفاد) کیا ہے۔

اور پتا نہیں بھائی اتنا بے تاب کیوں ہے۔ رات بہت لیٹ پہنچا تھا۔ صبح اس کو ناشتہ کرانا مشکل ہو گیا اور یہ رضا لوگ بھائی کے کیا لگتے ہیں جن کو یہاں آتے ہی اس بے تابی سے اس نے پکارا تھا اور ذرا ہی دیر میں وہ دوڑے چلے آئے تھے۔ ان کی ہنسی کسی صورت قابو میں نہیں آتی تھی۔ پھر سارا دن انہوں نے کہاں کہاں گزارا۔ ایک بوسیدہ اسکول کے باہر۔ کسی پرانے پارک میں نہر کے پلوں پر۔

اتنی گندی مٹیالی نہر سارے شہر کا کوڑا۔ پلوں کے نیچے اٹکا ہوا اور وہ کہتے ہیں Past Reloded۔

اسٹیشن پر وہ سب اسے ایسے رخصت کرنے چلے جیسے وہ حج پہ جا رہا تھا۔ اور وہ ایک ایک سے گلے ملتا۔ تھوڑی دیر رکتا۔ کوئی انفرادی پیغام دیتا۔ سب سے آخر میں عنبر کے پاس ٹھہر گیا۔

"اس دن جب تم قیصر کے ساتھ ہسپتال میں تنہا بیٹھی تھیں۔ تم نے بتایا اعجاز نوز دینے چلا گیا تھا۔ تم دعا کر رہی تھیں کہ کوئی آ جائے۔ اس وقت کون تمہارے پاس آیا تھا؟" اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب؟"

"پتا نہیں۔ لیکن مجھے لگتا ہے۔ کوئی آیا ضرور تھا' کوئی اہم شخص۔" گاڑی رینگنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ ڈنڈا پکڑ کر اپنے ڈبے میں سوار ہو گیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں انشاء اللہ)

www.pakdigest.com

رفعت ناہید سجاد

چراغ آخر شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد' ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے' جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی ثریا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونیورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

http://edigestpk.blogspot.cm

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے' وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔

عبیرہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بہ وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ تائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کر دیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

11

گیارہویں قسط

http://edigestpk.blogspot.com

وہ اپنے کمپارٹمنٹ کا ڈنڈا پکڑ کر لٹکا ہوا تھا۔ اپنے ساتھ [illegible] آہستہ رینگتی اور پلیٹ فارم سے باہر کی طرف سرکتی گاڑی میں مخالف سمت جاتا ہوا۔

بڑا عجیب تصور ہے۔ ایک شخص آپ کے سامنے کھڑا نظر آرہا ہے قدم بھی نہیں ہلاتا۔ لیکن ہر لمحہ آپ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ ایک سفید دھبے کی طرح نظر آنے لگتا ہے۔ انجن کا ہارن دلدوز چیخ کی طرح فضا میں گم ہوتا۔ یونی فارم میں ملبوس ٹی ٹی کی طویل سانس والی سیٹی۔ سب جیسے فاصلوں کی اطلاع دیتے ہیں۔

اسٹیشن سے باہر پتنگ کی ڈور کی طرح گنجل میں الجھی ہوئی لاتعداد پٹڑیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتی وہ ریل سہولت سے رواں دواں تھی۔ لاہور اسٹیشن سے باہر چھوٹے بریکٹ کی شکل کے curve میں اپنے مخصوص راستے سے گزرتی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

وہ اسی جگہ، اسی قدم، جہاں اس نے رسان سے اس کے سامنے جھک کر آنے والے کی نشان دہی چاہی تھی، جمی کھڑی تھی۔ گم صم، ہکا بکا۔ اس آدمی میں کچھ جناتی خصوصیات ہیں۔ کہاں سے آجاتی ہیں یہ کرامات۔ نہیں معلوم۔

اسے خوف سا محسوس ہوا۔ جہاں جملہ ختم ہوتا ہے، وہ اس سے آگے بھی پڑھ لیتا ہے۔ ان کہے لفظ اس کو سنائی دیتے ہیں اور آپ اس کو جھٹلا بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ اس کے لیے آپ کو خود کو جھٹلانا پڑتا ہے۔

جب آج صبح اس نے اپنے گھر کے لان میں چچا عبدالعزیز کے پاس پودوں سے متعلق باتیں کرتے پایا تو جیسے اس کے ماتھے پر لکھا تھا اس کا رزلٹ اس تک پہنچ گیا ہے۔ گو اس نے براہ راست اس تک کوئی اطلاع نہیں پہنچائی

تھی اور یہ خبر ایسی اہم بھی نہیں تھی کہ وصول کرنے والوں کی دل آزاری کا سبب بنائی جائے۔ ویسے بھی تاپ کرتا۔ ریکارڈ توڑنا اور نئے نئے ریکارڈ بنانا تو ہر کے حصے میں آئے تھے۔ وہ تو بس اچھی طرح پاس ہو جاتی تھی۔ اور فیل تو اب بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کو یقین تھا وہ اس کا رزلٹ سن کر آیا تھا۔ زندگی میں جب بھی اس نے اچانک ملنے والی خوشی کو سلیبریٹ کرنا چاہا یا سب سے چھپا کر رکھا دکھ کسی کو بتانا چاہا اور جب جب کسی کو پاس نہ پایا تو اچانک شہریار کہیں سے چھم سے برس پڑتا۔ جیسے چراغ رگڑنے سے جن نمودار ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی دل جوئی کے لیے نمودار ہوا تھا لیکن دور جاتی ٹرین میں اسٹیشن کی اجلی روشنیوں کے درمیان اس کو لگا اس آخری جملے کے بعد جو سیاہی سے لکھا اس نے وہ بھی پڑھ ڈالا تھا۔ وہ اپنی علمیت کی تصدیق کے لیے آیا تھا۔

اچانک لاؤڈ اسپیکر کھلے اور پھٹی ہوئی آواز میں کسی ٹرین کی کسی اور پلیٹ فارم پر آمد یا روانگی کی اطلاع دی جانے لگی۔ پہلے زبان اردو پھر انگریزی۔ لیکن سمجھ میں دونوں زبانیں نہیں آتی تھیں۔ یہ ریلوے کا نظام انگریز دے گیا تھا اور غالباً ابھی تک وہی اسپیکر استعمال ہو رہے تھے جو لارڈ صاحب پلیٹ فارم نمبر چار پر گاڑ گئے تھے۔

پلیٹ فارم بھی ایک جادو کا شہر ہوتا ہے۔ ایک پھونک سے آباد ہوتا ہے اور دوسری پھونک سے الٹ جاتا ہے۔ ریڑھیوں پر آباد ریسٹورنٹ نان کباب، چھولے، روٹی بوتلیں گلے سے لٹکے، رسالوں کے ریک پوٹلیاں اور گٹھڑیاں سنبھالے مسافر کس کس طرف جاتے ہیں اور کس کس کو چھوڑ کر جاتے ہیں اور کہاں کون ان کا منتظر ہوتا ہے۔ بس ایک دوڑ بھاگ ہے۔ چہروں پر گھبراہٹ نمایاں کہیں ٹرین ان کو چھوڑ کر نہ چل دے۔ ٹرین ایسی ہی بے مہر ہوتی ہے۔

پھر جب گارڈ کی سیٹی اور انجن کے ہارن کے ساتھ وہ رینگتی ہے۔ لوگ اس کے ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلتے ہیں۔ اپنے پیاروں کو رخصت کرنا آسان نہیں۔ پلیٹ فارم ختم ہو جاتا ہے اور ٹرین اپنے جاہ و جلال کے ساتھ آگے نکل جاتی ہے۔ رہ جاتا ہے تو وہ پلیٹ فارم کے بیچ کھدی ہوئی قبر کی طرح کا ریل ٹریک دو چمکتے سانپوں کی طرح جن پر موٹے موٹے بھاگتے چوہے اور ان کا تعاقب کرتے نیولے۔

http://edigestpk.blogspot.com

[illegible] ریڑھی والے اپنا سامان سمیٹے اس رخ روانہ ہوئے جہاں ان کا اگلا پڑاؤ تھا۔ جس کی چھٹی آواز کم از کم ان کو سمجھ میں آگئی تھی۔ سو وہاں جہاں دوسری پھونک سے اگلا طلسم آباد ہونے کو تھا۔

سوٹ کیس، کمبل، بکسے، تھیلیاں، پوٹلیاں، سرخ کپڑوں والوں کے سروں پر لدی، چھت پر تنے ہوئے لوہے کے جنگلے والے پل سے ایک قطار میں گزر رہی تھیں۔ بقیہ پوٹلیاں رخصت ہوتی ٹرین اپنی سیٹوں میں سمیٹ کر منزل کی طرف روانہ ہو چکی تھیں۔

ذرا دیر پہلے کی افراتفری مچاتے، آپا دھاپی میں ایک دوسرے کو ٹکریں مارتے شیشوں کے اندر جھانکتے، شور مچاتے ہراساں لوگ، "آنا" "فانا" غائب ہو گئے۔ جادو کا شہر۔ جسے جادوگر نے اپنے معمول کی ہتھیلی پر آباد کیا اور اڑا دیا۔ رہ گیا تو ٹی اسٹال والا۔ اس کا کھوکا پکا اور مستقل تھا۔ جس کا لڑکا بڑی مہارت سے چائے کی پیالیوں کا مینار لیے ان کے سامنے سے دوبارہ گزرا تھا۔ جمال نے بڑی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ جو اتنی پیالیاں لبالب بھری لے کر تم دوڑتے ہو۔ گرتی نہیں؟"

وہ شرما کے مسکرایا۔

"نہیں جی۔"

وہ عادی تھا۔ بعض سر پھرے بابو لوگ یونہی اپنی معلومات میں اضافے کے لیے اس سے سوالات کرتے رہتے تھے۔

"آرٹسٹ آدمی ہو۔ کب سے کررہے ہو یہ کام؟"
"عرصہ ہوگیا جی۔" سال مہینوں کا حساب شاید اس کے لیے اہم نہیں رہا تھا۔
"گھر کہاں ہے؟"
"گھر تو بڑی دور ہے جی۔ ساہیوال کا نام سنا ہے آپ نے اس سے بہت پیچھے ہمارا گاؤں ہے۔"
"گاؤں سے آئے تو اسٹیشن پر چائے دینے لگے؟"
"پہلے شہر میں تھا۔ برکت کی اسٹال پر۔ برکت صاحب فوت ہوگیا تو ابا اسٹیشن پر لے آیا۔"
"سوتے کہاں ہو؟"
"سونے کا ٹائم ہی کہاں ہوتا ہے۔ ادھر بینچ پر سوتے ہیں۔"
"ارشاد۔ اوئے دفع ہو مر۔ چائے ٹھنڈی لے کر جائے گا۔"
پیچھے سے آئی کرخت آواز پر وہ پھر سرپٹ دوڑا۔ کندھے سے بلند ہاتھ پر رکھی ٹرے میں پیالیوں کے مینار سمیت تختی لگے کمروں میں سے کسی ایک میں گم ہوگیا۔
"صاحب جی!" فرش پر مسافروں کا بکھرا گند سمیٹنے کے لیے تاکی مارنے والا ان کے ہٹنے کا منتظر تھا۔
حمیرا نے دیکھا تھا لیکن سنا نہیں۔
رخصت سے پہلے شہریار اس کے پاس رکا۔
"الیکشن ضرور لڑنا۔ میں اگلی دفعہ تمہیں ووٹ دینے آؤں گا۔"
"ہاں پلیز دیکھو بھولنا نہیں۔" حمیرا نے اسی کی سی سنجیدگی سے کہا تھا۔
پھر وہ عبو کی طرف گیا اور کچھ کہا جو اس نے دیکھا اور سنا نہیں۔
وہ سب متوجہ نہیں تھے۔ لیکن عبو اس کی نظر سے کبھی نہیں چوکی تھی۔ اس نے عبو کو معمول سے ذرا بلند آواز میں "کیا مطلب" کہتے سنا۔
اس کی آواز معمول سے بلند کیوں ہوئی؟ اس کا انحصار اس سوال پر ہوا جس کا مطلب وہ سمجھنے سے انکاری تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب "چائے والا بھی چائے گرم انڈے" کی اونچی صدا لگاتا ساہیوال کے کسی گاؤں کا بچہ پچھلی مرتبہ ان کے پاس سے گزرا تھا اور ان کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ اب جب ٹرین کے آخری ڈبے کی پچھلی دیوار بھی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی اور دور پار ایک قمقمے کے علاوہ مکمل اندھیرا تھا۔ وہ اسی دم بخود کیفیت میں انہی اندھیروں میں غرق تھی۔ وہ ایسا کیا کہہ گیا تھا کہ اسے پھر کا بنا گیا لیکن جو بھی کہا وہ بنا پوچھے اسے بتا دے گی اور نہیں بتانا چاہے گی تو پوچھنے پر بھی نہیں بتائے گی۔ سو اس کو انتظار کرنا تھا۔ خود شہریار ایسا غیر ذمہ دار نہیں تھا کہ اس الجھن میں کسی نئی الجھن کا اضافہ کرتا۔ جو کہا "کہنا بنتا ہی ہوگا۔"
وہ جب نہر کی پلی پر نسبتاً "ویران کونے میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے بول بول کر اتنے بہت دنوں کا حساب چکا رہے تھے۔ فیلڈ Ambulance میں تنہائی کے سوا اس کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا تھا۔ رنگین ستاروں سے لدے تاحد نظر پھیلے آسمان کے نیچے اپنے Tubular پر پڑا اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا۔ لہٰذا جب وہ خود سے باتیں کرتا تنگ آجاتا تو لاہور کا رخ کرتا اور اتنے دن جو کچھ خود سے کہا تھا ان کو بتانے لگتا۔ طویل اور مسلسل تنہائی نے اس کے اندر ایک حس بیدار کردی تھی۔ وہ جیسے آنے والے وقت کو بھانپ لیتا تھا۔
نہر سردی میں خشک ہو کر ایک گارے کا سا ملغوبہ بنی ہوئی تھی۔ آج اس کی وہ سج دھج نہیں تھی کہ اس میں روشنیاں جھلملاتی ہوں۔ نیشنل کالج آف آرٹس والوں کے مہندی کی چوکی کی طرح، پیلے پھولوں اور ربنوں سے سجے آرائشی بجرے ڈولتے ہوں، یا بچے تربوز کو لاکف جیکٹ کی طرح پکڑ کر ڈبکیاں لگاتے ہوں۔ نہر کی ڈھلوں پر

http://edigestpk.blogspot.cm

"تمہیں پتا ہے نہروں کو مجھ سے عجیب ربط رہا ہے۔"

"کیچڑ کی ایک پتلی نالی جو کہیں بہتی تھی کہیں تھمی ہوئی، کو بڑی دیر تک گھورنے کے بعد شہریار نے جیسے اچانک بڑا اہم اعلان کیا تھا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"میں جہاں جاؤں۔ یہ میرے ساتھ ہوتی ہے۔ کوئی کیمسٹری ایسی ہے جو مجھے نہر کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔ جہاں جہاں میری زندگی گزری وہاں اور کچھ نہ بھی ہو تو شہر کے وسط میں خاموشی سے بہتی ایک نہر ضرور ہوتی ہے۔ آج میں جہاں ہوں وہ پاکستان کے عظیم نہری نظام کا مرکز ہے۔" ان سب نے تائید کی کہ تاریخ کے پرانے طالب علم تھے۔

"کبھی طائرانہ نظر سے اس کا نظارہ دیکھیں تو آپ انسانی ہاتھوں کی مہارت پر دنگ رہ جاتے ہیں۔ چناب اور انڈس کی Tributaries اور ان سے نکلی سب لنک کینال ہر طرف سے بھاگتی آتیں۔ سندھ میں شامل ہونے کو بے تاب۔ پنجند پر ساری نہریں، سارے دریا اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ پھر بحیرۂ عرب میں ڈوبنے کو آگے بڑھتے ہیں۔ یاد رکھو جب چھوٹی چیز اپنا الگ وجود قائم نہ رکھ سکے تو کسی بڑے میں مدغم ہو کر اپنا آپ اس کے سپرد کر دیتی ہے۔ اس طرح فنا ہے بھی اور نہیں بھی۔"

اس نے اپنا لیکچر سول انجینئرنگ سے اچانک صوفی ازم کی طرف موڑ دیا تھا۔

"یہ Thesis اور Anti thesis کی درسی سی مثال ہے۔ انڈے مرغی جیسی۔"

"اور افسوس کہ ہمارا نہری نظام بھی انگریز دے گیا تھا۔ اپنا کیا ہے ہمارے پاس۔"

فوزیہ نے منہ پھاڑ کر آتی جمائی کو روکنے کی کوشش کی۔ کتنے بور لوگ ہیں یہ سب اور یہ نہیں ایک دوسرے کو کیسے برداشت کرتے ہیں۔ بھائی اسے لے آیا تھا اور ان سب کی محبت میں ایسی کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی کہ ان کے ساتھ پورا دن گزارا جا سکے۔

اس نے موبائل اپنے چہرے کے سامنے رکھا اور تصویریں بنانے لگی۔ وقت ہی گزارنا ہے تو یہ بھی [illegible]۔

http://edigestpk.blogspot.com

"گویا انہوں نے تمہیں پھر سے تلاش کر لیا۔" رضا نے پاس سے گزرتے [illegible] والا غبارہ خریدا تھا اور اس کو دھاگے کے دوسرے سرے پر ڈولتے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کا دھیان بھی گفتگو کی طرف نہیں تھا۔ ہوا میں ڈولتا، رقص کرتا غبارہ اس کے لیے زیادہ دلچسپ تھا۔

"ڈی آئی خان، لاہور، اوکاڑہ اور اب نہری نظام کا جال۔" رضا نے نظریں غبارے پر رکھے گنتی کی۔

"مگر ظلم یہ ہے کہ مجھے اس نہر میں شڑاپ شڑاپ کی اجازت نہیں۔"

"کیوں؟" کسی نے سوال کیا تھا۔

"اس لیے کہ افسروں اور بچوں میں فرق ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔"

"تم نے بتایا نہیں کہ تم افسر نہیں ہو۔" عبیو نے پوچھا تھا۔

"ان کو بتایا نہیں جاتا ان سے سنا جاتا ہے۔"

"شہریار۔" عبیو جیسے کچھ دیر کے سکوت کے بعد جس میں انسان خود سے الجھ الجھ کر نکلتا ہے، کہا۔

"تمہیں کیا محسوس ہوتا ہے۔ جب کچھ کرنے کی شدید خواہش ہو تو وہ کرنے سے روک دیا جائے۔"

"یہ ہماری ٹریننگ کا حصہ ہے۔ اپنا آپ ہی تو حوالے کرنا ہوتا ہے۔ آپ کی میں ہی تو توڑی جاتی ہے۔"

"لیکن میں اپنے اختیارات کسی کو نہیں دے سکتی۔" عبیو جیسے خود سے خفا تھی۔

"تمہارے پاس ہے ہی کیا۔"

"یہ تو صوفیاء کا مسلک ہوا۔" عثمان نے مداخلت کی۔

"بس اس فرق کے ساتھ، جب مرشد کوئی حکم دیتا ہے یا کچھ کرنے سے روک دیتا ہے تو آپ کو یقین ہوتا ہے کہ اسی میں آپ کی نجات ہے اور جو جو نجات پا جاتے ہیں انہیں درجات ملتے ہیں۔ مگر جب حکم وہاں سے آتا ہے جو آپ کا افسر تو ہے مگر مرشد نہیں تو اس کے کردار کے بہت سے پہلو آپ کے سامنے کھلتے ہیں۔ اس کے قول اور فعل کا تضاد سامنے آتا ہے۔ دیکھو ذرا یہ آدمی کیا ہے اور مجھ سے کیا توقع کرتا ہے۔ لیکن جب آپ مرشد کے سامنے اپنی انا سرنڈر کرتے ہیں تو اس پر آپ انگلی نہیں اٹھا سکتے کیونکہ اس کے کردار میں وہ غلا پن نہیں ہے۔"

کتنی توجہ سے لوگ اس کو سن رہے تھے سوائے رضا کے۔ سن تو شاید وہ بھی رہا تھا لیکن اس کی نظریں گڈی بادلوں کی طرح اپنے اڑتے ہوئے غبارے پر جمی تھیں۔

وہ چپ ہو گیا۔ لوگ بھی چپ ہو گئے تھے اور اس طویل خاموشی کو ہمیشہ کی طرح عبیو نے توڑا۔

"شہریار۔۔۔ زندگی مشکل ہے کیا؟"

"لو۔۔۔ زندگی نہ ہوئی کوئسچن پیپر ہو گیا۔"

"آزادی اور خود مختاری کا وہ طالب علمانہ زمانہ تو جیسے کھیلتے کھیلتے گزر گیا۔ اب تو کچھ کرنا ہے اور کر کے دکھانا ہے۔ عمر تو ایک خواب تھی۔ جیسے خواب میں آپ ہواؤں میں اڑتے ہیں۔ پانی پر چلتے ہیں۔ دنیا کی ہر زبان میں کمیونیکیٹ کر سکتے ہیں۔ اجنبی چہروں کو پہچانتے ہیں اور وہ آپ کو پہچانتے ہیں۔ پھر آپ بیدار ہو جاتے ہیں اور زمین پر کھینچ لیے جاتے ہیں۔ پھر آپ کا مادی وجود اپنی محدود طاقت کے ساتھ مشکلات سے ٹکراتا پھرتا ہے۔"

"ہم ڈاکٹر بنیں گے، ہم انجینئر بنیں گے۔" سمیرا نے جمال کے فقروں سے اپنا ٹکڑا جوڑا۔

"ہم یہ بنیں گے، وہ بنیں گے۔ ہم نے تو یہ خواب بھی نہیں دیکھے تھے۔ ہاں یہ ضرور سوچا تھا کہ یہ کریں گے وہ کریں گے۔ اب دعوے نہیں کرنے جو کرنا ہے بس کر کے [illegible] تم سب لوگ ایک دن آج والے موڑ پر آئے [illegible]"

http://edigestpk.blogspot.com

اس نے رپورٹر کی طرح فرضی مائیک عثمان کے آگے کیا۔

"بہت اچھا لگا تھا۔"

عثمان نے مٹھی والے مائیک میں منہ دے کر کیمرہ کانشس ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پٹے سوال کا گھسا پٹا جواب دیا تھا اور ایسے چپ سادھ کر بیٹھ گیا گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔

"زندگی کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔" جمال دو طرف بیٹھے لوگوں کے درمیان ٹہلتے ہوئے تقریر فرما رہا تھا۔

"اف توبہ۔" فوزیہ قطعی اکتاہٹ سے بڑبڑائی۔

"ہر حصہ اپنی اپنی جگہ اہم ہے اور دوسرے حصے سے باہم مربوط۔ مثلاً" آپ سوئیں گے تو خواب دیکھیں گے۔ اگر آپ نے بچپن نہیں گزارا تو آپ پر جوانی بھی نہیں آئے گی۔ آپ مریں گے تو جنت میں جائیں گے جیسا کہ میرے استاد فرما گئے ہیں۔ جنت میں سب جانا چاہتے ہیں، مرنا کوئی نہیں چاہتا۔ کون مرنا چاہتا ہے۔ بولو ابھی۔ جب آپ اس وقت سے گزریں گے تو اگلے وقت میں داخل ہوں گے۔"

فوزیہ نے اس ایک گھنٹے میں ہر دو منٹ کے بعد آنکھ اٹھا کر عثمان کی طرف دیکھا تھا۔ امید سے، آس سے، پتا نہیں وہ اس کو ہیرو کیوں لگتا تھا۔ اس میں ہیرو جیسی کوئی بات تو تھی نہیں اور کزنز کو بہنیں سمجھنے والی دانشوری سے بھی وہ آزاد نہیں تھا اور کون جانے اب بھی خیالوں میں وہ سنڈریلا کے پیچھے دوڑتا ہو۔

ایک انداز ہے۔ آپ کسی کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ کوئی آپ کے پیچھے آرہا ہے۔ دائرے میں گھومتے پتا بھی نہیں چلتا کون کس کے پیچھے بھاگ رہا ہے اور کون کس سے بھاگ رہا ہے۔

فوزیہ اپنے موبائل سے تصویریں بناتی (اس کا فخر کہ cell میں ایک کیمرہ ہے) کوئی متوجہ بھی نہیں تھا۔ وہ کس کو سب سے زیادہ فوکس کرتی رہی ہے۔ اچانک اس نے اپنا فون پل کی پٹی پہ رکھ دیا۔

"آپ کو نہیں لگتا کہ آپ لوگ کتنی بے معنی باتیں کررہے ہیں؟"

ایف اے فیل فوزیہ نے تلخی سے کہا تھا۔ عوام کو چپ لگ گئی۔ ساری فلاسفی دم بخود رہ گئی تھی۔

رضا نے انگشت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان اٹکے دھاگے کی چٹکی کھولی اور بدمزگی سے غبارہ ہوا میں اڑا دیا۔

وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

بڑی عجیب شرط تھی۔

اور عین اس وقت سامنے آئی جب وہ کسی ویب سائٹ کے لیے کلائنٹ سے الجھ رہا تھا۔ کام تو بجٹ میں ہو۔ اعلا ترین کوالٹی میں ہو۔ اور فوری ہو بزنس ڈیلنگ بھی بس ایسی ہی ہے۔ ہر فرد دوسرے کو الو بنانے پر تلا ہے۔ وہاں تک بحث میں الجھتے ہیں کہ انہیں اپنے آنے پائی کے خرچ ہو جانے کا ناگزیر یقین نہ ہو جائے اتنی مدت ان ذہنوں کے ساتھ الجھتے الجھتے اس کو جیسے ان کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اتنی جھک جھک اب اس کے ذہن پر بار نہیں بنتی تھی۔ اب بھی جس قیمت میں وہ پوری ویب سائٹ مانگ رہا تھا اس سے کہیں بڑی رقم تو اس نے اس میز پر لگا دی تھی۔ جس پر اس کے مقابل بیٹھا وہ خوشی خوشی اس کا خون چوسنے کی خواہش میں مرا جا رہا تھا۔

جب پہلی دفعہ اس کی پتلون کی جیب میں اس کا فون اپنی مخصوص رنگ ٹون میں ٹرایا تو وہ مطلق بھی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے جیسے آواز ان سنی کر دی اور قطعی بھولے بیٹھا تھا کہ اس نے یہ رنگ ٹون کس کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ وہ جب بھی کام کرتا اپنی ساری توجہ مخاطب کے لیے وقف کر دیتا تو اپنی محنت کا عوضانہ مانگنے کے لیے اس قدر بک بک اس کی طبیعت کا خاصا نہیں تھی لیکن اگر آپ اسی طرح اپنی بھلی طبیعت کے آگے ہتھیار ڈالتے رہیں تو زمانہ آپ کو نگے سیر بیچ کھائے گا اور اب تو جیسے اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ اور برداشت بھی عام دنوں سے کہیں بڑھ گیا تھا۔

وہ ایسے کہ کھیت سے ٹماٹر اٹھائے تھے اور منڈی میں بیچ رہا تھا۔ کام کرنے والے کی مشکلات سے بے نیاز۔ عثمان نے اپنی طبیعت کے اسی سکون سے جتایا تھا۔ کم از کم سات آدمی ہائر کرتا ہوں گے اور وہ سب کے سب مسلسل دس گھنٹے بھی کام کریں تو دی گئی مدت اور آفر کی ہوئی رقم کو کسی بھی ترازو میں بیلنس کر کے پلڑا برابر نہیں آتا۔

دوسری طرف گھنٹی پھر بجی تھی۔ گھی مالک نے اس کا فیصلہ سن لیا تھا۔ وہ صرف اپنی شرطوں پر کام کرتا ہے لیکن نہ اس نے اس کو کام دینے کا ارادہ ملتوی کیا تھا نہ ہی بجٹ میں بڑھوتی کا کوئی عندیہ دیا۔ سو اس نے جیسے آخری فیصلہ سناتے کہا تھا۔ "آپ کو یہ شرائط منظور نہیں تو وہ بخوشی کسی اور سے کام لے سکتے ہیں۔"

"اور میں نے جو بتایا اس میں رد و بدل کی گنجائش نہیں ہیلو۔"

اس نے آخری جملہ بول دیا تھا اور بغیر یہ جانے کہ فون کس کا تھا وہ اس طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک منٹ کو تو اس کو اپنی سماعت پر شک گزرا۔ جب وہ مزید ساتھ نہ دینے کا اعلان کر کے پلٹی تھی تو جیسے منظر سے ہمیشہ کے لیے

http://edigestpk.blogspot.cm

غائب ہوگئی تھی۔

"تم تو اب تک ویسے ہی ہو۔ ضدی ہٹ دھرم، اپنی بات پر اڑے ہوئے۔"

گو اس کا آخری جملہ ثریا کے لیے نہیں تھا لیکن وہ، جس کے لیے بھی تھا اس کے مزاج کا پتا دیتا تھا اور وہ جب سے غائب ہوئی تھی اس نے ان میں کسی سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے فون پر اس نام کی جھلملاہٹ ایک مدت سے بند تھی۔ وہ، جس کی صبح گڈ مارننگ کے پیغام سے شروع ہو کر سویٹ ڈریمز تک سینکڑوں میسج اور کال پر مشتمل رہتی تھی۔ آج پلٹی تھی تو اس کا جملہ بھی جو کسی خاص مقصد کے تحت بولا گیا لگتا بھی نہیں تھا۔ اپنے مزاج اور ارادوں کا پتہ دے رہا تھا۔

"مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔ مگر تم تو شاید ہمیشہ کی طرف مصروف بھی ہو۔"

اس کا اجنبی روکھا لہجہ کسی نامعلوم جہاں سے آتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ اب تک جن دنیاؤں میں اس کو ساتھ لے کر اڑتی رہی وہاں نہ یہ خشک لفظ تھے نہ طعنوں کے تیر شاید اس کو سنبھلنے میں کچھ وقت لگے۔

"نہیں کوئی خاص مصروف نہیں، کہو۔"

وہ پہلا جملہ بولا بھی تو اس کی آواز میں نہ ارتعاش تھا نہ اشتعال۔

ممی کمپنی والا جز بز ہوا۔

مصروف تو تھے وہ دونوں، پر یہ لڑکے بھی عجیب ہوتے ہیں (کمپیوٹر کا کام ان عجیب لڑکوں کے بغیر ہوتا بھی نہیں) ابھی فون کان سے لگا رکھا ہے۔ کانٹریکٹ سائن کرنے کا وقت آئے گا تو جنوں سے کھیلتا میسج کرنے بیٹھ جائے گا۔ نہیں تو ارد گرد سے بے نیاز اپنے سیل پر کرکٹ کھیلے گا۔ لیکن کام نہیں کرے گا۔

وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر منتظر بیٹھ رہا۔ فارغ ہولے تو بات آگے بڑھائی جائے۔

"مجھے کچھ کہنا ہے۔" اس نے دوبارہ کہا۔ "لیکن اس کے لیے تمہیں بالکل اکیلے آنا ہوگا۔ کسی کو بتائے بغیر اور تمہیں منظور نہیں تو بے شک مت آؤ۔"

لہجہ تھا یا زہر؟

http://edigestpk.blogspot.cm

جو اس کے احساس پر بوند بوند ٹپکتا رہا۔ اس انداز میں وہ کبھی نہیں بولی تھی۔ کم از کم اس سے تو نہیں۔ جدا ہونے کا فیصلہ وہ خود کر گئی تھی اور فیصلے کے نتیجے میں اذیت بھی وہ سہار نہیں سکی پھر پلٹ آئی تھی۔ لوگوں کے اعصاب سے کھیلنا اس کا پسندیدہ مشغلہ رہا تھا۔

اس کی آواز میں شکست تھی یا تحکم۔

یا شکست بھرا تحکم ورنہ حکم دیتے کسی کی آواز یوں لرزتی تو نہیں۔ عثمان کو خود پر حیرت ہوئی۔ اس انداز تخاطب سے اس کی انا مجروح نہیں ہوتی تھی۔ وہ جانتا تھا ایک مدت سے وہ دو پاٹوں کے بیچ پستی چلی آرہی ہے اس کے باوجود وہ سر اٹھا کر جیتا آرہا تھا اس کو اپنے مسئلوں کا حل خود ہی تلاش کرنا تھا۔ وہ تجویز دے سکتا تھا۔ حکم دینے کا عادی نہیں تھا اور جھکے سر کے ساتھ جی بھی نہیں سکتا تھا۔

"کب آنا ہے اور کہاں آنا ہے؟"

ممی والا سر اٹھائے ابھی تک منتظر تھا۔ اپنی شرطوں پر کام کرنے والے نے سامنے بکھرے کاغذ جیسے کسی حتمی فیصلے پر پہنچ کے ایک طرف سمیٹ دیے۔

"مجھے افسوس ہے۔" اس نے ممی والے سے کہا۔ "میں آپ کا یہ پروجیکٹ نہیں اٹھا سکتا۔" اسے لگا لڑکے کی آواز میں افسوس تو ہے لیکن شاید پراجیکٹ کے لیے نہیں۔

"میں بات کرتا ہوں۔ Bog's سے ہم بجٹ بڑھا بھی سکتے ہیں۔" وہ بوکھلایا۔

"شاید میں پھر بھی نہ لے سکوں۔" اس نے اپنی اسی ٹھہری ہوئی پرسکون آواز میں کہا۔ جس آواز سے وہ اس کی تمام تجاویز پہلے منٹ سے رد کرتا آرہا تھا۔

کوئی زور زبردستی تو تھی نہیں۔ اور ابھی تو معاملات بھی فائنل نہیں ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر جھلاہٹ طاری ہوگئی۔

"یہ موبائل فون بھی صرف ڈیٹنگ سروس ہے۔ کسی لڑکی نے بلایا ہے اور پیسے کو لات مار کر بھاگے جارہے ہو۔ الٹا پیسے لے کے جاؤ گے تو لڑکی بھی لات مارے گی۔ کیا فائدہ؟" جب کام سے ہی انکار ہوگیا تو کاہے کا لحاظ۔ وہ بے مروتی سے دانت نکال کر ہنس رہا تھا۔ موصوف تو پہنچے ہوئے بزرگ لگتے ہیں۔ وہ مسکرایا۔

"آپ اس لڑکی کو نہیں جانتے بزرگو! پیسے لے کر گیا تو زیادہ لات مارے گی۔"

"مسئلہ کیا ہے بھلا۔" کسی سبب کے بغیر اس نے رازداری میں شرکت کر ڈالی تھی۔

"مسئلہ وہی ہے۔ آدم حوا کے زمانے کا۔ میں اس کو پسند ہوں کیونکہ میرے پاس پیسہ نہیں لیکن وہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ میرے پاس پیسہ نہیں۔۔۔ نہیں سمجھے؟" اس نے موبائل واپس پتلون کی جیب میں اڑسا اور اسی سکون سے سیڑھیاں اترنے لگا جیسے آج کا یہ حادثہ اس پر سے روز گزرتا تھا۔ وہ تو غنیمت ہوا اس حادثے کا چشم دید گواہ وہ ممی والا تھا جو فائدے کے سوا کسی سودے کا قائل ہی نہیں تھا۔

گاڑی گیئر میں ڈالتے اور کوہ ندا کی طرف لپکتے ایک ذمے دار بڑا بھائی ہر جذبے سے اوپر آکر کھڑا ہوگیا۔ لڑکیاں باہر ہیں اور اس نے ان سے کہا تھا وہ وہاں سے واپسی پر ان کو لے لے گا۔ الٹا رکشا کے پیچھے خوار ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ان کو نہیں لے سکتا اور کیوں نہیں لے سکتا یہ بتانے کی بھی بندش ہے۔

رضا کا نمبر کلک کرتے۔ وہ لمحہ بھر کو رک گیا۔ وہ رضا ہے، ممی والا نہیں۔ شاید اس کو چٹکیوں میں اڑانا آسان نہ ہو۔ اس نے گلا کھنکار کر اپنی آواز کی ہمواریت چیک کی۔ جب اس کو یقین ہوگیا یہ لہجہ اس کے کان میں جا کر اس کو کسی شک میں مبتلا نہیں کرے گا تو وہ لائن پر آیا۔

http://edigestpk.blogspot.cm

[illegible] نکلی ہوئی ہیں۔ شاید [illegible] ہو جائے۔"

"میں لے لوں گا۔" اس نے رسان سے کہا۔ "تم جہاں ہو ٹھیک ہو نا۔۔۔ کوئی پریشانی تو نہیں؟" رضا کو شک گزرا وہ ضرورت سے زیادہ محتاط آواز میں کیوں بولا تھا۔

عثمان کا ضبط جواب دے گیا۔ "ایک تو یہ لوگ پتہ نہیں کون سے خفیہ کیمروں سے دیکھتے رہتے ہیں۔" اس نے جھنجلا کر فون بند کر دیا۔ اس یقین کے باوجود کہ رضا ہر کام چھوڑ کر بھاگتے ہوئے جائے گا یونہی احتیاطاً اس نے عبیو کو مطلع کرنا مناسب سمجھا۔ بیل جاتی رہی۔ پتا نہیں فون کہاں رکھے بیٹھی تھی جو اٹھانا ضروری نہیں سمجھ رہی۔ جھنجلاتے ہوئے اس نے حمیرا کا نمبر ڈائل کیا۔

"اپنی دوست سے کہو فون اپنے آفس کی پانچویں منزل سے نیچے پھینک دے۔"

"اچھی بات ہے۔" حمیرا نے نہایت سعادت مندی سے کہا۔ "اور۔۔۔؟"

"اور یہ کہ مجھے کام آپڑا ہے۔ فارغ ہو جاؤ تو رضا کو کال کر لینا۔ وہ تمہیں لینے آئے گا۔ نہ آسکا تو رکشا کرنا۔"

"بہت بہتر۔"

اس نے کن انکھیوں سے عبیو کی طرف دیکھا۔ فون اس کے قدموں میں silent موڈ میں پڑا تھا اور عثمان کی آواز میں جھنجلائی ہوئی شکست کی گونج سنائی دیتی تھی۔

وہ تو اس کے پیچھے پیچھے مارچ کرنے کی عادی تھیں۔ سپہ سالار نے ہی ہتھیار ڈال دیے تو وہ کیسے لڑیں گی۔ کار سیدھے رخ جا رہی تھی۔ لیکن اس کا ذہن ہر سمت بھٹک رہا تھا۔ ثریا نے اسے بلایا تھا اور اس کے عزائم

کچھ بھلے نہیں لگ رہے تھے۔ بٹنوں کو پک کرتا تھا اور ایک اہم Contrat اس کے ہاتھ سے نکل گیا یا اس نے خود نکال دیا تھا۔

وہ بے سمت چلا جاتا تھا۔

وہ بڑا خاص دن تھا۔ ان سب کی محبوب آپائی کی سالگرہ اور دونوں گھروں میں یہ واحد سالگرہ تھی، جس کا برس ہا برس سے اہتمام کیا جاتا تھا اور پتا نہیں کس نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا اور کب سے جاری تھا۔ پچھلے چند سالوں میں اس میں ثریا بھی آشامل ہوئی تھی اور اس سال ایک نیا دوست جو رضا کو سیکریٹریٹ میں ملا تھا۔ اتفاق سے آگیا تھا۔ لیکن ثریا اتفاق نہیں تھی۔ اس کو بلایا جاتا تھا۔ عثمان کی خواہش کے عین مطابق۔ کہ وہ سب جانتے تھے اس کو ہمارا حصہ بننا ہے۔ اس کی شدید تمنا تھی وہ اس کے اپنوں کا ایک حصہ بن جائے۔ بعض اوقات ہم تعلقات کو بھی فار گرانٹڈ لینے لگتے ہیں۔ یا شاید اس پر توقعات کا وہ بوجھ لاد دیا جو اس سے اٹھایا نہیں گیا۔ وہ سہار نہیں سکی اور پلٹ کر دیکھے بغیر نکل گئی۔ عثمان کو لگا وہ کبھی واپس نہیں آئے گی اور شاید کبھی نہیں بلائے گی۔ وہ ایسی ہی انا پرست تھی۔

اور اب جب اس نے آواز دی تو اس کی self respeet تو مجروح کی ہی تھی۔ اپنی انا بھی تہ تیغ کر ڈالی۔

محرابوں اور ستونوں کے ہال کے مرکز میں تیز تیز قدم اٹھاتے اس نے ایک نظر میز کے گرد ڈالی۔ خاندانوں کے گروپ، کاروباری لنچ ڈیٹ پر آئے کپل۔

کچھ خوش باش چہرے، کچھ منافقانہ مسکراہٹیں۔

منافقت اس سے عمر بھر نہیں ہو سکی۔ شاید اسی لیے وہ ٹھوکر کھاتا تھا۔ ہال میں دوسری وجہ سے وہ رونق نہیں تھی جو شام بڑے زندگی جو بن پر آنے سے ہو جاتی ہے۔ شاید اسی لیے اس کو وہ پہلی ہی نظر میں دکھائی پڑ گئی۔ یا شاید یوں بھی دکھائی دے جاتی۔

اس نے مسکرانا چاہا۔ لیکن پھر منافقت نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کیا۔ جب دل مسکرانے پر آمادہ نہ ہو تو ہونٹوں کو زحمت دینے کی کیا ضرورت؟ وہ ایک کو [illegible] رنگ مشروب تھا۔ ننھی سی چھتری کے سایہ تلے۔ شاید خوش ذائقہ بھی ہوتا، اگر کسی نے اس کو چکھا ہوتا۔ میز کے سامنے وہ کچھ دیر کو رکا۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے اس کے چہرے کو پڑھا۔ وہ بہت دیر روتی رہی تھی اور منتظر تھی اسے کچھ کہنا تھا، اور اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکا۔ (کہ بہادر لڑکے روتے نہیں) اور اس کو وہ سننا تھا جو کہنے کے لیے بلایا گیا تھا۔

اس کی پلکیں بھیگ کر جڑی ہوئی تھیں۔ گالوں پر سرخ دھبوں کے نشان اور چہرے پر پھیلی ایک جتا دینے والی اجنبیت، لمحہ بھر کو اس کو چوٹ لگی۔ کیا ان سب کا ذمے دار وہ خود ہے؟ اس نے نہ تو وعدے کیے تھے، نہ وعدوں سے فرار اختیار کیا۔ پھر یہ دیکھنے کے لیے وہ یہاں کیوں تھا، جو اس سے دیکھا نہیں جاتا۔ اس نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے اور موبائل نکال کر میز پر رکھتے اس سے نظریں کترالیں۔

معلوم نہیں وہ کس حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ اسے سزا سنانی تھی یا انعام سے نوازنا تھا۔ وہ شہنشاہ کے دربار میں تو پیش نہیں ہوا تھا۔ پھر بازیابی کا منتظر کیوں تھا۔ وہ آمنے سامنے تھے، مگر خاموش، دوسری طرف کی پہل کے منتظر۔ انہوں نے ایک دوسرے سے سلام دعا بھی نہیں کی۔ وہ ان رسموں سے ماورا ہو چکے تھے یا اتنے فاصلوں پر تھے کہ سب غیر ضروری ہو گیا تھا۔ بہت دیر سے جھکایا ہوا سر اسی نے اٹھایا، جس نے بلایا تھا۔ مسکرانے کی ہمت بھی اس نے کی۔ "ابھی جب تم اندر آرہے تھے اور تمہاری آنکھیں مجھے ڈھونڈ رہی تھیں کہ میں کہاں بیٹھی ہوں۔ اس ایک سیکنڈ میں، میں نے دیکھا۔ تمہارے قدم جمے ہوئے پڑتے ہیں۔ تمہارا سر اٹھا ہوا ہے اور تمہاری آنکھیں

[illegible] ایک آنسو بھی نہیں ٹپکا۔"

"میں نے بہت دن خود سے جنگ کی۔ میں اپنی طرف سے تمہیں سزا دیتی رہی۔ اپنے آپ سے تمہیں محروم کر کے۔ لیکن تم تو ویسے ہی ہو بہادر، نڈر، دلیر۔ اب پتا نہیں یہ تمہارے لیے سزا ثابت ہوئی یا انعام۔"

گویا وہ سوال جو اس کو درکار تھا اسی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس نے اس کی ساری بات بڑے تحمل سے سنی تھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر۔

اس کے ہونٹ منافقت نہیں کرتے تھے، لیکن اس کی آنکھیں بھی تو منافق نہیں تھیں۔ اتنا بڑا بیان دینے سے پہلے شاید اس نے ان آنکھوں کو پڑھا بھی نہیں تھا۔

"کیا چاہتی ہو؟" اس نے پسپائی اختیار کر لی، وہ اس کی برداشت کو ایک حد سے آگے لے جا کر آزما رہی تھی۔

"وہی تو۔" اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ابھری اور ڈوب گئی۔

"میں کیا چاہتی ہوں۔ میں کچھ چاہتی ہوں، ہم کچھ نہیں چاہتے، مگر۔"

"بات کو غلط طرف مت لے جاؤ۔" اس کے اندر کا متحمل انسان تھرتھرایا۔ لیکن اسے خود پر قابو پانا بھولا نہیں تھا۔

"کیا میں نے کبھی تم سے روایتی بات کی؟"

"ہاں۔ تم روایت شکن ہو۔ تم روایتی باتیں کیسے کر سکتے ہو۔ حالانکہ تم ایک روایتی بھائی ہو۔ ایک روایتی بیٹے ہو۔" اس نے انتہائی سکون سے بغیر کسی اشتعال میں آئے کہا۔

"لیکن جہاں میں آتی ہوں، وہاں تمہیں اپنے غیر روایتی ہونے پر بہت فخر ہے۔" عثمان کو لگا وہ لڑکھڑا کر گرا ہے۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ اس نے ٹھوکر لگائی منہ کے بل گرایا، لیکن فاتحانہ خوشی اس کے چہرے پر نہیں آئی۔ وہ اس کی طرف دیکھتی، لیکن کہیں اور دیکھتی اسی طرح رواں رہی۔

"تم روایت پرست نہیں، انقلابی ہو۔ کبھی غور کرنا اپنے انقلابی ہونے پر۔ بڑی بڑی باتیں، لمبے لمبے منصوبے، [illegible] تعبیر نہیں کیے اور ان سب کے درمیان کہیں اندر کی کونے میں چھپا ہوتا ہے کہ تم دراصل لوگوں کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہو۔ وہ تمہارے معیار کے نہیں، الگ تھلگ جیتے ہو۔ کون انقلاب لے آئے تم۔ تم خود اسی system کا حصہ ہو۔ جس کے خلاف جنگ کر رہے ہو۔ میں نے کہاں کہاں تمہارا ساتھ نہیں دیا۔ حالانکہ تمہارے ساتھ اس جنگ میں، میں خود اپنے پیروں سے زمین کھینچ رہی تھی۔ غور کرنا ان وجوہات پر جنہوں نے تمہیں انقلابی بنایا۔ کیونکہ میں اس سسٹم کا وہ جزو ہوں جو مراعات حاصل کر رہا ہے۔ تم اس سسٹم کو الٹ دینا چاہتے ہو۔ کیونکہ تم محروم ہو۔ میں پھر بھی اس قطار میں تمہارے ساتھ کھڑی تھی کہ آؤ اور مجھے الٹ دو۔ کبھی فرصت سے سوچنا کس کی قربانی بڑی تھی۔ جس نے مراعات یافتہ طبقہ چھوڑنے پر حامی بھرلی یا تم۔ جو خود کو ذرا سا بھی بدلنے پر تیار نہیں ہوئے۔"

"کیا حرج تھا اگر تم وہ سب مان لیتے جو پاپا کہہ رہے تھے۔ میرا تم پر بھروسہ بڑھ جاتا۔ صرف ان کو یقین دلا دیتے، وہ جیسا کہہ رہے ہیں ہم ویسا ہی کریں گے۔ وہ میرے پاپا ہیں ان کو حق ہے میرے مستقبل کی ضمانت مانگنے کا۔ میں نے تم سے صرف لفظ مانگے تھے کوئی قربانی تو نہیں مانگی تھی۔ اس کے بعد ہم اپنی زندگی گزارتے، اپنی مرضی سے، تمہاری خواہش کے مطابق۔"

"محبت سے نفرت تک میں کہیں بھی دھوکا دہی جائز نہیں سمجھتا۔" وہ جب سے ایک لفظ کی مداخلت کیے بغیر ایک سناٹے میں اسے سن رہا تھا۔ اس نے جیسے حتمی لہجہ میں اس تجویز کو قطعی رد کر دیا تھا۔

"اصول، قوانین، قاعدے، تم انسان ہو یا آئین کی کتاب!" اتنی دیر سے ٹھہری آواز ایک ثانیہ کے لیے

http://edigestpk.blogspot.com

بلند ہوئی۔ پھر اتنی دیر چپ رہی جب تک اسے اعتبار نہیں آگیا کہ اس نے خود پر قابو پالیا ہے اور آس پاس کی میزوں سے لوگ اب اس کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔

"سچ بتاؤ۔ مجھے حاصل کرنے کے لیے تم نے ذرا سی بھی محنت کی؟"

"کیا کرتا۔ تمہیں بھگا لے جاتا۔" وہ چڑ گیا۔

"مجھے ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ یہ بتانے کو کہ تم کتنی محبت کرتی ہو یا یہ بتانے کو کہ کس قدر غلط آدمی سے کرتی ہو۔"

"تم کیا سوچ کر آئے تھے۔ میں نے کیوں بلایا ہے؟"

"سچ تو یہ ہے کہ تم نے بلایا تھا اور میں خود کو روک نہیں سکا۔"

"میں زندگی میں آئندہ بھی بلاؤں تو چلے آؤ گے؟"

"آئندہ کے دعوے میں نے کبھی نہیں کیے۔"

"اچھا فرض کرو' جو کچھ میرے پاپا نے کہا' وہ تمہارے ابا کہہ رہے ہوتے تو تم میرے لیے کیا تجویز کرتے۔"

"تم ایک ناممکن سی بات فرض کروا رہی ہو۔"

"تمہاری آواز میں اپنے ابا کے لیے کیسا ناقابل بیان سا فخر ہے۔ حق تو مجھے بھی ہے۔"

"میں نے تم سے پوچھا' گلہ کیا؟"

"میں جب یہاں آرہی تھی تو معلوم ہے کیا سوچ رہی تھی؟ وہ سب جو اب تک تم نے مجھ سے کہا۔ ابھی تک ایک لفظ بھی ایسا نہیں آیا جس کی میں نے توقع نہیں کی تھی اور تم نے کہہ دیا ہو۔"

"چلو۔" اس نے سکون سے کہا۔ "کہیں تو میں تمہاری توقعات پر پورا اترا۔"

"اور میں یہاں کیوں آرہی تھی' یہ بھی شاید تم نہیں پوچھو گے۔"

وہ کچھ دیر کے لیے چپ رہی۔ جیسے لفظوں کو ٹٹولتی ہو۔

"رات پاپا میرے کمرے میں آئے۔ کیونکہ میرے گھر میں میری وجہ سے لوگ کافی تکلیف دہ وقت گزار رہے تھے۔ میرے سامنے انہوں نے دو چوائس رکھیں۔ نمبر ایک۔ [illegible] کہ تم ان کی پسند [illegible] کو قبول کرلو یا یہ کہ تم ان کی پارٹی جوائن کرلو۔"

"کون سی پارٹی؟ انہوں نے تو پچھلے سات' آٹھ سالوں میں کئی پارٹیاں بدلی ہیں۔"

ثریا جیسے متوجہ نہیں تھی۔ "الیکشن لڑو' ان کے گھر رہو' ان کی پراپرٹی سنبھالو اور جہاں سے آئے ہو' اس طرف پلٹ کر نہ دیکھو۔"

"لاحول ولا۔ اور دوسری والی تجویز کیا تھی؟"

"یہ کہ میں ان کی پسند پر اعتبار کرلوں اور اس کو چن لوں جس کو خود کو بدلنے کی تکلیف سے گزرنا نہ پڑے۔ چونکہ مجھے گزشتہ رات ہی ہر اس جواب کا پتا تھا جو تم مجھے آج دو گے۔ سو میں نے ان کی دوسری والی تجویز کو چن لیا۔"

"ارے واہ۔ تو گویا میں کھلی کتاب کی طرح شیلف پر پڑا ہوں۔"

عثمان کو خود پر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ اس جملے کے بعد بھی ہنس لینے کے قابل تھا۔ لیکن وہ تو نہ ہنسی تھی نہ روئی۔

"تمہیں معلوم ہے عثمان۔" اس نے جیسے خواب کی کیفیت میں بولتے اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا تھا۔

"مجھے تمہارے لوگ فیسی نیٹ کرتے ہیں۔ میں نے ان سب سے محبت بھی بہت کی اور ان کا تعاقب بھی۔ میں نے تمہارے ماحول کا حصہ بننے کے لیے جان لڑا دی۔ مجھے تمہارے ابا سے باتیں کر کے بہت مزا آتا تھا۔ وہ

http://edigestpk.blogspot.cm

کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ مگر کسی کو Hurt بھی نہیں کرتے' تمہاری دادی اماں ہیں وہ جب کچھ پڑھ کر اپنی اولاد پر دم کرتی ہیں تو اسی نیک نیتی سے مجھ پر بھی پھونک دیتی ہیں۔"

تایا ابو اور اماں کی دوستی بھی کتنی پیاری لگتی ہے۔ حالانکہ وہ دو بالکل مختلف شخصیات ہیں۔ کریم ابی اور بڑی تائی ہیں۔ جمال بھائی ہیں' شہریار رضا ہے۔ عبیر اور حمیرا۔ مجھے ان سب کی کشش اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کتنی شدت سے میرا دل چاہا۔ تم مجھے اسی طرح قبول لو جس طرح تم سب ایک دوسرے کے لیے لازم ہو۔ میں ہر اس اس جگہ پہنچی جہاں تم سب کے قدم تھے۔ لیکن میرے سوا تم سب ہمیشہ "ہم" رہے۔

"مبارک ہو۔" اس نے طویل خاموشی کے بعد کہا تھا۔ "گویا تم نے اپنے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو یکجا کر لیا۔ اب یہ تمہارا سالم وجود تمہارے لیے تکلیف کا باعث نہیں ہوگا۔ اب تم آگے دیکھو۔ مت سوچو ان سب کے بارے میں جو پیچھے رہ گئے۔ یہ یادیں بھی ایک دن تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گی۔ میرا بھوت بھی تمہیں ڈرانا بند کر دے گا۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ جب تم آج کے دن کی حقیقت پر بہت ہنسو گی۔ یہ تایا ابی بڑی تائی کریم ابی جن کو یاد کر کے ابھی تمہاری آنکھیں نم ہوئیں۔ سوچنے پر تم کو ان کے نام بھی یاد نہیں آئیں گے۔ حقیقت یہ ہے تم ایک عارضی فیز سے گزریں۔ بچوں کی طرح تم ان دیکھی چیزوں کے لیے مچلیں' پھر تم اپنے اصل کی طرف لوٹ گئیں۔ جیسے پرندے دن بھر اڑان بھرتے انجانے دیسوں کی سیر کرتے انجام کار اپنے گھونسلوں میں پلٹ آتے ہیں۔ مت سوچنا کہ مجھے تم سے کوئی گلہ ہے۔"

"نہیں عثمان۔ یہ نہیں کہ میں ہار گئی۔ میں اب بھی جنگلی بیج کا تعاقب جاری رکھتی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میں تمہیں جیت نہیں سکی۔ تمہاری دنیا مجھے قبولتی نہیں اور اپنی دنیا چھوڑ کر تم آ نہیں سکتے۔ بس کہیں ڈھکی چھپی تمنا سرمایہ تھی کہ تم میرا انفرادی وجود تسلیم کر لو۔ تمہارے لیے شاید یہ بھی مشکل تھا۔ میں سمجھ گئی تھی۔ یقین تو مجھے یہ بھی نہیں عثمان کہ تم نے میرے منع کرنے کے بعد واقعی کسی کو نہیں بتایا ہوگا۔"

کسی وجہ کے بغیر ایک اضطراری حالت میں بے اختیار اس نے میز سے اس کا فون اٹھا لیا اور اس سے اجازت لیے بنا اس کی Log ہسٹری کھول کر بیٹھ گئی۔

"او گاڈ۔" اس کے منہ سے قدرے بلند چیخ نکلی۔

"تم میرا اتنا سا بھرم بھی نہ رکھ سکے؟ میری ریکوئسٹ کے باوجود تم نے رضا' عبیر اور حمیرا تینوں کو بتایا ہے۔"

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ عثمان نے بڑے اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

اس نے فون کیوں کیا تھا۔ اب وضاحت بے کار غیر ضروری ہو گیا تھا۔ اس کے بے ساختہ بہتے آنسو پونچھے جائیں۔ یہ بھی بے معنی تھا اب۔ اس کی عمر میں ایک دم بہت سا اضافہ ہوا تھا۔ وہ اور بڑا اور سمجھ دار ہو گیا تھا۔

اس نے اپنا موبائل پتلون کی جیب میں واپس اڑسا۔ وہ ان چھوا جوس کا گلاس جو ان کے درمیان اس ساری کشمکش سے بے خبر بے حیثیت پڑا تھا۔ اس کا بل پے کیا۔

"چلا جائے۔" جیسے خود سے شاہانہ انداز میں مشورہ کیا تھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

بے تحاشا بہتے آنسوؤں کے سیلاب کے پیچھے اس نے اسے جاتے دیکھا۔

ویسا ہی بہادر' نڈر' دلیر۔

☼ ☼ ☼

اعجاز سابقہ واقعہ کی وجہ سے غیر معمولی محتاط ہو گیا تھا۔

حمیرا اپنے بے چارے چھکڑا سے کمپیوٹر پر جو جھٹکے کھا کھا کر چلتا تھا اور اگلا صفحہ کھولنے میں اتنی دیر لگاتا تھا کہ وہ

جھڑکوں سے نیچے اتر کر چائے کی پیالی لیتی بھاگتی اوپر آ سکتی تھی۔ لیکن فی الحال وہ اس تعیش کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کو آج ہی آؤٹ رپورٹ سب مٹ کرانی تھی۔ قیصر کے واقعہ کی وجہ سے اس مرتبہ ان کا Pamphlet بھی لیٹ ہو گیا تھا۔ ایک کونے میں پرانے میگزین کے انبار میں کچھ بکھرے ہوئے خالی صفحوں میں ادھورے کام نامکمل حالت میں پڑے تھے۔ ابھی ابھی یہاں سے لوگ اٹھ کر گئے تھے۔ چائے کی خالی پیالیاں' ادھ جلے سگریٹوں کے ٹکڑے۔ قالین پر گرے پانی سے اٹھتی چمڑے جیسی بو۔ سب اسی بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔

اعجاز نے انہیں آفس آنے کی اجازت تو دی تھی' لیکن ہدایتوں کے پلندے بھی ساتھ منسلک کر دیے تھے۔

"اندر سے اچھی طرح کنڈی لگا کر بیٹھنا' کوئی آئے تو اس شیشے سے جھانک لینا۔ بغیر پہچانے دروازہ مت کھولنا۔ بلکہ سرے سے کھولنا ہی نا۔ میں تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں۔ لڑکا اردو بازار گیا ہوا ہے' شام سے پہلے نہیں لوٹے گا۔"

میسیج کے آخر میں لکھا تھا۔ "آئی repeat دروازہ ہرگز نہیں کھولنا۔"

"اعجاز کچھ وہمی سا نہیں ہو گیا۔"

عبیر نے کاغذوں کا پلندا سنبھال کر خالی جگہ پر فلور کشن گراتے اپنی سیٹ سنبھال لی۔ قیصر کے حادثے کی تفصیل اور اس کے واضح ثبوت ان کے پاس نہیں تھے۔ اب وہ کچھ لکھیں بھی تو سب سچ ہونے کے باوجود جھوٹا پڑ جائے گا۔

"حادثہ بھی تو بڑا تھا۔"

حمیرا نے وقفے کے بعد سہی' لیکن ہمیشہ کی طرح کسی نہ کسی کی طرف داری کی تھی۔ کتنی دیر لکھتے رہنے کے دوران ان میں خاموشی چھائی رہی۔ حمیرا کا Excel پر جمع تفریق کا کام تھا اور عبیر اس حادثے کی ممکنہ تفصیلات لکھ رہی تھی۔ جو کچھ اس نے جہاں جہاں سے سنا۔ وہ جب بھی کچھ لکھتی اس میں شدت سے الو... واردات... جیسے خود اس کے دل اور وجود سے گزر گئی۔

"مارا' پیٹا۔" بظاہر دو لفظی جملہ لکھنے سے پہلے کتنی مرتبہ اس نے خود کو اس بے بسی کی تکلیف سے گزرتے دیکھا۔ جب اسے چمڑے کی پیٹی سے مارا گیا' جس میں لوہے کا بکل لگا ہوا تھا۔ جب اس کو گرا کر اس کے سینے پر ہاتھوں کی اس طرح بارش کی گئی کہ اس کا وجود نیل و نیل ہو گیا تھا۔ پھر جب اس کو ڈنڈے سے کوٹا جا رہا تھا' اس نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ تنہا' بے بس' دوستوں اور اپنے پیاروں سے دور۔ دشمنوں میں گھرا ہوا۔

ایک وقت تھا جب ٹکٹکی سے باندھ کر اس کے باپ پر کوڑے برسائے گئے تھے۔ سفید آقاؤں کے سیاہ فام غلاموں پر ڈھائے جانے والے ظلم سینکڑوں سال بعد بھی نام اور نسلیں بدل بدل کر سامنے آتے ہیں۔ جبر کا تصور ختم نہیں ہوتا۔

اس نے لکھنا روک کر اس اذیت سے نکلنے کی بھرپور کوشش کی۔ عین اس وقت جب وہ موجودہ وقت سے ماورا کسی اور زمانے میں کوڑے کھا رہی تھی۔ اس مکمل سناٹے میں دروازے پر دستک گونجی۔ وہ جیسے پوری جان سے لرز گئی۔

حمیرا نے روغنی کھرچے کاغذ میں شیشے سے باہر جھانکا جو محض اسی مقصد کے لیے چھیل کر چھوڑا گیا تھا۔

"دروازہ مت کھولنا۔" عبیر جیسے ٹکٹکی سے بندھی دہشت زدہ ہو کر چلائی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اعجاز کے ضرورت سے زیادہ محتاط ہونے پر ہنس رہی تھی۔ حمیرا نے جیسے اس کی غیر ضروری احتیاط کو توجہ ہی نہیں دی' آرام سے ہاتھ بڑھا کر بولٹ کھولا اور دروازے کے پٹ وا کر دیے۔

http://edigestpk.blogspot.cm

"دروازہ مت۔۔۔" وہ بے ساختگی میں کھڑی ہوئی۔ کاغذوں کا پلندہ اس کی گود سے نکل کر فرش پر دور تک بکھر گیا۔ خالی بال پین ہاتھ میں لیے وہ حمیرا کی حماقت پر اس کو کوستی دم بخود کھڑی تھی۔

"السلام علیکم آیئے۔"

حمیرا نے نا صرف دروازہ کھولا تھا بلکہ آنے والے کی آمد نے اسے جس خوشی سے دوچار کیا وہ اس کا روز مرہ نہیں تھی۔

"ارے واہ۔ یہ تو سوچا بھی نہیں تھا۔ آپ فضائی میزبان کی طرح دروازے پر استقبال کرتی ملیں گی۔" یہ آواز، یہ انداز، اب بہت نامانوس نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ uneasy ہو جاتی۔ دروازہ کھولنے والی نے چونکہ اس کے اندر آنے کے لیے وافر جگہ مہیا کر دی تھی لہٰذا اس کو اندر پہنچنے کے لیے رسمی مراحل سے گزرنا نہیں پڑا۔ یونہی ادھر ادھر نظر گھما کر در و دیوار کا جائزہ لیتے جیسے چیزوں کی طرح ہی اس نے کونے میں کھڑی عبیو پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی تھی اور ہٹالی۔

"سو آپ کو گھر والوں نے نکال دیا۔ ایک دن یہی ہونا تھا انجام کار۔"

"یہ کیسے طے کیا آپ نے؟ کہ نکال دیے گئے ہیں یا بھاگ آئے ہیں۔" حمیرا نے دروازے کے اسی پٹ کے پاس کھڑے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

وہ چاروں طرف نگاہ گھماتا ایک دم رک گیا۔

"اوہ۔ میں آج بھی اپنا زرہ بکتر بھول آیا۔ سو یہ ہے وہ مشہور زمانہ دفتر۔ اور انٹلیکچو ئلز کی طرح آپ لوگ اپنے دفتر کو گندا بھی رکھتے ہیں؟" اوپر مکڑی کے جالے سے ہوتی اس کی نگاہ عبیو پہ ٹکی جیسے یہ سوال اسی سے تھا۔

"چلیں۔ ہم انٹلیکچو ئل ہونے کی کوئی ایک شرط تو پوری کرتے ہیں۔" عبیو کا جواب نہیں تھا۔ جیسے ایک دہشت سے بھرا سانس تھا جو آزاد ہوا۔ وہ چاروں طرف گھوم کر دیکھتے اس کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا۔

"اور آپ کونے میں کس لیے کھڑی ہیں؟ آپ کے ہوم ورک میں کیا [illegible] آج یہ سوال بدلا گیا تھا۔ لیکن بلانے والا غائب ہے۔ یہ بھی دانشوری کا تقاضا ہے؟ دیر سے آنا یا بالکل نہ آنا؟"

"وہ تو آپ اور اعجاز وغیرہ آپس میں نمٹ لیجیے گا۔ کہیں تو آپ کی خاطر مدارات کی جائے؟"

"جی نہیں۔۔۔ نوازش۔۔۔ اور اچھا ہوا آپ نے کہا ہی نہیں کہ تشریف رکھیے، ورنہ میں کہاں رکھتا تشریف۔" "جہاں ہم نے رکھی ہے۔" وہ کریم بی ایک محاورہ بولتی ہیں۔ چمگادڑوں کے مہمان ہم بھی لٹکیں تم بھی لٹکو، سو تشریف رکھیے۔" بیٹھتے بیٹھتے وہ ٹھٹک گیا۔

"کیا یاد دلا دیا، اور مجھے لٹکایئے گا نہیں۔ لٹک جانے والے بڑے انسان تھے، اور پلیز آپ دونوں بھی بیٹھ جایئے۔" پھٹی ہوئی دری کے ایک کونے پر سکون سے بیٹھتے اس نے شاہانہ انداز میں گویا ان کو بھی بیٹھنے کی اجازت عطا فرمائی تھی۔

عبیو نے اس کی طرف دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے کمرے کی حالت پر اس قدر تنقید کی تھی اور اب اس اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے اس کے بیٹھنے سے وہ ساری قابل اعتراض چیزیں غائب ہو گئیں، حالانکہ اس کے گھٹنے کے بالکل پاس ابھی تک چائے کی چھوڑی ہوئی وہ پیالی پڑی تھی، جس کی تہ میں کسی دانشور نے اپنا بجھا ہوا سگریٹ موڑا تھا۔

"سو آپ لوگ یہاں بیٹھ کر کام کرتے ہیں، کیا کام کرتے ہیں؟" اس بات کا کوئی جواب بنتا بھی تھا یا نہیں۔ عبیو نے ایک لمحے کو سوچا۔ وہ جو جواب بھی دے گی رد کر دیا جائے گا۔ وہ سوال ہی اس لیے کرتا ہے کہ جواب پلیٹ

http://edigestpk.blogspot.cm

دے جائیں۔ لیکن خوش اخلاق حمیرا کو عبیو کی خاموشی گراں گزری۔ عبیو پر بددماغی کا حرف آئے اس سے یہ بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔ وہ فوراً "اچھے Compare" کا رول پلے کرنے لگی۔

"آج تو ہم اپنے تھیٹر کی آؤٹ رپورٹ تیار کر رہے ہیں اور قیصر کے ساتھ ہونے والے حادثے کی ذاتی انکوائری۔" وہ تو جیسے صاحب تھا اور کام چور ماتحتوں کو چیک کرنے آدھمکا تھا۔ یہ حمیرا کا مؤدبانہ لہجہ۔ عبیو نے اندر سے جھنجلا کر سوچا تھا۔

"اور ریکارڈ storing کا کام آپ کسی کیبنٹ کے بجائے اس فرش سے لیتے ہیں؟"

حمیرا بے ساختہ ہنس دی۔

"وہ تو آپ کے ناک کرنے پر عبیو ایک دم کھڑی ہوئی تو سب کاغذات الٹ گئے۔"

"واہ' یہ کھڑی ہو جائیں تو چیزیں الٹ جاتی ہیں۔ اس کا مطلب حکومتیں الٹنے کے لیے ان کا کھڑا ہونا ضروری ہے۔" حمیرا ابھی بھی ہنسنے کے موڈ میں ہوتی۔ آج شاید ایسا ہی ایک دن تھا۔

"ہمارے پاس ٹی بیگ ہے۔ ڈرائی ملک ہے اور یہ خوف ناک ٹک بھی ڈھل کر جھک جائے گا۔ جب تک اعجاز نہیں آتا۔ آپ کے لیے چائے بنائی جائے۔" حمیرا نے کلرکی چھوڑ کر پھر سگھڑ بی بی کا کردار اپنا لیا۔

"باقی تو سب سمجھ آتا ہے' مگر اس میں اعجاز کا ذکر کہاں سے آیا۔"

"یعنی؟ آپ نے کہا تھا کہ اعجاز آپ کو بلا کر لیٹ ہو گیا ہے۔"

"یہ تو آپ نے کہا تھا۔" اس نے بے پروائی سے ایک بکھرا کاغذ اٹھانے اور اس میں بغور غرق ہوتے کہا۔ لمحوں میں ہی اس نے کاغذ سے سر اٹھایا۔ اس کی پڑھائی کی اسپیڈ خوف ناک حد تک تیز تھی۔ یا کاغذ پر موجود مواد میں اس کی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اپنے عمل کے بالکل برعکس اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"ارے واہ۔ تو آپ کسی واک کی تیاری بھی کر رہے ہیں۔ پرامن پروٹیسٹ ریے بین کی سیاہ گلاسز چڑھا کر۔ Nike کے جوتے' آپ کے آگے آگے بھاگتے پرائیویٹ چینلز کے وڈیو کیمرے۔"

اور اس نے دونوں کی طرف اچٹتی نظر دیکھتے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ کام ان پر چھوڑ دیں جو اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ کو کرنا ہے تو بڑا کام کیجیے۔" اس نے لمحے بھر کے لیے عبیو کی آنکھوں میں جم کر دیکھا۔

"آپ سے کچھ اور توقعات ہیں۔"

"مثلاً" "چڑی کو دھنک رنگ میں رنگوا لوں؟"

"اس میں بھی کوئی برائی نہیں۔ اور یہی ایک راستہ بھی نہیں۔ جس طرح Doctrate بھی واحد حل نہیں۔"

"ہیں!" حمیرا نے نوٹ کیا اس منظر کے کچھ ایکٹ اس سے Missing ہیں۔ اس سے قبل کہ وہ کسی نتیجے تک پہنچ سکتی بڑی برق رفتاری سے فاروق نے موضوع بدل ڈالا تھا۔

"ویسے اس وقت آپ لوگ یہاں نہ ہوتیں تو کیا ہوتا؟ یعنی میں ڈیڑھ سو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتا اور پتا چلتا تالا لگا ہوا ہے۔"

"ہمیں پتا ہوتا آج آپ آ رہے ہیں تو ایک لفٹ لگوا لیتے۔ ویسے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آنے پر احتجاج کرنے والے اور ریے بین چڑھا کر واک کرنے والوں میں کوئی فرق ہے تو بتایئے؟"

"فرق ہے نا۔ ایک کے آگے آگے کیمرے نہیں دوڑتے۔ واک کے علاوہ Election کے لیے بھی آپ لوگوں نے کچھ کام کیا یا نہیں؟" انٹرویو لیتے رہنا شاید اس کی سرشت میں شامل ہے۔

"بالکل کیا۔" حمیرا نے فخر سے کہا۔ "ابھی جب شہریار آیا ہوا تھا تو ہم نے سارے شہر کے پوسٹر پڑھ ڈالے۔"

"اوہ۔ تو شہریار صاحب تشریف لائے اور آپ نے پھر مجھے ان کی دید سے محروم کر دیا۔" اس کو واقعی افسوس ہوا تھا یا اس کو ایسا ہی کچھ کہنا تھا اور اس نے کہہ دیا۔

"پھر کس نتیجے پر پہنچے' کس کو ووٹ دیں گے؟"

"کس کو ووٹ دیں۔ سب تو بار بار کے آزمائے ہوئے ہیں۔"

"لیکن وہ تو کہتے ہیں اب ہم نے سبق سیکھ لیا ہے۔"

"وہ کہتے ہیں نا۔"

"یقین تو کرنا پڑتا ہے ورنہ کیا کریں گی؟ انتظار۔ کہ بندوقوں والے آ جائیں۔"

"ہم اس حالت میں آ گئے ہیں۔ دس اچھوں میں سے ایک اچھا نہیں۔ ہزاروں برے لوگوں میں سے سب سے کم برا ہمارا انتخاب ہے۔ اس کے بعد ڈرایا جاتا ہے۔ سو جاؤ' ورنہ گبر آ جائے گا۔"

وہ ان دونوں کو باتیں کرتا سن رہی تھی۔

اس کے ہاتھ میں پین تھا۔ لیکن کتنی ہی دیر سے اس کا قلم جھک کر کاغذ تک نہیں پہنچا تھا۔ لکھنے کے لیے مواد بنانا پڑے گا۔ فاروق اور حمیرا نامعقول قسم کی بحث میں الجھ گئے تھے اور حمیرا تو ویسے بھی بڑی شوقین ہے ہر قسم کے مذاکرات میں کود پڑنے کی۔ اس کا ہاتھ کی بورڈ پر رہی تھا۔ وہ نہ وہاں سے ہٹی تھی' نہ اگلا لفظ ٹائپ کر سکی۔ بہرحال یہ دونوں رپورٹ آج ہی مکمل ہو جانی چاہئیں۔

حمیرا نے پلٹ کر عبیو کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے حصے کے دو چار جملے بول چکی تھی اور اب بیٹھی بے چین ہو رہی تھی۔ کیونکہ اخلاقیات نبھانا بھی اس نے کندھوں پر نہیں لیا اور بہرحال اس کو کام مکمل کرنا تھا۔ ایک نامحسوس اداسی کی طرح عبیو کی بے چینی از خود حمیرا تک منتقل ہوئی اور جیسے ساری فضا میں پھیل گئی۔

[illegible] کی طرف نگاہ گھمائی۔ خود کو بے جگہ اور بے مقصد سا محسوس کیا۔ اور یہ پہلی دفعہ نہیں تھی۔ دوسری اور تیسری بھی نہیں۔ (اور وہ تو شمار بھی نہیں کرتی) کہ وہ وہاں موجود تھا۔ تو اس کا موجود ہونا کسی منصوبہ بندی کا حصہ نہیں تھا' لیکن پھر بھی وہ اس کو ناخوش سا محسوس کرتا تھا۔

اس نے بحث سمیٹ دی۔

کسی کی بھی ناخوشی کا سبب وہ ہو' یہ کوئی معقول بات تو نہ ہوئی۔

"ایسا ہے کہ۔" جیسے اس نے اگلی تقریر کا آغاز کیا۔ "میں نے لاہور پہنچ کر عثمان کو فون کیا۔ اس نے کہا وہ تو available نہیں ہے۔ میں رضا کو فون کر لوں۔ رضا کا نمبر ملایا تو پتا چلا وہ اسی طرف ہی آ رہا ہے۔" اس نے کہا "میں فوری طور پر یہاں پہنچ جاؤں' وہ مجھے یہیں سے لے گا۔ اب آپ چاہیں تو مجھے کسی اور کے سر مسلط کر سکتی ہیں۔ آپ کی کریم بی کے سوا میں ہر در کھٹکھٹانے کو تیار ہوں' خواہ ان کا محاورہ کتنا ہی کمال کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ Pass the parcel کی طرح ہر شخص مجھے دوسری طرف کیوں دھکیل رہا ہے۔"

"عثمان نے کہا۔ وہ available نہیں؟"

عبیو نے تشویش سے حمیرا کی طرف دیکھا۔ "اس نے ایسے کہا؟"

"پتا نہیں وہ کہاں ہے' اس کو کیا ہوا؟"

"کہاں ہے۔ مجھے نہیں پتا' کیا ہوا' یہ بھی نہیں پتا' لیکن کچھ ہوا ضرور۔"

وہ تشویش سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

http://edigestpk.blogspot.com

رفعت ناہید سجاد

چراغ آخرِ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد' ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود [illegible] نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پراعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف ٹی وی چینلز اور تھیٹر کے لیے پروگرامنگ کرکے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے' وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔

www.edigestpk.blogspot.com

عبیرہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بے وجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے' جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے' جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے' اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے' جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۱۲
بارہویں قسط

www.edigestpk.blogspot.com

دوستوں نے فتح کا جشن منا رکھا تھا۔ چھت پر چڑھ کر کا شغوف سے گولیوں کے اوپر داغتے۔ منہ سے ہا لالا کی جنگلی آوازیں نکالتے اور ڈھول کو جنونیوں کی طرح پیٹتے۔ لگتا تھا کوئی معرکہ سر کر آئے ہیں۔

عین نیچے صوفے پر بیٹھے اسے خوف محسوس ہوا جیسے چھت اس کے سر پر آپڑے گی۔ کتنی ہی مرتبہ دہشت زدہ ہو کر اس نے سر سے ڈھلکتے دوپٹے کو سنبھالا جیسے وہی گرتی چھت کو سہارے گا۔

کوئی قلعہ سر کیا تھا۔ لوٹ کے مال میں لونڈیاں باندیاں ہاتھ لگی تھیں۔ سب سے حسین اور نازک مزاج کنیز شہزادے کے حصے میں آئی تھی۔ وہ جیت کے نشے میں بدمست جھومتا تھا اور دھمال ڈالتا تھا۔ فتح کی نشانی جس صوفے پر جس طرح بٹھائی گئی تھی وہاں ویسے ہی بنا جنبش ایسے بیٹھے تھے جیسے کسی جادوگر کی پھونک نے اسے پتھر کا بنا دیا ہو۔ حالانکہ اس نے پیچھے سے آنے والی آوازوں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

رخصتی میں اس کا ساتھ دیتے رضا اور آپائی' سمن آباد والے اس گھر کے دروازے تک آئے تھے۔ جہاں کیلوں کے گیٹ پر شادی مبارک رنگی برنگی قمقموں سے جھلملا رہا تھا۔ چھت سے زمین تک سنہری روشنیوں کی لڑیاں گھر کے ماتھے پر سہرے کی طرح لٹکی جل بجھ کرتی تھیں۔ گھر میں ایسی افراتفری اور چیخ و پکار مچی تھی جیسے کسی قدرتی آفت کے آنے سے لوگوں نے اپنے حواس کھو دیے ہوں۔ بروکیڈ کی شیروانیاں اور چمکتی ٹوپیوں میں ملبوس بے تحاشا اور بے مقصد ننگے پاؤں بھاگتے بچے۔ ایک دوسرے کو حکم دیتے اور چلا چلا کر رعب جماتے مرد۔ ہنستے کھیلتے بچے کو بے سبب تھپڑ رسید کرتے مٹی تھنی بھاری بھرکم وجود والی ٹھسے دار عورتیں۔

وہ دونوں سیمنٹ سے بنے راستے کے پاس ایک اجاڑ اور پیلی گھاس والے لان کے سرے پر کب سے گم صم کھڑے تھے۔ پاس سے گزرتے ہی بدحواس لوگوں کو انہوں نے پیغام دیا۔ وہ کون تھے اور کیوں آئے تھے۔ گو دونوں

اس کی ساعت پر یہ بے ہنگم طوفان ناگوار گزر رہا تھا۔ لیکن شاید رضا کو اس مچھلی بازار سے زیادہ کوفت ہو رہی تھی۔ آپائی نے اپنے سمجھدار بیٹے کو ٹھنڈے لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"لوگوں کا اپنا اپنا طریقہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ خوشی کے لمحوں میں ضبط کر لیتے ہیں۔ کچھ بے قابو ہو جاتے ہیں۔ غم میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ نہ ضبط کرنے والے کمال کرتے ہیں نہ بے قابو ہو جانے والوں پر گزری واردات انوکھی ہوتی ہے۔ بس ہر ایک اپنے اپنے ظرف کے مطابق جذب کرتا ہے۔ باقی چھلک جاتا ہے۔" رضا نے اچانک پلٹ کر اپنی ننھی سی ماں کی طرف دیکھا۔

"آپ شہریار کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کم کریں۔" اس نے ماحول میں موجود تناؤ سے نجات حاصل کرنا چاہی۔ لیکن شاید انہیں مکمل کامیابی ہوئی بھی نہیں۔

آپائی عادتاً" دل کھول کر ہنسی تھیں۔ رضا کو بھی مسکرانا پڑا۔ یہ الگ بات کہ ان دونوں نے ایک دوسرے سے نظر ملانے سے اجتناب ہی کیا تھا۔ ان کے نظریات میں بھی قطعی اختلاف تھا۔ اگر کچھ مشترک تھا تو صرف حوصلہ۔ ہو کتنی دیر سے پھٹ پڑنے کی خواہش کے باوجود' اس ہمت سے کھڑے تھے جیسے اس قسم کے ماحول کا حصہ ہوں۔ آپائی کا خیال تھا بیٹی بیاہی ہے' لڑکی والوں کو سر جھکا کر جینا چاہیے۔ رضا ان سے قطعی متفق نہیں تھا۔ بیٹی بیاہی ہے کروی نہیں رکھی کہ آپ سر جھکا کر ان کے سامنے قید ہو کر پیش ہوں۔ پابہ زنجیر۔

وہ سردی کے اس موسم میں کب سے اپنا پیغام پہنچائے جانے اور وہاں سے جواب آنے کے منتظر کھڑے تھے اور یہ نہیں کہ لوگ ان کے وجود سے بے خبر تھے۔ لیکن لڑکی کے گھر والے لڑکے والوں کے صحن میں بہر کیف مفتوح ہی تصور کیے جاتے ہیں اور ان کے وجود سے بے نیازی دراصل ان کو پیچ سمجھنے کا ڈھکا چھپا پیغام ہے۔ ان کا رویہ پچھلے تین دنوں سے ایسے تھا جیسے ان کے مابین رشتے ہموار نہ ہوئے ہوں دشمنیاں پیدا ہوئی ہوں۔ وہ تو عادی ہے ... لیکن ابھرتے بھی مخاصمت کی بنیاد پر قائم ہو رہے لڑکی والے۔ لڑکے والے کب سے وہ اپنے ذاتی ناموں کے بجائے قبیلوں میں بانٹ کر پکارے جا رہے تھے۔ شاید وقت کے ساتھ کبھی یہ برادری سسٹم ختم ہو جائے۔ دوریاں سمٹ جائیں۔ ابھی تو ان کی بہن ان کی پہنچ سے بہت دور جا چکی تھی۔

قسم کی ممانیاں' چچیاں قسم کے رشتے داروں نے دیکھا لڑکی والوں کی طرف سے آئے دو مہمان Attended باہری صحن کے اس حصے میں کھڑے تھے۔ جس جگہ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں کھلتی تھیں اور جہاں بارات گھر میں داخل ہوتے ہی دولہا کو لے کر چھت پر دھم دھم کرتی چڑھ گئی تھی۔ دلہن کے گھر سے آئی دلہن صحن کو سیاہ کر رہی تھیں وہ دونوں اس کالک کے پاس منتظر تھے کہ کوئی ان کو دلہن تک پہنچا دے یا صاف جواب دے کر رخصت کر دے۔ جیسا بھی ان کے گھر کا دستور ہو۔

پھر کوئی زیورات سے لدی پھندی فربہ اندام سسرالی خاتون آگے کو آئیں۔

"آپ لوگ اندر آکر بیٹھیں نا!"

لہجے کی نمایاں ناگواری گویا ان کو بہت مرتبہ بلا لیا گیا تھا اور نخرہ تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا اور اتنی مصروفیت میں کس کے پاس وقت ہے کہ روشنیوں کے جھماکوں میں دو اجنبی چہروں کو بلایا اور بٹھایا جائے۔ جن کا رنگ بدلتی روشنی کے ساتھ بدلتا تھا۔ تضحیک آمیز رویے بھی فاتح قدموں کو سرشار رکھتے ہیں۔

کہا جاتا ہے دوسری عالمی جنگ میں جب ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کیے گئے تو جرمنی کو بیٹھنے کے لیے کرسی نہیں دی گئی۔ اتحادی قوم میں فتح کے نشے میں چور ہاری ہوئی قوم سے ہزیمت آمیز رویہ رکھ کر فتح کا جشن مناتے رضا لوگ کا وہ جرمنی تھا اور اپنی نازی ماں کے ساتھ شکست کے معاہدے پر رضامندی دے کر یہاں تضحیک

سے آیا تھا۔ پر اب تو آ گیا تھا نا!

کسی اور چچی ممانی نے چلتے چلتے ٹھٹک کر ناگواری سے دیکھا۔ وہ پہلے یہاں سے گزریں تب بھی وہ دونوں اس دیوار کے سائے تلے آتے جاتوں سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اتنی دیر بعد جب اس کا دوبارہ گزر ہوا تو وہ اپنی پہلی پوزیشن سے ذرا بھی نہیں ہلے تھے۔

بارات لے کر جب وہ لڑکی والوں کی طرف گئے تو انہوں نے ان لوگوں کی آتے جاتے جھلک تو دیکھی تھی۔ دلہن کے کیا لگتے تھے اور کچھ لگتے بھی تھے یا نہیں ان کے علم میں نہیں تھا۔

"آپ کے ہاں شاید دستور ہے لڑکی کی ساتھ والی آنے کا اس لیے پوچھا کہ بعض لوگ پرانے خیالات کے ہوتے ہیں۔ پر اب کون سا زمانہ رہ گیا ہے۔ بڑے بڑے گھروں میں ایسے سلسلے چلتے تھے۔ صحن میں پوری بارات کے بستر لگ جاتے۔ اب تو چھوٹے چھوٹے گھر ہوتے ہیں۔ دو تین کمروں کے۔ ایک کمرہ دلہن کے لیے مخصوص ہے۔ دو کمروں میں سارا گھر سمائے۔ مہمان رکھے جائیں یا ساتھ والی کو؟" وہ مسکرا تو رہی تھیں لیکن اس مسکراہٹ کے بریکٹ میں کہیں باریک حروف میں درج تھا۔ "تشریف لے جائیے۔"

آپائی اندر ہی اندر لرز کر رہ گئیں۔ اس تقریر کے جواب میں اگر رضا کا ضبط جواب دے گیا تو!

انہوں نے بڑی مہارت سے پھر چور نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ برداشت سے اس کا رنگ سرخ پڑ رہا تھا۔ خیر وہ بچہ نہیں۔ رشتے کی نزاکتوں کو سمجھتا ہو گا۔

اور واقعی! وہ کیوں آئے تھے نہ کوئی رسم نہ رواج۔ قاعدہ نہ دستور۔ یونہی براتی رضا کو ذرا جاہل قسم کے لوگ لگے اور ہر جاہل کی طرح اپنی لاعلمی پر نازاں بھی جوں جوں برات تنویر کو لیے آگے کی طرف جا رہی تھی اس میں عجیب قسم کا اضطراب پیدا ہو رہا تھا۔ وہ پوزیسو ٹائپ کا بھائی نہیں تھا لیکن عثمان کی غیر موجودگی میں اسے خود پر بوجھ بھی زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔

www.edigestpk.blogspot.com

اپنے انتخاب کا پورا پورا حق تنویر کو دیا گیا تھا۔ جمال بھی اس کا انتخاب تھا اور اسی حق کا دوبارہ استعمال کرتے اس نے اپنا فیصلہ بدل ڈالا تھا۔ لیکن اسے لگا وہ غلط طرف جا رہی ہے۔ گو جا چکی ہے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ اس کے پیچھے لپکا تھا۔ پھر اس نے پلٹ کر آپائی سے کہا۔

"ہم تھوڑی دیر کے لیے ہو آتے ہیں۔ اس کو تسلی رہے گی ہم دور نہیں۔" یہاں بھی آپائی میں اور اس میں اختلاف رہا۔

ان کا خیال تھا اس کو آج سے بلکہ ابھی سے ہمارے بغیر رہنے کی عادت ڈالنی پڑے گی۔ لیکن وہ رضا کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکیں۔

انہوں نے پھر اس کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"پہلا فنکشن ہے ان کے گھر کا۔ ان کو شاید عادت نہیں۔ اول اول اتنی ہی بدنظمی ہوتی ہے۔"

رضا قائل نہیں ہوا۔ وہ بھی شادی گھر کھول کر نہیں بیٹھے تھے۔ ان کے ہاں کی بھی پہلی شادی تھی۔

تنویر کو اطلاع ہوئی۔ اس کے گھر سے کوئی اس سے ملنے آیا تھا اور ملے بغیر چلا گیا۔

"عجیب لوگ ہیں۔" ساس نے بدمزگی سے کہا۔ "آئے کیا کرنے تھے پھر ملے بھی نہیں۔ ایسی بھی کیا بے صبری۔ مجھے ذرا (ولیم فائیو) دینا۔ کہاں ہے نعیم! اسے میری دوائیوں کا پتا ہوتا ہے۔ شادی ہو گئی تو کوئی ایسا دنیا سے انوکھا کام ہو گیا۔ ماں کی طرف سے لاپروا ہو گیا۔ بیوی آ گئی۔ اب ماں کو زہر دے دو۔ پلا دو اسے۔"

وہ طنطنے سے اندر آئیں اور باہر چلی گئیں۔ بیٹیاں لپک کر باہر کی طرف دوڑیں نعیم کو اطلاع دینے "اماں خفا ہو گئی ہیں۔ سارے گھر میں ہاہاکار مچ گئی۔ غالباً" اماں کا روٹھ جانا۔ ایک اہم Event ہوتا ہو گا۔ وہ آگاہ نہیں تھی۔

لیکن خوف کے اس ماحول نے اس کو سہما ضرور دیا تھا۔ اس بھرے پرے گھر میں صرف ایک ہی آدمی سے واقف تھی اور وہ بھی اس وقت بیوی کے پیچھے ماں کو بھلا کر نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے تو خود اس کو لمحے بھر کے لیے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ وقفوں وقفوں سے اس کو اطلاعات کانوں میں پڑتی گئیں۔

"نعیم بھائی کے دوست ڈھول لے کر آئے ہیں۔ ڈھول والوں نے پیلے کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

"وہ بہت پر ہے۔ دوستوں میں گھرا ہوا۔"

"ماشاءاللہ اپنی شادی سے بہت خوش ہے۔"

لہجے میں عجب کڑواہٹ تھی۔ جیسے ماشاءاللہ اس میں زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہو۔

پیاس سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ نہ اس نے پانی مانگا نہ کسی نے خود سے زحمت کی۔ وہ تو جیسے اس کو ایک دم بٹھا کر بھول بیٹھے تھے۔ گویا آج کے سارے دن میں اس کی کوئی خاص حیثیت بھی نہ ہو۔

وقفوں وقفوں سے لوگ اس کے دائیں بائیں بیٹھتے اور جیسے اس کے وجود کو فراموش کیے آپس میں بات چیت کرکے اٹھ جاتے۔

نعیم کی کوئی شادی شدہ کزن اب اس کے پاس بیٹھی تھی۔ تنقیدی انداز میں اس کو سر سے پاؤں تک دیکھتی۔ وہ غالباً "ان لوگوں میں سے تھی جو دنیا کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے پھرتے ہیں۔" "ہم بہتر جانتے ہیں" کے گمان میں سرشار۔

"یہ کیا گنواروں کی طرح دوپٹہ مڑھ رکھا ہے۔ میں دیکھ رہی تھی سارا فوٹو سیشن خراب ہو گیا۔"

پھر ذرا جیسے تنبیہہ سے کان میں بڑبڑائی۔

"اف سلوٹ بھی نہیں پہنتی۔ سامنے سے دوپٹہ پرے کرو۔ آج ہی اڑ کر سیٹ نہ لگیں تو آئندہ کیا ہو گا۔"

"[illegible] کپڑے پہننے کی تمیز نہیں۔ جیولری کی سینس نہیں۔ کیا اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔"

اس کے دائیں بائیں بیٹھنے کی اب ان دونوں کی باری تھی۔ اس کو گھیرے میں لیے اپنی قابلیت کے زعم میں "مرد کو قابو رکھنے کے وہ سارے گر جو ان کے اپنے آزمائے ہوئے تھے۔ اس کے کانوں میں اتارنے لگیں۔

ہر جملے کے بعد تائید کے لیے وہ دوسرے کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر ہاتھ مارتیں اور ایک غلیظ سا قہقہہ ان کے حلق سے آزاد ہوتا۔ اس چہرے سے بے پروا جو کبھی پیلا پڑتا تھا کبھی لال۔

ان کے مساموں سے اٹھتی تیز خوشبو کے بھبکے اس کی قوت شامہ کے لیے ایک کڑی آزمائش بن رہے تھے۔ کتنی مرتبہ اسے لگا وہ الٹی کر دے گی۔ وہ جب دائیں طرف سے جھک کر بائیں طرف والی لڑکی سے باتیں کرتیں تو اپنے وجود کا وزن اس پہ ڈالتے اپنی سرگوشی اس طرح مخاطب تک پہنچاتی کہ راستے میں پتھر کی طرح بیٹھی دلہن پر قطرہ قطرہ ٹپکتی Lipstick پرفیوم اور وجود سے اٹھتے ناگوار مہک کے جھونکے۔ کھلے ڈلے الفاظ۔

وہ مشکل سے حلق تک آئی ابکائی روکتی۔

"پریشان نہ کرو۔" کسی کو رحم آتا۔

"لے وہ کوئی چوچی ہے۔ آج کل سب کو سب پتا ہوتا ہے۔"

"اللہ یہ کیسی آزمائش ہے۔" جس کے پہلے ہی امتحان میں اس نے خود کو بے اختیار ہوتے محسوس کیا۔

عجب شادی تھی۔ جس کی جی بھر کے خوشی وہ ایک لمحہ بھی نہیں منا سکی۔ نہ اس گھر میں جہاں سے چلی تھی اور نہ اس گھر میں جہاں وہ آ گئی۔ اپنی ذات کی تکمیل کی خواہش میں جہاں تک پہنچی۔ شادی صرف کسی کو پا لینے کا ہی نام ہے۔ ابھی اس کی الفت یہیں پر ختم ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ایسے جنجال بھی آئیں گے۔ بے خبر تھی۔

دائیں بائیں سے اچھلتے فقرے اور کبھی کبھی جیسے ہوا کی لہروں پر سوار سامنے کھڑی عورتوں کے جملے آپس میں مدغم ہو کر بے ترتیب ' بے ربط اس کے کانوں سے ٹکراتے۔

"کندھے چوڑے نہیں ہیں۔"

"میک اپ بہت تیز ہے۔"

ایسے تنقیدی انداز جیسے کمپنی سے مال آرڈر پر منگایا تھا۔ بلٹی چھڑائی تو عیب راز کھلا۔

"ماتھا ضرورت سے زیادہ اونچا ہے۔" (کس کی ضرورت سے ' پتہ نہیں)

"قد بھی بہت لمبا ہے۔ لڑکیاں تو ٹھگنے سے قد کی اچھی لگتی ہیں۔"

ساس کو بھنک پڑی یا شاید کسی نے بھاگ کر مخبری کی۔ ساس کے سسرالی کھڑے باتیں بنا رہے ہیں بال تو مارکیٹ سے انہوں نے اٹھایا تھا۔ اور ان کا بیٹا جان بھی دے دیتا تو وہ کمتر پر سودا نہ کرتیں۔ وہ اپنا رونا بھول بھال لپک کر آئیں۔ اپنے سسرالیوں کو جلتے دیکھ کر ان کا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس کا صاف مطلب تھا وہ کوئی غلط چیز اٹھا کر نہیں لائی تھیں۔ انہوں نے ایک اونچا قہقہہ لگایا۔ سسرالیوں کو راکھ کرنے کے لیے۔ شاید وہ کامیاب بھی رہیں۔

"دلہن کا گھونگھٹ نیچے کردو۔" انہوں نے اپنی بیٹی سے بلند آواز میں کہا۔

"نظر لگ جاتی ہے۔"

ہا۔۔۔ لا۔۔۔ لا۔

اوپر سے پھر ایک زوردار نعرہ بلند ہوا تھا۔ نظر لگ جانے والی وہ اٹھا لائے تھے۔ کوئی ڈور کاٹی تھی۔ پتنگ لوٹی تھی۔

"ماشاء اللہ ساری رونق میرے نعیم کے دم سے ہے۔" وہ اپنی ذات میں گم مسکرائیں۔ بیٹے کی ماں ہونا بھی کچھ کم فخر کی بات تو نہیں۔

"امی! آپ بھائی کے پاس آ کر بیٹھیں نا!" ایک بیٹی اماں کو کہنی مارتی بولی۔

"لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔"

دلہن کے برابر انہیں بٹھاتے تو وہ اس مہارت سے بڑبڑائی کہ دلہن کے کان بھی لاعلم نہ رہ سکیں۔ مصلحت اسی میں تھی کہ محفل میں اس پر فخر کیا جائے تاکہ لوگوں کو زبانیں کھولنے کی جرأت نہ ہو۔ لیکن تنہائی میں اسے جتا دیا جائے کہ زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کوئی ایسی قابل ذکر چیز نہیں ہے۔

وہ مٹی کا مادھو درمیان میں بیٹھی تھی۔ زبان بند رکھے۔ ان کے گمان میں تو اس کے کانوں میں بھی ڈاٹ تھی۔ جب بھی کوئی تکلیف دہ بات اس کے کانوں کے قریب سے سرسراتی اس کا جی چاہتا کاش اس کے کان سننے سے عاری ہوتے۔ وہ گھنٹہ بھری ضبط کے ایسے مراحل سے گزری کہ اس کا دل ہر احساس سے خالی رہ گیا۔ تھوڑی دیر پہلے تک بائیں طرف دھڑکتا گوشت کا لوتھڑا منجمد برف میں تبدیل ہو رہا تھا۔ لیکن نہیں اسے گرنا نہیں۔ ٹھوکر کھانی ہے لڑکھڑانا بھی ہے لیکن پھر سنبھل کر اٹھنا اور روٹین میں شامل ہونا ہے۔

اب گھر میں گلابی چائے کا دور چل رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں تیز طرار کزنز سے ماں بیٹی نے جگہ بدل لی تھی۔ گویا فوٹو سیشن ہو رہا تھا۔ ابھی تک اس کا نہ باقاعدہ تعارف ہوا تھا نہ اس نے سب کی صورتیں دیکھی تھیں۔ لیکن جھکے سر کے ساتھ وہ ان سب آوازوں کو خوب پہچاننے لگی تھی۔ ان کے عزائم محسوس کرنے لگی تھی۔ بعض لہجے بھی اپنا چہرہ رکھتے ہیں۔ ورنہ مانوس ہوتے عمریں درکار ہوتیں۔

"تیری تائی تو جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔" اسی انداز میں انہوں نے جھک کر اپنی بیٹی سے کہا۔ "وہ کہیں رات ٹھہرنے کا ارادہ تو نہیں۔ میں کہاں اتنا بڑا ٹبر سنبھالتی پھروں گی۔ توبہ۔"

www. igestpk.blogspot.com

"آپ دلہن کا نام لیں نا! آپ کہیں دلہن تھکی ہوئی ہے۔ آرام کرے گی۔ ایسے کسی نے نہیں نکلنا۔ صبح سے بیٹھی بس کھا رہی ہیں۔"

"دیکھو دیکھو مگا دیکھو۔ سب سے بڑے مگ میں چائے لی ہے۔"

"بادام بھی میرے سامنے مٹھی بھر کر ڈالے ہیں۔ تائی! آپ ٹھیک سے چائے لیں نا!" اس نے اس کو اپنے قریب سے اٹھ کر کسی نامعلوم سمت جاتا محسوس کیا۔ غالباً "بڑے مگ والی تک۔

"صبر... صبر" اس نے خود کو تنبیہ کی۔ اس قسم کی منافقتوں کا تو عادی ہونا پڑے گا۔ گو ان جملوں سے مانوس ہونے کے لیے۔ اس کو عمروں کو مشق درکار تھی۔ اس نے اپنے سر کو نا محسوس بوجھ سے جھکتا محسوس کیا۔ مہمانوں کو ہانکا جا رہا تھا۔

رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا۔

اس کے اپنے گھر میں مہمان شاید کھانا وانا کھا کر سونے کی تیاری کر رہے ہوں۔ اماں پر کام کا بوجھ بڑھ گیا ہو گا۔ عبیر میں بھی بچپنا ہے۔ حالانکہ اسے فوراً "بڑا ہو جانا چاہیے۔ اس سے قبل کہ کوئی حادثہ اس کو رات و رات بوڑھا کر دے۔ اس کے کانوں میں ابھی تک رضا کے آخری جملے تازہ تھے۔ پتا نہیں یہ سب کچھ کہنے کا اس کا مقصد تھا بھی کہ نہیں۔ وہ ویسے ہی بے جان تودے کی طرح بیٹھی تھی۔ وہ آواز جو اسے پیچھے سے پکارتی تھی سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔

لوگوں کا خروش کم ہوتے ہوتے معدوم ہو گیا تھا۔ غالباً "دونوں خواتین مہمانوں سے نجات پانے میں کامیاب ہو ہی گئی تھیں۔ جب اس کو اپنے کمرے میں لے جانے کی ہدایت کی گئی اور آخری خواہش کے طور پر پوچھا گیا "کچھ چاہیے" تو اس نے حلق میں چبھتے کانٹوں کی کھبن کہیں اندر تک محسوس کی۔ پانی سے بھرے اس گلاس کی طرف ایک نظر دیکھا جس ... اندر صوفے پر بیٹھا اس کو خوفناک ... کہ لفظوں سے ... کوشش کی ... ضبط اور قوت برداشت کو آزماتے اس نے آنسوؤں کو وہیں خبردار کر دیا تھا۔ پتا نہیں وہ سب کون تھیں۔ موٹی، درمیانی، پتلی۔ بہت چالاک، کم چالاک، زیادہ چالاک۔

زندگی سے کیسے نباہ کیا جاتا ہے۔ اس نئے نظام میں کیا کیا رکاوٹیں پیش آئیں گی۔ اس کا سلیبس کیا ہے۔ ایسا سلیبس جس میں امتحان پہلے لیا جاتا ہے۔ سیکھا بعد میں جاتا ہے۔ یہ نہ کہیں تحریر تھا نہ کسی نے بتایا۔ جو الفاظ کبھی باضابطہ طور پر سوچے بھی نہیں گئے وہ بے جھجک ان کی زبانوں سے ادا ہو رہے تھے اور اس کی خاموشی ان کو شہہ دیے جا رہی تھی۔

پہلی دفعہ ہی اس کو اپنا یہ نظریہ ہوا ہوتا دکھائی دیا کہ فرد خاندان سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنے لوگوں سے کم برا ہو سکتا ہے یا زیادہ برا۔ لیکن اچھا نہیں ہو سکتا۔ ہاں اچھا لگ سکتا ہے۔

"ابھی تو بہت مہمان ہیں گھر میں۔ فارغ ہو لیں تو دیکھیں گے میسر پہ چلیں گے۔"

اس کا پہلا جملہ ہی بے زاری لیے ہوئے تھا۔ حالاں کہ اس نے تو کوئی فرمائش بھی نہیں کی تھی۔ وہ چت لیٹی ساری رات چھت کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بھی اس کو وہ نہیں لگا جو اسے ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ وہ وہی کچھ تھا جو دراصل وہ تھا۔ زندگی گزارنے کی منصوبہ بندی پا لینے کی خوشی عہد و پیمان۔

ان کا وقت آئے بغیر گزر گیا۔ درمیان رات میں کسی وقت جب اس کے سیل کی روشنی چمکی اور بجنے کے بجائے وہ بستر پر تھرتھرایا تو وہ تیر کی طرح فون جھپٹ کر باہر نکل گیا۔

چاند کی پتا نہیں کون سی راتیں تھیں لیکن اوپر والی منزل کے کمرے کے آگے بنی چھوٹی سی بالکنی میں وہ بند

شیشوں کے پیچھے سے اس وقت تک اسے باتیں کرتا نظر آتا رہا جب تک اس کی آنکھ غنودگی سے تھک کر بند نہیں ہو گئی۔

پھر رات بھر پیسے سوتی جاگتی گڑیا کی طرح ڈگر ڈگر پلکیں پٹپٹاتی رہی۔ اٹھا کر بٹھاؤ تو پٹ سے آنکھیں کھول دیتی اور لٹاؤ تو آنکھیں بند کر لیتی۔ بند آنکھوں میں بھی اس کی پلکیں تتلی کے پروں کی طرح پھڑپھڑاتیں ایسی کھل بند آنکھوں والی ایک گڑیا ابا کے کسی انکل نے اسے دی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا۔ اس کو کل کی گڑیا کہتے ہیں۔ اس میں کوئی چھوٹا سا میکنزم لگا تھا۔ اس کے اپنے نظام میں جیسے ساری مشین تتر بتر ہو گئی۔ بچی تھی تو صرف تھرتھراتی پلکیں۔

پلکیں جن کے پیچھے دو قیمتی موتی جانے کب سے اس نے سنبھال رکھے تھے۔ وہ ان ہیرے موتیوں کی قدر سے بے پروا کروٹ لیے بے خبر سو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اٹھ جا باتیں بنوائے گا۔ لوگوں سے؟"

صبح ہوتے ہی باگیں پھر سے اماں کے ہاتھ میں آ گئی تھیں۔ "چل ادھر جا کر میرے کمرے میں بیٹھ۔" وہ بہت دیر بے مہار پھر نا برداشت بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ "کچھ بات کرنی ہے تجھ سے۔"

پھر وہ اسی رنگروٹ کی طرف متوجہ ہوئیں جو نیا نیا پلاٹون میں شامل ہوا تھا اور متوحش تھا۔ جیسے رسے تڑا کر دوڑ جانا چاہتا ہو۔

"بات یہ ہے لڑکی!" انہوں نے اپنے حافظے کو ماتھے کے پیچھے کہیں ہتھیلی مار مار کر تلاش کرنا چاہا۔

"کیا نام بتایا تھا بھلا۔ ہمارے زمانوں میں تو لڑکیوں میں شرم و حیا ہوتی تھی۔ سارا گھر مہمانوں سے بھرا پڑا۔ دن چڑھا ... سوتی ... آپ میری بیٹی اور دیکھو ... صبح سے اٹھ کر مہمانوں کو ناشتہ دینے میں لگی ہے۔ تو جا ناں! کھڑا کیوں ہے۔"

حکم کی تعمیل میں تاخیر ضرور ہوئی۔ مگر انکار نہیں۔ اگلے ہی لمحے وہ باہر تھا اور اس سے اگلے ہی لمحے۔ اسی سرعت سے اس کے پیچھے والدہ محترمہ۔

اور اس کے لیے کیا حکم تھا؟ وہ باہر آئے یا اندر ہی ٹھہر کر اگلے حکم کا انتظار کرے۔ جاگتی گڑیا اب بے جان پلکیں کھولے بستر پر بیٹھی منتظر تھی۔

"بھائی ہمیشہ امی کے ساتھ ناشتہ کرتا ہے' وہ چلا گیا ہے۔ آپ ناشتہ کر لیں۔" میز گھسیٹ کر ناشتہ کی ٹرے اس کے بستر کے قریب لاتی وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"آج تو ہم آپ کو ناشتہ دے رہے ہیں۔ کل سے تو یہ سب آپ کو ہی سنبھالنا ہو گا۔ ہی ہی ہی۔ گھر کی مالکن تو آپ ہی ہوئیں ناں اب۔"

آنسو تو کہیں نہیں گئے تھے۔ وہیں ٹھہرے ہوئے تھے پپوٹوں کے پیچھے۔ پلکوں کی باڑ سے ٹکراتے۔ سہارتے اور واپس ہوتے۔ خبردار! پرائے دیس میں رسوا نہ کرنا۔ صبح سے ہی اس کو گھر کے آئین کی شقیں قسط وار پڑھائی جانی شروع ہو گئی تھیں۔

"ہم ہندوؤں کی طرح شور شرابے پر یقین نہیں رکھتے۔ ہاں ولیمہ سنت ہے۔ ہو گا تو ضرور شہرت کے بجائے سادگی سے ہو گا۔ لیکن زیادہ ضروری ہے دعا۔ لہٰذا پہلے درس ہو گا۔ ڈاکٹر صاحب کی شاگرد ہیں۔ وہ زوج پر درس دیں گی۔ اذکار و دعائیں خاص، تاثیر سے' دو مانگی جائے گی۔ پھر قہوے کا دور چلے گا۔ ہم لوگ تو اسی ولیمہ پر یقین رکھتے

www.edigestpk.blogspot.com

ہیں۔ آپ کی زندگی میں دخل نہیں دینا چاہتے تھے۔ ورنہ بارات کا فنکشن بھی سادہ ہوتا۔"
ان چھوئے ناشتے کی ٹرے واپس لے جاتے اعلان کمرے سے باورچی خانے تک ساتھ ساتھ منادی ہوتا گیا۔
کیونکہ وہ بولتی جارہی تھی اور چلتی جارہی تھی۔
"بھابھی بیگم کو سسرال میں پہلا ناشتہ پسند نہیں آیا۔ ہم تو ایسے ہی ہیں بھئی۔ سیدھا سادے لوگ۔"
"تمہاری امی میری امی سے ٹھیک طریقے سے نہیں ملیں۔" وہ تو سبق فرفر یاد کر آیا تھا۔
"امی نے تمہارے لیے خاص طور پر اپنے ہاتھ سے ناشتہ بنایا تھا۔ تم ان کی اکلوتی بہو ہو۔ ان کا دل رکھنے کے لیے ہی کچھ چکھ لیتیں۔"
درس والی مائی بھی جیسے تاک تاک کر اس پر ہی نشانے باندھنے آئی تھی۔
"عورت کا فرض مرد کو خوش رکھنا ہے۔ اس کے ہر حکم کی بجا آوری۔ بلا چون وچرا۔ اگر کوئی عورت ایسی حالت میں مری جس میں اس کا مرد اس سے ناخوش تھا۔ وہ سیدھی جہنم میں جائے گی۔" جہنمیوں کی بھی کمی نہیں۔ اس دنیا کے جہنم۔ اس دنیا کے جہنم۔ عورت کو تو ہر دو جگہ جلنے کی ہی نوید دی گئی ہے۔
جتنی دیر تقریر جاری رہی۔ ہر اہم نقطے پر گھر والے پلٹ کر اس کی طرف ایسے دیکھتے تھے گویا "سن لیا نا۔ اب جہنم میں جانا ہے تو مکمل کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی۔"
لمحے بھر کے لیے اسے لگا بات عورت کے فرائض کی نہیں۔ تنویر کے فرائض کی ہے۔ کیا ہم کسی کو ڈکٹیشن دے کر فقرے کے اصول بھی وضع کر سکتے ہیں؟

☼ ☼ ☼

"ایک نئی چیز شروع ہوئی۔ کہنی کے اوپر ایسا درد ہے کہ ٹیس مارتا ہے۔" گزشتہ رات سے گھر واپسی تک اماں کا جتنی مرتبہ نعیم سے سامنا ہوتا مرض سارے جسم میں بدلتا ایک سے دوسری جگہ دوڑتا دندناتا پھرتا تھا۔
غالباً "جس عورت کو شوہر کی حکم عدولی پر جہنم میں جانا تھا وہ محض تنویر تھی اس لیے اماں درس سے عدم دلچسپی لیے اپنے امراض سے آگاہ کرتی وقفے وقفے سے شوہر پر غراتی تھیں۔
"سن! رات کو وہاں ٹک نہ جانا۔ واپس گھر آنا۔ بہنوں والا ہے' کچھ حیا کر۔" ولیمہ ختم ہو گیا تھا۔ ابھی ہی کسی رسم کے مطابق جب وہ رات کے کھانے کے لیے میکے جارہی تھی تو چلتے چلتے ازراہِ احتیاط ایک اور نصیحت اس کے پلو سے لپیٹ دی گئی۔
"یہ بڑھیا کون ہے۔ ہر وقت ٹراتی رہتی ہے۔ نوکروں کو اپنے مقام پر رکھنا چاہیے۔"
بدقسمتی سے گھر میں گھستے ہی اس کا پہلا سامنا ہی کریم بی سے ہوا۔
"دیکھو' میں نے تم سے شادی کی ہے۔ میں نے تمہیں کہہ دیا تھا۔ میں تمہارے سارے خاندان کو برداشت نہیں کر سکتا۔ بلاوجہ گھور گھور کر دیکھتی ہے اور اس کو تم لوگ کچھ کہتے بھی نہیں۔"
اس نے حیرت سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ یہ تو اس نے کبھی نہیں کہا تھا۔
یا شاید کہہ ہی دیا ہو۔ اس کی تو آنکھیں اور کان دونوں بند تھے۔ شہریار اکثر اپنے مرشد کا بیان دُہراتا تھا۔ ہماری آنکھیں تب کھلتی ہیں جب بند ہونے کو ہوتی ہیں۔
ایسے ہی کسی ایک بند آنکھوں اور بند کانوں والے فیصلے کے دن رضا نے اسے رسان سے کہا تھا۔
"ذہین ہونے اور میچور ہونے میں بہت فرق ہے۔ تم ذہین تو ہو لیکن ایموشنلی سٹیبل نہیں ہو۔ تمہاری

بھابھی عمر کسی چار سال کے بچے سے زیادہ نہیں۔ تمہارا مطالبہ ہے ابھی ابھی۔ اسی وقت ڈوائٹ ناؤ۔"
اور تب اس نے وہیں کھڑے کھڑے اسی وقت رضا کو کنڈم کر دیا تھا۔ آج اس گھر میں قدم رکھتے اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی جذباتی عمر بھی سینکڑوں سال آگے نکل آئی تھی۔
راہداری ہو چکی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو اس کا دوسرا سامنا عبیر گروپ سے ہوا۔ وہ سب اس کے استقبال میں برآمدے میں کھڑے مسکراتے تھے۔ انہیں جیسے کسی سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اس کا جی چاہا وہ اپنی بہن کے گلے سے لگ جائے۔ اس کو اپنے لوگ کتنے پیارے لگے۔ وہ ان کو دکھ دے کر نکلی تھی۔ لیکن وہ اس سے دکھی نہیں تھے۔ دکھی تھے تو وہ جن کی خاطر اس نے اپنے گھر والوں کے سروں کے مینار پار کیے۔ وہ جھک کر رُک گئی۔ پتا نہیں وہ عبیر کو گلے لگاتی تو اس کو کیسا لگتا۔ اس کو لڑکا لوگ ابا کے کمرے میں لے گئے۔ گھر پلاؤ کی مانوس سی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اس نے پہچانا' دم کی یہ خوشبو بڑی تائی کے ہاتھ کی ہے۔
نعیم نے ابا کے کمرے کی طرف جاتے ایک نظر اس کے گروپ کی طرف دیکھا۔ فقرے پہ فقرہ اچھالتے وہ جیسے اس کی آمد سے شاد ہو گئے تھے۔
"بھائی مرائی۔" پھر اس نے اکتاہٹ سے پلٹ کر ذرا سی مدھم آواز میں اپنی بیوی سے کہا۔
"اب آئی ہو تو یہ قابلیت اور فلسفہ یہیں چھوڑ جاؤ۔ لڑکیاں معصوم اور سادہ اچھی لگتی ہیں۔ خرانٹ لڑکیاں مردوں کی ضرورت نہیں۔"
اس نے فیصلہ کیا وہ اپنا ماضی' اپنی پوری زندگی اپنے سب لوگ ایک گٹھری میں بند کر کے یہیں کہیں کسی کونے میں الٹ جائے گی۔ کم از کم یہاں سرمایہ محفوظ تو ہو گا۔ دانت نکالتی آگے بڑھی۔ شادی کا فیصلہ اس کا اپنا تھا۔ کسی اور کا ہوتا تو بھی وہ یوں ہی نصیب والی عورت کی طرح اٹھلاتی گھر میں اترتی۔
شکست کھا لینا اتنا تکلیف دہ نہیں جتنا شکست خوردہ ہونے کا اعتراف کرنا۔ کریم بی اس کو بار بار کھوجتی تھیں۔ اپنے ایک ایک عزیز رشتے دار سے ہنس ہنس کر ملتی دادی سے دعائیں لیتی۔ اماں کے سامنے کھل کر مسکراتی وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آئی۔ گھر والوں کو اس یقین کے حصار میں گھیر کہ اس پر دکھ کی کوئی واردات نہیں بیتی۔ وہ اپنا کمرہ دیکھنے آئی تھی۔ بڑی تائی نے ہنس کر کہا تھا۔ "ابھی کل تو تم گئی تھی بیٹا! آج ہی کمرے کے بنا اداس ہو گئیں۔"
کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر اس نے باہر جھانکا۔ اس کے آنگن میں ہلکی سردیوں کی مدھم چاندنی جھپک مار رہی تھی۔ بیل سے چمٹے آتشی پھول اسی طرح جگر جگر جھلملاتے تھے۔ جب وہ کل یہاں سے گئی تو چمکتے تھے سب کچھ وہی تھا۔ گھاس' دیوار' بیلیں' آسمان' چاند' ستارے۔
سب کچھ وہی تھا۔
گھر کے لان میں دونوں ہاتھ پشت پر باندھے شہریار تنہا واک کر رہا تھا۔ اس کو اچانک محسوس ہوا کمرے کی کھڑکی کے فریم میں جڑا تنویر کا چہرہ وہ نہیں تھا جو اس نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔ اپنے اعزاز میں ہونے والی خوش رنگ روشنی چھوڑ کر کمرے کی کھڑکی میں فٹ کچھ نامانوس سی لگی۔
"کیا ہوا تنویر؟" اس نے پیار سے پوچھا۔
آنکھ سے نکلنے کو بے تاب' بند باندھے آنسو' ٹپ سے ٹپکے اور آزاد فضا میں کہیں تحلیل ہو گئے امانت بہ امانت دار رسید!

☼ ☼ ☼

www.edigestpk.blogspot.com

جب مٹی کے مادھو کی طرح درمیان میں سجا کر اس پر تنقید کی جاتی۔ اس کی تربیت میں کیڑے نکالے جاتے مذہب سے دوری کے طعنے دیے جاتے تو وہ گونگے بہروں کی طرح کسی نہ کسی کام میں جت جاتی۔ ہر رات سونے سے پہلے ماں بیٹے کا ایک سیشن ہوتا۔ جس میں بیٹے کی تربیت کے ساتھ ساتھ بیٹے کے باپ کی بھی ٹریننگ ہوتی کیونکہ وہ دبے لفظوں اور ڈرے لہجے میں بہو کے دفاع میں بیان دیتے تھے۔ وہ سیشن سے واپس آتا تو اس کی تیوری چڑھی ہوتی۔ ہر رات ایک مخصوص وقت میں بجنے والی بیل پر وہ فون اٹھا کر دریچے میں کھڑا ہو جاتا۔ اپنی پشت پر دروازہ بند کر کے جس سے باہر کی کوئی بھنک اندر نہیں پڑتی تھی۔

کسی کزن نے ترس کھا کر اسے بتایا تھا۔

"اس کا ایک لڑکی کے ساتھ افیئر چل رہا تھا لیکن وہ لڑکی چچی کو پسند نہیں تھی۔ چچی کسی ایسے خاندان کی لڑکی لانا چاہتی تھی جو مشہور و معروف اور شریف ہوں۔ عزت دار ہوں ان کی ناموری ہی اس بات میں ہو کہ یہ اچھے خاندان کے لوگ ہیں۔ تمہاری بدقسمتی کہ تم ایک بھلے گھر کی لڑکی تھیں۔ چچی پیسے کی لالچی ہیں۔ لیکن ایک امیر گھر کی لڑکی پھانسنے کے بجائے انہوں نے اپنے بیٹے کو کسی شریف خاندان کے پیچھے کیوں ڈالا۔ یہ میں نہیں جانتی۔ ہاں یہ مجھے یقین ہے کہ تمہارا وہ شک کہ وہ لڑکی اب بھی فون کرتی ہو گی۔ غلط ہے کیونکہ ایسا کوئی لمبا چوڑا عشق تو تھا نہیں اور ویسے بھی آج کل لوگ شادیوں کو ضروری بھی نہیں سمجھتے اور میری مانو تو اس جھنجھٹ سے نکل آؤ۔ تمہارا شوہر کسی سے عشق کرنے کا اہل بھی نہیں۔"

اس کی تربیت اس ماحول میں نہیں ہوئی تھی جس میں ان مراسم کے لیے شادیوں کو غیر ضروری سمجھا جائے۔ وہ بیوی تھی اسی کے کمرے میں رہتی تھی۔ وہ دیکھتی تھی جب بھی اچانک وہ کمرے میں آجائے تو شوہر اپنے سیف دھاپ سے بند کر کے تالا لگا دیتا تھا۔ اس کے یوں اچانک چلے آنے پر خود سے بڑبڑاتا بھی۔

"تم کیا بلی کی طرح [illegible] آہٹ کرنے [illegible] آتی ہو۔"

"مجھے تمہارے رازوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے لیے تو تمہاری زندگی خود ایک تالا ہے۔" اس نے کہنے کی جسارت نہیں کی۔

اس نے بےزاری سے سوچا کیا ہو گا حد سے حد۔ چند بے ہودہ تصویریں۔ خطوں کا تو وہ زمانہ نہیں۔ شاید کچھ ہوں خط۔

پھر زندگی ایک اکھاڑے میں آگئی۔ وہ ہر روز ایک نئی پٹخنی کھاتی۔ ماں باپ نے اس کا کیا نام رکھا تھا اسے یہ بھی یاد نہیں رہا۔ اب اس کا شوہر اس کو بے وقوف کہہ کر بلاتا۔ ہنی مون پیریڈ شروع ہوئے بغیر ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی سے "جی اچھا" کے سوا ہر لفظ مٹا دیا تھا۔ "جن لوگوں کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا وہ بیٹیوں کو ایک ڈگری دے کر رخصت کر دیتے ہیں۔"

"عورت کی دانشوری کسی کام کی نہیں ہوتی۔ گھر چلانے کا ہنر سیکھو۔"

"M.A' Phd بے کار ہے۔ کچھ کر کے دکھانا ہے تو روٹی گول پکا کر دکھاؤ۔"

"میری بہنوں میں بیٹھو بات کرنے کا سلیقہ سیکھو۔"

"آئندہ تمہاری کوئی دوست اس گھر میں نہیں آئے گی۔ مجھے نفرت ہے ایسی شتر بے مہار لڑکیوں سے۔"

"تمہارے گھر میں کسی چیز کی روک ٹوک نہیں اسی لیے تم منہ اٹھا کر گلی کوچوں میں بھٹکتی پھرتی تھیں اب ہر ایسی جگہ تمہاری بہن نظر آتی ہے۔ آدھے دوست تو اس کے جیل سے ہو آئے ہیں اور یہ لڑکوں کو دوست بنانے کا کیا رواج ہے؟"

"کس قسم کا فضول M.A تم نے کیا ہے۔ اردو میں کرو "اسلامیات میں کرو۔"

"میری ماں کے درس میں بیٹھا کرو۔ تمہاری مذہبی تعلیم بہت ناکافی ہے۔" وہ انگلیوں پر وظیفے کی طرح ہدایات گنتی جاتی۔

☆ ☆ ☆

اس دن وہ کسی فنکشن سے واپس آیا تو اس کا چہرہ غصے سے بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ٹائی کھول کر بستر پر پھینکتے اس نے چلا کر کہا۔

"کون سی جگہ ہے جہاں تمہاری بہن موجود نہیں ہوتی۔ کسی کتاب کی تقریب رونمائی تھی۔ تمہاری بہن اور اس کی سہیلی آگے آگے۔ اس کی سہیلی کوئی اچھے کردار کی لڑکی نہیں ہے۔ دیکھو اس کو سمجھا دینا۔ اس کے بھلے کے لیے کہتا ہوں۔ لڑکی ہوتی کیا ہے۔ اس کا کام صرف اپنے شوہر کا دل بہلانا ہے۔ عورت کا مقام گھر ہے۔ اس کی حیثیت کارنس پہ سجے ایک گلدان کی سی ہے۔ اس کا کام شمع محفل بننا نہیں۔ چراغ خانہ بننا ہے۔ مگر تمہارے ہاں [illegible] کیے جاتے ہیں۔"

اس کی تلخی اور اپنی بات منوانے پر اصرار دن بہ دن تند و تیز ہوتا جا رہا تھا۔

سب کچھ چھوڑ کر وہ ایک عورت بن گئی تھی۔

وہی قاعدے والی عین سے عورت۔

کبھی کہیں کوئی ٹیس سر اٹھاتی بھی تو وہ دبا لیتی۔ اس کے گھر والے اس سے دور ہو رہے تھے۔ یا اس نے خود کوشش کر کے انہیں اپنے سے دور کر دیا تھا۔ کبھی کبھی بے بسی کی کیفیت میں اسے اپنے گھر والوں پہ غصہ آتا۔ وہ آج کی دنیا میں ناکام لوگ ہیں۔

کتنی مدت بعد اسے ثریا کی ایک بات یاد آئی۔ اس نے عثمان سے کہا تھا "تم لوگ اصحاب کہف ہو۔ غار میں [illegible] باہر نکلو تو تمہیں پتا چلے [illegible]"

چونکہ وہ لوگ دنیا سے نمٹنے کا ڈھنگ نہیں جانتے لہٰذا ساری دنیا سے الگ تھلگ شرافت کی چھتری میں دبکے بیٹھے ہیں۔ خود اس قابل نہیں تھے کہ چالاکیوں کا مقابلہ عیاریوں سے کر سکتے۔ اپنی اولاد کو بھی دنیا سے نمٹنے کا ڈھنگ نہیں سکھا سکے۔ حقیقی دنیا سے دور کتابوں میں گم سب اچھا اچھا پڑھ لیتے ہیں اور اچھا اچھا بول دیتے ہیں۔ وہ اچھا کہیں اس دنیا میں ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ انہیں اس کی پروا نہیں۔

اپنی عمر کاٹ کر بھی اس نے دنیا کا جو رخ اب دیکھا تھا وہ اس سے ہمیشہ نابلد ہی رہی۔

وہ گھر جاتی تو مضبوط بہادر اور سالم بنی رہتی۔ اپنے گھر میں ان دو آنسوؤں کے سوا اس نے کسی سے اپنا دکھ نہیں کہا۔ وہ جیسا چاہتا تھا وہ اس جیسی بننے میں لگ گئی۔

جب ثریا پیدا ہونے والی تھی۔ وہ ایم اے اردو کر چکی تھی۔ بے وقوف عورت کے لیے ایک اور ڈگری بائیں ہاتھ کا کھیل ثابت ہوا۔

اور جب وہ ابھی گود میں تھی کہ اسے کانٹریکٹ پر ایک ٹیچنگ جاب مل گئی۔

گھر کے ایک کونے میں تالا لگے گیراج میں ایک خفیہ گاڑی کھڑی رہتی تھی۔ جسے چلانے کی اجازت نہیں تھی لوگ دیکھیں کہ گھر میں دو گاڑیاں ہیں۔ خوامخواہ نظر لگا دیں گے۔ وہ گاڑی کو نظر بد سے بچانے کے لیے ابتدا" [illegible] سردی گرمی کالج جاتی رہی۔ پھر ثریا کو میکے چھوڑ کر جانا پڑتا تھا تو پرانی آلٹو اس کے استعمال میں آگئی۔ [illegible] بے شمار اٹھتے سوالوں سے کترانے کے لیے اس نے کوشش بھی کی۔ بچی دادی رکھ لیں یا پھوپھیوں کے پاس رہ جائے۔ لیکن انہوں نے صاف جواب دے دیا تھا۔

www.edigestpk.blogspot.com

"کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو الزام تراشی کون برداشت کرے گا بابا۔ پھر میں ٹھہری نماز تسبیح والی۔ بچہ تو وقت بے وقت پاک ناپاک کرتا ہی رہتا ہے اور مجھے سارا دن فرصت بھی کہاں ہوتی ہے؟"

ایک دو تین کافی دلیلیں ہیں جو آپ کو پسند آئے چن لیجئے۔

گلے ناراضی کے باوجود میکے والوں نے یہ بوجھ اٹھالیا اور یہ بار ان پر ہی آنا تھا۔ اس کے باوجود دونوں گھروں نے اپنے مابین ایک اجنبی سی دیوار تانے رکھی جس پر وقفوں اور زمانوں میں دو اینٹ اونچائی کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

اس نے بہت کوشش کی نعیم کو اسی طرح قبول کر لیا جائے جیسے گھر میں شامل ہونے والے باقی افراد قبول کیے گئے تھے۔ لیکن اس کے لیے واجبی سی بھی محنت نعیم نے نہیں کی نہ اس کے گھر سے اماں اور کریم بی کے سوا کوئی اس کی طرف سے کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ تنویر کی نرم طبیعت مزاج کی تلخی میں بدلتی چلی گئی۔ بے شمار ناجائز الزامات کے ساتھ آخر کار وہ اس پر چڑچڑی ہونے کا ایک جائز الزام لگانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔

زندگی میں اور کوئی تبدیلی آئی یا نہیں فرق پڑا تو اتنا کہ ان کے معاشی حالات آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگے۔ وہ چھوٹے گھر سے بڑے گھر اور سمن آباد سے ہائی ٹیک سوسائٹی میں شفٹ کر گئے۔ جگہ جگہ نوکری کرتے نعیم کا اب اپنا اخبار تھا اور اس نے اپنے جیسے کئی ملازم رکھ چھوڑے تھے۔ اس کا اگلا پروجیکٹ ایک نیوز چینل کا اجرا تھا جس میں سردست کچھ رکاوٹیں تھیں۔ وہ رکاوٹیں کیا تھیں کیونکہ وہ قابل اعتبار نہیں تھی اس لیے اس کو اعتماد میں نہیں لیا گیا۔

☆ ☆ ☆

پھر اس دن Al-Fatah سے گڑیا کے Pamper اٹھائے بل پے کرتے اسے سامنے کے شیشوں میں یکدم کسی شناسا وجود کا احساس ہوا۔ شیشے میں ڈولتا ہیولا کتنے برسوں بعد دکھائی دیا تھا۔ لمحے بھر کو اس کا جی چاہا نظریں کترا کر گزر جائے۔ وہ لوگوں کا سامنا کرنے سے اس طرح گھبرانے لگی تھی پھر جیسے اسے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ وہ گھوم کر پلٹی۔

"ہیلو ملیحہ۔" ملیحہ چونکی نہیں۔

ملیحہ نے اسے دوکان میں داخل ہوتے بھی دیکھا تھا۔ اپنی بیٹی سے جھنجھلا کر بولتے بھی۔ اس نے اس کے ہاتھوں میں اضطراب کی سی کیفیت بھی محسوس کی جو بل دیتے اور پیکٹ پکڑتے نمایاں نظر آ رہی تھی۔ اور تو اور اس نے یہ بھی دیکھا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے لیکن نظریں چرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ منتظر رہی۔ وہ کیا فیصلہ کرتی ہے۔ ملتی ہے یا اس سے کترا کر نکل جاتی ہے۔ وہ ایک مدت بعد آمنے سامنے ہوئے تھے۔ اور اسے کوئی گلہ نہیں تھا۔

روایتی لڑکیاں اپنی شادی سے بہت خوش ہوں اور مگن ہوں تو سب سے پہلے اپنی عزیز ترین سہیلی کو فراموش کرتی ہیں۔ وہ ایسی روایتی بھی نہیں تھی اور اس کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا بجھا بجھا سا دکھ اسے بہت مگن بھی نہیں بتاتا تھا۔

اس نے کسی سوال سے آغاز نہیں کیا۔ یہ زندگی ہے۔ سب آپ کی خواہش کے مطابق نہیں بھی ہوتا۔ اس نے سب کچھ اس پر چھوڑ دیا۔ وہ کیا پوچھتی ہے۔ کیا بتانا چاہتی ہے۔

"کہاں ہوتی ہو ملی؟" ایسے سوال عموماً یونہی سر راہ مل جانے والے لوگوں سے کیے ہی جاتے ہیں اس نے موقع دیا، رسمی سلام علیک کے بعد وہ وہاں رکنا چاہتی ہے یا نکل جانا چاہتی ہے۔ اس کو دونوں آپشن پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ جو بھی چن لے سو اس پر نے ٹھہر جانے کا آپشن چنا تھا۔

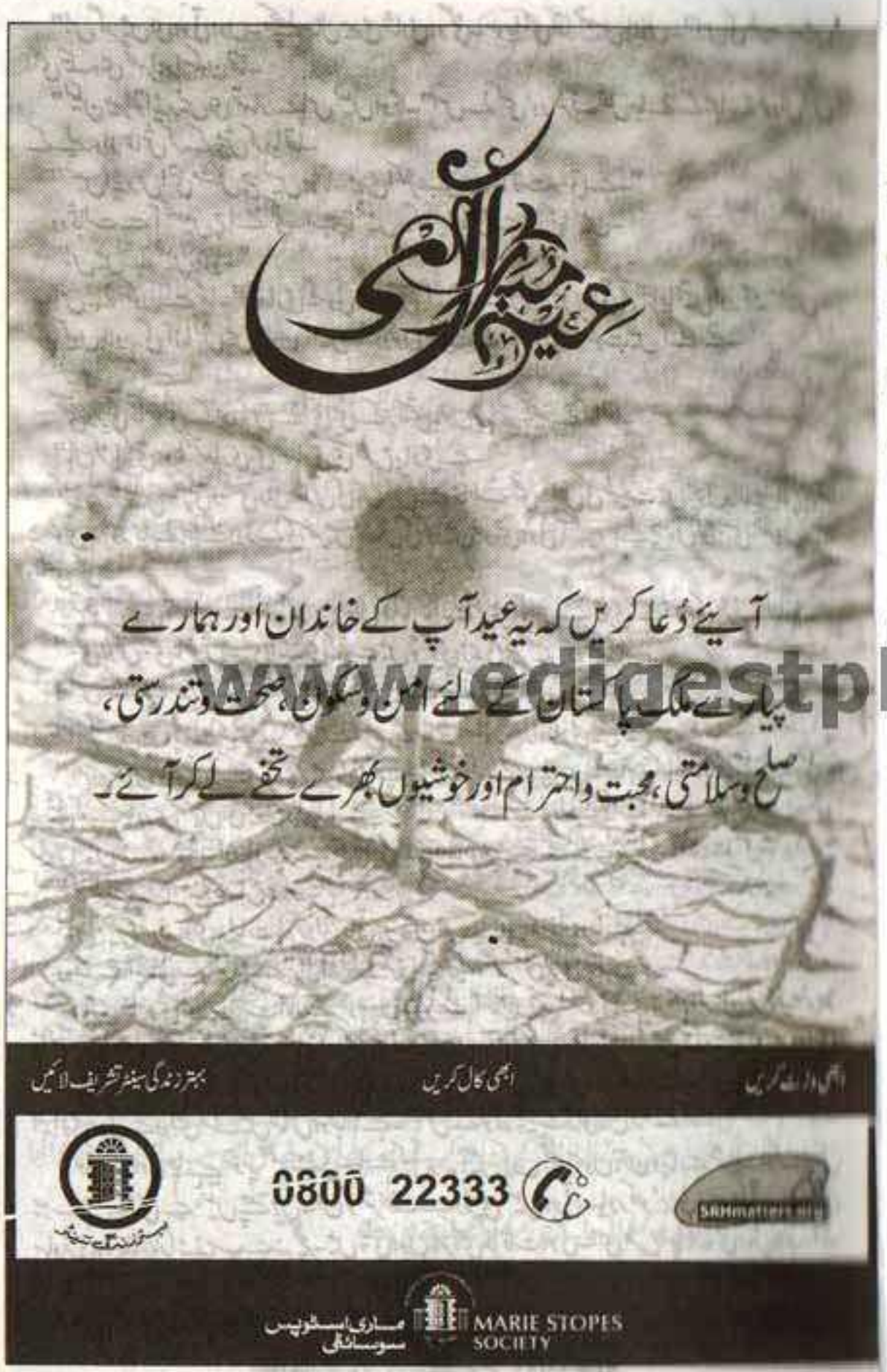

www.edigestpk.blogspot.com

"بس گھر میں ہی ہوتی ہوں۔ پچھلے سال میری شادی ہو گئی۔ سوچا بھی تھا تمہیں بلاؤں۔" اس کی طبیعت میں ابھی تک وہی ٹھہرا ہوا سکون تھا۔

"لیکن میرا تو ایڈریس ہی تمہارے پاس نہیں ہو گا۔" اس نے کسی اور طرف نکل جانے کے بجائے خود ہی اس کے لیے جواز تلاش کر کے پیش کر دیا تھا۔

"نہیں ایڈریس اتنی مشکل چیز نہیں ہوتا۔ میری اکثر عبیرہ سے ملاقات رہتی ہے۔"

وہ خجالت سے آنکھیں چرانے لگی۔ اب پتا نہیں وہ کیا کیا جانتی ہے اور کیا نہیں۔

"بس میں نے نہیں بلایا۔"

اس نے سکون سے کہا۔ "تمہاری یکسوئی میں فرق آتا شاید۔ میں تمہیں بلاتی تم آنا چاہتیں اور آنہ سکتیں۔ سوچا کیوں بلاوجہ کی آزمائش میں ڈالوں تمہیں۔" دونوں طرف کے مناظر جیسے سکوت میں آ گئے تھے۔

"یہ میری بیٹی ہے۔"

کتنی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے اپنی بیٹی کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرتے کہا تھا۔

"ہاں گڑیا لگتی ہو نا تمہاری بیٹی تمہاری ہی طرح پیاری ہے۔"

گڑیا پپڑ پلکیں جھپکتی دیکھتی رہی۔ اس کی ماں کس سے مخاطب تھی۔ اس کی طبیعت میں بچوں والا چلبلا پن تھا نہ شوخی۔ شور مچانے بھاگنے دوڑنے کی عمر میں وہ ماں کی گود میں سوچتی ہوئی آنکھیں لیے چیزوں کو اجنبی نظروں سے دیکھتی تھی۔

"تم خوش ہو ملی؟" اس سے قبل کہ اس سوال کا سامنا اسے کرنا پڑتا اس نے تیزی سے اس کی طرف الٹا دیا۔

"کبھی خوش کبھی ناخوش۔ کسی ایک ہی کیفیت میں تو آدمی زندگی بھر نہیں رہ سکتا نا۔"

وہ اس کے اپنے اندر تک جھانکنے والی نظروں سے بچنے لگی۔

www.edigestpk.blogspot.com

"اصل میں ہوتا پتا ہے کیا ہے۔" ملیحہ نے اس کے ساتھ اسٹور کی راہداری میں گھستے ہوئے کہا۔

"ہم دوسروں کو خوش رکھنے کے چکر میں اپنا آپ ملیامیٹ کرتے رہتے ہیں۔ بظاہر تو کہا جاتا ہے نیکی ہے لیکن یہ نیکی کرنے کا درس ہمیں ہی کیوں دیا جاتا ہے۔ کیا ہمیں نصیحت کرنے والے ثواب کمانے سے ماورا ہیں۔ خود کیوں نہیں کرتے وہ نیکی۔ اور یاد ہے جب ہم فارسی optional پڑھتے تھے۔ اس میں ایک حکایت تھی۔

"کم ظرف پہ اپنا احسان ضائع نہ کرو۔"

لیکن ہمیں صرف وہی ہدایات یاد کروائی جاتی ہیں جن میں دوسروں کا مفاد ہوتا ہے۔"

وہ کندھے اچکاتی بے فکری سے ٹرالی میں گروسری کے پیک ٹھونستی بولتی جا رہی تھی۔

"ہماری خاموشی اور برداشت ہمارے شوہروں کے لیے آسانیاں پیدا کر دیتی ہے۔ ہم اگر تن کر کھڑے ہو جائیں تو وہ بھی کسی مشکل میں تو پڑیں کہ کس کا ساتھ دیں۔ ہم انہیں بزدل بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے ظالم کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اب وہ ظالم چاہے اس کی بیوی ہو یا گھر والے۔ جس طرف سے تیر اندازی ہوتی ہے وہ اسی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔" اس نے ٹوتھ پیسٹ ٹرالی میں گراتے کہا۔

"کوئی وجہ ہونی چاہیے تو ہر ظلم سہنے کی۔ یا ہے کوئی وجہ؟ میں کیوں ظلم سہوں؟ ان کو پتا ہے شریف لوگ بزدل ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں چھیڑتے ہیں۔ ان کو شرافت سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ یاد رکھو 'بزدلی سے ہوتی ہے۔ ستی ساوتری ہو جانا ہمارا نہ مذہب ہے نہ کلچر۔ میں چلتی ہوں پھر کبھی ملاقات ہو گی۔ اسی طرح اچانک کئی سال بعد۔ اللہ حافظ۔"

وہ ٹرالی گھسیٹتی۔ کیش کاؤنٹر کے کیو میں کھڑی ہو گئی۔ نہ اس نے آنے کا وعدہ کیا۔ نہ ملنے کے لیے بلایا نہ اس کی

طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ اس کی طرف جا بھی نہیں سکی۔

وہ ہر طرف۔ راستے میں پھسلن بچھاتی چلی گئی تھی اور اس کو تو پھونک پھونک کر چلنا تھا۔

☼ ☼ ☼

سیف کے لاک میں چابی جھول رہی تھی۔ اتنے سالوں میں یہ لاپروائی پہلی دفعہ ہوئی تھی۔ اور وہ جب سے چابی کو سر زدہ سی ایسے دیکھ رہی تھی جیسے سیف سے کوئی پھن پھیلایا ناگ جھول رہا ہو۔

اس نے ہر چیز فنا کر دی تھی۔ لیکن اپنے اندر کی حاسد عورت کا گلا نہیں گھونٹ سکی۔ وہ شاید اپنی جنگ 'ہزیمت' برداشت کر لیتی اگر وہ اس شخص کو جس سے اس نے محبت کی تھی۔ کبھی خیانت میں مبتلا نہ دیکھ لیتی۔ وہ اس کی اس بے ہنگم کزن کی بات کو بھی بے اعتباری سے رد کر دیتی لیکن اپنی نظروں کا کیا کرتی۔

ہر روز وہ اس کو دیکھتی تھی۔ وہ چور نظروں سے اس کو دیکھتا اور موبائل لے کر اس کی پہنچ سے دور ہو جاتا۔ کبھی وہ اپنا فون خود سے جدا نہ کرتا بات کر کے کمرے میں واپس آتا تو سب سے پہلے call history صاف کرتا۔ وہ سوال نہیں کرتی تھی لہٰذا جواب بھی نہیں ملتا تھا۔

وہ اپنی سیف کی حفاظت بھی جان پہ کھیل کے کرتا تھا اور یہ حادثہ کبھی پیش نہ آتا۔ اگر بس وہ ٹرتی ہوئی یہ خبر لے کر نہ آتی کہ اماں حضور اس سے روٹھ گئی ہیں۔ کیونکہ وہ آفس سے واپس آ کر سیدھا اپنی بیوی کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ بیوی سے بہت دن کی خفا تھیں۔ جب سے انہوں نے اسے اسماء کے رشتے کے لیے کہا تھا اور بات آگے چلانے کے بجائے اس نے ایک گمبھیر چپ اختیار کر رکھی تھی۔ اور وہ جورو کا غلام دفتر سے آیا تھا اور سیدھا اس کے کمرے میں۔

www.edigestpk.blogspot.com

وہ ... تھی۔ ... اس کی چابی اٹکی رہ گئی اور وہ ... بھر میں ہوا ہو گیا تھا۔ ایک نظر اس نے کھلے دروازوں کی طرف دیکھا۔ اس کی شکایتوں اور نااہلیوں کے محاذ دیر تک چلیں شاید۔ وہ بھی اماں مشکل سے ہی مانتی تھیں۔

وہ چپ چاپ سیف کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ہاتھ لگانے کی ہمت اس میں اب بھی نہیں تھی۔ وہ جب بھی اس الماری کے پاس سے گزرتی۔ پہلو بچا کر نکلتی کیا ہو گا اندر زیادہ سے زیادہ۔ کچھ تصویریں۔ جہاں تک وہ اسے جانتی تھی یہ ہو وہ تصویریں۔ کچھ خط پھر بھی وہ ایک نظر اسے ضرور دیکھے گی۔ جس کا عشق اس کے سر سے ایک دوسرا عشق کرنے کے باوجود نہیں اترا۔

تو وہ حالت میں اس نے سر اندر ڈالا۔ پہلی نظر میں اسے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جس سے اس کے تجسس میں ٹھنڈ پڑتی۔ نہ تصویریں تھیں نہ رنگین کاغذوں پر لکھے خط سوکھے گجرے؟ نشانی کے طور پر دیے گئے چھلے؟ ان چیزوں کی آس میں اس نے اتنے آگ کے دریا پار کیے تھے۔ ان میں سے کسی ایک میں بھی اسے کامیابی نہ ہوئی۔ فائلوں کے انبار اور کاغذوں کے بوسیدہ ڈھیر کے سوا اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے الجھن سی ہوئی۔ وہ اتنی بے وقوف تھی کہ اسے ان کاغذوں سے بھی دور رکھا جائے۔ کیا ہو گا حد سے حد 'زمین جائیداد' پراپرٹی کے کاغذات یونہی خود پر جھنجلاتے الماری کے پٹ بند کرنے سے پہلے اس نے کسی بھی سبب کے بغیر ایک کاغذ اٹھا لیا۔

"اپنا ذہن سے وہ بات کہلوائی جائے جو ہم کہلوانا چاہتے ہیں۔"

پہلے پہل تو اسے حیرت ہوئی یہ "ہم" کون تھا اور کس قسم کی ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے صفحے کے مکمل

مندرجات میں جانے کے بجائے دوسرا صفحہ اٹھا لیا۔

"پریس کے ذریعے مایوسی پھیلائی جائے یقین دلایا جائے کہ ملک ڈوب رہا ہے۔"

"ہمارا ایجنٹ بات کرے گا۔ لیکن کوئی ایسی بات نہیں کہے گا جیسے براہ راست بات کرتا ہو۔ ایسے کہے کہ اتفاقاً" ہی کچھ کہا ہے۔"

"معمولی پوسٹ سے شروع کرو۔ جب تک اوپر نہ آجاؤ۔ ہمارا دیا ہوا پیسہ ظاہر نہ کرو۔"

"کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے جس سے ہمارا مفاد مجروح ہوتا ہو تو اس سے بڑا المناک حادثہ پیدا کیا جائے تاکہ لوگوں کو اپنی اپنی پڑ جائے۔"

"ظلم کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ اس لیے انتہا سے آگے کا ظلم کیا جائے۔ ہمارے اس Moto سے انحراف ممکن نہیں۔"

موٹی موٹی فائلوں کے انبار میں ڈوبے ہوئے ان کاغذوں پر یہ کیا لکھا تھا۔ کس طرف سے یہ حکم نازل ہو رہا تھا اور ان احکامات کا اس کے شوہر کے خفیہ لاکر میں کیا کام تھا اور انگوٹھی کی ڈبیہ جیسی مخملی پیک میں یہ ایک آنکھ کا ماڈل اس کے کس کام کا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ تینوں گھر میں داخل ہوئے تو عثمان اب تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ رضا نے ایک بار پھر فون ملانے کی کوشش کی۔ سروسز والی بی بی اپنی مشینی آواز میں کوک رہی تھی کہ پاور ڈ آف ہے۔

"کیوں مگر؟" عبیر نے تشویش سے پوچھا۔

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ تم نے خود ہی پریشانی کو فرض کر لیا ہے۔" رضا نے اپنی طبیعت کے مخصوص ٹھہراؤ سے کہا۔

"وہ جب کسی کام میں مصروف ہو تو فون آف کر دیتا ہے۔ اس نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ ہم لوگ اس کے بارے میں فکر مند ہیں اور اگر اس نے کہا کہ وہ فاروق سے مل نہیں سکتا تو تم جانتے ہو وہ ایسا ہی ہے۔ صاف گو دل کی بات کہہ دینے والا اور فاروق نے تو اس بات کا ہرگز بھی برا نہیں منایا تھا۔"

"لیکن آخر وہ فون کیوں نہیں کرتا؟" عبیر اس الجھن سے باہر نہیں آئی تھی۔

"از راہ کرم اپنی تشویش گھر کے بڑوں تک منتقل نہ کر دینا۔ ان کے امن میں خلل ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی ایک مفروضے پر۔ وہ جیسے ہی فون نکالے گا۔ پہلی کال ہمیں ہی کرے گا۔ وہ جانتا ہے وہ بہت دیر سے ہم سے آؤٹ آف ٹچ ہے۔"

"وہ جانتا ہے۔" عبیر جھنجلائی۔

"لیکن یہ نہیں جانتا ہمیں پریشان کر رہا ہے۔"

انہوں نے گھر میں قدم رکھا تو جاتی ہوئی دوپہر میں وہ ایک ایک کے کمرے میں جھانک آئی تھی۔ تمام افراد خانہ اپنی اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ کسی کے چہرے سے کسی پریشانی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن آخر وہ ہی کیوں ہراساں ہوئی جاتی تھی۔ ایسی کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ لیکن کہیں دل کے اندر کوئی کلاک ٹک ٹک کرتا تھا۔ جاسوسی فلموں کی طرح۔ جیسے ابھی کوئی بم پھٹنا چاہتا ہے۔

"نہیں اسے کچھ ہوا ضرور ہے۔" اس نے اپنے وہموں کو مزید ہوا دیتے سوچا۔

دادی اماں برآمدے والے تخت پر جہاں ابھی تک مری مری دھوپ آرہی تھی اپنی تسبیح تھامے کسی وظیفہ میں مصروف تھیں۔ دوپہر کے سونے والوں میں وہ سب سے دیر سے سوتیں اور سب سے پہلے اٹھ بیٹھتی تھیں۔ بڑی تائی کے غسل خانے سے چھما چھم پانی برسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اماں بے فکری کی نیند سو رہی تھیں۔ پاس رکھی ان کی کتاب سے قرینے سے سجا ہوا ٹیگ جھانک رہا تھا۔ جہاں تک انہوں نے پڑھ ڈالی تھی کہ جب آنکھیں کھلیں گی تو پڑھنا شروع کر دیں گی۔ چچا عبدالعزیز دودھ کی دیگچی سے اپنی کڑک چائے کے جھاگ اٹھا رہے تھے۔ وہ سر کے بل میں بھی جھانک آیا۔ ان کی ساری توجہ ٹی وی پر تھی۔ رضا کا سر اندر آتے انہوں نے دیکھا۔

"لوگ سڑکوں پر ہیں۔ لیڈرز زرداری آپ کا چیف جسٹس مجرم کی طرح نظر بند ہے۔ ڈاکٹر قدیر ہیرو ہونے کی سزا پا رہے ہیں۔ الیکشن کے بعد کوئی ایسا انقلاب آئے گا کہ ہم سب پر امید ہو جائیں؟"

"امید ہی تو رہتے ہیں ہم۔" رضا نے مہذب لہجے میں دروازے پر ٹھہر کر کہا۔

"مگر کیا کیا تھا گورے نے منگو کو چوان سے؟ قانون وہی ہے پرانا۔"

شام ڈھل رہی تھی۔ مغرب ہوا چاہتی تھی۔ عبیر کی وحشت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اگر سب صحیح تھا تو اس کے دل میں وحشت کا ابال تھمتا کیوں نہیں تھا۔ ان کی نظریں دروازے پر جمی تھیں۔ ابھی دروازہ کھلتا ہے۔ ابھی عثمان واپس آتا ہے۔ وہ اندر داخل ہو گا اور سارے بے بنیاد واہمے رفع ہو جائیں گے۔ اچانک دروازہ کھلا پھر واقعی ایسا ہوا۔

"آگیا۔" روکتے روکتے بھی عبیر کے منہ سے پھسلا۔

دروازے کے دونوں پٹ کسی نے ہاتھ مار کر چوپٹ کھول دیے تھے۔ باہر سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آنے کے ساتھ اندر آیا۔ کھلے دروازوں کے بیچ درمیان وہ کھڑی تھی۔ اپنی بچی کو سینے سے لگائے۔ اجڑی ویران حال۔ وہ لوگوں کی نظریں اس پر اٹھیں۔

کمرے میں موجود لوگوں پر سکتہ چھا گیا۔ کوئی جیسے اس سے سوال کرنے کو اٹھ بھی نہیں سکا۔ لوگ اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔

لڑکیاں اس حالت میں کب گھر آتی ہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

"کیا ہوا تھا؟" اماں کے حلق سے ڈوبی ہوئی آواز آئی۔

"وہ مجھے مار ڈالیں گے میں بھاگ آئی ہوں اب میں وہاں نہیں رہ سکتی۔"

رضا نے بڑھ کر گڑیا کو گود میں اٹھایا۔

"ادھر بیٹھو کون مار رہا ہے تمہیں!"

عبیر نے گلاس بھر کر پانی دیا۔ جسے وہ ایک سانس میں غٹ سے چڑھا گئی۔ دوسرے کمرے سے ابا ننگے پاؤں ہراساں اندر داخل ہوئے۔

"تم لوگوں نے ٹی وی نہیں لگایا۔ بے نظیر کے اجلاس میں پھر بم دھماکا ہوا۔ اس پر گولی بھی چلائی گئی ہے۔" ان کی نظر اپنی بیٹی پر پڑی اور وہ ساکت ہو گئے۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

www.edigestpk.blogspot.com

رفعت ناہید سجاد

چراغ آخر شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد' ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دورانِ تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آن لائن یونی ورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے' وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔

www.pkdigest.com

عبیرہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بدوجہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے' جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف اسپانسر مل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شومیں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے' جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے' اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان' شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے' جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا دیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۱۳
تیرہویں قسط

پاکستان کے سارے شہر شعلوں کی لپیٹ میں آگئے۔ ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ پاکستان میں آگ پہلی دفعہ نہیں لگی تھی۔ جب لاہور میں مارشل لاء لگا تھا۔ جب ایوب خان کو ہٹایا گیا۔ جب مشرقی پاکستان نے سوچا اس کے نام کا آخری نصف اس کے لیے بے کار ہے۔ جب نظامِ مصطفیٰ کے نفاذ کے لیے پاکستان کو بھسم کرنا ضروری سمجھا گیا۔

ادھر کراچی بار بار آگ اور خون سے کھیلتا ہے۔

اتنے آگ بجھانے والے نہیں آئے' جتنے لگانے والے آئے تھے۔ کوئی ڈائن ہے جو کلیجہ چباتی ہے۔

آزادی کے متوالے' غازی' جہاد' ٹارگٹ کلنگ' بم دھماکے' دہشت گرد پاکستان کی تاریخی ڈکشنری ہر عہد میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

جنرل ہسپتال کے سامنے مری روڈ آگ کی زد میں تھا۔ یہ وہ شہر ہے جہاں لیاقت علی کو گولی لگی۔ بھٹو کو پھانسی چڑھایا گیا اور ایک دھماکا اب تیسرے کو نگل گیا تھا۔ بعض شہروں کے نصیب میں خون ناحق لکھے ہوتے ہیں۔

لوگ شدید اشتعال میں آگئے۔ ان کے لیڈر کو مار دیا گیا تھا۔ یہ غم انہوں نے ATM کی مشین توڑ کر اس میں سے پیسہ نکال کر دور کیا۔ بیکری کے شیشے توڑ کر کیک پیسٹریاں کھائیں اور جاتے جاتے پل سے لے کر چاندنی چوک تک سب کو آگ میں نہلا گئے۔

اور یہ وہ خبر تھی جو آگ کی طرح نہیں پھیلی۔ آگ کو ساتھ لیے لیے پھیلی تھی۔

چینل ہنگاموں کی لائیو کوریج کررہے تھے۔ فضا میں کہیں گہری سوگواری تھی۔ اچانک کالی جینز اور سیاہ شرٹ میں ملبوس پلے' سوکھے ڈھانچے سے لڑکے نمودار ہوئے جو رات کی تاریکی میں پہچانے بھی نہیں جاتے تھے۔ ان

کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے' جو انہوں نے سر سے بلند کر رکھے تھے۔ وہ کسی گاڑی کے قریب ٹھہر کر ڈنڈا نیچے کرتے اور بڑی تن دہی سے اس وقت تک ضربیں لگاتے' جب تک شیشہ چھناکے سے چور نہ ہوجائے۔ ان کے چہروں پر نہ غم تھا نہ غصہ۔ وہ جیسے ڈیوٹی پر آئے تھے۔ کسی بھی گاڑی کی ونڈ اسکرین چکنا چور کرکے ادھر ادھر نظر ڈالتے کیا اور کوئی گاڑی آس پاس ثابت کھڑی ہے۔ پھر دشمن کی طرح اس پر کاری وار کرکے وہ اگلی گاڑی کی طرف لپکتے۔ ان کے پاس گویا کوئی ہدف تھا' جس کو پورا کرنا تھا اور کہیں کوئی رپورٹ کرنا تھی۔

جن پر اصلی غم ٹوٹا تھا وہ دکھ سے نڈھال تھے۔ ان کے ساتھ کیا گزر گئی یہ تو سمجھنے میں بھی ان کو زمانے درکار تھے۔

وہ سب کے سب ٹی وی کے سامنے دم بخود بیٹھے تھے۔ کیا ہونے والا ہے کیا ہوگا۔ بڑی تائی غیر معمولی آوازیں سن کر ننگے پاؤں بستر سے اتریں اور حواس باختہ سی بھاگتی آئیں۔ رضا دیوار سے ٹیک لگائے ایک ٹک ٹی وی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عبیر' حمیرا صورت حال کو سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔

سڑکیں بدامنی کا شکار تھیں اور اس بدامنی میں کہیں عثمان بھی غائب تھا۔ اس کی ڈھنڈیا پڑی اور شور مچا۔ معلوم کرو کہاں ہے۔ ٹھیک تو ہے۔ فون کیوں نہیں اٹھاتا۔ ان سب لوگوں نے خود کو چور محسوس کیا۔

ملک میں حالات پھر بگڑ رہے تھے۔ سر عباس کی پیشانی پر موٹی سی رگ پھڑپھڑانے لگی تھی۔ انہوں نے حالات کو بار بار بگڑتے دیکھا تھا۔ وہ اپنے دو بچوں کو بھی ساتھ ساتھ غیر محفوظ دیکھ رہے تھے۔ وہ جو باہر رہ گیا تھا اور وہ جو اندر آگئی تھی اور جب سے آئی تھی ایک بے ربط اور بے معنی جملے کے سوا اس نے کچھ نہیں بولا تھا اور وہ جملہ کیوں بولا تھا اس کی وضاحت بھی اس نے کسی کو نہیں دی تھی۔

ہم بھی بڑے بھولے لوگ ہیں دیواروں کے پیچھے بند دروازوں میں جب تک خود حفاظت میں رہیں' دشمن میں گھرے لوگوں کے خوف سے بے خبر ہوتے ہیں۔

سر عباس ریموٹ ہاتھ میں پکڑے ایک چینل سے دوسرے چینل سرفنگ کرتے دنیا گھوم آئے۔ امن کہیں نہیں تھا۔ ہر اسکرین بھڑکتے شعلوں کی فوٹو گرافی سے بھری ہوئی تھی۔

اماں کو لگا یہ آگ ٹی وی سے نکل کر ان کے گھر تک آگئی ہے۔

وہ جب سے آئی تھی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی خاموش بیٹی کریم بی کی گود میں چلی گئی۔ اس ننھی جان کے چہرے پہ بکھری وحشت بتاتی تھی کہ وہ جانتی ہے کہیں کچھ غلط ہے۔ کتنا غلط ہے اور کہاں کہاں غلط ہے یہ جاننے کی بھی اس کی عمر نہیں آئی تھی۔

پانی کا گلاس اس نے ایک سانس میں ختم کرلیا تھا۔ پتا نہیں وہ کس چیز پر آئی تھی۔ رکشہ سے یا پیدل بھاگتی ہوئی۔ وہ اس بری طرح ہانپ کیوں رہی تھی۔

اماں نے بے بسی سے ایک طویل سانس کھینچا۔ اس کو یوں سر جھکانے کی تربیت تو نہیں دی گئی تھی۔ لیکن ہم ساری کی ساری قوم بس ظلم سہتے رہنے کی عادی ہوگئی ہے۔

کسی بے قرار روح کی طرح وہ اپنی کرسی سے اٹھیں۔ لوگوں کو خبروں میں اور خود اس کو اپنے آپ میں مگن چھوڑ کر وہ لاؤنج سے باہر آگئیں۔ کیلری سے نکل کر جالی والے پردے کی کھڑکی سے انہوں نے باہر برآمدے کی طرف جھانکا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔

"کس قدر لاپروا ہے یہ لڑکا۔"

بڑی تکلیفوں سے انہوں نے اپنے ذہن کو ایک کم تکلیف کی طرف مبذول کرلیا۔ دروازہ کھول کر وہ موڑھوں

www.pkdigest.com

والے نصف قطر کی شکل کے برآمدے میں چلی آئیں۔

آپائی نے رضا کی طرف دیکھا۔ اس کی مرضی کیا ہے۔ ان کی نظریں اس میں صرف یہی کھوجتی تھیں۔ عثمان کی خیریت پتا لگے' کوئی اس کی تلاش میں جائے' یہ تو وہ خود بھی چاہتی تھیں۔ لیکن گھر کی پناہ سے نکل کر وہ ان جنونیوں کے ہتھے لگ جائے' جو ہاتھ آئی ہر چیز کو برباد کر رہے تھے۔ اس کی اجازت وہ کبھی نہ دیتیں۔ مگر وہ وہی کرے گا جو وہ چاہے گا اور ان کو بھی قائل کر ڈالے گا۔

رضا اٹھ کر ان کے پیچھے گیا۔ کہیں وہ باہر تو نہیں نکل رہیں۔

لیکن وہ باہر نہیں نکلی تھیں۔ بھربھراتی ہوا میں' برآمدے میں کھڑی' تاریکی میں وہ جیسے کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ پیچھے چچا عبدالعزیز کے کوارٹر سے آتی ایک دھیمے پاور کے بلب کی ناکافی روشنی گیٹ تک کے راستے میں ملگجی سی چمک پھیلا رہی تھی۔ ورنہ ہر سو مایوسی بھرا اندھیرا تھا۔

وہ جس کو دھماکے سے اڑا دیا گیا۔ کسی کی بیٹی تھی اور ان کی اپنی بیٹی کہتی ہے' اس کو مار دیا جائے گا۔

تاریخ میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ دنیا کے اہم لوگوں کو پسند نہیں آتا۔ پھر واقعات میں اپنی مرضی کا ردوبدل کرنے کے لیے ہم قانونِ قدرت اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ رضا خاموشی سے ان کے برابر آ کھڑا ہوا۔ وہ جانتی تھیں کہ اس محفل سے ان کی کھوج میں اٹھ کر کوئی آیا تو رضا آئے گا۔

"لائٹ آن کر دوں؟"

اور منظوری لیے بغیر باہری برآمدے کے ماتھے پر بلیو بیلز کی طرح جھکے لیمپ کا بٹن وہ دبا چکا تھا۔

"ہر طرف کیسا عجیب سناٹا ہے۔"

اماں نے پڑوسیوں کے گھروں میں جھومتے تین آور درختوں کی طرف دیکھا۔ کھمبوں کی روشنی میں درختوں کے ڈولتے سائے جیسے ان کے آنگن میں چڑیلیں رقص کرنے اتر آئی ہوں۔

اندر فون مسلسل بج رہا تھا۔ لوگ لوگوں کی خیریت معلوم کر رہے تھے۔ سب ٹھیک ہے نا! ہاں سب ٹھیک ہے۔ حالانکہ کچھ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ سب کا سب غلط تھا۔

"مجھے اسی دن کا ڈر تھا۔" اماں نے بغیر کسی کو مخاطب کیے جیسے کاہی گھاس سے کہا تھا۔

"ہاں مگر اس دن کو لانے میں اس نے بہت دیر لگا دی۔" رضا کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"وہ یہ کیوں کہتی ہے کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" اماں اور ایک سہم بھرا ارتعاش۔

"وہ کہتی ہے تو اس میں کوئی سچائی ہی ہو گی۔ بہرکیف اب وہ گھر کی پناہ میں آ گئی ہے اور فی الحال ہم اس سے کوئی سوال نہیں کریں گے۔ جب تک کہ وہ خود کچھ نہ بتا دے۔"

"میرا دل پریشان ہے۔"

"میرا دل کہتا ہے پریشانیاں ختم ہونے کو آئیں۔"

اماں نے اس کی طرف دیکھا۔ کتنے بے شمار واقف لوگوں میں اگر کسی سے ان کے دل کو ڈھارس ہوتی تھی تو وہ یہی ایک لڑکا تھا۔ بچے ان سے فاصلوں پر تھے۔ اپنی اپنی دنیا میں مگن۔ بظاہر ایک دوسرے سے کوئی گلہ بھی نہیں تھا۔

شوہر تاریخ کا ایک ورق' دکھ سکھ میں شراکت کیا ہوتی ہے' وہ اس کے قائل ہی نہیں تھے۔ وہ کبھی کسی ایسی محفل میں بھی شریک نہیں ہوئے جہاں خاندان ایک یونٹ کی طرح بیٹھ کر ہنسی مذاق کرتا ہو' ایک دوسرے سے اپنا دکھ کہتا ہو۔ وہ درمیان میں آتے بھی ہیں تو لیے دیے انداز میں۔ نہ وہ کھلتے ہیں' نہ ان کے ہوتے کوئی کھل سکتا ہے۔ وہ تو کھانے پر بھی بہت ہی کم آتے تھے۔

یہ قوموں کی تاریخ لکھنے والے گھر کے جغرافیہ سے کیسے بے خبر رہ سکتے ہیں۔ کتنی دفعہ ان کا جی چاہا' وہ تنویر کا قصہ لے کر ان تک جائیں۔ اپنے اندیشوں اور واہموں کا اظہار کریں لیکن وہ ہر دفعہ یا تو کچھ پڑھتے ہوئے پائے گئے یا ساتھ بیٹھے وجود سے قطعی بے خبر دنیا بھر کی خبروں میں گم ملے۔

ان کے دل میں کبھی کبھی شدت سے خواہش اٹھتی کاش! وہ کوئی چینل ہوتیں ان کو سنا تو جاتا۔

لیکن ان کو انا توجہ کی بھیک مانگنے سے جھجکتی تھی — زیادہ سے زیادہ کیا پڑے گا ان کے کشکول میں۔ وہ ڈی ڈی میوٹ کر دیں گے۔ بے دھیانی کی سی کیفیت میں سر ان کی طرف گھمائیں گے لیکن بالکل بھی متوجہ نہیں ہوں گے اور دل میں خواہش کریں گے کہ جو کچھ اس عورت کو کہنا ہے وہ جلدی کہہ ڈالے۔ ایسا نہ ہو' وہ ڈاکٹر شاہد مسعود سے بازی لے جائیں۔ ایسے میں ان کو صرف یہی سوجھتا' چپ چاپ ان آوازوں کی طرف متوجہ رہیں جو اس کمرے میں گونجتی ہیں۔ دل کی آواز کا گلا دبا کر۔ سر عباس کا بھی گھر کے فیصلوں میں بھی عمل دخل نہیں رہا تھا۔ وہ خود بخود ہو جاتے تھے۔

جب دادی اماں رہنے کے لیے آئیں تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ ایسی بھلی بی بی باقی بیٹوں پر کیسے بھاری پڑ سکتی تھی۔ بڑی خاموشی سے ان کو ضرورت کی ہر چیز مہیا کر دی گئی۔ ان کے تخت' ان کو مرضی کی خوراک' ان کی نیند کے مقررہ اوقات۔

پھر ایک دن اچانک ثمین کے بکسے سمیت بڑی تائی آ گئیں۔ اماں کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ایسی باتوں پر بہوئیں عموماً ناک بھنویں چڑھاتی ہیں۔ وہ خوش ہو گئیں' کوئی ہم نوا ملا جس سے وہ فرصت کے لمحات میں لمبی لمبی گپیں ہانکتیں اور اپنے پڑھے ہوئے ناولوں کی کہانیاں سناتیں۔ پھر جب وہ خود اپنا بوریا بستر سمیٹ کر کچھ دن کے لیے کسی اور گھر کی طرف چل دیتیں تو وہ اداس ہو جاتیں۔

اسی طرح ایک دن سر عباس اپنے بھائی کے بیٹے کی انگلی تھامے گھر میں داخل ہوئے' جو بے چارہ ان کی طرف سہمی' خوفزدہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ پھر وہ تصویریں جنہیں کوڑے کا ڈھیر سمجھ کر ردی اخباروں کے ساتھ باہر ڈال دیا

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

شائع ہو گئے ہیں

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو — راحت جبیں — قیمت: 225 روپے

☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں — فائزہ افتخار — قیمت: 500 روپے

☆ محبت بیاں نہیں — لبنیٰ جدون — قیمت: 250 روپے

خوبصورت سرورق
خوبصورت پیشکش
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

www.pkdigest.com

گیا تھا اور سر عباس وہاں سے اٹھا لائے تھے۔ سنہری فریم کروا کر نہایت عقیدت سے دیواروں پر چپکانے والی بھی وہی تھیں۔

ہر قسم کے شکوے بھی انہوں نے ہی سنے۔ بڑی تائی یہاں خوش نہیں ہیں۔ شہریار کو تو انہوں نے نوکر کی طرح گھر میں رکھ رکھا ہے۔ باہر کا سودا سلف لانے کے لیے اور دادی بے چاری کی کیا حیثیت ۔۔ انہوں نے تو مایوس ہو کر تخت کا سہارا پکڑ لیا ہے۔

وہ کسی الزام کی تحقیقات کے لیے اس کے پیچھے نہیں گئیں۔ سچے تھے یا جھوٹے۔ سچ مچ کسی نے کہا تھا یا مزا لینے والوں نے اڑایا تھا۔

ان کے شوہر کی دلچسپی کوئی تھی تو اپنے خاندان کی آبیاری۔ انہیں گھر میں مکمل سکون چاہیے تھا۔ جو انہیں مل رہا تھا۔ اتنے اعلا استاد۔ اتنے اچھے باپ اتنے صالح انسان۔

ایک دنیا ان سے محبت کرتی ہے۔ ان پر جان چھڑکتی ہے۔ لیکن کبھی کسی نے غور نہیں کیا ان کو اتنا اچھا انسان بنائے رکھنے میں کس کا عمل دخل تھا۔

ان کی مرضی کا کھانا۔ ایک علیحدہ کمرہ' پڑھائی لکھائی کے لیے پُرسکون ماحول گھر کے ہر جھمیلے جھنجھٹ سے آزاد۔ حسبِ خواہش سونا اور جاگنا۔ بچوں کی ذہنی آزادی اور اپنے اپنے معاملات میں ان کا اختیار کون سا ان دیکھا ہاتھ آخر ان سب کو نظم و ضبط میں رکھے ہوئے تھا۔

کیا اس ان دیکھے ہاتھ کا دماغ بھی ہے اور دل بھی یا اس کو صرف گھر کا حکمران بنا کر تنہا کر دیا گیا ہے۔ کوئی اس کا شکریہ ادا کرنے بھی نہیں آتا۔

اماں برآمدے میں پڑے موڑھوں میں سے کسی ایک پر ٹک گئی تھیں۔ وہ وہیں ستون سے ٹیک لگائے سیڑھیوں پر پاؤں پھیلائے دراز ہو گیا۔ باہر سناٹا تھا اور نیم اندھیرا۔ ایک مکمل ٹھہراؤ کی سی کیفیت۔ جیسے دنیا میں کہیں کچھ نہیں ہو رہا۔ آسمان پر ستارے جھلملاتے ہیں۔ درخت ہلکی ہوا کے جھونکوں سے سرسراتے۔ یہ کیسا عجیب دیس ہے۔ کوئی باہر بیٹھا ٹی وی دیکھے تو اسے لگے پاکستان کی گلی گلی گولیاں چل رہی ہیں۔ چپے چپے پر آگ لگی ہے۔ روم جل رہا ہے نیرو بیٹھا بانسری بجاتا ہے۔

اور عثمان بھی ان کالے کپڑوں میں ملبوس سوکھا لڑکا نہیں ہے' جو ڈنڈا اٹھائے گاڑیوں کے شیشے توڑنے کی ڈیوٹی دیتا پھر رہا ہو گا۔ لیکن اس نے گھر اطلاع نہ دے کر غیر ذمہ داری کا مظاہرہ ضرور کیا۔ وہ یقیناً "جہاں ہے اس آگ سے محفوظ ہے۔ لیکن پھر آخر کس آگ میں جل رہا ہے۔

"اماں!" عبیو نے سر باہر نکالا۔ اس کا چہرہ اطمینان سے تمتما رہا تھا۔

"عثمان کا فون ہے۔"

اس کے ہاتھ میں اماں کا موبائل تھا۔

"کسی اور فون سے بات کر رہا ہے۔ اپنا فون کہیں گرا بیٹھا ہے۔"

بعض اوقات ہم ایک دم خوش ہو جائیں تو خوشی پر ناراضی حاوی ہو جاتی ہے اماں نے اسے بری طرح جھڑکا۔

"کیا ہو رہا ہے شہر میں اور تم بے خبر بیٹھے ہو۔"

"اماں' اماں!" اس نے اچانک گرجتی برستی اماں کو رسان سے ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"میں شہر میں نہیں تھا اور اتفاق سے مجھے خبر بھی نہیں ملی۔ لاہور پہنچا تو اطلاع ہوئی یہاں فسادات ہو رہے ہیں۔ راستے بند' گھر نہیں پہنچ سکتا۔ پیٹرول پمپ بند کر دیے گئے۔ دیکھا تو فون غائب۔ یاد پڑتا ہے کہ پتلون کی جیب میں ڈالا تھا۔ پر نہیں ہے۔ جگہ جگہ دکانیں اور گاڑیاں جل رہی ہیں۔ ایسی لاقانونیت کبھی نہیں دیکھی۔" اماں

نے گہرا سانس لیا۔

"تم نے نہیں دیکھی بیٹا! ہم نے تو بار بار دیکھی ہے۔"

پھر وہ رضا سے بات کرنے لگا۔

"یونہی مجھے خیال آیا ڈوک کی نہر کی طرف چلتے ہیں۔ میں رائے ونڈ کی طرف نکل گیا۔ اچھا ہوا تم سب اکٹھے ہو۔ کوئی پریشانی والی بات تو نہیں۔" جمال کا حال بھی پوچھا۔

"جمال کا حال کیا پوچھنا۔ جب لال مسجد والا واقعہ ہوا۔ ہم نے پریشانی میں اس کی خیریت پوچھی۔ بولا مجھے کیا ہونا ہے۔ نہ میں لال مسجد کے اندر نہ باہر اور مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے' عثمان میں تمہاری تلاشی لوں گا تو فون برآمد ہو جائے گا۔"

رضا نے موبائل بند کرتے خود سے سوچا۔ سچ بول دیتا تو کیا حرج تھا اور نہر کی طرف کیوں جا نکلا' کون جانے ہم نے بھی کون سا بور اچ بولا۔

دونوں کی گفتگو میں تنویر کے آنے کا ذکر سرے سے غائب تھا۔ اس طرح ہمیں لگتا ہے حادثے کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔ ریت میں سر دے کر۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" اماں کو وہم ہوا کوئی بات تھی' ضرور جو ان سے چھپائی گئی۔

"کہتا تھا ایسے حالات زندگی میں کبھی نہیں دیکھے۔" اماں نے ایک گہرا سانس لیا۔

"تم نے نہیں دیکھے بیٹا! ہم نے تو بار بار دیکھے ہیں۔"

انہوں نے رضا کو موبائل واپس پکڑاتے اسی بے اطمینانی سے چاروں طرف دیکھا۔

"ایوب خان کیوں آیا تھا مجھے نہیں پتا۔ میں کبھی ہسٹری کی طالب علم نہیں رہی اور اتنی بڑی بھی نہیں تھی کہ سمجھ سکتی۔ ہاں جب وہ گیا پاکستان میں ایک نیا راستہ کھول گیا۔ امن و امان کا یہ عالم تھا کہ ٹریفک پولیس والے بھی ڈیوٹی پر نہیں آتے تھے۔ دکانیں بازار سنسان ہو گئے۔ کوئی بے چارہ معاش سے تنگ آ کر کھولتا بھی تو ڈنڈے مار مار کر دکان کا کچومر نکال دیا جاتا۔ ٹریفک سگنل بھی بس دو چار ہی ہوتے تھے ان بے چاروں کی بھی گردن مروڑ دی تھی۔ کوئی سڑک' کوئی بازار ایسا نہیں تھا جہاں تباہ کاری کے اثرات نہ ہوں۔ اسکول اتنی مدت بند رہے کہ بچے پڑھنا بھول گئے۔

بندوق کے زور پر آنے والے عموماً" بندوقوں کے زنگ کھا جانے کے بعد بھاگنے کی کرتے ہیں۔ وہ بلاوجہ اقتدار پر آ بیٹھا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو دھوکا دے کر سیاست دانوں کو عمر بھر کے لیے سیاست سے محروم کر کے' یہ بھی عجیب بات ہے' جب اہلِ اقتدار مخالفین کے لیے عمر قید تجویز کرتے ہیں تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کے اپنے اقتدار کی عمر کتنی ہے۔

پھر الیکشن کروایا۔ بی ڈی ممبرز بنے۔ جوڑ توڑ' ان سازشوں نے قائدِ اعظم کی بہن کو ہرا دیا۔ الیکشن کے اس سلسلے کے بعد گمان تھا کہ لوگ ایوب خان کو الٹ کر رکھ دیں گے مگر پھر جنگ بھی ہو گئی۔

اور یہ عجیب بات ہے۔ جب کوئی بڑی بات ہونے والی ہوتی ہے تو کوئی اس سے بھی بڑی بات ہو جاتی ہے۔ جس سے لوگ پچھلی بات کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پتا نہیں لیکن ایسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔

میں بہت چھوٹی تھی لیکن جنگ کو کھیل کی طرح لیا جا رہا تھا۔ ہم جنگ جیت گئے۔ لیکن ہماری تاریخ اتنی مرتبہ لکھی گئی اور اتنے ملکوں میں لکھی گئی کہ اصلی واقعات کہیں اس انبار میں دب کر رہ گئے۔ اب لوگ پوچھتے ہیں۔ ہم جنگ جیتے تھے یا نہیں۔ لیکن اگر ہم جیت نہ رہے ہوتے تو کبھی جنگ بندی کی قرارداد پیش نہ ہوتی اور نہ ہی سب بڑی طاقتیں مل کر یہ جنگ بند کرواتیں۔ جنگ ہار کر دشمن نے اپنے امن پسند ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا۔ اس

www.pkdigest.com

وقت لوگ اس طرح نہیں سوچتے تھے۔ دشمن دشمن ہوتا ہے۔ وہ دوست نہیں ہوتا۔ جب وہ ہمارا دشمن ہے تو ہم خود بخود دشمن ہوئے۔

پھر ہم نے دیکھا کہ سب نے تاشقند میں بیٹھ کر اس جیتی جنگ کو ہار دیا۔ ہم اچھے جواری نہیں ہیں۔ جب میز کے گرد بیٹھتے ہیں تو ہار کر ہی اٹھتے ہیں۔ لوگ ایوب خان کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔ بھٹو صاحب ہیرو تھے۔ لوگ ان کی یو این او کی تقریروں کے متن پڑھتے اور سر دھنتے تھے۔ اخباروں سے تصویریں کاٹ کر کاپی میں چپکاتے جو ہماری البم کی جگہ تھی اور جہاں ہم پہلے وحید مراد اور شمیم آرا کی تصویریں چپکایا کرتے تھے۔ کیونکہ تب حکومت حکمرانوں کے پاس تھی۔ عوامی رائے نامی کوئی چڑیا بھی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ حد سے حد کبھی کسی واقعہ پر کوئی ہجوم اشتعال میں آجاتا۔ صبح نکلتا تو شام تک گولیاں کھا کر ٹھنڈا ہو کر بیٹھ رہتا۔ ٹیں ٹیں فش۔

بھٹو صاحب نے ٹرین سے سفر کیا۔ تو بڑے بھائی جو اس وقت کی یوتھ (نوجوان نسل) تھے اسٹیشن پر جمع ہو گئے۔ انہوں نے اس معاہدے کے خلاف استعفیٰ دیا تھا۔ یہ پہلی بات تھی جو عوام چاہتے تھے اور حکمرانوں نے کی۔ 'وہ جذباتی آدمی تھے۔ تم لوگ تو جذباتی ہونا کمزوری سمجھتے ہو لیکن ہم سب جذباتی ہوتے تھے۔ وہ روئے اور انہوں نے جس رومال سے آنسو پونچھے' وہ وہیں نیلام ہو گیا۔

بھائی جان یہ بات سناتے رونے لگے اور میں بھی رونے لگی۔ وجہ نہیں معلوم۔ پھر ایوب خان نے اپنی دس سالہ ترقی کا جشن منانے کا فیصلہ کیا۔ یہ 1968ء تھا اور میں فرسٹ ایئر میں داخل ہوئی تھی۔ لاہور کالج بینرز سے بھر گیا۔ لیکن میں اپنی سینئر ٹیچرز کو زیر لب بڑبڑاتے دیکھتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھیں جنہوں نے انگریزوں کا عہد' کانگریس کی مکاریاں اور قائداعظم کو تاریخ کے صفحوں میں نہیں۔ اپنے آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جیسے 68ء سے 71ء تک سب کچھ ہماری آنکھوں نے دیکھا تھا اور وہ دیکھا جو کبھی کہیں نہیں دیکھا تھا۔ نشے میں دھت 'اپنی غلیظ سی مندی مندی آنکھیں کھولے حکمران ملک کو آہستہ آہستہ تباہی کی طرف جاتے سکون سے بیٹھے تماشا دیکھا ہوا۔

عذاب شدہ قوموں پر بارش میں مینڈک ٹپکے تھے۔ ہم پر حکمرانوں کا عذاب ٹپکتا ہے۔ یہ ہم پر نازل اسی لیے کیے جاتے ہیں کہ ملک کو تباہی کی طرف دھکیل دیں۔ ایک پہیہ ہے جو مسلسل پیچھے کی طرف چل رہا ہے۔

پاکستان کی کل عمر میں نصف سے زائد جب صبح آنکھ کھلتی ہے تو ایک شخص کرسی پر بیٹھا ملتا ہے۔ کیا جی کہ آج سے میں آپ کا حکمران ہوں اور ہم سب یہ پوچھنے کے بجائے بھئی تم کون؟ کس نے تمہیں حکمران بنایا! ہم جلدی جلدی اس کے ہونے کو دلیلوں سے ثابت کرنے پر تل جاتے ہیں۔ حدیثیں **کنگھالتے** ہیں۔ قائداعظم کا فرمان ڈھونڈتے ہیں یا اقبال کا کوئی شعر۔ آخر میں عدالتوں کا فیصلہ آجاتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ آگیا اور اس کا آنا ملک کے لیے مبارک فعل ہے۔

وہ آ پھنسے جاتا ہے۔ آنے کی وجوہات بعد میں بیٹھا ڈھونڈتا رہتا ہے۔

"اب کون آئے گا؟" عبیر نے پوچھا۔

"اس کا جواب تو تمہارے والد بہتر دے سکتے ہیں یہ تو گھر بیٹھی ایک عورت کی سوچ ہے۔ میرے ذہن میں تو ایسے ہی فلمیں چلتی رہتی ہیں۔ ناکام فلاپ فلمیں۔" اماں کھسیانی سی ہنسی ہنسیں۔

رضا نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس الجھن بھری کیفیت میں فضا میں دیکھتے کہا۔

"تو میں اس سیاسی پارٹی کا حامی نہیں۔ لیکن غلط ہوا بہت غلط۔"

"ایسے کام کیے اس لیے جاتے ہیں کہ سب غلط ہو جائے۔" حمیرا ان سب کو نا پاکر کھوجتی آئی تھی اور وہیں پام کے گملے کے پاس ٹھنڈے فرش پر بیٹھی ٹھٹھر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ٹی وی کئی گھنٹے سے آگ دکھا رہا تھا۔ مبصرین تیل چھڑک کر آگ اور بھڑکا رہے تھے۔

وہ جب سے آئی تھی۔ اسی بید کی بے کشن والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ گڑیا کریم بی کی تحویل میں چلی گئی کہ بچی سوائے کریم بی کے کسی سے مانوس نہیں ہوتی تھی۔

اس نے کب کا جھکا ہوا سر اٹھا کر دیکھا۔ باری باری لوگ اسے تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پہلے اماں اٹھ کر عثمان کی فکر میں گئیں پھر رضا گیا۔ ابا لاؤنج سے واپس چلے گئے کیونکہ وہ لوگ چیزوں کے ساتھ اپنا ذاتی تبصرہ کر رہے تھے۔ وہ ٹی وی دیکھتے کوئی اور آواز نہیں سنتے تھے۔ اگر ان کا اخبار بھی ان سے پہلے کسی اور کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اسے نہیں پڑھتے تھے نیوز پرنٹ اور سیاہی کی تازہ خوشبو میں بسا اخبار ان کو محبوب تھا۔ وہ چند چیزوں میں بہت نازک مزاج تھے۔ پھر عبیر گئی۔ حمیرا گئی۔

اس کو ایک خوف ناک اکیلے پن نے گھیر لیا۔ اس کا اپنا کوئی گھر در بھی تھا! اس کو یہاں آنا چاہیے تھا یا نہیں۔ کیا چاہیے کیا نہیں چاہیے۔ وہ مصلحتوں کا مزید شکار نہیں بن سکتی۔

اسے لگا وہ سب اسے چھوڑ گئے تھے۔ دانستہ گو وہ ذرا ہی دیر میں پلٹ بھی آئے لیکن اس کے لیے نہیں شاید لاؤنج میں چلتے تنہائی وی کے لیے یا شاید انہوں نے احساس کر لیا تھا' وہ وہاں اکیلی رہ گئی ہے۔ وہ اس کے گرد بیٹھے تھے۔ منتظر لیکن کچھ بولتے نہیں تھے۔ جانے پہل کون کرے گا۔ انتظار کرے کہ وہ پوچھیں یا خود شروع ہو جائے۔

اور خود شروع ہو تو کہاں سے شروع کرے۔ وہ جو برستی بارش میں انٹرنیشنل ریلیشنز کا فورم اٹینڈ کیا تھا۔ یا جب اس نے جمال سے آنکھیں پھیری تھیں۔

یا یہ کہ رخصتی کے محض ڈیڑھ گھنٹے بعد اس پر انکشاف ہوا کہ اس سے بہت بڑی حماقت ہو گئی اور کیوں اس نے اس حماقت بھرے رشتے کو گھسیٹے رکھا اور جب گھسیٹ ہی لیا تھا تو آج ایسا کون سا حادثہ پیش آیا کہ وہ اس کو مزید کھینچ تان کر ساتھ نہیں لے جا سکی۔ کہانیاں بیان کرنا ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتا۔

لوگ اس کے ساتھ سب اچھا اچھا کھیل رہے تھے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جیسے وہ تو روز یونہی اجڑی کھٹی گھر کے چپلوں میں مسلے ہوئے کپڑوں کے ساتھ بچی گود میں لٹکائے آتی رہتی تھی۔

وہ چوری سے اس کی طرف دیکھتے تو اس کو کسی منظر میں الجھا ہوا پاتے۔

ٹی وی کے جوش کے باوجود کیسا عجیب سناٹا تھا۔ اس کا جی چاہا ایک زور کی چیخ مارے اور اس اندر کے سناٹے کو پاش پاش کر دے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی کہ اس سے دانش مندانہ رویوں کی توقع کی جاتی ہے۔ بیل پھر بجی۔ خبروں کی طرف متوجہ بے دھیانی کی کیفیت میں رضا ہی نے فون اٹھایا۔ لیکن اس کے چہرے پر جیسے ایک جھٹکے سے تناؤ کی کیفیت نمودار ہو گئی۔

"جی ہاں! تو یہ کیں ہے۔ یہ تو آپ لوگوں کو بتانا چاہیے۔ یہاں سے تو کیوں ہے۔ جی ہاں! نوکری پیشہ لڑکیوں کی بیکی تو بیماری ہے۔ میرا خیال ہے رات ہو چکی ہے۔ آپ اس کام کو صبح کے لیے اٹھا رکھیے۔ جی نہیں! ابھی کسی کو فون پر نہیں بلا سکتا۔"

غالباً فون رکھا جا چکا تھا۔ کیونکہ رضا نے لال بھبھوکا چہرے اور بے ربط جملے کے ساتھ واپس رکھ دیا تھا۔ کس کا فون تھا کیا کہتا تھا جیسے سوالات قطعی بے معنی تھے۔

کسی نے بھی نہیں کیے۔

وہ خوف اور بد اعتمادی سے سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کیا مجھے واپس بھیج دیا جائے گا۔

اور شاید بھیج ہی دیا جائے۔ کیونکہ جب اماں نے کسی سے مخاطب ہوئے بنا اور کسی کو ہدایت دیے بغیر کہا۔

www.pkdigest.com

تنویر کا بستر لگا دو اس کو آرام کرنا ہے۔ تو جیسے گھر میں اس کے بستر کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ اتنا بڑا گھر چھوٹا پڑنے لگا۔ وہ جس کمرے سے رخصت ہو کر گئی۔ وہ اب عبیر کے پاس تھا۔ دیوار میں نصب اس کی وارڈ روب میں اب عبیر کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ شیلف میں کتابیں بھی اس کی تھیں۔ اور میز پر رکھا کمپیوٹر بھی بستر کے سرہانے تپائی پر جہاں امتحان کی تیاری کرتے ہر رات پانی کا گلاس بھر کر رو شیشے سے ڈھک کر گھونٹ گھونٹ پیتی تھی۔ اب وہ تپائی تھی نہ گلاس۔ حالانکہ اتنا بڑا امتحان اب بھی درپیش تھا۔ خلا کسی کے جانے سے پیدا نہیں ہوتا۔ وہ بہت جلد پُر ہو جاتا ہے۔ ایک کی جگہ دوسرا آجاتا ہے اور وہ دوسرا بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے۔

اس کی بیٹی نیند سے بے چین تھی لیکن نئی جگہ سونے کے تصور سے الجھ رہی تھی' رات ہو گئی اور ہر بچے کی طرح وہ واپس گھر جانا چاہتی تھی لیکن اس ننھی سی عمر میں اس نے کیا دیکھا کہ صبر سے صرف ماں کے فیصلے کی منتظر رہی۔

اماں کے کمرے میں بڑی تائی اور آج تو تایا بھی تھیں۔ حمیرا نے اپنا تکیہ اٹھایا اور دادی اماں کے کمرے میں ان کے تخت پر سکڑ کر لیٹ گئی۔

"سوری تنویر!" حمیرا نے اس کے کمرے میں جھانک کر جیسے اس کو شب بخیر کہتے معذرت کی تھی۔

"آج آپ آئیں اور آج ہی ہم بھی ہیں اتفاق ہے۔" حمیرا نے مسکرانے کی کی تھی۔

آج ابھی تو کسی نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا۔ وہ صرف آج کے لیے ہی آئی تھی کیا۔

عبیر نے رضا کارانہ طور پر کمرہ تو خالی کر دیا تھا۔ لیکن رات گزارنے کے لیے ہر کیف کہیں بستر چاہیے تھا۔

اس نے کریم بی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ تسبیح کے دانوں پر اس کی سسرال کے خلاف بڑبڑا رہی تھیں۔ یہ آخری کمرہ تھا لیکن یہاں سونا مذاق نہیں۔

☆ ☆ ☆

www.pkdigest.com

وہ اپنی بیٹی کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔ ماں کی آنکھوں میں دیکھتے نیند سے بوجھل پلکیں لیے۔ آخر وہ سو ہی گئی۔ عبیر اس کے بستر پر نیا کمبل رکھنے اور کچھ چاہیے تو نہیں پوچھنے آئی تو اس نے دیکھا۔ اس کے آنسو ٹپک کر گڑیا کے بالوں میں گر رہے تھے۔

اسٹور سے میٹرس نکال کر اس نے فرش پر گرایا۔ لاؤنج کی کرسیاں گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ لگائیں۔ کافی ٹیبل اٹھا کر کرسیوں پر رکھتے اس نے دیکھا درمیان میں خاصی جگہ نکل آئی تھی۔ جہاں وہ اطمینان سے لیٹ سکتی تھی لیکن شاید سو نہیں سکتی تھی۔ اس کا دل پھٹ گیا تھا۔ ایک تنہا کمرے میں بے آواز آنسو بہاتے یہ اس کی بہن تھی۔ کب سے وہ اپنی بہن سے نالاں تھی۔ ہر چیز پر اعتراض کرتی میاں اور سسرال کی دھمکیاں اس تک ٹرانسفر کرتی لیکن پتا نہیں قسمت کیا ہوتی ہے۔ آج کی رات کوئی بھلی رات نہیں تھی' وہ جانتی تھی سب اپنی اپنی جگہ اپنے بستروں پر آنکھیں پھاڑے چھت کو دیکھتے ہوں گے۔ اسے اپنی ماں پر بھی ترس آیا۔ وہ جب سے بہادر عورت بنی ضبط کے جانے کن کن درجوں سے گزر رہی تھی۔ اس کا جی چاہا ان کے پاس جائے۔ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر سمجھائے۔

"کیا ہو گیا ہے اماں! جو آپ کی قدر نہیں کرتا۔ آپ خود کو اس کے قدموں میں کیوں رولتے ہیں۔"

لیکن جذباتی ہونے کا دعوا کرنے کے باوجود وہ ذرا بھی نرم نہیں پڑتی تھیں۔ حد سے حد کیا ہو گا۔ وہ اس کو دیکھ کر اکتاہٹ سے کہیں گی۔

"کیوں پھر رہی ہو' آدھی رات ہو گئی سوتی کیوں نہیں۔"

بریکٹ میں کہیں لکھا ہو گا مجھے رونے دو۔ سب کسی نہ کسی کونے میں کسی نہ کسی بریکٹ میں آنسو بہا رہے ہیں۔ کیا ہم ایک جگہ اکٹھے بیٹھ کے نہیں رو سکتے۔ جس جس کو رونا ہو ایک دفعہ میں رو لے۔

نئی جگہ' نیا ماحول' نئے حالات وہ پھر اٹھ بیٹھی۔ کتنی دیر اس نے کروٹیں لے کر سونے کی کوشش کی تھی۔ دیوار سے لگی کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز سی۔ نیند بہت دور تھی لوڈشیڈنگ کی وجہ سے اندھیرا گھپ اور نہ بھی ہوتا تو اس کمرے کی بجلی آس پاس کے سب کمروں کو ڈسٹرب کرتی ہے۔ وہ کرسی سے ٹکی حالات حاضرہ پر غور کرنے لگی اچانک عثمان غائب ہوا۔ تنویر برے حالوں پہنچی اور ملک اس سے بھی برے حال میں پہنچ گیا۔

اس ایک لمحے سے پہلے زندگی کتنی مختلف تھی۔ "لمحوں میں ہم صدیوں سے گزر آتے ہیں۔" ایک ادھورا سا جملہ جیسے اندھیرے اور مایوسی میں اس کو روشن کر گیا۔ اس نے خود کو مضطرب سا محسوس کیا۔

یہ بے وقت اسے کیا خیال آیا تھا۔ گھبراہٹ میں گھٹنوں سے کمبل ہٹاتے اس کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

"عثمان!" اس نے اندھیرے گھپ میں آواز کی سمت دیکھا' وہ دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔

"عثمان نہیں آسکے گا تنویر!" عبیر نے رسان سے کہا۔

"راستے خراب ہیں۔ اماں نے منع کر دیا تھا۔"

پتا نہیں اس نے سنا یا نہیں۔ وہ جس طرح چوکھٹ میں کھڑی تھی اسی طرح اپنے وجود کو گھسیٹے زمین پر بیٹھ گئی۔ کواڑ کی پشت سے ٹیک لگائے گھٹنے سمیٹے اس کا ہیولا بھی جیسے وحشت زدہ نظر آتا تھا۔

"وہ موبائل نہیں اٹھا رہا۔"

"اس نے بتایا تھا اس کا فون گم ہو گیا ہے۔ جس نمبر سے اس نے فون کیا وہ اماں کے موبائل میں ہے۔ بات کرو گی؟"

"کیا وقت ہوا ہے؟"

"دو بجیں۔" اس نے دیوار پر لگے کلاک پر چمکتی سوئیوں سے اندازہ لگایا۔

"رہنے دو۔" وہ وقت اور زمانے سے اور اک ایک طویل وقفے کے بعد کسی فیصلے پر پہنچ پائی تھی۔

"سردی ہے تنویر' کمبل میں آجاؤ۔" کتنی دیر سے وہ اس طرح ساکت بیٹھی تھی کہ عبیر کو وحشت نے آگھیرا۔ اندھیرا اور سناٹا کہ پھر اس نے کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا۔

اچانک بجلی آگئی۔ جیسے اس کو بجلی آنے کا پتا بھی نہیں چلا۔ دور کسی کمرے سے آتی مدھم روشنی میں وہ دروازے میں چوکھٹ سے ٹکی ایسے ساکت بیٹھی تھی۔ جیسے وہاں کوئی انسان نہ ہو۔ کسی کلاسک پینٹنگ کا ایک ٹکڑا رکھا ہو فریم میں جڑا ہوا۔

بجلی آجانے سے بلیک اینڈ وائٹ فیگر میں کچھ رنگ آگئے تھے۔ لیکن ویسے ہی پھیکے بے جان۔

ہر وقت ہر ایک سے بیٹھ کر باتیں کرنے والی تڑتڑ بولتی دونوں طرف کی زبانیں جیسے گم ہو گئی تھیں۔ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھی اور کرسی کے سہارے کمر ٹکائے نیم دراز' وہ دونوں الگ الگ۔

"تم ان دنوں کیا کر رہی ہو عبیر! نعیم بتا رہے تھے تمہارے دوست کچھ اچھے لوگ نہیں۔ کچھ تو ان میں سے جیل بھی ہو آئے ہیں۔"

"آخر سیدھے راستے اس کے لیے کیوں نہیں بنے؟"

"میرا دوپٹہ پہن کر کیوں گئی تھیں۔ میرا جوتا کہاں پھینک دیا۔ سنبھال کر نہیں رکھ سکتیں تو مت ہاتھ لگایا کرو میری چیزوں کو۔"

"لیکن اپنی عورت کو تو انہوں نے چراغ خانہ نہیں بنایا۔ صبح صبح اٹھ کر وہ بھی مزدوری پہ نکل جاتی ہے۔"

"ہاں بدتمیزی تو شاید اس نے کی۔"

"اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں گدھے بھی بنائے ہیں' گھوڑے بھی۔"

وہ بے آہٹ اٹھی اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھے بغیر واپس ہو گئی۔

اس نے اپنی شکست خوردہ بہن کو کندھے جھکائے گیلری سے گزرتے دیکھا۔

اس کی وحشت میں اضافہ ہو گیا۔

"واقعی۔ لمحوں میں ہم صدیوں سے گزر آتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

سر عباس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر کی طرف جھانکا۔ باہر برآمدے کا فرش ابھی تازہ تازہ دھلا تھا۔ خشک فرش پر پانی گرنے کی سوندھی مہک ہوا میں اڑتی پھر رہی تھی۔ ابھی ایک نئی اور قیمتی گاڑی ان کی سڑک سے ایک جھونکے کی طرح اڑی اور گیٹ سے باہر نکل گئی۔ خشک میوہ جات کی چار خانوں والی شیشے کی پلیٹ اَن چھوئی پڑی تھی۔

چند دن پہلے کچھ حادثے پیش آ گئے۔ کچھ حادثے ان پر ایسے بھی گزرے تھے کہ اب بہت سے حادثے ان کو خوف زدہ نہیں کرتے تھے۔ عین اس وقت جب وہ لیڈر کے مارے جانے کی اطلاع لے کر آئے تو ان کو اپنی بیٹی سر جھکائے مجرم سی بیٹھی ملی تھی۔ شاید وہ عمر بھر خود کو مجرم سمجھتی رہی۔ اس کا خیال تھا یہاں اس کو سزا ملے گی۔ چونکہ وہ کوئی خطا کر کے نکلی تھی۔ لہٰذا وہاں کی زندگی بھی جیل کی طرح کاٹی۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ وہ اس کے شادی شدہ گھر کبھی نہیں گئے' نہ کبھی شوہر نے ان کی دعوت کی' نہ کبھی بلایا اور نہ کبھی نہ آنے پر کوئی گلہ کیا۔

وہ منتظر رہے شاید وہ اپنے بہن بھائیوں سے کچھ ذکر کرے یا اپنی ماں سے کچھ کہہ دے۔ لیکن وہ جس دن سے اتری تھی اس دن سے اب تک اس نے اپنی چپ نہیں توڑی۔ حتیٰ کہ اس کے ساس' سسر' ماں' باپ سے ملاقات کرنے کے لیے' بڑے آدمیوں کی طرح ٹیلی فون کر کے اور ملنے کے لیے وقت لے کر ایک شوفر سے چلانے والی گاڑی سے تنی ہوئی گردن کے ساتھ اترے تھے۔

سر عباس کی بے نیاز انہ طبیعت نے بھی بھانپ لیا تھا۔ جس دن وہ بارات لے کر آئے تھے اور آج کے دن تک ان کے حلیے' چال ڈھال سب بدل گیا تھا۔

خاتون سونے میں پیلی ہو رہی تھیں۔ آگے آگے چلتی گھر میں داخل ہوئیں' ان کے شوہر ان سے دو قدم پیچھے دھاگے سے بندھے مٹی کے گھگو گھوڑے کی طرح لڑکھتے ہوئے چلے آئے تھے۔ وہ اپنی اسٹڈی میں مع اہلیہ منتظر تھے' منتظر اور خاموش' انہوں نے دیکھا جس کے ساتھ نکاح کے بول پڑھا کر اسے پہلی مرتبہ رخصت کیا گیا' دوسری مرتبہ وہ اسے لینے نہیں آیا تھا۔

اسٹڈی میں ان کی کرسی پر بیٹھتے بیگم صاحبہ نے کچھ دیر رُک کر جیسے کرسی کے رنگ عمر پختگی پر غور کرتے نمایاں طور پر کچھ جتانا چاہا۔ ہر اپ اسٹارٹس (نو دولتیے) کی طرح قدیم چیزیں ان کو بھاتی نہیں تھیں۔ ان کے بیٹھ جانے کے بعد ان کی تقلید میں اسی طرح ان کا شوہر بیٹھ رہا مہر بلب' دم بخود۔

مذاکرات شروع ہوا چاہتے تھے اور ان مذاکرات میں جو تناؤ تھا' وہ دونوں طرف نمایاں تھا۔ بات کون شروع کرے گا اور کریم بی سے توقع کرنا کہ ان کی خاطر مدارات کے لیے وہ کچھ کریں گی عبث تھا۔ خاتون کئی مرتبہ گلا کھنکار چکی تھیں۔ مکالمات کا آغاز کسی طرف سے نہیں ہوا۔ پہلے سے رکھا ڈرائی فروٹ ڈش درمیان میں اَن چھوا

پڑا تھا۔ حتیٰ کہ طویل خاموشی سے اکتا کر اماں نے ہی پہل کی۔

"جی فرمایئے؟"

"فرمانا کیا جی۔ آپ کے سامنے ہے' آپ کو پتا ہے۔"

"آپ کو کیا پتا ہے' آپ وہ بتایئے۔" نہ چاہتے بھی اماں کے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔

انہوں نے ایک طویل آہ بھری۔

"بس جی کیا بتاؤں۔ ہمارا زمانہ اور تھا اب اور زمانہ آن لگا ہے۔ یہ میرے سامنے بیٹھے ہیں' پوچھ لیں ان سے ان کی اور ان کے خاندان والوں کی خدمت گزاری کرتے کرتے اپنی زندگی مٹی کر لی مٹی۔ آج یہ وقت آن لگا ہے' آپ کی بیٹی ہے' عیش کرتی ہے' نوکر چاکر' خدمت آرام' گھر کی سواری' آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں۔ کوئی گلہ تھا شوہر سے تو مجھ سے کہتی' پرس پکڑا' بیٹی سنبھالی اور ہیل پمپ کرنک ٹک کرتی چل دی۔ پہلے میں نے سوچا کسی سہیلی وہیلی کی طرف گئی ہوگی' جاتی رہتی تھی اکثر..."

کہانی لمبی تھی' ہاتھ' آنکھیں' ماتھے کے بل لہجہ میں ڈرامائی اتار چڑھاؤ سب ہی بات کو وزن دار بنائے دے رہے تھے۔

"جب حادثہ ہوا' میرا تو دل دہل گیا' نعیم بولا یا بولایا پھرا میں نے کہا بیٹھ جا' آرام کر' میں پتا کرتی ہوں' پتا کیا تو کیا کہ بی بی روٹھ کر میکے جا کر بیٹھی ہیں' یہ بیٹھے ہیں سامنے پوچھ لیجیے ان سے شادی کے اتنے سال۔ بس رخصت ہوئی تو کبھی میکے جا کر جھانکا بھی نہیں' اور ہم پر تو جی بھروسہ بھی نہیں۔ بچہ بھی ہم نہیں پال سکتے' بس اپنے ہی ماں' باپ پالیں گے' اچھا بھئی پال لو' کیا؟ کہ نوکری کروں گی' کر لو بھئی' ہمارے خاندان میں تو عورتوں کی کمائی کھانا کوئی اچھی بات نہیں سمجھی جاتی' نگردی' نوکری کی بھی اجازت دی۔ لاڈلی بیوی جو ٹھہریں' پھر تربیت اور ماحول کا اثر تو عمر بھر رہتا ہے۔

پر اب کیا ہوا' اتنی سی بات تھی۔ میری طبیعت خراب رہتی ہے چل چلاؤ کا زمانہ' آج ہیں کل نہیں رہیں گے۔ میں نے صرف اتنا کہا ڈاکٹر سے وقت لے لینا۔ یہ بیٹھے ہیں سامنے' ہماری تو ساس میاں کو ہمارے حوالے کریں ان کی مرضی نہ کریں تو وہ مالک' بس جی ان کے تو مزاج الٹ گئے۔ میرا میاں میرے پاس بیٹھا تھا' اسے بلوایا کیوں؟"

سر عباس نے ان ہی خاتون کی طرح گلا کھنکارا' لیکن ان کے برعکس صاف' ہموار اور ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

"اور آپ کی خواہش ہے ہم آپ کی اس ساری کہانی پر اعتبار کر لیں۔ بات یہ ہے محترمہ! ہم نے اپنے بچوں کو آزادی دے رکھی ہے' وہ آزادی جس کے آپ خلاف ہیں۔ سوچ کی' فیصلے کی' تعمل کی' ہر طرح کی آزادی' جب ہماری بیٹی نے آپ کے گھرانے کو پسند کیا تو آپ کو قطعی ناپسند کرنے کے باوجود ہم نے اس کا فیصلہ قبول کر لیا۔ وجوہات گیا ہیں میں نہیں مانتا' لیکن اگر اس نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ وہاں نہیں رہنا چاہتی تو ہمیں یہ بھی قبول ہے۔ اگر وہ کہتی ہے کہ وہ واپس جانا چاہتی ہے تو ہمیں اس پر بھی اعتراض نہیں' فیصلہ ہر طرح سے اس کے ہاتھ میں ہے' اور جس کی اس قدر لاڈلی ہونے کے ابھی آپ نے ڈنکے پیٹے' وہ تو اس کے آنے اور جانے سے لاتعلق دکھائی دیتا ہے۔"

خاتون جیسے سر عباس کے کچھ جملے سمجھیں' کچھ ان کے ہاتھ سے پھسل گئے' کن اکھیوں سے انہوں نے مٹی کے مادھو کی طرف دیکھا۔ لیکن اس سے عقل کی ہر توقع بعید تھی۔ خود سر عباس ہی ان کی مدد کو آئے۔

"نعیم آپ کے ساتھ نہیں آیا؟ ہم نے اس کے ساتھ بیاہا تھا۔" انہوں نے لفظ کھینچ تان کے سیدھے کیے اور ان کے سامنے رکھ دیے تھے۔

www.pkdigest.com

"شادی ایک آدمی سے نہیں ہوتی ہمارے معاشرے میں سارے خاندان سے ہوتی ہے۔ میں جو اس کو لینے آئی ہوں اس کو بلوائیں تو سہی۔ میں پوچھوں تو کیا تکلیف تھی۔ مجھے کیوں نہیں بتایا۔"

ان کا لہجہ بتدریج طنز سے لجاجت کی طرف پلٹ رہا تھا۔

"میں نے آپ سے کہا نا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آنا ہوا تو خود آجائے گی۔ میں کسی محل میں نہیں رہتا' آپ کی آج کی آمد کی اس کو اطلاع ہو گئی ہو گی۔"

"کسی کی بیوی کو یرغمال بنا کر رکھنا تو عدالت بھی پسند نہیں کرتی۔" انہوں نے بڑی مہارت سے کسی بڑے بریکٹ میں لپیٹ کر ان کو مقدمہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔

"جی بہتر' اگلی ملاقات کچہری میں ہو گی۔ فی الحال آپ تشریف لے جائیے۔"

وہ اسپرنگ کی طرح اچھلیں اور ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئیں۔ توہین ان کے چہرے پر لکھی تھی۔ اب انہوں نے ایک اور پینترا بدلا تھا۔

"آخر مرد ذات ہے' کب تک بیوی کے بغیر رہے گا۔ اس سے کہیں جلدی فیصلہ کرے' کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔"

وہ ان کے کمرے سے رخصت ہوئے تو اسی طرح پرس ہلاتی' ساس آگے آگے اور مٹی کی گاڑی پیچھے پیچھے دھاگے سے بندھی لڑھکتی ہوئی۔

انہوں نے کھڑکی کے شیشے سے دیکھا۔ گاڑی ایک جھونکے سے اڑی اور گیٹ سے باہر تھی۔ کریم بی کے دھلے ہوئے فرش پر ٹائروں سے کیچڑ کے داغ چھوڑتی' داغ صاف ہو جائیں گے' اس گھر میں بیرونی اثرات زیادہ دیر نہیں رہتے' وہ اپنے نظریے سے انچ بھر نہیں ہٹے تھے۔

www.pkdigest.com

☼ ☼ ☼

اماں اس کو ڈھونڈتی اندر والے صحن میں آئیں تو ان کی اس پر نظر پڑی۔ وہ چچا عبدالعزیز کی چارپائی پر اپنی خاموش بیٹی کو گود میں بٹھائے اس کے سر پر اپنا گال رکھے گم صم بیٹھی تھی۔

دو بندروں کے بت' برا مت بولو' برا مت سنو' جو گھر کے اندر آئے اور واپس چلے گئے' وہ ان سے لاعلم نہیں لگتی تھی۔ اب آزادی اظہار کا فیصلہ عباس صاحب نے خود ہی کر لیا۔ کیا معلوم اس کی رائے کیا تھی۔

کوئی اختلاف ہوا ہے ان کو اندازہ تھا۔ اس کی طبیعت میں اشتعال بھی زیادہ ہے۔ کسی معمولی اختلاف سے شاید وہ روٹھ کر آئی تھی۔ اس کا خوف زدہ پیلا چہرہ دیکھ کر انہیں لگا اختلاف اتنا معمولی نہیں تھا۔ آخر وہ کھلتی کیوں نہیں' کسی کسی وقت اس کی آنکھوں سے جھانکتا پاگل پن بھی ان کو پریشان کر رہا تھا۔ ایک معمولی سا غلط فیصلہ اور اس کی اتنی بڑی سزا وہ تنہا جھیل رہی تھی۔ اس لیے کہ اس نے یہ فیصلہ تنہا کیا تھا۔ یہ فیصلہ ان سب کا بھی ہو سکتا تھا۔ نتائج تو بہرحال اسی کو بھگتنے تھے۔

"وہ مجھے لینے آئی ہیں۔"

اس نے سرگوشی سے پوچھا۔ بچی نے دہشت زدہ ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔ وہ صرف یہ ہی دیکھتی تھی۔ اس کی ماں کا چہرہ کیا کہتا ہے۔ اس عمر میں اس کی ماں مینا کی طرح چہکتی پھرتی تھی۔ اس وقت تک جب تک وہ پنجرے میں قید نہیں کر دی گئی۔ پتا نہیں کون کون سے اقرار چھپانے کے لیے۔ اس نے خود کو سب سے دور کر لیا تھا۔ اور جانے ناخوش لڑکیاں یہ کیا کرتی ہیں۔ میکے میں آتی ہیں تو بد مزاجی کا لبادہ اوڑھے' اتنا کہ پیار کرنے والے بھی ان سے اکتا جائیں اور اس طرح سسرال کے پردے رکھ لیتی ہیں۔ لیکن جب سسرال والے الزام لگاتے ہیں تو خود اس

کے گھر والے یقین کرنے والوں کے گروہ میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کو اپنی بیٹی سے زیادہ اس کی بیٹی پر رحم آیا۔

عبیرہ نے دور سے ماں' بیٹی اور اس کی بیٹی کو ملول دیکھا۔ تین مختلف نسلیں' عورت ہونے کے دکھ میں غم زدہ تھیں۔ اس نے گڑیا کو اس کی گود سے اپنی گود میں منتقل کر لیا۔

"میں بازار جا رہی ہوں' کچھ منگوانا تو نہیں؟"

کوئی جواب موصول نہیں ہوا' ہر نسل پر سکتہ طاری تھا۔

"چلو بازار چلتے ہیں۔" اس نے آخری نسل کی طرف امید سے دیکھا۔

"اتنے بہت سے کھلونے لے کر آئیں گے' باربی' باربی کے کپڑے' ریڈ کلر کے۔" پہلی مرتبہ اس کے معصوم مکھڑے پر ایک چمک بھری مسکراہٹ ابھری۔

"پھر جناب! ہم جائیں گے پارک' وہاں سلائیڈ لیں گے۔" وہ اس کو گود میں اٹھائے دو قدم ہی چلی تھی کہ پیچھے سے تنویر نے دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں۔ وہ اس کو چھین لے گا' اس لیے نہیں کہ اس کو اس سے محبت ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ یہ کر سکتا ہے۔"

انگریزی زبان میں کہے لفظوں کا ننھی جان کو ایک حرف بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ اس کے لیے لفظ اور ان کے معنی اتنے اہم نہیں تھے۔ وہ ماں کے چہرے سے دنیا کی ہر زبان پڑھ سکتی تھی' اماں ٹھٹک گئیں۔

"مجھے نہیں معلوم تنویر تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ کبھی تم نے تفصیل سے بتایا بھی نہیں۔ لیکن میں تمہاری ماں ہوں۔ میں دیکھتی ہوں' میں جانتی ہوں' تمہارا وہ فیصلہ بھی غلط نہیں تھا۔ میں نے تمہیں کبھی تمہارے اپنے فیصلوں پر بھی ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا۔ لیکن خدا کے واسطے اپنی بیٹی کو تو مسکرانے دو۔"

"گڑیا! مجھے پکڑو۔"

اماں اپنی چارپائی پر بیٹھی تھیں کہ عبیرہ نے دوڑ لگا دی۔ پہلا چکر خالی گیا' لیکن دوسرے چکر میں گڑیا جھپٹ کر اٹھی اور خالہ کو پکڑنے کی کوشش میں قل قل ہنسنے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ کتنی دفعہ ٹیلی فون کے پاس سے گزری۔

ابھی چار سال پہلے وہ اسی بے قراری سے اسی ٹیلی فون کے گرد منڈلایا کرتی تھی' کھوجتی ڈھونڈتی' موقع تلاش کرتی' ابا اپنی پڑھائی میں گم ہوں۔ اماں کے ناول کا آخری چیپٹر ہو' دادی اماں کے وظیفے لمبے ہو جائیں' بڑی تائی کا غسل خانے سے عشق طویل ہو جائے' کریم بی کے چاول دم پر لگے ہوں' گلیاں ہوں سونیاں۔

پھر وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ نمبر ڈائل کرتی تھی۔ اتنی کم مدت میں اتنا کچھ بدل جاتا ہے کہ واقعات تو یاد آ کر دل کو رنجش دیتے ہیں۔ لیکن وہ بے قراری یاد نہیں آتی۔ انسان بھی کیسے عجیب خسارے کے سودے کرتا ہے' پھر بیٹھا حیران ہوتا ہے۔

اس نے ریسیور اٹھایا اور خود سے کتنی دیر کی جنگ کے بعد اٹھایا۔ لیکن فوراً" ہی رکھ دیا۔ وہ صبح سے اپنے خلاف اس جدوجہد میں مصروف تھی۔ نمبر ملائے اور ادھورے ہی چھوڑ دیے۔ کبھی اسے مکمل کامیابی بھی نصیب ہوئی۔ ایک مرتبہ اس کے کان میں بیل بھی بجی۔ ایک دفعہ اس نے دوسری طرف سے ہیلو بھی سنی' لیکن پھر منقطع کر دیا۔ معلوم نہیں وہ کہاں کھڑی ہے۔ دوسری طرف سے اس کو سنا بھی جاتا ہے یا نہیں۔ جہاں اور بہت نقصان

ہوئے وہاں اس کی اپنی ذات سے اعتماد جیسے بالکل اٹھ گیا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا' جب اس نے ریسیور بھی اٹھایا۔ نمبر بھی ملائے اور اس کی آواز استقامت سے سنی۔

"جمال!" دوسری طرف سے بھاری' پُرسکون' لیکن ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا گیا' اس کی آواز میں کوئی ہیجان نہیں تھا۔ کتنی دیر تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ بولے گی تو کیا' خود کو اس طرح کمپوزڈ رکھ سکے گی۔ یہ غنیمت ہوا کہ اس نے "جمال" سے دوسرے ہیلو تک کی بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جیسے اسے خود سے الجھتے رہنے کا وقت دے کر وہ اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس سے بات کرنا اس کے لیے کبھی آسان نہیں رہا تھا۔ رات بھر خود سے الجھتے' مشق کرتے بھی لگتا' اس کا آموختہ ابھی کچا ہے۔

"آپ سے ایک بات کہنی ہے۔" حلق میں پھنستی' اعتماد سے عاری آواز' بے ربط سا جملہ' یہ بتائے بغیر کہ وہ بات کہنے والی تھی کون' غنیمت ہوا کہ اس نے اس کا لہجہ اس کے فقرے سے پہچان لیا۔ یہ جتائے بغیر کہ اس کے کانوں نے اس فون پر اس کا جو آخری جملہ سنا وہ اتفاق سے لفظ بہ لفظ یہ ہی تھا۔

"جی فرمایئے۔" پتا نہیں اس میں احترام تھا یا اجنبیت۔ اس کا رہا سہا اعتماد دھڑ دھڑا دھڑنے لگا۔

"میں ان دنوں 80f میں ہوں۔"

"ہاں میرے علم میں ہے۔" اس نے اسی سکون سے کہا۔

"لیکن مجھے جو کہنا ہے نہ میں فون پہ کہہ سکتی ہوں' نہ گھر پر۔"

"تو یہ سننے کے لیے مجھے کہاں جانا ہوگا؟"

"پلیز۔" اس نے مری مری سی آواز میں کہا۔ "بے حد ضروری ہے۔" وہ کچھ دیر چپ رہا۔

"ہم جوش میں آگے سے آگے بھاگتے تو رہتے ہیں تنویر! لیکن پھر واپس بھی جانا ہوتا ہے' دونوں طرف کے سفر کی تیاری ہے؟"

"یہ سفر یک طرفہ ہے' واپسی کی نوبت نہیں آئے گی۔"

وہ دیر تک چپ رہا۔

"اچھی بات ہے' کب آؤں؟"

"جتنی جلدی ممکن ہو سکے کل۔"

☆ ☆ ☆

پتا نہیں اس نے یہی جگہ دوبارہ کیوں چنی' ہال میں وہ داخل ہوئی تو لمحے بھر کو اس کے پاؤں زمین نے پکڑ لیے۔ وہ اسی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر جھلکتا ہلکا سا تناؤ بتاتا تھا کہ وہ اس کو یاد دلانا چاہتا ہے۔ اس میز اور اس کے گرد بچھی کرسیوں پر ایک اہم فیصلہ ہوا تھا۔ اگر ان میں سے کسی کی یادداشت کمزور ہو تو۔

آج اس کی انگلیوں میں وہ حلقہ نہیں تھا جو اس کو باندھ کر رکھتا تھا۔

"بولو۔" وہ ابھی بیٹھنے اور سمجھنے بھی نہ پائی تھی اور شاید وہ بہت جلدی میں تھا اور پوچھنے کی نوبت آئی تو وہ نہیں جانتا تھا۔ اب وہ آئی تھی تو کیوں' فاصلوں نے اتنا فرق تو دیا تھا۔

"جو میں جانتی ہوں' اگر وہ جان جائے تو مجھے قتل کر دے گا۔"

کتنی دیر کے سناٹے کے بعد اس نے پوچھا۔

"تم نے کیا دیکھا تھا؟"

"کاغذات۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تم نے پڑھے؟"

"سرسری۔ اتنا وقت نہیں تھا۔ لیکن کسی ٹریڈ مارک کے بارے میں آپ نے بتایا اور میرے ذہن میں بڑی تیزی سے کڑیاں مل گئیں۔ وہاں ایک زیور کی ڈبیا میں کچھ پڑا تھا۔"

"اس کو معلوم ہوا کہ تم نے دیکھا؟"

"پتا نہیں' میں گھر چھوڑ کر آ گئی۔"

"گھر؟" جمال نے ایک طویل سانس کھینچا۔

"اور کیا گھر چھوڑ کر آنے کی بس یہ ہی ایک وجہ تھی؟"

تنویر نے اس کے لہجے کی سختی محسوس کی۔ "گھر" کہتے اس کے لہجے کے طنز کی چبھن بھی دل میں کبھی۔ اس کا چہرہ کیا کہتا تھا' نہ اس نے سر اٹھایا' نہ دیکھا' مدت ہوئی سر اٹھانا تو وہ بھول ہی چکی تھی۔

"یہ فوری وجہ تھی؟" اس نے اس کی پیشہ ورانہ تحقیقات پر ذرا محتاط رویہ ضرور اختیار کیا۔

"ویسے وہ تمہیں ہرگز قتل نہیں کرے گا۔ اس خوف کو دل سے نکال دو' کبھی اس راز کا افشا ہونا بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ اب تو ان کی تعداد میں اتنا اضافہ ہو چکا ہے اور ان میں اتنی ڈھٹائی آ چکی ہے کہ انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ حکومت کی مرضی سے یہاں آئے ہیں' حکومت جانتی ہے' اب ان کی ناک کے نیچے ہوتا ہے سو یہ کوئی راز نہیں' لیکن اب جب تم نے یہ راز کھول ہی دیا ہے تو تمہیں یہ بھی پتا چل چکا ہوگا کہ میں تب بھی آگاہ تھا' اور سن لو' میں ہمیشہ اس دن سے خائف رہا ہوں جب میں اور وہ آمنے سامنے ہوں۔ سو تمہارے شوہر پر ڈیوٹی میری نہیں' میرے ایک اور کولیگ کی ہے' اس پروفیشن میں کوئی مداخلت نہیں ہوتی۔ لیکن میں یقین دلاتا ہوں' اس کے ہوتے تم محفوظ ہو' وہ ہمیشہ آس پاس ہوتا ہے' وہ اب بھی ہوگا یہیں کہیں۔"

ٹھنڈی چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرتے اس نے جیسے سکون سے کہا۔

"میں صبح فجر کے ساتھ چلا تھا۔ اور اگلے قدموں واپس اسلام آباد جاتے کچھ وقت درکار ہوگا۔ لہٰذا فوری واپسی چاہیے۔"

لیکن میں پوچھ سکتا ہوں اس اعتماد کے لیے تم نے مجھے کیوں چنا۔"

اس نے پہلی دفعہ سر اٹھایا۔ جم کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اور میں پوچھ سکتی ہوں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے میں اپنی زندگی ریوائنڈ کر کے اس ریسٹورنٹ کی شام تک واپس لانا چاہتی ہوں۔"

اپنے لہجے میں اس قدر تلخی اس کے اپنے لیے بھی اجنبی تھی۔ جمال نے اس کے تنے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔

"واپس پلٹنا واقعی مشکل کام ہے' بلکہ ناممکن تقریباً" اس لیے میں اس قدر گھٹیا نہیں کہ سوچوں تم یہاں تک پلٹو گی کہ اس ریسٹورنٹ میں وہ شام آ جائے۔ میرا مطلب ہے مجھ سے کیا چاہتی ہو' محض کتھارسس یا انتہائی اقدام؟"

"دونوں۔"

"دکھ' فکروں سے آزاد ہونا ہمارے بس میں نہیں۔ لیکن اپنے متعلقین کو ان الجھنوں میں نہ الجھانا ہماری ذمے داری ضرور ہے۔ سو چہرے سے یہ ماتم دور کرو اور اپنے لوگوں میں ہنستی مسکراتی واپس جاؤ۔ زندگی بخیر۔"

وہ اس کو تنہا چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ تنویر کے وجود میں ایک سردی کی لہر سی دوڑ گئی۔

www.pkdigest.com

اب بھی ہو گا، یہیں کہیں، وہ ہمیشہ آس پاس ہوتا ہے۔
اس نے چوری سے ریستوران میں ہر طرف نگاہ دوڑائی۔
کون ہو سکتا ہے، یہ بیرہ، وہ مینیجر، واش روم کے بیچارہ لے کر نکلتا نیلے گاؤن والا سونیو یا وہ جس کو بلا کر جمال نے چائے کے پیسے دیے۔ دوستوں کے گروپ میں فرنچ فرائیز کھاتے اور چپس اڑاتے لوگوں میں سے کوئی ایک تنہا بیٹھا کچھ سوچتا یہ، یا آرڈر کا انتظار کرتا وہ؟
اور اس نے کہا کیا تھا۔ اس کا تعاقب کیوں کیا جاتا ہے؟
وہ دہشت زدہ ہو کر اٹھی اور تیزی میں بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

عبیرہ جب سے وہ اپائنٹمنٹ لیٹر ہاتھ میں پکڑے حیران بیٹھی تھی۔
عجیب خط تھا۔ نہ اس نے اپلائی کیا، نہ اس ادارے سے اس کی آگاہی تھی، نہ اس کا کوئی انٹرویو ہوا، نہ short listing میں نام آیا۔ وہ نعمت غیر مترقبہ کی طرح اترا تھا۔
اس کو محض وقت اور تاریخ سے آگاہ کیا گیا تھا، جہاں اس کو ہیومن ریسورس والوں کے سامنے پیش ہونا تھا۔
"مجھے بھی یاد نہیں۔" ثمیرا نے کہا تھا۔ "میں نے جا بہ جا درخواستیں دی تو ہیں، اپنی بھی تمہاری بھی، آن لائن بھی ہارڈ کاپی بھی۔ لیکن میرے نوٹ بکس میں ایسا کوئی آڈر نہیں۔ بہت ممکن ہے شہریار نے تمہاری طرف سے اپلائی کیا ہو۔ اس دن بتا رہا تھا جب فرصت میں جا کر نیٹ کیفے بیٹھتا ہے تو ہم دونوں کی طرح بیٹھا درخواستیں بھیجتا رہتا ہے، سویٹ بچہ۔"
اسے اچانک خیال آیا۔ اتنا بڑا واقعہ گزرا اور اس نے اس سویٹ بچے سے شیئر بھی نہیں کیا۔ الجھنوں نے عجیب طرح الجھا دیا تھا۔ سو پہلا کام تو یہی ہے کرنے والا۔ سارا قصہ اس کے گوش گزار کیا جائے، اس کے بعد ضرور کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی۔
"انٹرویو دینے جاؤ گی۔" ثمیرا نے شک سے پوچھا۔
"جانا چاہیے؟"
"کیا حرج ہے؟" اس نے ہمت بڑھائی۔
"وہ زبردستی تو روک نہیں لیں گے، نہیں پسند آیا تو مت کرنا۔"
"اور تم..... تم کہاں جاؤ گی؟"
"میں کسی اور جگہ..... جمال بھائی کہتے تھے، بچپن گزر گیا، اب ایک دوسرے کی انگلی چھوڑ کر اپنی اپنی سمتوں میں سفر کرنا ہو گا۔"
"مشکل نہیں ہو گا؟" عبیرہ نے آہستگی سے پوچھا۔
"شروع میں تو ہو گا، پھر شاید عادی ہو جائیں۔" ثمیرا کی آواز عبیرہ سے بھی دھیمی تھی۔
"ہم اتنے matter of fact قسم کے لوگ ہیں کیا؟"
"ہیں تو نہیں۔"
"پھر کیا ہو گا؟"
"پتا نہیں پھر کیا ہو گا۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں گے)

رفعت ناہید سجاد

چراغ آخر شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مثل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد' ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادی اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونی ورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے' وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔

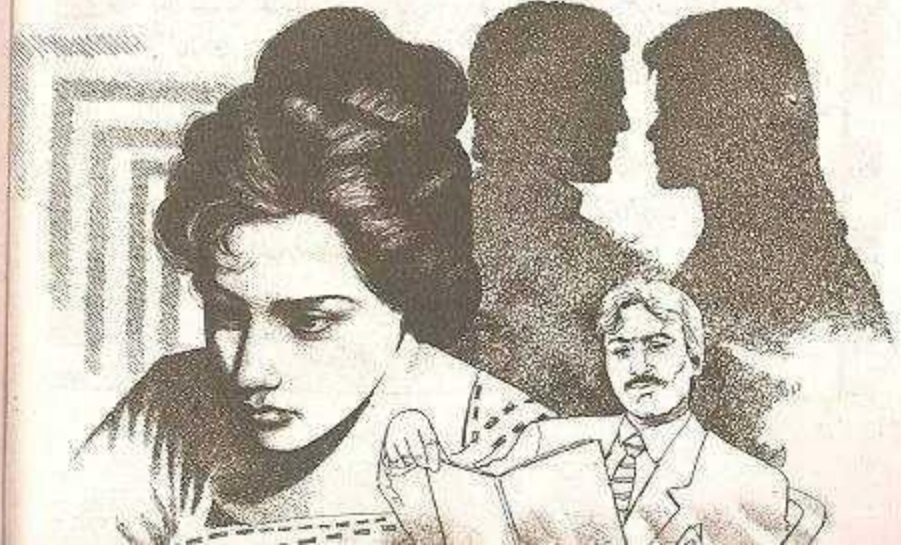

www.pkdigest.com

عبیرہ اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن نہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بدوجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف اسپانسرل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھا رہی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۱۴

چودھویں قسط

ظفر علی روڈ پر ایک قطار سے اگے کچنار اور سنبل کے درختوں سے ٹوٹ کر گرتے خشک پتے اس کے پیروں تلے آکر چرمراتے تھے۔ اس نے رکشہ چھوڑ دیا تھا۔ کتنی دیر سے وہ پتے کی چٹ ہاتھ میں لیے بھٹکتی پھر رہی تھی۔

جوں جوں وہ رکشہ کو دائیں سے بائیں مڑواتی رکشہ والے کی بڑبڑاہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ شدید کوفت میں مبتلا اس نے عاجز آکر اس کی مطلوبہ رقم فراہم کی اور رکشہ سے اتر آئی۔

موسم خزاں آگیا تھا۔ راتیں ٹھنڈی ہوگئی تھیں۔ لیکن سورج میں ابھی تک حدت تھی۔ بڑا سا گولا عین اس کے سر پر تمتماتا۔ اپنی تیز اور تند شعاعیں تاک تاک کر اس کو مار رہا تھا۔

بڑی بڑی بستیوں کا بڑا عجیب کلچر ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے لاعلم نہ بھی ہوں تو لاعلم ظاہر کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ دیوار کے اس طرف کون آباد ہے۔ ان کو کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی چھوٹی بستی میں داخل ہو کر آپ وہاں موجود کسی پہلے آدمی سے کہیں "وہاں جانا ہے، جہاں فوتگی ہوئی ہے" تو وہ شخص تانگہ کروا کے سیدھا آپ کو موت والے گھر تک لے جاتا ہے۔ لیکن اس علاقے میں سیکورٹی پہ کھڑے گارڈ، سڑک پر بھاگنے والے بچوں اور یونہی بے مقصد آوارہ گردی کرنے والے لڑکوں میں سے کوئی نہیں جانتا" وہ پتا کہاں ہے جو اس کی پرچی پر لکھا ہے۔ اور پتا نہیں ایسا کوئی ایڈریس "گوگل Earth" پر موجود بھی تھا یا محض کسی نے مذاق کیا ہے۔ آج کل مذاق کی قسمیں بھی عجیب و غریب ہوگئی ہیں۔ گلیوں کی ترتیب بھی عجیب تھی۔ تیرہ کے بعد اٹھارہ آجاتی۔ اور وہ چودہ نمبر کہاں جا چھپی تھی۔ جو ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتی تھی۔ ہر چکر پر تیرہ نمبر گلی سے گزرتے اس کی نظر اس شخص پر پڑتی تھی جو درخت کے تنے سے ٹیک لگائے۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز نیم وا آنکھوں سے دھوپ اور تازہ ہوا کے جھونکوں سے جیسے مدہوش تھا۔

انچیوں کی طرح آنکھیں بند کیے اپنے آپ میں گم، درخت کے تنے سے رانجھے کی طرح ٹیک لگائے گویا دنیا جہان سے بے زار دکھائی دیتا تھا۔ بس اس کے ہاتھ میں بانسری نہیں تھی اور ظفر علی روڈ پر گائیں بھینسیں چرانا ممنوع تھا۔ مگر اس کے چہرے پر رانجھے کے برعکس غصہ اور تلخی تھی۔ مگر کس چیز کی۔ آج کل لوگ رانجھے والے سکون کو ترس گئے ہیں۔ اس نے افسوس سے اس کی طرف دیکھا۔ کندھوں تک آئے لمبے بالوں اور بدرنگ جینز میں وہ خود ہی مسکراتا تھا، اپنے موبائل پر کچھ لکھتا اور لکھے کو پڑھ پڑھ کر پھر مسکراتا تھا۔ اگلے چکر میں وہ گزرتی تو اس کا چہرہ پھر اسی تلخی کی رو میں نظر آتا۔ سیاہ مکوڑوں کی ایک بے ترتیب قطار درخت کے تنے کے گرد کھودی ہوئی باریک مٹی کے ڈھیر پر کسی کام میں مصروف تھی۔ مکوڑے اپنی تیز رفتاری میں اس کے پیروں پر سے گزرتے اپنا راستہ بناتے چلے جاتے۔ وہ شاید ان سے بھی بے پروا تھا۔

"پتا نہیں شاعر ہے کہ دیوانہ۔" اس نے سوچا، ورنہ لوگ یوں سڑکوں پر دنیا و مافیہا سے بے نیاز چوکڑی مار کر تو نہیں بیٹھتے۔ چوتھی دفعہ گلی نمبر چودہ کی تلاش میں بھٹکنے سے پہلے یونہی اس کو خیال آیا۔ پتے کی پرچی اس کے سامنے رکھ کر دیکھی تو جائے۔ کیا پتا کوئی بہتر نتیجہ ہی سامنے آجائے۔ اور کون جانے جو وہ پتھر کھینچ مارے اگر واقعی دیوانہ ہے تو" دوسری دفعہ قریب سے دیکھنے پر اسے لگا، وہ دیوانہ بھی ہے تو بے ضرر ہے۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر درخت کی چھاؤں اور تنے دونوں سے دور ایک لمحے کو ٹھہری۔

"احتیاط اچھی چیز ہے۔" اس نے سوچا تھا۔

"آپ یہ پتا سمجھا سکتے ہیں؟" اس نے پوچھا تو اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے پرچی تھامنے کے لیے ہاتھ آگے کردیا۔ پرچی اس تک پہنچانے کے لیے جتنا جھکنا پڑا اور جتنا ہاتھ پھیلانا پڑا عبیر نے ہی پھیلایا۔ وہ اسی سستی اور کام چوری سے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔

اس نے ایک اچٹتی نظر پرچے پر ڈالی۔ غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک دفعہ اور جیسے یقین کرنے کے لیے پھر پتا پڑھا۔ یونہی اس نے پوچھ لیا تھا۔ جیسے ہر راہ چلتے سے پوچھا تھا۔ اس کو پتا تھا، وہ بھی اس ایڈریس کے لیے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

شائع ہوگئے ہیں

خوبصورت سرورق
خوبصورت چھپائی
مضبوط جلد
آفسٹ پیپر

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو — راحت جبیں — قیمت: 225 روپے
☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں — فائزہ افتخار — قیمت: 500 روپے
☆ محبت بیاں نہیں — لبنیٰ جدون — قیمت: 250 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کرے گا۔ جیسا کہ اب تک پوچھنے والے سب راہ گیر کر بیٹھے تھے۔ لیکن اس کی توقع کے بالکل برعکس اس نے ہاتھ شانے سے پیچھے لے جا کر اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے اپنے عقب میں بنی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی دیوار کے ساتھ اُگے ہوئے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے وہ نروان حاصل کر رہا تھا۔

"یہ؟" اس نے حیرت سے بلڈنگ کی طرف دیکھا۔ یہاں تو کسی انٹرویو کے کوئی آثار نہیں آرہے تھے۔ نہ امیدواروں کا تانتا بندھا تھا' نہ چہل پہل۔ دیر اسے ضرور ہوئی۔ مگر اتنی بھی نہیں کہ لوگ انٹرویو سے فارغ ہو کر جا چکے ہوتے۔

"اس میں تو اسٹریٹ چودہ لکھا ہے اور یہ تیرہ ہے۔"

"یہ چودہ ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ تیرہ باہر والی لین ہے' جس سے آپ اندر آئی ہیں۔"

"اوہ!" اس نے سٹ پٹا کر سوچا۔ اگر وہ ذرا بھی بیکار ہوش ہوتا تو اس کو سڑک کے چکر لگاتے دیکھ چکا ہوتا۔ پتا نہیں اب کون کے دیوانہ سمجھ رہا ہوگا۔ اس نے ذرا خجالت سے نظر بچانی چاہی اور احتیاطاً پوچھ ہی لیا۔

"یہ EAs کا دفتر ہے۔"

حالانکہ اب تو بورڈ بھی سامنے نظر آنے لگا تھا۔ سوال ہی احمقانہ تھا' پہلے کیوں اس بورڈ پر نظر نہیں پڑی۔ تب ماموں اللہ بخش اس کو اٹھا کر کہاں لے گئے تھے۔

اس نے اسی بے زاری سے اور اسی انگوٹھے سے دو مرتبہ پیچھے کی طرف اشارہ کیا گویا یہی ہے' یہی ہے۔

بنگلے کے پیچھے مختصر سے لان کے بعد وقار سے کھڑی چھوٹی اینٹوں کی عمارت میں اسے داخل ہونا تھا۔ گیٹ تک پہنچ کر اسے خیال آیا' پتا نہیں اسے آنا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔ پر اب تو آگئی تھی۔ ریسپشن پہ کھڑی رنگ برنگے ٹیلی فونز کے بٹنوں سے کھیلنے والی لڑکی اس کو دروازے پر کھڑا دیکھ بھی چکی تھی۔ جائے فرار ممکن نہیں تھی۔ تو وہ اس کو آتے دیکھ کر اپنی ڈیوٹی پر مؤدب انداز میں پلٹ گئی۔

"السلام وعلیکم۔ EAs کی طرف سے عائشہ ریاض آپ کو خوش آمدید کہتی ہے۔ فرمایئے' میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

کال سینٹر کی سی مشینی بے روح آواز میں اس نے رٹا ہوا فقرہ ادا کیا تھا۔ اس نے بڑے تحمل سے اس جملے کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔ پرس سے کاغذ کا وہ ٹکڑا جو ابھی تک لفافے میں تہہ ہوا احتیاط سے جما ہوا تھا' اس کے آگے کر دیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس کی انگریزی ختم ہو گئی تھی شاید۔

اس نے کاغذ لفافے سے نکال کر الٹا پلٹا۔

"یہ لفافہ مجھے ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ میں لیٹ ہو گئی ہوں۔ وجہ یہ کہ میں پچھلے ایک گھنٹے سے یہ بلڈنگ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"آپ نے فون کر کے کنفرم کیوں نہیں کر لیا؟"

"میرے پاس نمبر نہیں تھا۔" اس نے بے توجہی سے کہا۔ عائشہ ریاض نے لمحے بھر کے لیے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ لیٹر ہیڈ' پیڈ کے کارنر پر لکھا تو ہے۔" وہ دوبارہ خجل ہو گئی۔ پہلا امپریشن ہی حماقت کا تھا۔

"لیٹ ہو جانے کا مطلب میرا ٹائم ختم؟"

www.pkdigest.com

"پتا نہیں۔" اس نے کسی یقین کے بغیر تذبذب میں کہا۔ جیسے وہ اس قسم کے فیصلوں کا اختیار نہ رکھتی ہو۔
"تو پتا کریں۔" اس نے کہنیاں کاؤنٹر پر ٹیک کر چس چس کرتے پاؤں اور ٹخنے میں گڑے جوتے کے اسٹریپ سے دکھتے ہوئے پیر کو آرام دینے کے لیے سہارا لیا تھا۔
اس نے فون اٹھایا اور بات کرنے سے پہلے جیسے اس کو واضح ہدایت جاری کی تھی۔
"آپ ادھر بیٹھیے میں بتاتی ہوں۔"
دفتروں کا یہ اسٹائل۔ معمولی معمولی باتیں بھی راز ہوتی ہیں۔ اس نے پلٹ کر ادھر دیکھا' جہاں اسے بیٹھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ دیوار کے ساتھ لگے صوفے' سائیڈ لیمپ اور صوفوں کے سامنے بچھی میز۔ اور بیٹھنے کا ارادہ کینسل کر کے اس نے اس سے دور ہو کر شیشے پر جھولتی بلائنڈز سے کسی وجہ کے بغیر باہر کا نظارہ دیکھنا شروع کر دیا۔ حالانکہ باہر کوئی ایسا دلچسپ منظر بھی نہیں تھا۔ لگتا ہے نوکری ہاتھ سے گئی۔ کسی کا قصور نہیں' حماقت بھی اپنی تھی۔ آپریٹر کی آواز دانستہ مدھم تھی۔ وہ کیا پوچھ رہی تھی اور اسے کیا جواب دیا جا رہا تھا۔ آواز دھیمی نہ بھی ہوتی تو اسے کن سوئیاں لینے کا کوئی شوق نہیں تھا۔
"السلام و علیکم۔" اس کے پیچھے ایک اور نامانوس اور نرم آواز گونجی۔ ویسی ہی مشینی اور بے روح۔
"میرا نام پروین وسایا ہے۔ ایم ڈی کو افسوس ہے کہ ہمارا پتا تلاش کرنے میں آپ کو تکلیف ہوئی۔ وہ اپنے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"
ایسا باتکلف ماحول۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔ اتنی عمر وہ منہ پھٹ' کھلے دل اور کھلے ذہنوں کے درمیان زندگی گزارتی آئی تھی۔ اب شاید اس کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانے اور تول کر بولنے کی تربیت لینی ہوگی۔ زمانہ طالب علمی گزر گیا۔ وہ پلٹی' لمحے بھر کے لیے اس نے عادتاً ہی مخاطب کی آنکھوں میں دیکھا۔
پتا نہیں کیسا گہرا اَن مٹ دکھ تھا ان آنکھوں میں کہ لمحے بھر کو اس کی روح تک کانپ گئی۔
"تمہیں انٹرویو دینے ضرور جانا چاہیے۔" بھائیوں نے اسے مشورہ دیا تھا۔ "ورنہ تمہیں ساری عمر خود پر یقین رہے گا۔ میں انٹرویو دیتی تو سلیکٹ کر لی جاتی۔ اپنے اس یقین کو توڑنے کے لیے اس سے اچھا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔"
ان سب نے مل کر سوچا تھا۔ ابا جان نے بھی تائید کی تھی۔ "کوئی زور زبردستی نہیں۔ مناسب نہ لگی تو منع کر کے آجانا۔"
وہ اپنے آپ کو آزمانے اس کے پیچھے چلی۔ یہاں تک ساتھ لانے والی ایم ڈی کے کمرے کے باہر اسے چھوڑ کر رک گئی۔ کون جانے جو اندر جاتے اس کے پر جلتے ہوں۔ زندگی میں بہت سے پروٹوکول ہیں۔ ان سے نمٹنا بھی سیکھنا ہوگا۔
وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ میز کے اس طرف بیٹھے ادھیڑ عمر کے بزرگ نے جیسے اس کو لمحے بھر میں مسحور کر دیا۔ سرمئی بالوں اور سفید قلموں سے مسکراتے اور کچھ سوچتے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھائے۔ وہ اس کے بیٹھنے کے منتظر رہے۔
"میرا نام عبیر عباس ہے۔" شاید اس کی آواز اتنی مشینی اور بے روح نہیں تھی اور اس نے یہ بھی نہیں کہا۔ فرمایئے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔ لیکن اس نے دیکھا' وہ کتنی لائق شاگرد ہے اور کتنی جلدی سیکھ رہی ہے۔ بلا سے اس کے رزلٹ کارڈ پر سی گریڈ لکھا گیا تھا۔
"میں جانتا ہوں۔" انہوں نے بھاری' لیکن ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔
"کیسے؟" لیاقت دھری رہ گئی اور اس نے پھر ایک بے تکا سوال کر ڈالا تھا۔

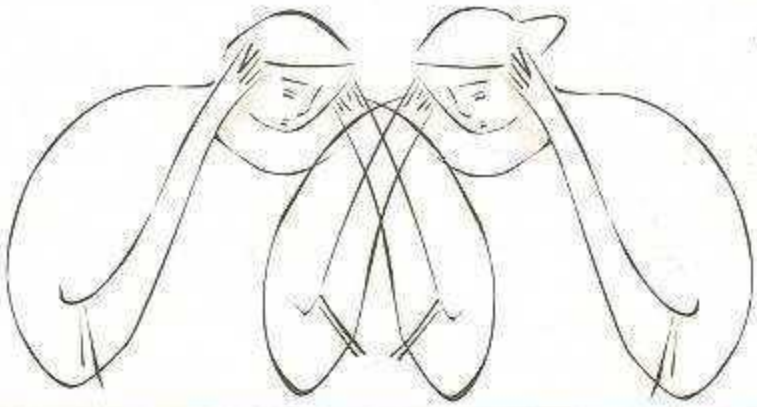

صحت کے ایسے مسائل جن پر کسی سے بات کرنے میں آپ کو مشکلات پیش آتی ہیں
اور آپ اُن کے حل کے بارے میں فکر مند ہیں ؟

اِن مسائل پر قابلِ اعتماد اور درست، حقائق پر مبنی معلومات اور ماں اور بچے کی صحت و نگہداشت کی اعلیٰ اور معیاری مشاورت و خدمات کے لئے آج ہی "بہتر زندگی سینٹر" تشریف لائیں۔
اپنے قریبی "بہتر زندگی سینٹر" کا پتہ حاصل کرنے کے لئے یا مزید معلومات کے لئے 24 گھنٹے مُفت کال کریں 0800 22333
ابھی وزٹ کریں www.srhmatters.org اور تربیت یافتہ، ماہر ڈاکٹر سے حاصل کریں اپنے ہر سوال کا جواب مکمل راز داری کے ساتھ۔

بہتر زندگی سینٹر، بہتر زندگی میں پہلا قدم

0800 22333
SRHmatters.org

www.pkdigest.com

"ایسے کہ میں نے ہی آپ کو بلوایا ہے۔"

"آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟" جس دن سے خط ملا تھا' اس وقت سے ذہن میں اٹکا سوال از خود اس کی زبان سے پھسلا۔

"انٹرویو مجھے کرنا چاہیے۔ لیکن آپ کرنا چاہتی ہیں تو آپ ہی کر لیجیے۔" وہ گھبرا سی گئی۔ اس کے لہجے میں ماتحتوں والی مرعوبیت پیدا ہوتے شاید زمانے درکار تھے۔

"میرا مطلب تھا' میرے گریڈز اچھے نہیں آئے۔ میرا جاب کا کوئی سابقہ تجربہ بھی نہیں' اور میرے گھر والے کہتے ہیں' مجھ سے بہت غلطیاں ہوتی ہیں۔ میرے پاس کوئی سفارش بھی نہیں۔"

"اوکے۔" انہوں نے اپنا پاپ پلیٹ میں رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتے کہا۔

"ہم آخر سے شروع ہو کر پیچھے کی طرف چلتے ہیں۔ سفارش تو آپ کی آئی ہے اور اتنی تگڑی کہ میں نا نہیں کر سکا۔ گھر والوں کو ہم ہمیشہ غلط لگتے ہیں۔ میرے گھر والے بھی مجھ پر بہت بھروسا نہیں کرتے۔ جب یہاں سے آپ جائیں گی تو آپ کے پاس جاب کا سابقہ تجربہ آجائے گا۔ اور گریڈز اس جاب میں اہم نہیں۔ کیونکہ آپ نے سوال نہیں کیا کہ آپ کو کیا کرنا ہوگا۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" اس نے ہونقوں کی طرح بوکھلا کر دہرایا تھا۔

"یہ سوال پہلے آنا چاہیے تھا۔ آپ کو انٹرویو دینا نہیں آتا۔ یہ عیب آپ نے نہیں گنوایا۔"

تڑتڑ بولتی اس کی زبان ایسے موقعوں پر ہمیشہ گونگی ہو جاتی تھی۔ اس نے نہایت سنجیدہ چہرے کے ساتھ انتہائی غیر سنجیدہ گفتگو کرتے باس کا چہرہ لمحے بھر کو دیکھا۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" اس نے اب اپنا چہرہ میز کے اس طرف بیٹھے صاحب کی طرح سنجیدہ بنا لیا تھا۔

"ہاں۔ اب بات ہوئی۔" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔

"مجھے بتایا گیا تھا' تم نے ایک اسکرپٹ لکھا تھا۔" وہ لمحے بھر کو رکے' شیشوں کے فریم سے جھانکتی آنکھیں۔ جن میں عقاب کی سی چمک کوندتی تھی۔ کچھ دیر کو اس پہ ٹھہریں۔

"تم کہنے میں کوئی حرج تو نہیں۔ اگر میری کوئی بیٹی ہوتی تو لگ بھگ تمہاری عمر کی ہوتی۔ تو قصہ یہ ہے کہ وہ اسکرپٹ کوئی اعلا درجے کی تحریر نہیں تھی۔"

"عجیب آدمی ہے۔" اس نے دل میں جھنجلا کر سوچا۔ اس نے کب دعوا کیا تھا۔

"ایک سے ایک اعلا ادیب یہاں بھرا پڑا ہے۔ مگر پھر بھی تمہیں چنا گیا۔ کیونکہ میں اپنی نسل سے مایوس اور تمہاری نسل کی طرف امید سے دیکھتا ہوں۔ تم لوگوں کے اندر چراغ جلتے ہیں۔ تمہیں وطن کا دکھ ہے۔ تم یہاں سے فرار نہیں چاہتے' یہیں رہ کر تبدیلی چاہتے ہو۔ کیا نام تھا بھلا اس پلے کا۔" پردیسی؟ جلاوطن۔"

"آپ نے ڈرامہ دیکھا نہیں' لیکن آپ کو یہ پتا ہے کہ اس کا اسکرپٹ معیاری نہیں تھا۔ آپ کو اس کا نام یاد نہیں' لیکن اس کا موضوع یاد ہے۔"

وہ بڑی فراخدلی سے مسکرائے۔ ایک طویل مسکراہٹ۔

"وہی۔ بالکل ویسا' جیسا مجھے بتایا گیا تھا۔" انہوں نے اپنی مسکراہٹ وہیں روک دی۔ "تم عباس کی بیٹی ہو۔ تمہاری رگوں میں ان کا خون ہے' جو اس وطن کے لیے قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ میں ان کا اس قدر احترام کرتا ہوں کہ تم نہ بھی چاہتیں تو تمہیں اس جگہ زبردستی بلوا لیتا اور تمہاری جینز میں شامل اس خون کا پورا پورا فائدہ اٹھاتا۔ تم ہمارے لیے کام کرو گی۔ ہمارے لیے اسکرپٹ لکھو گی۔"

ان کے انداز میں سوال نہیں فیصلہ تھا۔

www.pkdigest.com

"میں نے پھر کوئی اسکرپٹ نہیں لکھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ تبدیلی اس طرح نہیں آتی۔"
"اتنی سی عمر میں کام بھی کرلیا' مایوس بھی ہوگئیں۔"
"مجھے کس کام کے لیے سلیکٹ کیا گیا ہے؟"
"اگر مجھے پتا چل جائے کہ تم یہاں کام پر آمادہ ہو تو میں تمہیں تفصیل بتا سکتا ہوں۔ ورنہ شاید تفصیل سے آگاہ نہ کروں۔"
"یعنی پہلے مجھے ہامی بھرنی ہے۔ کام کی نوعیت بعد میں طے ہوگی۔"
"ایسا ہی ہے۔"
"میں آپ کے ساتھ کام کا وعدہ کرلوں اور آپ مجھے کہیں کہ فلاں کو قتل کر آؤ۔"
"ہاں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کسی کو قتل کروانا ہو تو تم سے بہتر کوئی نہیں۔"
اس نے ایک نظر دفتر کے درودیوار پر ڈالی۔ آفس میں گھستے ہی ارد گرد کا جائزہ لینے کے بجائے وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔ اور یہ بھی عجیب بات ہے نا چاہتے بھی لوگ اس کو ہر قسم کی بحث میں الجھا لیتے ہیں۔ اسے پتا بھی نہیں چلتا' وہ کب سوالوں کے جواب دینے میں جُت جاتی ہے۔ نہ یہ کسی امیری این جی او کا دفتر تھا' نہ کوئی ورک شاپ۔ بظاہر تو دفتر ہی تھا۔ لیکن یہاں ایسا کیا ہوتا ہوگا۔ کسی چیز سے جھلکتا بھی نہیں تھا۔ سامنے بیٹھے بزرگ کہیں سے بھی خطرناک نہیں لگتے۔ کبھی مسکراتے ہیں۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔
"پھر کس نتیجے پر پہنچی ہو؟" انہوں نے اپنے سامنے کھلی فائل ایک طرف سرکا دی۔
"مجھے آپ کو جوائن کرنا چاہیے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ میں اس طرح نہیں کر سکتی۔"
"میں نے جاب کے لیے نہیں پوچھا' میرے اتنے طویل مطالعے کے بعد تم کو لگا' میں ناقابل اعتماد نہیں؟ کسی کو قتل کرنے نہیں بھیجوں گا۔"
وہ چپ رہی۔ جب آپ کسی کا چہرہ پڑھ رہے ہوں تو اس بات سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں کہ آپ کو بھی عین اسی وقت اسی طرح پڑھا جا رہا ہے۔
"میں بتاتا ہوں' ایسا ہے بیٹا! کہ میں اتفاق سے تمہارے بیشتر حلقۂ احباب سے آگاہ ہوں۔ اعجاز سے' قیصر سے جب تک وہ واپس نہیں چلا گیا' تمہارے استاد محترم فیصل صاحب سے' پرفارمنگ آرٹس والی ثریا سے' فاروق سے جن سے تمہاری بہت پرانی دوستی نہیں' سارہ حق سے اور ان کی حقوق نسواں والی کمیٹی سے' اینڈ آف کورس حمیرا' رضا' عثمان آپ کے بہنوئی نعیم ملک۔ ان میں سے کچھ کا میں نے صرف ذکر سنا ہے اور کچھ سے میں ملا ہوں۔"
لمحے بھر کو اسے محسوس ہوا' ان سارے ناموں میں کسی ایک نام پر اس کے تواتر سے دھڑکتے دل کی ایک دھڑکن غائب ہوگئی تھی۔
"تم سے ملتا رہتا تھا۔ حالانکہ وہی زیادہ ضروری تھا۔"
"آپ میرے بزرگ ہیں۔ پوچھنا بنتا تو نہیں مگر یہ سوال مجھے چبھ رہا ہے۔ کیا یہ دفتر محکمۂ جاسوسی کا ہے؟"
"صحیح پہنچی ہو۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ایک طرح سے Yes' جاسوسی کا لفظ بڑا بدنام ہوگیا ہے۔ علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں محکمۂ جاسوسی بازار کا نرخ معلوم کرتا تھا۔ فرض کیا ہم صرف یہ جاسوسی کریں' ہمارے ارد گرد بسنے والوں میں پاکستان دشمن کہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ صرف ایک ایسی لسٹ تیار کریں جو براہ راست یا بلاواسطہ طور پر پاکستان کے خلاف باتیں کرنے والوں کی ہو۔ ایسی بات جو بظاہر بڑی بے ضرر ہوتی ہے اور دیکھنے میں کسی مقصد سے کی بھی نہیں گئی ہوتی۔ لیکن وہ پاکستان کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

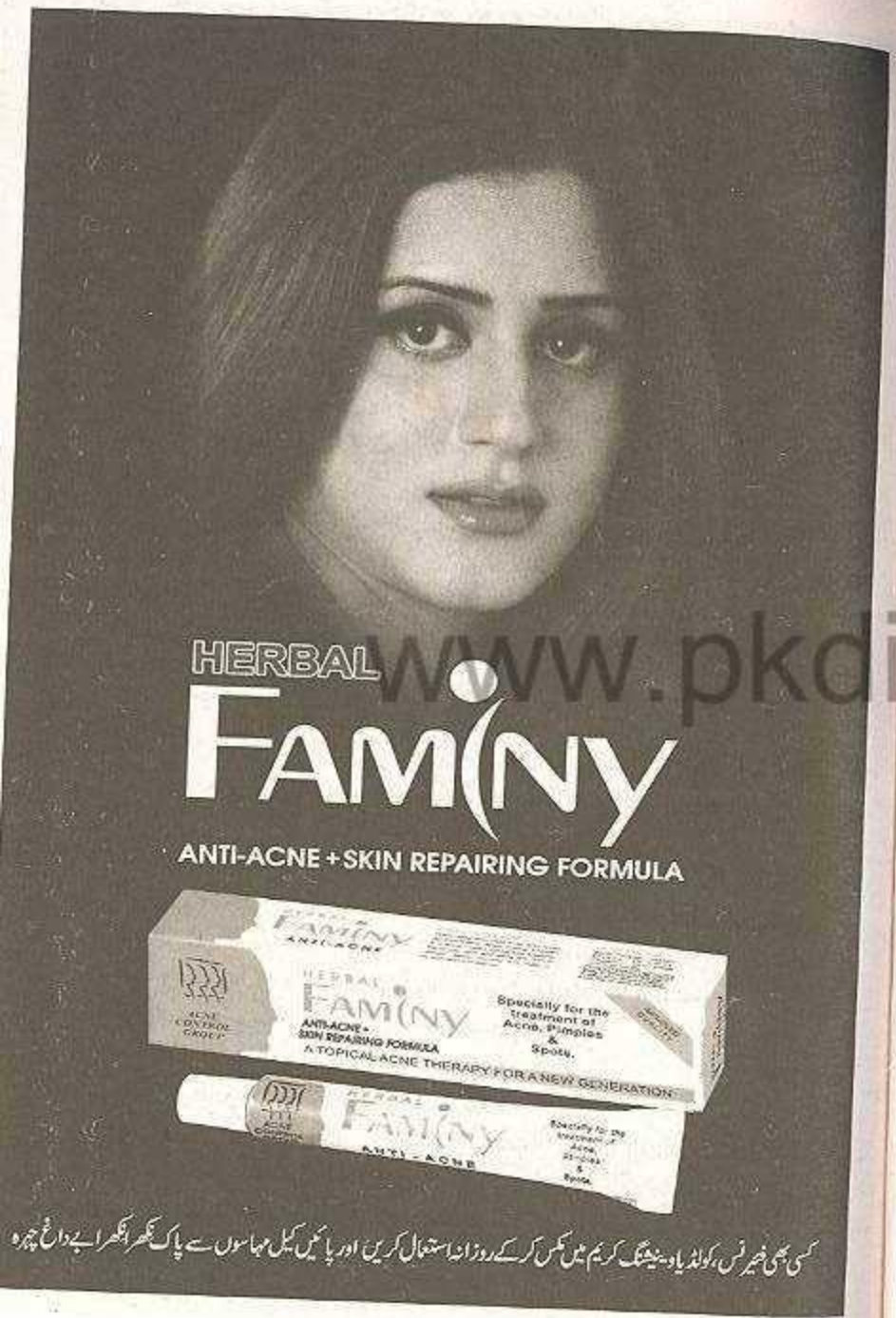

"اور جب ایک ایسی لسٹ تیار ہو جائے تو مجھے ان کو چن چن کر قتل کرنا ہوگا؟ بات یہ ہے سر! میں نے گینگسٹرز (نوجوانوں) میں ایسے بہت لوگ دیکھے ہیں جن کا کہا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن بزرگوں سے میرے بڑے اچھے مراسم رہے ہیں۔ وہ مجھے بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ لیکن آپ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئے۔"

"لیکن میں نے تو سنا ہے، تمہیں ایسی الجھی الجھی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔"

"میں ایک گمنام ہستی ہوں۔ اتنا کچھ آپ نے میرے بارے میں کہاں سے سن لیا؟"

"اس کو چھوڑو۔ اب ذرا سنجیدگی سے بتاؤں، میرے پاس جاب نہیں ہے۔ جاب کے لیے تو تم نے اپلائی بھی نہیں کیا تھا۔ لہٰذا توقع بھی نہیں کر رہی ہوگی۔ ہم یہاں ریسرچ شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ریسرچ کا موضوع اور Method (طریقہ) تم کو اچھا لگتا ہے تو شروع کر دینا۔ لیکن اس دوران کوئی اچھی جاب کی آفر آتی ہے تو تم جا سکتی ہو۔ کمپنی تمہارے مستقبل میں رُکاوٹ نہیں بنے گی۔ میری اس فرم میں سو سے کم لوگ ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی غیر معمولی نہیں۔ ہر ایک اپنے اندر غم لے کر یہاں آتا ہے۔ کوئی کسٹم سے دکھی ہے، کسی کو ذات سے دکھ پہنچے ہیں، بنیادی طور پر تو ہم پلپ (Polp) تیار کرتے ہیں، لیکن تم چونکہ لکھنے پڑھنے والی لڑکی ہو، اس لیے تم رپورٹ تیار کرو گی۔ ریسرچ رپورٹ۔ لیکن اس میں ہمیں خانہ پری نہیں کرنی۔ کام کے ساتھ دیانت داری چاہیے۔ ہمیں کسی قسم کی غیر ملکی فنڈنگ حاصل نہیں۔ ہم اپنے ہی پرافٹ سے یہ کام کریں گے۔ کچھ ادارے ہمارے ابھی بھی قابل بھروسا ہیں، ہو سکتا ہے ہمارا کام کسی کام آئے اور وہ ہم کو معاشی طور پہ سپورٹ کر لیں۔ سو ہم تمہیں بہت شان دار پیکج تو نہیں دے سکتے، لیکن تمہارا نقصان نہیں ہونے دیں گے۔"

"اس کا فیصلہ اپنے ابا سے اجازت لینے کے بعد کر سکوں گی۔ جو کچھ آپ نے کہا، وہ سب میں ابا کو بتا دوں گی۔"

"ہاں، ضرور، اگر سب کچھ اپنے والد کو بتا دیا جو میں نے بتایا ہے تو مجھے یقین ہے وہ نا نہیں کریں گے۔ سو کام کی بات کو ہم لپیٹتے ہیں۔ جتنی دیر ہم چائے پیتے ہیں، مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ "میں اپنے بارے میں بس اتنا ہی جانتی ہوں جتنا آپ نے مجھے بتایا۔ میں آپ کو کیا کہہ کر بلاؤں؟ آپ کی تو اولاد نہیں تھی۔ اس لیے آپ نے مجھے بیٹی کہہ دیا۔ لیکن میں اپنے ابا کی جگہ کسی کو بھی نہیں دے سکتی۔"

"نا، نا، غلط سمجھا۔ میں نے کہا تھا، میری بیٹی نہیں ہے۔ یہ نہیں کہا تھا اولاد نہیں ہے۔ ویسے بھی کچھ لوگوں کی جگہ کوئی لے بھی نہیں سکتا۔ میں اس وقت کے لیے دعا کروں گا جب تم مجھے ابا مان لو۔ کہو بے شک مت۔"

اتنی دیر کے ماحول میں تناؤ کے بعد وہ خوش دلی سے ہنس پڑی۔ "آپ کی دعا ضرور پوری ہوگی۔ کیونکہ روایت ہے کہ جب آپ کسی کے لیے ایسی دعا کریں جس میں آپ کا کوئی مفاد نہ ہو تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔"

اس نے ان کی محدب عدسہ کے عقب سے چمکتی آنکھوں کو یک دم بجھتے دیکھا۔

"لیکن مفاد تو ہے میرا، کیا یہ دعا اب قبول نہیں ہوگی؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ یہ مفاد کی بات بھی ابا کو بتانی ہوگی۔

جب اداس آنکھوں والی لڑکی اندر آئی۔ وہ اس وقت تک چپ تھے۔ اداس لڑکی جس نے پشت سے آواز دے کر اپنا تعارف کرایا تھا۔ جس کے لہجے میں ایک زہریلی تلخی تھی۔ جیسے مٹھاس بھری آواز میں کسی نے تلخیوں کا زہر گھول دیا ہو۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی۔ منتظر رہی کہ چائے بنانے کا حکم دیا جاتا ہے کہ چلی جائے۔ پھر خود ہی ٹی کوزی اٹھا کر چائے پیالیوں میں انڈیلنے لگی۔

"تمہیں شاید اس چائے کی عادت نہ ہو۔ لیکن اس نے مجھے چینی سے ہٹا کر گڑ پر لگا دیا ہے۔ مجھے بھی اب گڑ کی

REMAINE
صرف 15 دِنوں کے اندر اندر بال گرنا بند
100%
ریمین دن میں دو بار بالوں کی جڑوں میں اس طرح اسپرے کریں کہ ساری جڑیں بھیگ جائیں اور پھر ہلکا سا مساج۔۔۔ بس!
ریمین یہ تو آئیلی ہے اور نہ کوئی اسکا سائیڈ افیکٹ۔۔۔ ایکدم پیور ہربل
بال گرنے کی کوئی بھی وجہ ہو، ریمین کا باقاعدہ استعمال
زیادہ سے زیادہ 15 دنوں میں بال گرنا بند کر دیتا ہے۔
REMAINE
STOPS HAIR FALL
100%
www.remaine.com.pk
"یقین کیجیے، اب آپکا ایک بال بھی نہیں گرے گا ۔ ۔ ۔ یہ ڈاکٹر غزم مُشیر کا وعدہ ہے

www.pkdigest.com

چائے اچھی لگنے لگی ہے۔ تمہیں اچھی نا بھی لگی تو دوا سمجھ کر ناک بند کر کے پی جانا۔"

اس نے کرسی پر بیٹھے پہلو بدلا۔ ایک دن کڑکی چائے پینے سے یقیناً "موت تو واقع نہیں ہوتی۔ لیکن یہ کون سا نظام ہے کہ آپ کو کڑکی چائے کا نشہ ہے تو مہمان بھی ضرور روی ہوں۔

اس نے پہلا گھونٹ بھرا تو جیسے کسی نے اس کا حلق مٹھی سے کھینچ نکالا ہوا۔ چائے اس حد تک میٹھی تھی کہ کڑوی لگنے لگی۔ اس نے خاموشی سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی چائے بھی ویسی تھی جیسے اس کی آواز۔ دوسرے گھونٹ میں اس کو ادرک کا مزہ آیا۔ تیسرے میں دار چینی کی مہک۔ اگر یہاں کام کے سلسلے میں ٹرمز اینڈ کنڈیشن طے ہوئیں تو وہ یہ شق ضرور شامل کروائے گی کہ بے شک اس کا کوئی الاؤنس ضبط کر لیا جائے، لیکن اس ملغوبے کو پینے پر اس کو مجبور نہ کیا جائے۔ وہ اسی طرح کھڑی تھی۔ شاید تعریف کی منتظر۔

"بہت اچھی چائے ہے تھینک یو۔" اس نے اس کو دو جملوں میں نمٹانا چاہا۔

"لیکن آپ نے گھونٹ لیا تو آپ کے چہرے سے لگتا تھا کہ آپ چرائتہ پی رہی ہیں، آپ نے کبھی چرائتہ پیا ہے؟"

اس کی آواز میں بلا کا اعتماد تھا۔ جیسے اسے یقین ہو، اس کا مخاطب قطعی لاعلم اور جاہل شخص ہو۔ اس نے خاموشی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کبھی دھوئیں میں پکا کھانا کھایا ہے؟ کبھی اپلے تھاپے ہیں؟ کبھی گھر کے ہوتے بھی آپ کے ماں، باپ نے آپ کو دربدر کیا ہے؟ کبھی قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں؟"

وہ ہراساں ہو گئی۔ میرا قصور؟ بے شک یہاں کے لوگ دکھی ہوں گے، حکمران کے دکھوں میں میرا حصہ تو نہیں۔ کیا یہاں پر انٹرویو کے لیے آنے والے کا استقبال ایسے ہی تلخ کلامی سے کیا جاتا ہے؟ چائے تلخ، گفتگو تلخ۔" وہ پلٹ کر جا چکی تھی۔

"یہ مت سمجھنا میں نے یہاں سب کو سر چڑھا رکھا ہے۔ کچھ لوگوں کو میں بطور خاص رعایت دیتا ہوں۔"

اچانک ان میں افسرانہ تنک مزاجی نے سر اٹھایا۔ وہ چائے کا آخری گھونٹ بھر کے کھڑی ہو گئی۔ یہ تنک مزاجی بھی ضرور تھی۔

"پتا نہیں میں بھی ان میں شامل ہوں گی یا نہیں۔ لیکن اس لہسن، ادرک والی چائے کا شکریہ۔"

وہ اس کے ساتھ اٹھ کر باہر آ گئے۔ معلوم نہیں وہ ہر ملازم کو اسی طرح رخصت کرنے دروازے تک آتے ہیں یا وہ بھی ان میں سے ہے، جن کے لیے بطور خاص رعایت ہے، کیوں ہے مگر؟

"فن تعمیر سے بھی کچھ دلچسپی ہے تم کو؟" ایک قطار میں بنے بے حد دلکش گھروں کو دیکھتے انہوں نے کہا۔

"ہمارے ہاں فنکار بھی بہت ہیں، چور بھی۔ ہمارا اور یجنل فنکار مہنگا ہے۔ لیکن چور سستا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ مال کو لاٹھیوں کے گز بیچتا ہے۔ کون سی تعمیر آپ کو پسند ہے؟ یورپین، اسپینش، جرمن؟ غرناطہ میں کسی کا بڑی محنت سے بنا گھر ایک بٹا دس قیمت پر اس سڑک کے کنارے تعمیر ہو سکتا ہے۔ اس غریب کو وہاں بیٹھے پتا بھی نہیں کہ وہ ظفر علی روڈ پر شفٹ کر گیا ہے۔ قدیم زمانوں میں پھر بیکی بدی کا رواج تھا۔ ٹھگ بھی اپنی بستیاں الگ بناتے تھے۔ آج کے ٹھگ درمیان میں بڑے طنطنے سے رہتے ہیں۔ یہ جو سامنے عظیم الشان محل دیکھ رہی ہو، یہ اس وزیر کا ہے کہ جب افغانستان میں جہاد ہو رہا تھا، یہ طورخم کے راستے بے روک ٹوک ہیروئن درآمد کرتا تھا۔ کچھ کو اوجڑی کیمپ کے حادثے نے ارب پتی بنا دیا۔ کچھ اس سے بھی پہلے مسلمانوں کو کچل کر انگریز کی وفاداری میں میلوں پر پھیلی اراضی کے مالک بن بیٹھے تھے۔ یاد رکھو، امیر آدمی میرے اور آپ کے خون کی قیمت پر امیر ہوتا ہے۔ اور اپنی دھاک دنیا بھر پر جماتا ہے۔ آج عزت پیسے کی ہے۔ نہ وہ کسی کو پوچھنے کی جرأت دیتا ہے، نہ کسی میں ہمت ہے کہ

اس سے پوچھے۔ جس جس نے ایسا پیسہ اکٹھا کیا، اپنے گرد ایک حصار بنا لیا خود کو ناقابل پرستش سمجھ کر۔ ہم بھی پیسے کی پرستش کرنے والی قوم بن گئے۔ ہم تو بزدل نسل تھے۔ لیکن تم دلیر لوگ ہو۔ جو ہم نہیں کر سکے تم کرو گی نا؟"

وہ اس طویل سڑک پر پتا نہیں کب سے چل رہی تھی۔ اس کا ذہن منتشر تھا۔ اور وہ بار بار منتشر ہوتا تھا۔ کہیں کوئی منزل بھی ہے یا بے سمت سفر جاری رکھنا ہے۔

"ظلم کا کہیں کوئی خاتمہ نہیں۔ ہم نے انگریز کے عہد میں ظلم سہے۔ آزادی کی آس میں۔ آزادی ملی تو چند ہی برسوں میں ہمیں لگا ہم آزاد نہیں ہوئے، بس ہمارے آقا تبدیل ہو گئے ہیں۔ وہ انگریز ہی کی طرح ہمیں لوٹ کھسوٹ کر کھاتے رہے۔ ان ہی کی طرح بندوق کے زور پر حکومت کرتے۔ آواز اٹھانے پر قلعوں میں قید کیے جاتے۔ سختیاں سہتے سہتے مر جاتے۔ جو کوئی ایک آدھ سخت جان بچ کر نکل آتا۔ وہ چپ چاپ وطن چھوڑ کر پردیس میں جا بستا۔ پھر کوئی دوسرا آ جاتا۔ ہم بھولے بھالے تبدیلی کی آس میں اس کے پیچھے لگتے۔ خواب دیکھتے۔ لیکن سب ایک سے تھے۔ کوئی جابر تھا۔ کوئی آمر تھا تو کوئی مغرور۔ درمیان میں کوئی بھلا آ بھی گیا تو ہم نے بڑی سہولت سے اس سے نجات حاصل کر لی۔"

وہ چل رہی تھی اور فقرے اس کے کانوں میں گونجتے جا رہے تھے اور جب واپسی پر اس کا گھیراؤ کیا گیا کہ اپنی زندگی کا پہلا انٹرویو دے کر آئی تھی اور بڑی اہم ہوئی تھی تو اسے لگا اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ گم صم سی ان کے بیچ بیٹھی رہی۔ سب اس سے تابڑ توڑ سوال کر رہے تھے۔

"انہوں نے کیا پوچھا تھا؟"

"تم نے کیا جواب دیا۔"

"اس کا کوئی یہ جواب ہوتا ہے۔"

"انٹرویو میں کوئی ایسے بولتے ہیں؟"

وہ جیسے جرم کر کے آئی تھی۔ سب اس کو گھیرے میں لیے بیٹھے تھے۔ کبھی سوال عثمان کی طرف سے آتا تھا۔ کبھی حمیرا کی۔ درمیان درمیان میں اماں بھی مختصراً کچھ پوچھتی تھیں۔ تماشا دیکھنے کو تو بڑی تائی بھی آئی تھیں۔ بے شک سوال ان کے پاس کوئی نہیں تھا۔

"تم انٹرویو دیتے نروس ہو گئی تھیں بیٹا؟"

وہ جب ابا کے لیے شام کی چائے لے کر گئی تو انہوں نے اپنے مخصوص رسان سے پوچھا تھا۔

"نہیں تو ابا! لیکن جنہوں نے میرا انٹرویو کیا وہ عجیب سے تھے۔ کچھ مختلف سے اور وہ انٹرویو بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ میرے ارد گرد رہنے والے سب لوگوں کو جانتے تھے۔"

"مثلاً" کس کو جانتے تھے۔ کریم بی کو، آپ کی بڑی تائی کو!"

"نہیں۔" اس نے بغیر مسکرائے اپنی مخصوص سیٹی پر بیٹھتے کہا۔ "آپ کو، دادا کو، میرے حلقے میں میرے سارے دوستوں کو۔"

"عموماً" کمپنی جب کسی کو رکھنا چاہتی ہے تو اس کے بارے میں مکمل معلومات کر لیتی ہے۔ اگر ان کو معلومات تھیں تو اس کا مطلب تم رکھی گئیں اور بڑی بات ہے کہ اپنے بھائی اور دیگر لوگوں کی طرح جاب کے لیے کئی سال دھکے نہیں کھانے پڑے۔ جہاں تک میں نے پتا کروایا ہے، وہ ایک پیپر مل ہے۔ تمہیں کس چیز کی آفر دی گئی۔"

"انہوں نے کہا ہے، یہ مستقل جاب نہیں۔ کوئی ریسرچ پروجیکٹ ہے۔ کچھ لکھنا ہو گا۔"

"تو کام تم کو پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ میں کرنا ہو گا۔"

"پتا نہیں۔ میں نے ان سے کہا میں اپنے ابا سے اجازت لینے کے بعد جواب دوں گی۔"

www.pkdigest.com

"ابا کی اجازت سے چلو گی تو اپنے فیصلوں پر اعتماد کیسے کرو گی؟ ابا کب تک ساتھ چلے گا؟"
وہ اندر سے کانپ گئی۔
"مشورہ ضرور کرتے ہیں بیٹا! لیکن پھر فیصلہ خود کرتے ہیں اور انجام اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں۔"
"وہ مجھے جانتے ہی آپ کے حوالے سے ہیں۔ دوسرا میرا تھیٹر پلے جس کا اسکرپٹ انہوں نے ریجیکٹ کر دیا کہ اس میں بہت خامیاں تھیں۔"
"وہ تو ہوں گی ہی۔ اس کے لیے عمر کا تجربہ چاہیے۔ لیکن تحریر ناپسند کر کے پھر تحریر کے شعبے میں رکھ لیا۔ وجہ؟"

"آپ کی وجہ سے۔"
"لیکن میں تو تمہارا کام نہیں کروں گا۔ تم اپنا کام خود کرو گی اور یاد رکھنا میں نے کسی سے تمہاری کوئی سفارش نہیں کی۔ جا رہی ہو پھر؟"

☼ ☼ ☼

قیصر کے چلے جانے کے بعد ان کے چھوٹے سے دفتر میں ہونے والا معمولی سا کام بھی بند ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے ضروری سمجھا۔ کم از کم اعجاز کو آگاہ کر دے کہ اسے کام مل گیا ہے۔ البتہ وہ جب بھی دفتر کو از سر نو کھولنے کا ارادہ کرے۔ اعجاز نے بتایا' وہ خود بھی رزلٹ کے بعد سے دھکے کھاتا پھر رہا ہے۔ کسی مناسب اور اچھے روزگار کی تلاش میں یا گزارہ اور قابل برداشت روزگار' ورنہ جو ہے اور جیسا ہے رزق۔ ایک بات سے کیا کیا بات اس کے ذہن میں سرسراتی نہیں پھری۔ سارہ حق' بھرے پیٹوں کو پلیٹ میں رکھ رکھ کر روزگار پیش کرتی پھر رہی تھیں۔ لیکن وہ اپنے اس شدید مداح کے لیے' جس نے سولہ سال گھر والوں کے خون پسینے کی کمائی سے پڑھا' اس لیے تھا کہ کسی قابل ہو کر قرض میں جکڑا ان کا بال بال رہا کرا سکے۔ کسی قسم کا حل نہیں نکال سکیں۔
"ایک تو ہماری نئی نسل تن آسان بہت ہے۔ کوئی کیا کرایا کام ان کو پکڑا دے۔ محنت کرو' اپنے لیے روزگار خود ڈھونڈو۔"

ان دنوں ان کا گراف بہت بلند تھا۔ وہ ہر وقت ٹی وی پر بیٹھی اس حکومت پر گرجتی برستی رہتی تھیں جس کے تخت کے پائے ویسے ہی لرز رہے تھے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو گرتی پڑتی دیوار کو دھکا دینے زور شور سے ڈٹ جاتے ہیں۔ پارٹیوں کو ہر وقت شہیدوں کا خون درکار رہتا ہے۔ انگلی تو وہ بھی کٹوا لیتی تھیں۔ ایسے لوگ کس پارٹی میں جائیں گے' فیصلہ عموماً الیکشن کا نتیجہ آنے کے بعد کیا جاتا ہے یا انتظار کہ کب کوئی شب خون مارتا ہے۔
قیصر چلا گیا۔ پتا نہیں وہ بچھڑے ہوؤں کو یاد بھی کرتا تھا یا نہیں۔ دو سال ہر وقت ساتھ رہتے لگتا' وہ یونہی زندگی بھر ساتھ ساتھ جدوجہد کرتے رہیں گے۔ لیکن جب جب اپنی زندگیوں اور ناکامیوں کی طرف پلٹے تو بچھڑے ساتھی ہوا سے اڑتے خشک پتے کی طرح کہیں سے کہیں جا نکلے تھے اور کون جانے وہ بڑھاپے میں ان لوگوں کا نام یاد کرنے بیٹھے' جن کے نام کے بغیر زندگی ادھوری تھی اور حافظہ ساتھ نہ دے۔
ان دنوں اس کو گھر میں بھی گھبراہٹ رہتی تھی۔ جیسے ہر طرف مایوسی کی فضا ہو۔ تنویر جب سے آئی تھی صرف ایک دفعہ کہیں باہر گئی تھی۔ کہاں اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ وہ کبھی پلٹ کر اپنی نوکری کی طرف بھی نہیں گئی بڑی سہولت سے وہ اپنے Explanation لیٹر وصول کرتی اور بھول جاتی۔ سارا دن اس کا گھر کے دروازوں کی کنڈیاں چیک کرنے میں مصروف گزرتا۔ پھر بھی اسے شک ہوتا' ابھی یہاں کوئی کھڑا تھا۔ میں نے دروازہ بند کیا تو پیچھے سے کسی نے کھولنے کی کوشش کی تھی۔ خوف سے ستا ہوا پیلا چہرہ لے کر وہ پلٹتی۔

"کوئی نہیں ہے بی بی۔" چچا عبدالعزیز اپنا حقہ چھوڑ بار بار دروازے کی طرف دیکھ کر آتے۔ "وہم ہے بی بی!"
تمام وقت شیشوں پر پردے گرے رہتے۔ وقفوں وقفوں سے وہ پردے سرکا کر شیشے سے ناک ٹکا کر باہر جھانکتی۔ پھر جیسے کسی کو وہاں پا کر جلدی سے پردے برابر کر دیتی۔ تیزی سے پلٹ کر اپنی بیٹی کو ڈھونڈتی اور اچھی بھلی ہنستی کھیلتی بچی کو جھپٹ کر گود میں بٹھا لیتی۔ بیشتر وقت اندھیرے میں گزار دیتی اور کسی قیمت پر کسی ڈاکٹر کے پاس جانے پر آمادہ نہیں تھی۔

شہریار چند دن کے لیے آیا تو اس کے لیے دوائیں اور گھر والوں کے لیے ہدایتیں تجویز کر گیا۔ یہ سب سے سخت وقت تھا اور ان کو بہرحال اس سے گزرنا ہی تھا۔ شہریار کا خیال تھا اس کے توہمات کو توڑنے کی کوشش نہ کرو۔ اس سے بحث مت کرو۔ لیکن اس سے اتفاق بھی نہیں کرو۔ بس چپ چاپ سن لو توجہ سے۔ ہمدردی سے نہیں۔ البتہ گڑیا نے مانوس ہونے میں بہت وقت نہیں لیا تھا۔ وہ مینا کی طرح چہکتی گھر بھر میں کدکڑے لگاتے پھرتی تھی۔ خاموشی سے ماں کی شکل دیکھنا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بے دھڑک ابا کے کمرے میں گھستی اور بغیر کسی مرعوبیت کے کہ وہ کچھ لکھ پڑھ رہے ہیں یا ٹی وی دیکھ رہے ہیں' اچک کر اسٹول پر بیٹھ جاتی اور لایعنی سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتی۔ وہ بھی اس سے کبھی زچ نہیں ہوتے تھے۔ ساری شام اس کی خالہ کے ساتھ برف پانی کھیلتے گزرتی۔

☆ ☆ ☆

شہریار بے اطلاع آیا اور ہمیشہ کی طرح چونچال موڈ میں نہیں تھا۔ فوجی ہونے کے ناتے اس کی بار بار پوسٹنگ آتی تھی۔ تبدیلی کا خیال اسے تنگ کرتا تھا۔ وہ کسی جگہ مانوس ہونے لگتا کہ اسے بدل دیا جاتا۔ زندگی میں اس نے اس قدر گھر بدلے تھے کہ ثبات کا تصور اس کے لیے خواب ہو کر رہ گیا تھا۔ پچھلی دفعہ آیا تو اطلاع لایا تھا کہ عنقریب اس کا دانہ پانی وہاں سے اٹھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے دفتری معاملات کا بہت تفصیل سے ذکر نہیں کرتا تھا۔ اپنے گھر سانذہ اترنے کے بعد وہ میانی صاحب گیا۔ استاد کے مزار پر فاتحہ کے بعد وہ سیدھا 80F آگیا۔ شاید یہ 80F کی تازہ الجھنیں تھیں جس نے اس کو رنجیدہ کر دیا۔ یا کون جانے وہ گھر سے کس ملال میں گرفتار چلا تھا۔ آخر یہ گھر ہے۔ یہاں خوشیاں بھی اترتی ہیں رنج بھی۔ بعض گھروں کا تصور ہمارے ذہن میں پرائمری اسکول کی چھٹی بن جاتا ہے۔

تنویر کا یہاں آنا' عبیر کی معمول سے ذرا لیٹ میل سے وصول ہوا تھا۔ اس نے بہت تفصیل سے نہیں لکھا تھا۔ لیکن کسی سے چھپا نہیں تھا کہ اس کی واپسی کسی خوش وقتی کی دلیل نہیں تھی اور آخر ایک دن اس کو واپس آنا ہی تھا۔ انہوں نے بھی ایک دوسرے سے لفظوں سے اس اندیشے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن سب جانتے تھے' کسی دن انہیں ایک ایسے دن کا سامنا کرنا ہوگا۔ معلوم نہیں وہ دن خوشگوار ہوگا یا ناخوشگوار۔

گھر پر رہی یہ لمبی کہانی اس کو اس کی امی نے سنا دی تھی۔ اب اس کہانی میں کتنا نمک مرچ تھا اور کون کون سے بھگار لگائے گئے' وہ اندر کی حقیقت سے بہت زیادہ آگاہ نہیں تھا۔ وہ یوں بھی واقعات کی باریکیوں میں نہیں جاتا تھا۔ اگر اس کی واپسی ایک خوش کن امر ہے تو سب کے ساتھ مل کر خوش ہو جائے گا ورنہ ان کی اداسیوں میں حصہ بٹا لے گا بس۔

"نائلہ کی بیٹی ہے آخر۔ سسرال کے ٹینٹوے پر پاؤں رکھ کر حکومت کرے گی اور نہیں ملی حکومت تو چھوڑ کر آ گئی گھر۔ خود ہی تو بیاہ کیا تھا۔ بیٹی کے مستقبل کا بھی نہیں سوچا۔ سسرال میں تو سو سو باتیں ملتی ہیں سننے کو۔ نائلہ بی بی نے یہ تربیت تو نہ دی بیٹیوں کو۔ بی اے' ایم اے کروا دیا۔ سڑکوں پر رلتی پھریں گی تو کیا خاک گھر بسائیں گی۔"

اپنے جملے کے اختتام پر انہوں نے ایک اچٹتی سی نظر بیٹے پر ڈالی۔ تربیت کا نقص تو انہوں نے نکال دیا تھا۔ در پردہ جو پیغام انہوں نے دیا' وہ پہنچا بھی یا نہیں۔ ان کا دل جلا کر راکھ کرنے میں تو باپ بیٹے کو کمال حاصل تھا۔

وہ ان کے سامنے بیٹھا چاپ چاپ سب کچھ سن رہا تھا۔ ان کی ادھوری سی تسلی تو رہی کہ اتفاق نہیں کیا ان سے تو اختلاف بھی تو نہیں کیا۔ سر جھکائے اپنے چمکتے بوٹوں پر نظر جمائے کہیں سے کہیں پہنچا ہوا تھا۔ کہاں پہنچا ہوا تھا۔ وہ ماں تھیں۔ بے خبر نہیں تھیں۔ لیکن بااختیار بھی نہیں تھیں کہ اس کی سوچوں کو لگام دیتیں۔ کہاں سے لائیں وہ لفظ جن میں تاثیر ہو۔ ان کی توقع کے عین مطابق مگ کا آخری گھونٹ بھرتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کا پہلا سامنا گھر بھر میں چھائے سکوت سے ہوا۔ وہ گھر جس کے در و دیوار بولتے تھے۔ ایک ٹہنے کو اسے لگا گھر میں کوئی ہے ہی نہیں پھر اس کی نظر تائی نائلہ پر پڑی۔ خلاف معمول ان کے ہاتھ میں ناول کے بجائے اون سلائیاں تھیں۔ وہ غالباً "گڑیا کے لیے کچھ بُن رہی تھیں۔

عثمان اندر سے آیا تو بہت بشاش نہیں تھا۔ امی نے عبیر اور تنویر کے بازار جانے کی اطلاع دی۔ بڑی تائی اپنی سالانہ ٹرپ پر اپنے کسی اور رشتے دار کی طرف منتقل ہو گئی تھیں۔ دادی اماں اندر تھیں اور ابا کہیں اپنی اسٹڈی میں۔ وہ ایک ایک کو ڈھونڈتا کمرہ کمرہ پھرا۔ کتنا عجیب تصور تھا۔ اسے لگا یہ گھر نہیں ایک جیتا انگارہ ہے۔ جسے کسی نے پانی کا چھینٹا مار کر بجھا دیا ہے۔ جس گھر میں ہمہ وقت زندگی گونجتی تھی۔ ایک حادثے اور اس کے اثرات نے اس کو سناٹے میں گم کر دیا تھا۔ بہرکیف سمجھ دار لوگ ہیں' اس حادثے سے بھی نکل آئیں گے۔

وہ عثمان کے پاس بیٹھ کر چپ چاپ ڈسکشن کا کوئی ریپیٹ ٹیلی کاسٹ دیکھنے لگا۔ الیکشن سر پر تھے۔ لیکن بہت ہی کم لوگ ووٹ دینے کے موڈ میں نظر آتے تھے۔ دھڑا دھڑ قانون سازیاں ہو رہی تھیں۔ سپریم کورٹ سے فیصلے پے جا رہے تھے کہ کل کس نے دیکھی ہے۔ سب پاکستانیوں کی طرح جن کی رائے کی کوئی وقعت ہی نہیں ہوتی' وقفوں وقفوں سے وہ مبصر کی آواز کے ساتھ ان کی رائے آتی اور گم ہو جاتی۔ یونہی ہم کبھی کبھی چپ کا طلسم توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حتیٰ کہ عبیر اور تنویر واپس پلٹیں۔ بیٹی کے ہاتھ میں قند سے بڑی گڑیا تھی۔ وہ جوش میں چیختی چلاتی داخل ہوئی۔ ایک اجنبی کو اپنے ماموں کے پاس بیٹھا دیکھ کر ٹھٹھکی ... پھر اسی توتے کی طرح چیختی آواز میں شور مچاتی دوڑنے لگی۔ سب مردہ تنوں میں جیسے جان پڑ گئی۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔

بازار میں کیا کیا دیکھا۔ کیا کھایا اور کیا خریدا؟" اس کے پاس ساری رپورٹ تیار تھی۔ تنویر چپ چاپ شہریار کے پاس جا بیٹھی۔

عبیر نے تھیلوں کا ڈھیر میز پر رکھتے نووارد کی طرف دیکھا۔

"تم کب کے آئے ہوئے ہو؟ اور بتاتے کیوں نہیں آنے کا؟"

شہریار نے لمحے بھر کے لیے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک بالکل مختلف رنگ تھا۔ ایسا رنگ جو اس سے پہلے اس چہرے پر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس نے توجہ تنویر کی طرف کر لی۔ جو صوفے کے ایک کونے میں نئی غائب دماغی سے اپنی بچی کو اپنوں میں گھل مل کر چہکتا دیکھ رہی تھی۔ بہت ظلم کیا اتنے فاصلوں میں رکھ کر۔

وہ اس کو کیا جواب دیتا۔ وہ آنے کا کیوں نہیں بتاتا تھا اور کیسے اسے سمجھاتا' اس کے چہرے کا کوئی رنگ اس کے لیے کبھی اجنبی نہیں رہا۔ وہ جو ابھی بہن کے ساتھ باہر سے آئی تھی۔ اس کے چہرے پہ کیا لکھا تھا۔ شاید وہ لفظ لفظ نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن ہر مفہوم سے آگاہ تھا۔

اس نے آنے کا کیوں کہیں بتایا' یہ بھی اب بے معنی لگنے لگا تھا۔

www.pkdigest.com

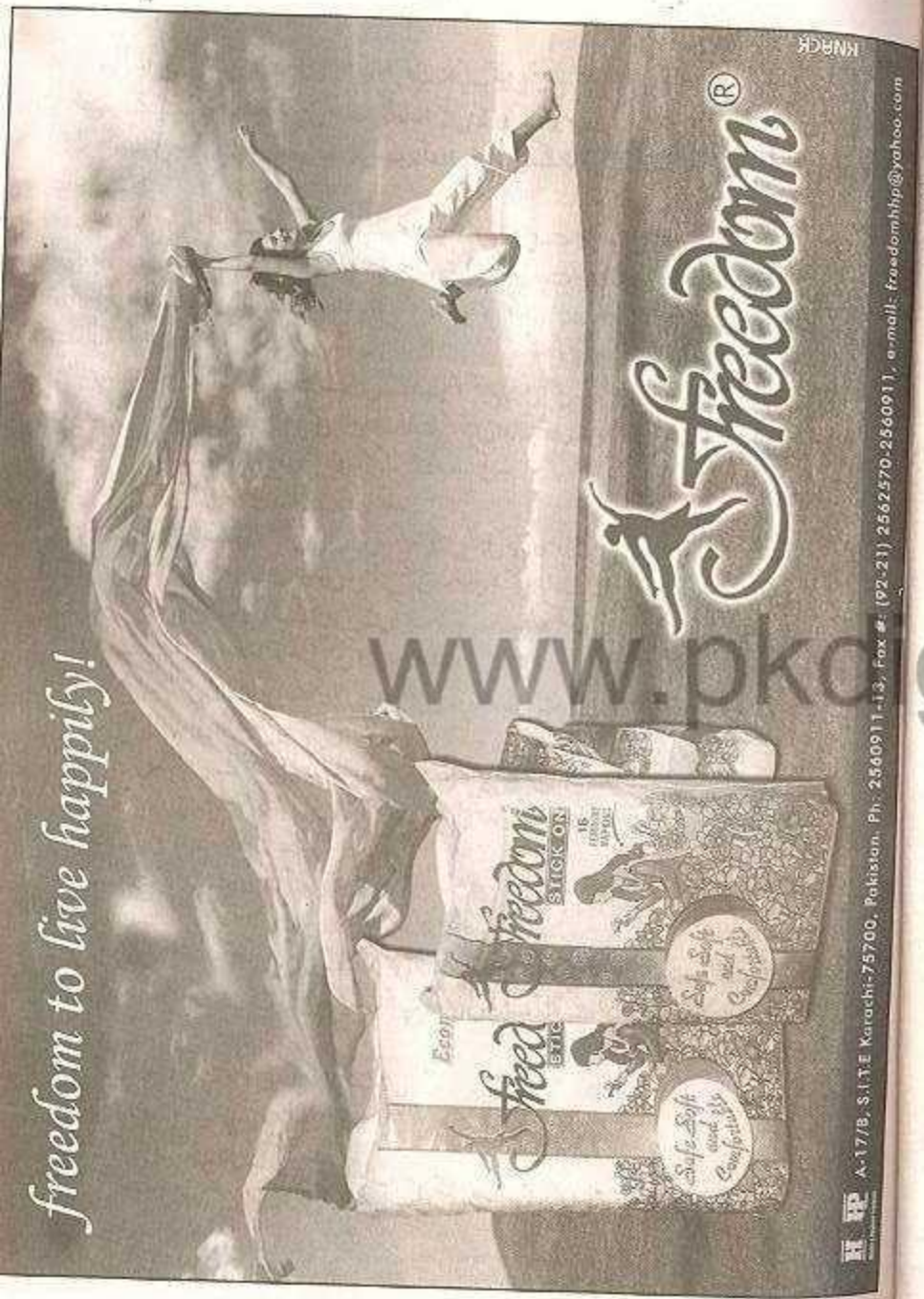

☆ ☆ ☆

عبیر نے اپنا کمرہ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن اپنی چیزیں ابھی وہاں سے نہیں ہٹائی تھیں۔ اس کو گمان گزرتا تھا' وہ ضرور پلٹ کر واپس چلی جائے گی کہ اس کو اپنے شوہر سے خوفناک قسم کا عشق تھا۔ تمام تر خامیوں سمیت اس کے کیے ایک ایک لفظ پر ایمان کی طرح یقین بھی۔ کتنی مرتبہ اس نے حمیرا اور اس تک اپنے شوہر کے بے معنی احکامات پہنچا کر دل آزاری کی تھی۔ کتنی معصومیت سے وہ خواہش مند رہتی کہ وہ سب کے سب اس کے شوہر کی اسی طرح تابعداری کریں جیسے وہ کرتی آئی ہے۔ گو اب اس کے دل میں کوئی غبار نہیں رہا تھا۔ اور ایسے میں روٹھ کر آجانا تو اس کی سمجھ میں آتا تھا لیکن واپسی کے راستے بند کر کے آنا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا اور کیا جانے جو پھر کسی دن اس کے من میں سمائے اور پھر اسی راستے پر پلٹ جائے۔

اگر اس نے اس کو تنہائی میں روتے نہ دیکھ لیا ہوتا تو اس کی اذیت سے کبھی آگاہ نہ ہو پاتی۔ کیا تھا اگر سب کے درمیان بیٹھ کر حرف حرف سچ بول دیتی۔ کیا اس پر اعتبار نہ کیا جاتا۔ لیکن پتا نہیں ہم سب ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اکٹھے بیٹھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن مل کر رو نہیں سکتے۔ انسان اپنا اپنا دکھ الگ الگ تالوں میں محفوظ دوسروں سے چھپاتا پھرتا ہے۔

کتنے دن تو وہ اسی لباس میں پھرتی رہی جس میں اٹھ کر آئی تھی۔ عبیر کی وارڈ روب کھلی تھی' سامنے تھی۔ ایک آدھ جوڑے کے سوا اس نے کوئی سوٹ بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ کریم بی نے تو اس خیال کا بھی کئی دفعہ اظہار کیا کہ "چل کر اس کے گھر سے اپنے کپڑے جوتے لے آتے ہیں۔ ہماری استعمال کی چیز ہے بھئی۔" ہر مشکل کام آسان کر دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ لیکن وہ نہ بازار جانے پر آمادہ ہوئی نہ گھر' گھر کے نام سے تو اس کی رنگت پیلی پڑ جاتی۔ حتیٰ کہ اس دن ابا نے گیلری کے عین درمیان کھڑے ہو کر ذرا سی بلند آواز میں جیسے کسی کو مخاطب کیے بغیر اعلان کیا تھا۔

"تنویر کو بازار لے کر جاؤ اور اس سے کہو اپنی ضرورت کی چیزیں لے کر آئے۔"

ابا احکامات بہت ہی کم صادر کرتے تھے۔ لیکن جب وہ حکم دے دیتے تو اس میں کسی چوں چراں کی گنجائش نہ ہوتی۔ اماں تک تابعداری سے کھڑی ہو جاتیں۔ اتنے دن سے سستی کرتی ٹالتی' کام چوری کرتی تنویر جیسے معمول کی طرح اٹھی اور عامل کے پیچھے بے آواز چل پڑی۔ کتنے دن گزر گئے کہ اس نے یوں کھلے آسمان کے نیچے کھلی فضا میں سانس نہیں لیا تھا۔ باہر نکلنے کے تصور سے خوف زدہ تھی۔ رکشہ گھر سے باہر تو کھڑا نہیں تھا۔ وہ پیدل چلنے کی عادی نہیں رہی۔ یا یوں کھلے عام چلنے سے کترا رہی تھی۔ پتا نہیں کیا وجہ تھی۔ لیکن جتنی دیر ان کو رکشہ نہیں ملا' وہ پلٹ پلٹ کر دیکھتی تھی جیسے اس کے پیچھے مسلسل کوئی آرہا ہو۔ جانے خواہش مند تھی کہ کوئی اس کے پیچھے آئے یا خوف زدہ تھی کہ کہیں اس کا پیچھا تو نہیں کیا جا رہا۔

گڑیا جیسے اس ساری فضا سے ایک دم بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس کا بچپن جواں بیٹی نے مل کر مار ڈالا تھا از خود ہی بیدار ہو گیا۔ وہ فٹ ہاتھ سے چھلانگ مار کر نیچے اتر آتی۔ گھاس پر پھدکتے کسی ٹڈے کو دیکھنے کے لیے رکوع میں جا کر ٹھہر جاتی۔ رُک کر نہایت دلچسپی سے درختوں کے کوؤں کو دیکھتی' ہاتھ چھڑا کر کسی مرگھلے کتے کے پیچھے بھاگ پڑتی۔ عبیر اس کو گھسیٹ کر واپس نہیں لاتی تھی۔ رُک کر اس کا انتظار کرتی۔ اس کا حق تھا' بچپن کے مزے لوٹے۔ پہلی مرتبہ تو اس کے اندر کا بچہ جاگا تھا۔ وہ دور کھڑی اس کے اندر اپنا آپ دیکھتی تھی۔

"رکشہ بھی نظر نہیں آرہا۔ یہ ہر جگہ رُک جاتی ہے۔ تم بھی اس کے ساتھ ٹھہر رہی ہو۔ کب چلیں گے۔ کب نکلیں گے۔ کب پہنچیں گے۔ کب واپس آئیں گے۔"

"گڑیا!" ماں نے جھنجلا کر پوچھا تھا۔ "تم آخر ٹھیک کیوں نہیں چلتیں؟"

عبیر نے چلتے چلتے ٹھٹک کر تنویر کی طرف دیکھا۔ انہیں لگا' وہ ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا سکتیں۔

"ٹھنڈ بڑھتی جا رہی ہے۔" عبیر نے لبنیٰ کے برآمدوں میں اس کے ساتھ چلتے کہا۔ "سویٹر شال وغیرہ بھی لے لینا۔"

چھوٹا پرس اس کو تھماتے اس نے گڑیا کا ہاتھ تھام لیا۔ کس تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر وہ دکان میں گھسی بغیر سوچ بچار کے جو اس کے ہاتھ لگا اٹھا کر افراتفری میں وہ پلٹی یہ رنگ اسے پسند تھے یا ڈیزائن کیسا تھا۔ وہ اس سے ماورا تھی۔ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ گڑیا اسی سکون سے stuff toys کے ریک کے شیشوں سے ماتھا ٹکا کر اندر کا منظر انجوائے کر رہی تھی۔

"اس کا دھیان رکھنا۔" کپڑے پکڑتے اس نے عبیر کو تنبیہہ کی تھی۔ وہ بھی نہایت تابعداری سے شیشوں کے پیچھے گڑیا پر دھیان جمائے کھڑی تھی۔ اچانک اسے محسوس ہوا شیشوں میں ابھرتی شبیہہ نامانوس نہیں تھی۔ کوئی ہے مگر کون ہے۔ تنویر کا وہم۔ وہ پلٹی ہی تھی کہ جیسے رک گئی۔

اس کا سانس حلق میں پھنس کے کیوں رہ گیا تھا۔

اس نے نظریں بچانے کی کوشش کیوں کی تھی۔ کیوں اس کا جی چاہا وہ ہوا میں تحلیل ہو جائے اور کسی کو نظر نہ آئے۔ اس کے پاس اور بہت سے سوالوں کی طرح ان سوالوں کا بھی جواب نہیں تھا۔ مگر وہ دیکھی جا چکی تھی۔ جائے فرار بھی نہ امکان۔ وہ اوپر والے شیلف میں ایک ترتیب سے لگے کھلونوں کو کھوجتے چونکا۔

لمحے بھر کے لیے اس کو اور ساتھ کھڑی بچی کو غور سے دیکھا۔

"تو آپ ہیں۔" کسی جوابی تائید کے بغیر اس نے نظریں دوبارہ انہیں شیلف پر لٹکا دیں۔

"آپ کی ہم زاد چھوٹی ہو گئی ہیں یا تبدیل ہو گئی ہیں؟"

"اضافی ہو گئی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ وہ مسکرانے کے بجائے مزید سنجیدہ ہو گیا۔

"باقی کے ہم زاد کیسے ہیں؟" رضا عثمان' سرعباس' کریم لی اور یہ آپ عموماً "حالت سزا میں کیوں پائی جاتی ہیں۔ ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے۔"

"آپ نے تو شاید سزا کے ڈر سے آنا ہی چھوڑ دیا۔"

اس کی زبان سے پھسل گیا تھا۔ وہ پکڑتی رہ گئی اور جملہ ہوا ہوا۔

"میں تو سزاؤں کا منتظر ہوتا ہوں۔ مگر لگتا ہے منصفی کرنے والے جاتے رہے اور یوں بھی لاہور آنا ہی نہیں ہوا۔ رضا نے بتایا تھا' وہ ان دنوں یہاں نہیں ہو گا۔ رہا آپ لوگوں کی طرف آنا تو مجھے کریم لی کے چیٹنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"ابھی آپ نے کہا' آپ سزاؤں کے منتظر رہتے ہیں۔"

"ایسا کہا تھا۔ چلیے آپ سنائیے سزا۔"

"مجھ سے تو اچھی منصفی ہوتی ہی نہیں۔"

"گویا جتنی بھی سزا آپ تجویز کریں گی۔ اس سے آپ کی تسلی نہیں ہو گی۔ کیا بنا آپ کی پی ایچ ڈی کا؟ نہیں ہو گی۔"

"رنج ہے کہ جاتا رہا؟"

www.pkdigest.com

"ہے۔" اس نے متانت سے کہا۔
"گویا زندگی بھر کا روگ ہے۔ اس روگ کو پالنے کے سوا کچھ اور بھی کر کے دیکھیے۔"

"یہ میری بہن ہیں تنویر!"
وہ اتنی سی دیر میں خریداری کو نمٹا آئی تھی یا بدحواسی میں خریداری کا ارادہ پھر سے ترک کر کے بیٹھی تھی۔ کاؤنٹر پر کھڑے بے ضرر سے لڑکے کو وہ شک سے پلٹ کر دیکھتی بے ساختگی میں فاروق سے ہی ٹکرائی تھی۔ تھیلے سینے سے لگائے اپنے سے ٹکرا جانے والے کو جانچ پرکھ کرتی نگاہوں سے سر سے پاؤں تک گھورا۔ اس توجہ سے کہ سلام کا جواب کہیں درمیان ہی میں رہ گیا تھا۔
"کیسی ہیں آپ؟" اسے حیرت ہوئی' وہ کسی سے رسان سے بھی بات کر سکتا تھا۔
"تھینک یو۔" اس نے رکھائی سے کہا۔ "چلو عبیر!"
عبیر کو اچھا لگا۔ چلو کچھ تو اس کے ماضی میں سے سلامت رہ گیا تھا۔ اس نے ایک اجنبی کو دیکھا اور حسبِ عادت رد کر دیا تھا۔
ایک ڈول اور کپڑوں کا بل ادا کرتے اس نے پھر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ ابھی اس کی بہن تمتمائے چہرے کے ساتھ اس سے فرصت سے محوِ گفتگو تھی جو سب بھلا کر شیلف میں لگی چیزوں کی طرف متوجہ تھا۔
"کون تھا؟" اس نے نسبتاً بلند آواز سے پوچھا تھا۔
"رضا کا دوست ہے۔"
"رضا کا دوست؟ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔"
"ہاں تمہارے جانے کے بعد گروپ میں آیا ہے۔" عبیر نے جواباً اپنی آواز مزید دھیمی کر لی تھی۔ وہ بہت دور نہیں تھا۔
"گروپ میں؟" اس کا شک بڑھ گیا۔ "تم سب لوگ جانتے بھی ہو ٹھیک سے۔ مجھے جمال نے خود بتایا تھا۔ میرے پیچھے لوگ لگے ہوئے ہیں۔ تم لوگ کسی کا اعتبار بھی تو نہیں کرتے۔ میں نے اس کو بہت دفعہ دیکھا ہے یہ ہمارے گھر کے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے۔"
تنویر کی آنکھیں متحرک تھیں۔ بڑی تیزی سے دکان میں چاروں طرف دیکھتے اس نے جھپٹ کر بیٹی کو اٹھایا۔ عبیر کا بازو مضبوطی سے گھسیٹا اور دروازے کی طرف دوڑی۔
عبیر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس دیوانگی میں بھی وہ عبیر کی حفاظت کرنا نہیں بھولی تھی۔

☆ ☆ ☆

(باقی آئندہ شمارے میں ان شاء اللہ)

لے کر ریڑھ کی ہڈی کے آخری سرے تک اسے کاٹتی چلی گئی تو بلا ارادہ اس کا منہ کھلا۔ درد سے بھری ایک کراہ اس کے حلق سے آزاد ہو گئی۔

دم بخود کھڑا اسلمان اس کو دور سے دیکھتا تھا۔ اس کے ملنے والوں میں اس کو سزا پاتے دیکھنے کا اسے یارا تھا یا نہیں۔ بس منہ اٹھا کر چلا آیا تھا۔ وہ نہ عباس رشید کے بندھے ہاتھ پاؤں کی طرف دیکھتا تھا۔ نہ کوڑا لہرا کر بھاگتے آتے شخص کے چہرے پر مشقت کا پسینہ ڈھونڈتا تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بھاگتے قدموں کی چاپ سن رہا تھا۔ دھپ' دھپ' دھپ۔

"کوڑے اسلامی سزا ہے۔" جنرل کا دفاع کرتے محفل میں بیٹھے اس کے ہمنوا بڑبڑاتے تھے۔ "اگر آپ اللہ کے قانون کو نہیں مانتے تو مرتد ہیں۔ تکلیف تو صرف پہلا کوڑا لگنے کی ہوتی ہے۔ ایسے ہی زبردستی کے شہید بنتے ہیں یہ لوگ اس کے بعد کمر سن ہو جاتی ہے۔ تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوتا۔"

ان کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے خیال میں پاکستان کا ہر شہری اس قابل تھا کہ اسے کوڑوں سے دھن کر رکھ دیا جائے۔

جب پولیس کی وین ہتھکڑی ڈالے اس کو واپس لے کر چلی تو وہ اس سے ملے بغیر چپ چاپ گاڑی میں آکر بیٹھ رہا۔ اسے لگا وہ گاڑی نہیں چلا سکتا۔ کتنی دیر سامنے کا منظر دھواں دھواں رہا۔ یہاں تک کہ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور فضا میں تحلیل ہو گئے۔

"ایک جملہ تم کہنے سے رہ گئے تھے۔ عباس رشید!" اس نے بنا کسی کو مخاطب کیے کہا تھا۔
"کہو میری پشت پر کوڑوں کے پانچ داغ پاکستان ہیں۔"

gest.com

☼ ☼ ☼

وہ اس بھیانک خواب سے بیدار ہوا تھا۔ جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔
حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے چبھ رہے تھے جیسے وہ برسوں سے تپتے صحرا میں ننگے پاؤں بھاگتا پھر رہا تھا۔
وہ میٹرس سے اٹھا کھلی فضا میں سانس لینے کو بے تاب وہ ستاروں بھرے آسمان کے نیچے آیا۔ صحن میں لگے نلکے سے منہ لگا کر جیسے اس نے سیروں پانی پیا۔ پانی اس کی باچھوں سے نکل کر گرتا' اس کے گریبان کو بھگوتا اس کا دامن شرابور کر چکا تھا۔ اور پیاس تھی کہ بجھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔
اس نے کلائی بلند کر کے ستاروں کی مدہم روشنی میں وقت دیکھنا چاہا۔ دو بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔
ڈائل کے نیچے سے چوکور خانے میں لکھا تھا۔
4 اپریل 1979ء۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)